1

گنگا کے پجاری ناگ

اے۔ حمید



بمبئے بڑودا ریلوے لائن بڑے گھنے جنگلوں میں سے گزرتی ہے۔ ان جنگلوں میں ایک ریلوے جنکشن آتا ہے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ یہاں سے ناگ پور اور کامٹی کے لئے ٹرین بدلنی پڑتی ہے۔ یہ میری جوانی کے آغاز کی آوارہ گردیوں کے زمانے کی بات ہے۔ اس زمانے میں ریل گاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے میں دو باتوں کا بطور خاص خیال رکھتا تھا۔ پہلی بات، تو یہ کہ سامان بالکل ساتھ نہ ہو۔ اگر سامان ساتھ لے جانا ضروری ہو تو پھر ایسے سامان کو ترجیح دی جائے جو کوٹ پتلون یا بش شرٹ کی جیبوں میں آ سکے۔ مثلاً ٹوتھ برش' کنگھی' چاقو وغیرہ۔ دوسری بات جس پر میں بڑی سختی سے عمل کرتا تھا یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی کوشش کی جائے۔ کئی بار پکڑا بھی جاتا۔ ٹی ٹی بس اتنی سزا دیتے کہ جہاں پکڑتے وہیں ٹرین سے نیچے اتار دیتے۔ ایک بار بھوپال کے سٹیشن پر پکڑا گیا تو وہیں اتار دیا گیا بلکہ ٹی ٹی نے ایک قلی کی نگرانی میں مجھے سٹیشن سے باہر نکلوا دیا۔ میں بڑا خوش ہوا کہ اس طرح بھوپال شہر دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ کچھ دیر تک شہر کی آوارہ گردی کرنے کے بعد میں ریلوے یارڈ کی طرف سے لائنوں پر چلتا پلیٹ فارم پر آ گیا اور دوسری گاڑی میں بغیر ٹکٹ سوار ہو کر آگے روانہ ہو گیا۔ ایک بار بمبئی سے بغیر ٹکٹ آتا ہوا برہان پور کے سٹیشن پر اتار دیا گیا۔ وہاں سے بھی دوسری گاڑی میں بیٹھ کر سفر کو جاری رکھا۔ ٹی ٹی مجھ سے کرایہ چارج کرتے مگر میرے پاس چھ سات روپے ہی ہوتے تھے۔ کچھ مجھے بھولا بھالا سا لڑکا

دیکھ کر بھی انہیں مجھ پر ترس آ جاتا تھا اور پولیس کے حوالے نہیں کرتے تھے۔ بس ٹرین سے اتار دیتے تھے۔ میرے لئے یہ کوئی سزا نہیں ہوتی تھی۔ مجھے کسی جگہ ضروری پہنچنا تو ہوتا نہیں تھا۔ دن کے وقت ٹرین سے اتارا جاتا۔ دوپہر کو یا شام ک دوسری ٹرین پکڑ لیتا۔

یہ سن 44-1943ء کا زمانہ تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ میں بمبئے بڑودا ریلوے لائن پر سفر کر رہا تھا۔ برسات کا مو تھا۔ دن کی روشنی شام کے ملگجی اندھیروں میں بدل رہی تھی۔ آسمان پر کالی کالی گھٹائی چھائی ہوئی تھیں۔ گوالیار سیکشن میں بارش بھی ہوئی تھی۔ آگے آ کر بارش رک گ تھی۔ میں نے ٹھنڈی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ بش شرٹ قسم کی آدھے بازوؤں وال قمیض تھی۔ پاؤں میں فلیٹ شوز تھے۔ میں اب بھی گھر سے بھاگتا تھا تو اس بات کا خا طور پر اہتمام کرتا تھا کہ میرے پاؤں میں فلیٹ شوز ضرور ہوں۔ امرتسر میں اپنے پا ایک فلیٹ شوز کا جوڑا فرار کے لئے ہر وقت ساتھ رکھتا تھا۔

ٹرین بڑودا سٹیشن کی ریلوے لائن پر بڑی تیزی رفتاری سے دوڑتی جا رہی تھی ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے میرے بالوں کو اڑا رہے تھے۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر شا کے سرمئی دھندلکوں میں غائب ہوتے درختوں اور ندی نالوں کو دیکھنے کی کوشش کر تھا۔ آگے وہی ریلوے جنکشن آ رہا تھا جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اور جہاں ناگ پور اور کامٹی جانے کے لئے گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ ٹرین کی رفتار آہستہ ہو لگی۔ پھر ٹرین کی دونوں جانب کارخانوں اور مکانوں کی روشنیاں شروع ہو گئیں۔ آ ٹرین جنکشن کے بہت بڑے ریلوے یارڈ میں دھڑدھڑاتی ہوئی داخل ہو گئی۔

میں کھڑکی سے سر باہر نکالے ریلوے لائن پر گاڑی کو ٹریک بدلتے دیکھ رہا تھا پیچھے سے آواز آئی۔

"ٹکٹ۔ ٹکٹ"

میں وہیں سہم گیا۔ اس آواز سے میرے کان بڑی اچھی طرح شناسا تھے۔ یہ ٹی

کی آواز تھی جو خدا جانے پیچھے کونسے سٹیشن سے ساتھ والے ڈبے میں سوار ہو گیا تھا اور اب چلتی ٹرین میں ایک ڈبے کے دروازے سے دوسرے ڈبے کے دروازے میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ خاکی وردی والا ٹکٹ چیکر ایک لالہ جی کا ٹکٹ چیک کر کے اسے واپس کر رہا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق میں نے ڈبے میں سے فرار ہونے کا جائزہ لیا۔ اگر ٹرین کھیتوں میں سے گزر رہی ہوتی تو میں ضرور کھڑکی میں سے باہر کود جاتا مگر ٹرین ریلوے یارڈ میں سے گزر رہی تھی جہاں چاروں طرف ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا تھا اور جگہ جگہ کانٹا بدلنے والے ہینڈل لگے تھے۔ اگرچہ گاڑی کی رفتار نہیں تھی مگر ڈبے سے کودنا خطرناک تھا۔ آخر میں نے اسی طریقے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا جس پر میں اکثر عمل کیا کرتا تھا۔ جب ٹکٹ چیکر نے مجھ سے ٹکٹ مانگا تو میں نے بڑا بھولا سا چہرہ بنا کر کہا۔

میں نے ٹکٹ لیا تھا جی۔ کسی نے میری جیب سے نکال لیا ہے۔ ساتھ گیارہ روپے تھے وہ بھی نکال لئے ہیں۔

ٹکٹ چیکر پر میرے جھوٹ کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ "ٹکٹ کی رقم بمع جرمانے کے نکالو۔"

میں نے کہا۔ "میرے پاس تو صرف تین روپے کچھ آنے ہیں جی"

"ٹھیک ہے۔"

ٹکٹ چیکر نے لوہے کی سلیٹ والی کاپی بند کر کی جیب میں ڈالی اور میرا بازو اپنی مضبوط گرفت میں لے کر بولا۔

"تمہیں دوسری ٹرین کی سیر کراتا ہوں"

اس ستم ظریف ٹی ٹی نے جب ٹرین سٹیشن پر رکی تو مجھے ایک دوسرے ٹکٹ چیکر کے حوالے کر دیا جو مجھے پکڑ کر ناگ پور جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ وہ اسی ریلوے لائن کا ٹی ٹی تھا۔ مجھے گارڈ کے ڈبے میں بٹھا دیا گیا۔ ٹی ٹی بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ گاڑی ناگ پور یا خدا جانے کامٹی کی طرف چل پڑی۔ شہر کی روشنیاں پیچھے رہ گئیں۔

گاڑی اندھیرے میں جنگلوں اور کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔ چلتی گاڑی کے شور میں مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ بارش ہو رہی ہے یا نہیں۔ ڈبے کے اندر روشنی تھی۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔ یہ رن تھرو ٹرین تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ٹی ٹی مجھے کہاں لئے جا رہا ہے۔ اتنے میں گاڑی کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ گارڈ نے دروازے میں کھڑے ہو کر باہر دیکھا اور پھر لالٹین کا سرخ روشنی والا حصہ جس طرف گاڑی جا رہی تھی اس طرف کر کے ہلانے لگا۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلتی رک گئی۔ تب ٹی ٹی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھایا اور بولا۔

"چلو نیچے اتر جاؤ"

میں تو حیران ہو کر رہ گیا کہ یہ شخص مجھے کہاں اتار رہا ہے۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کونسی جگہ ہے، کونسا سٹیشن ہے؟"

"چلو نیچے اترو"

وہ مجھے کھینچتا ہوا ڈبے کے دروازے تک لایا اور باہر دھکیلنے لگا۔ میں سوائے نیچے اترنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نیچے ریلوے لائن کے پتھروں پر گرتے گرتے بچا۔ گاڑی کے پہیے چرچرائے اور گاڑی آہستہ آہستہ آگے چل پڑی۔ میں ریلوے لائن کے پاس کھڑا حسرت سے چلتی گاڑی کو دیکھنے لگا۔ گارڈ ڈبے کے دروازے میں کھڑا اب لالٹین کی سبز روشنی ہلا رہا تھا۔ گاڑی نکل گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ ٹرین کی آخری بوگی کی سرخ روشنی آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی۔

میں دل میں ٹی ٹی کو گالیاں دیتا ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ یہاں ٹرین آہستہ ہوئی تھی اور گارڈ نے لال اور سرخ بتی بھی دکھائی تھی۔ ضرور یہاں مزدور ریلوے لائن کی مرمت وغیرہ کر رہے ہوں گے مگر یہ لوگ رات کو مرمت کا کام نہیں کیا کرتے۔ پھر یہاں گاڑی کیوں آہستہ ہوئی تھی؟ یہی سوچتا ہوا میں آگے کی طرف لائن کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ آسمان پر بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ خدا کا

بڑا کرم تھا کہ بارش تیز نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے اندھیرے میں لال بتی نظر آئی۔ ذرا آگے گیا دیکھا کہ ریلوے لائن سے نیچے ایک طرف کھمبے کے ساتھ سرخ روشنی والی لالٹین لٹک رہی تھی۔ کھمبے کے پاس چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی کے اندر بھی لالٹین کی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔

جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ ایک آدمی چارپائی پر بیٹھا اریل کا حقہ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جیسے بدک کر اٹھا اور بولا۔

کون ہے بے تو۔ دھت

میں نے جلدی جلدی اسے اپنی رام کہانی سنا ڈالی اور اس سے پوچھا کہ یہ کونسی جگہ ہے اور آگے کونسا شہر ہے۔ وہ آدمی جھونپڑی کے دروازے میں آگیا تھا اور مجھے ایک ہاتھ سے پیچھے دھکیل رہا تھا۔

"آگے جاؤ آگے۔ بھوجار والی قصبہ آئے گا۔ جاؤ وہاں جاؤ"

وہ ظالم شخص مجھے وہاں سے دھکے دے دے کر آگے کا راستہ بتا رہا تھا۔ میں چلنے لگا تو بولا۔

"آگے ندی کا پل ہے۔ جنگلے کے ساتھ ساتھ چلنا۔ پل کمزور ہے"

یہ بات اس نے اپنی مدھیہ پردیش کی دیہاتی بولی میں کہی تھی۔ میں اس کے جملوں کو صاف اردو میں لکھ رہا ہوں۔ اندھیری رات، بارش کی پھوار، بجلی کی چمک، خدا جانے کونسا جنگل تھا۔ کونسی ندی تھی۔ وہ ندی نہیں بلکہ دریا تھا۔ اگرچہ اس کا پاٹ بڑا نہیں تھا کیونکہ وہ پہاڑی علاقے میں سے گزر رہا تھا۔ آگے جانے کے لئے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تھوڑا اطمینان ہوا تھا کہ آگے کوئی قصبہ ہے جہاں کسی نہ کسی طرح رات بسر کی جا سکتی ہے۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ ایک جنگلہ دکھائی دیا۔ ریل کی پٹڑی اور جنگلے کے درمیان چھوٹا سا راستہ بنا ہوا تھا۔ میں جنگلے کو پکڑ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ مجھے نیچے پانی کا شور سنائی دیا۔ ایک بار تو میرے من میں خوف کی لہر دوڑ گئی میرے نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ اندھیرے میں مجھے دریا کا پانی

دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر جس طرح سے اس کی آواز آ رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ نیچے کافی گہرائی میں چٹانوں سے ٹکراتا بہہ رہا ہے۔

میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جنگلے کو پکڑ کر بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا آ بڑھ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے میں پل کی دوسری طرف پہنچا۔ اب مجھے اس بھوجار والا بھوجا والی قصبے کی تلاش ہوئی۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ رات کا وقت گھٹا ٹوپ اندھیرا' کالی گھٹا' بارش کی پھوار' سوائے آس پاس کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ بھوتوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ خدا کے بھروسے میں ریلوے لائن کے سا ساتھ چلنے لگا۔ ایک خوف مجھے یہ بھی تھا کہ کوئی سانپ نہ ڈس لے۔ ان جنگلوں م سانپ بھی بہت ہوتے ہیں جو برسات کے دنوں میں باہر نکل آتے ہیں۔ کافی دیر تک میں چلتا رہا۔ ایک جگہ روشنی جھلملاتی نظر آئی۔ یہ روشنی بائیں جانب اندھیرے م ٹمٹما رہی تھی۔ میں ریلوے لائن سے اتر آیا۔ بڑی مشکل سے جھاڑیوں کے درمیا ایک پتلی سی پگڈنڈی مل گئی۔ یہ پگڈنڈی ناریل کے درختوں کے بیچ سے ہوتی ایا ٹیلے کے پاس نکل آئی۔ جو روشنی مجھے رات کے اندھیرے میں ریلوے لائن سے نظ آتی تھی وہ بجلی کے ایک بلب کی تھی جو ایک پھاٹک کے اوپر جل رہا تھا۔ پھاٹک دروازہ کھلا تھا۔ دیوار کو جنگلی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اندر نگاہ ڈالی۔ چھ سا احاطہ تھا۔ ایک طرف چھپر کے نیچے گائے بیٹھی ہوئی تھی۔ درمیان میں او۔ چبوترے پر ایک کوٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کی چھت مخروطی تھی۔ میں نے پہچا لیا۔ یہ کوئی مندر تھا۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے مندر میں نے جنگلوں اور دور اف دیہات میں اکثر دیکھے تھے۔ ایک دم سے بجلی چمکی اور بارش کی موٹی موٹی بوندیں گر۔ لگیں۔ میں دوڑ کر چھپر کے نیچے گائے کے پاس چلا گیا۔ مندر کی کوٹھڑی سے کسی آواز دی۔

"کون ہو؟"

یہ عورت کی آواز تھی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میں کون ہوں۔ عورت نے پھر آ

دی۔ میں نے کہا مسافر ہوں۔ راستہ بھول گیا ہوں۔ ایک عورت کو میں نے کوٹھڑی سے باہر نکلتے دیکھا۔ پھاٹک کے بلب کی ہلکی سی روشنی وہاں تک آ رہی تھی۔ عورت گیروی ساڑھی میں تھی۔ اس کے بال کھلے تھے اور شانوں پر گرے ہوئے تھے۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ کوئی چڑیل نہ ہو۔

"یہاں آ جاؤ"

میں ڈرتا ڈرتا اس کی طرف گیا۔ وہ دروازے کے ایک طرف ہٹ گئی۔

"مینہ میں کیوں بھیگتے ہو۔ اندر آ جاؤ"

کوٹھڑی چھوٹی سی تھی۔ بجلی کا چھوٹا سا بلب اندر بھی روشن تھا۔ ایک جانب دیوار میں ہنومان کا بت رکھا تھا جس پر سیندور ملا ہوا تھا۔ زمین پر چٹائی بچھی تھی۔

"لڑکے! تم ادھر کے نہیں ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟ ادھر جنگل میں کیسے نکل آئے؟"

یہ جوگن قسم کی عورت بھی اس علاقے کی دیہاتی بولی میں بات کر رہی تھی۔ میں اس کے جملے صاف اردو میں لکھ رہا ہوں۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ پنجاب کا ہوں۔ ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔ ٹی ٹی نے جنگل میں اتار دیا۔ جوگن عورت کی عمر چالیس پینتالیس کے قریب ہو گی رنگ کالا تھا۔ آنکھوں میں کسی وقت شرتی چمک سی پیدا ہو جاتی تھی۔ میرے دل میں خوف سا پیدا ہو رہا تھا کہ یہ عورت کہیں چڑیل نہ نکل آئے۔ میں نے نظر بچا کر اس کے پیروں کو دیکھا وہ سیدھے تھے۔ میں نے سنا ہوا تھا کہ چڑیل کے پیر الٹے ہوتے ہیں۔ کوٹھڑی میں سیندور اور لوبان کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کا ایک دروازہ کھلا تھا جس میں سے برسات کی رات کی ہوا اندر آ رہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا کہ بمبئی جانے والی گاڑی یہاں کہاں سے ملے گی۔ جوگن عورت چٹائی پر جو میلا سا سرہانہ پڑا تھا' اس کے نیچے ہاتھ ڈالے کچھ ٹٹول رہی تھی۔ پھر اس نے سرہانے کے نیچے سے ٹین کی گول ڈبی نکال کر کھولی۔ اس میں کالے رنگ کی تین چار گولیاں پڑی تھیں۔ ایک گولی نکال کر اس نے

پھیل گیا تو میں سادھ کے تھڑے سے نیچے اترا اور دوسری طرف آ کر دیکھا۔ یہاں سے ایک پتلا سا راستہ جھاڑیوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ یہی وہ کچا راستہ تھا جس پر سے گزر کر رام دلاری نے کہا تھا کہ تم مان پور قصبے میں پہنچ جاؤ گے۔ مجھے مان پور قصبے کی پولیس چوکی میں جا کر تھانیدار ست پرکاش کو رام دلاری کا خط دینا تھا جو کپڑے میں لپٹ میری کمر کے ساتھ بندھا تھا۔

میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا جھاڑیوں کے درمیان سے گزر گیا۔ آگے ایک چھوٹی سی کچی سڑک آ گئی جس کی دونوں جانب جھاڑیاں بھی تھیں اور اونچے اونچے گھنے درخت بھی تھے۔ ایک بیل گاڑی پیچھے سے آ رہی تھی جس کے آگے بیل جتے ہوئے تھے۔ میں سڑک کے کنارے ہو کر کھڑا ہو گیا۔ بیل گاڑی پر ایک دیہاتی بیٹھا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دیا تو وہ رک گیا۔

"کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "مجھے مان پور پولیس چوکی جانا ہے"

دیہاتی کا لہجہ ذرا بدل گیا۔

"بھائی وہاں کیا کرنے جا رہے ہو؟ کیا تمہارا کوئی آدمی قتل ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ مجھے تھانیدار جی سے ملنا ہے"

گاڑی بان نے بڑی نرمی سے کہا۔

"بھائی اوپر چڑھ کر بیٹھ جاؤ۔ میں ادھر ہی جا رہا ہوں"

میں چھکڑے کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ چھکڑا خالی تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد قصبے کے مکان نظر آنے لگے۔ سبزیوں ترکاریوں کے کھیت شروع ہو گئے۔ قصبہ کے مکان سارے کے سارے اینٹ پتھر کے تھے اور سب کی چھتیں ڈھلانی تھیں۔ وسطی ہندوستان میں چونکہ بارشیں بہت ہوتی ہیں اس لئے یہاں گاؤں کے مکانوں کی چھتیں کھپریل جوڑ کر ڈھلانی بنائی جاتی ہیں تاکہ بارش کا پانی ان پر نہ رکے۔ پتھر چونکہ اس سطح مرتفع والے علاقے میں بہت ہوتا ہے اس لئے مکانوں کی دیواریں پتھروں کی ہوتی

ہیں جو دھوپ اور برسات کی بوچھاڑوں کی مار کھا کھا کر زنگ آلود سیاہی مائل ہو گئی ہوتی ہیں۔ دھوتی نما ساڑھیوں میں ملبوس نیم عریاں دیہاتی عورتیں کھیتوں میں مردوں کے ساتھ کام کرتی نظر آ رہی تھیں۔ قصبے کے مکان شروع ہوئے تو ایک جگہ پیپل کا گھنا درخت تھا جس کے قریب ہی چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا۔ اس مندر میں مسلسل گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

گاڑی بان نے ایک کوارٹر نما مکان کے آگے چھکڑا روک دیا اور بولا۔

"بابو بھائی یہی ہے پولیس کی چوکی"

میں چھکڑے سے اتر پڑا۔ گاڑی بان تیزی سے چھکڑا آگے نکال کر لے گیا۔ کوارٹر کے دروازے پر ایک جانب ہندی اور انگریزی میں پولیس چوکی لکھا تھا۔ برآمدے میں ایک مریل سا سنتری سٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ میں اس کی طرف آیا تو وہ ترش لہجے میں بولا۔

"کیوں بے۔ کدھر آ رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے تھانیدار صاحب ست پرکاش جی سے ملنا ہے۔"

سنتری اسی طرح سٹول پر بیٹھا بیڑی پیتا رہا۔ پھر ذرا ہنس کر بولا۔

"کیوں بے۔ تجھے صبح صبح تھانیدار جی سے کیا کام پڑ گیا ہے۔ کہاں سے آ رہا ہے؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے کہا۔ "یہ ساری باتیں میں تھانیدار صاحب کو ہی بتاؤں گا۔"

برآمدے میں ایک کمرہ تھا جس پر چق پڑی ہوئی تھی۔ اس کے اندر سے کسی مرد کی تیز آواز آئی۔

"کیوں رے رلیا رام کس سے باتیں کر رہا ہے؟"

اس سنتری کا نام رلیا رام تھا۔ اس نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ "کوئی لڑکا ہے۔ کہتا ہے بڑے صاحب سے ملوں گا۔"

اس کے بعد چق ایک طرف کو اٹھی اور ایک وردی پوش سپاہی اندر سے نکلا۔

شاید وہ حوالدار ہو گا۔ وہ بھی بڑا سوکھا ساکھا تھا۔ میری طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

میں نے جو باتیں پہلے سنتری کو کہی تھیں وہی دہرا دیں۔ یہ بالکل نہ بتایا کہ میں ست پرکاش کے نام کسی کا خط لے کر آیا ہوں۔ دوسرے سنتری یا حوالدار نے برآمدے میں ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"چل ادھر ہو کر بیٹھ جا۔ صاحب آئے گا تو مل لینا۔"

میں برآمدے میں ایک ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ رام دلاری نے جو مجھے چاندی کے پانچ روپے دیئے تھے وہ میری میلی کچیلی پتلون کی پچھلی جیب میں اسی طرح محفوظ پڑے تھے۔ رام دلاری کا خط میری کمر کے ساتھ بندھا تھا۔ سگریٹ کی ڈبیا راستے میں کہیں دوڑتے دوڑتے گر گئی تھی۔ سگریٹ میں نے بچپن ہی میں پینے شروع کر دیئے تھے۔ دوسروں کو دیکھ کر یہ بری عادت مجھے بھی پڑ گئی تھی۔

کافی دن نکل آیا تھا۔ قصبے کے بازار میں کالے کالے سانولے سانولے دیہاتی آدمیوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ کوئی سائیکل پر گزر جاتا۔ کوئی ریڑہ ایک طرف سے آ کر دوسری طرف نکل جاتا۔ اکثر آدمیوں نے صرف گھٹنوں سے اوپر تک دھوتیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اوپر کا دھڑ ننگا تھا۔ عورتوں کے رنگ بھی گہرے سانولے تھے۔ ابھی تک مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ قصبہ مان پور جہاں میں بیٹھا ہوں اس کے آگے کونسا بڑا شہر آتا ہے۔ میں تو بمبئی جا کر فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھنے کے شوق میں گھر سے بھاگ کر آیا تھا کہ راستے میں بغیر ٹکٹ پکڑا گیا اور ٹی ٹی نے بیچ جنگل میں بارش میں اتار دیا۔ اب بھی میں نے یہی سوچا ہوا تھا کہ رام دلاری کا خط تھانیدار کو دے کر میں بمبئی بھاگ جاؤں گا۔ یہاں سے کوئی نہ کوئی گاڑی تو بمبئی کی طرف ضرور جاتی ہو گی۔

اتنے میں ایک وردی پوش پولیس کا آدمی تھانے کے احاطے میں داخل ہوا۔ اس کو دیکھتے ہی سٹول پر بیٹھے ہوئے سنتری نے بیڑی ایک طرف پھینکی اور جلدی سے اٹھ

کھڑا ہوا۔ میں نے اس وردی پوش آدمی کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا تو مجھے اس کے ماتھے پر دائیں جانب زخم کا نشان بھی نظر آگیا۔

ضرور یہی ست پرکاش تھانیدار تھا۔ سنتری نے اسے سیلوٹ کیا اور آگے بڑھ کر دروازے کی چق اٹھا دی۔ تھانیدار اندر چلا گیا۔ میں اسی طرح برآمدے میں بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر سنتری سے کہا۔

"تھانیدار صاحب آ گئے ہیں نا؟"

سنتری بولا۔ "ہاں ہاں آ گئے ہیں۔ مگر ابھی کام کر رہے ہیں۔ تم آرام سے بیٹھے رہو۔"

میں پھر وہیں ستون کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اتنے میں وہی تھانیدار کمرے سے باہر آیا اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ میں دوڑ کر اس کے سامنے آ گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

اس کے ہاتھ میں بید کا ڈنڈا تھا۔ میں نے ذرا آگے ہو کر کہا۔

"میں رام دلاری جی کا خط لایا ہوں"

وہ ٹھٹک سا گیا۔ سنتری اتنے میں دوڑ کر آیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچنے لگا۔ تھانیدار نے غصے میں اسے ڈانٹ دیا۔

"کیا کرتا ہے۔ چھوڑ دے اسے"

پھر تھانیدار نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے واپس اپنے کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں جو حوالدار بیٹھا تھا اسے فوراً باہر جانے کو کہا۔ جب کمرے میں صرف میں اور تھانیدار رہ گئے تو اس نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور کہا۔

"کہاں ہے خط؟"

میں نے کہا۔ "پہلے اپنا نام بتائیں"

وہ ذرا سا مسکرایا۔

"میرا نام ست پرکاش ہے۔"

اس دوران میں نے اس کے ماتھے پر دائیں جانب زخم کے آدھ انچ لمبے نشان کو غور سے دیکھ لیا تھا۔ اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کا سر درمیان سے تھوڑا سا گنجا تھا۔ میں نے اپنی کمر کے گرد لپٹا ہوا کپڑا اتارا اور اس میں سے رام دلاری کا لفافہ نکال کر ست پرکاش کو دے دیا۔ وہ لفافہ پھاڑ کر خط پڑھنے لگا۔ خط پڑھتے وقت اس کے چہرے کے تاثرات ایسے ہو رہے تھے جیسے اسے کوئی ایسی شے مل گئی ہو جس کے ملنے کی اسے بالکل امید نہ تھی۔ خط پڑھ کر اس نے تہہ کر کے خاکی بش شرٹ کی جیب میں رکھا اور تیز آواز میں سنتری کو آواز دی۔ سنتری دوڑتا ہوا اندر آگیا۔ ست پرکاش نے کہا۔

"اس لڑکے کے لئے ناشتہ لے کر آؤ"

"یس سر"

سنتری سیلوٹ کر کے چلا گیا۔

تب ست پرکاش نے میز پر کہنیاں رکھ کر میری طرف جھک کر ممنونیت سے بھرے لہجے میں کہا۔

"تم نے وہ کام کر دکھایا ہے جو ہماری بمبئی پولیس کا بڑے سے بڑا اور چالاک سے چالاک افسر بھی نہیں کر سکا ہم تمہارے دھنوادی ہیں۔ تم پنجاب کے ہو اور مسلمان ہو۔ دھنوادی کا مطلب سمجھتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "نہیں سر"

"اس کا مطلب ہے ہم تمہارا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہم تمہارے شکرگزار ہیں۔"

میں نے اس سے کہا۔

"سر! بس میرا ایک کام کر دیں۔ مجھے کسی طرح بمبئی پہنچا دیں۔"

"وہاں تمہارے رشتے دار ہیں کیا؟"

میں نے اسے یہ نہ بتایا کہ مجھے فلم ایکٹروں کو دیکھنے کا شوق بمبئی لے جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہاں جی۔ میرے ایک چاچا جی وہاں رہتے ہیں۔"

ست پرکاش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم تمہیں خود بمبئی پہنچائیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ مگر ابھی تمہیں میرے پاس رہنا ہو گا شاید تم نہیں جانتے کہ تم مدھیہ پردیش کے ایک بہت بڑے خونی ڈاکو کے ڈیرے سے جان بچا کر نکل آئے ہو۔"

میں نے فوراً کہا۔

"اب جس طرح بھی ہو رام دلاری جی کو بھی وہاں سے نکال لائیں۔ وہ وہاں خوش نہیں ہے۔ اسے ڈاکوؤں کے سردار ٹھاکر نے قید کر کے رکھا ہوا ہے۔"

ست پرکاش آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"فکر نہ کرو۔ ہم رام دلاری کو بہت جلد وہاں سے نکال لائیں گے اور ان ڈاکوؤں کو بھی گرفتار کریں گے۔"

سنتری ناشتہ لے کر آگیا۔ پیتل کی تھالی میں گرم گرم پوریاں تھیں۔ پیتل کی کٹوریوں میں بھاجی اور اچار تھا۔ چار۔ چھوٹی چھوٹی پوریاں تھیں۔ میں گھر میں صبح صبح قلچے سری پائے کا ناشتہ کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی دو ڈھائی قلچے کھا جایا کرتا تھا۔ اوپر سے مجھے بھوک بھی بہت لگی ہوئی تھی۔ جب تک سنتری نے صراحی میں سے پانی نکال کر میرے پاس گلاس رکھا میں تین پوریاں کھا چکا تھا۔ تھانیدار ست پرکاش میری طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ پوچھنے لگا۔

"پوریاں اور منگواؤں؟"

میں نے کھاتے کھاتے کہا۔

"ہوں"

ست پرکاش نے سنتری کی طرف دیکھ کر حکم دیا۔

"چار پوریاں اور لے کر آؤ۔"

"یس سر"

ناشتہ کرنے کے بعد ست پرکاش نے میرے لئے چائے منگوائی باہر سنتری کو آرڈر کر دیا کہ اندر کسی کو آنے نہ دیا جائے۔ وہ کاغذ پنسل سامنے رکھ کر بیٹھ گیا اور مجھ سے ڈاکوؤں کے ٹھکانے کے محل وقوع کے بارے میں باتیں پوچھنی شروع کر دیں وہ مجھ سے تفصیلات پوچھتا جاتا تھا اور ساتھ ساتھ کچھ لکھتا اور کاغذ پر کہیں کہیں نشان بھی لگاتا جاتا تھا۔ جب ست پرکاش تھانیدار نے مجھ سے ڈاکوؤں سے متعلق ساری تفصیلات حاصل کر لیں تو مجھے ساتھ لے کر گھر آ گیا۔ اس کا گھر قصبے کی ایک گلی کے کونے پر تھا۔ یہ دو منزلہ پختہ مکان تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"یہ لڑکا اپنا بیٹا ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ سندری سے کہہ کر اس کے کپڑے دھلوا دینا۔"

ست پرکاش واپس پولیس چوکی چلا گیا۔ میں سارا دن گھر میں رہا۔ ست پرکاش کی ہندو بیوی نے مجھے ایک نئی دھوتی نکال کر پہننے کو دی اور میرے کپڑے نوکرانی سندری نے دھو کر استری کر دیئے۔ دوپہر کو مجھے صحن میں جہاں ایک گائے بندھی تھی وہاں بانس کی چارپائی پر تھال میں کھانا ڈال کر دیا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ست پرکاش کی ہندو بیوی مجھے گھر کے کھانا پکانے والی جگہ یعنی چوکے کے قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ اس لئے کہ میں مسلمان تھا۔

اس دوران ست پرکاش تھانیدار نے ساتھ والے قصبے اور قریبی شہر سے بھی پولیس کی کچھ نفری منگوالی تھی اور ٹھاکر ڈاکو کی کمین گاہ پر چھاپہ مارنے کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ دوپہر کے بعد ست پرکاش پولیس کی بھاری مسلح نفری لے کر ڈاکوؤں کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوا۔ یہ ساری کاروائی مجھے بعد میں رام دلاری نے بتائی۔ پولیس نے چاروں طرف سے ڈاکوؤں کو گھیرے میں لے کر اچانک حملہ کیا تو وہاں افراتفری مچ گئی۔ سب سے پہلے ست پرکاش نے رام دلاری کو اپنی حفاظت میں لیا۔ کئی ڈاکو مارے

گئے۔ تین پولیس کے سپاہی زخمی ہوئے۔ ڈاکوؤں کا سردار ٹھاکر اپنے چند ساتھیوں سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

شام کا اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں چھایا تھا کہ پولیس پارٹی قصبے میں واپس آ گئی۔ پولیس کچھ ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے بھی لے آئی تھی۔ رام دلاری کو ست پرکاش تھانیدار اسی وقت خود گھر لے کر آ گیا۔ رام دلاری نے مجھے دیکھا تو خوش ہو کر ست پرکاش کی بیوی سے کہا۔

"بھابو جی! یہ مسلمان لڑکا اگر میری مدد نہ کرتا تو میں یہاں واپس نہیں پہنچ سکتی تھی۔"

رات کو ناریل کی چھال کے سائبان کے نیچے چارپائیاں ڈال دی گئیں۔ رام دلاری نے نہا دھو کر نئی ساڑھی پہن لی تھی۔ اس نے سر میں تیل ڈال کر بالوں میں کنگھی بھی کی ہوئی تھی۔ اس علاقے کے رواج کے مطابق جوڑے میں مونگرے کے پھولوں کا جوڑا بھی باندھ رکھا تھا۔ اس وقت مجھے وہ بڑی خوبصورت اور اچھی لگی۔ وہ عمر میں مجھ سے پندرہ بیس سال بڑی ہو گی مگر لگتی بالکل نوجوان تھی۔ ڈاکوؤں کے درمیان رہنے سے بھی اس کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑا تھا۔ وہیں چارپائیوں پر بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا گیا۔ ست پرکاش نے ڈاکوؤں پر یلغار اور پولیس مقابلے کا سارا واقعہ تفصیل کے ساتھ اپنی بیوی کو سنایا اور اپنی بہادری کا رعب جماتا رہا۔ رام دلاری اس دوران میری چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"مجھے بھائی جی بتایا ہے کہ تم بمبئی جانا چاہتے ہو اور تمہیں فلم ایکٹروں اور فلم ایکٹرسوں کو دیکھنے کا شوق ہے۔"

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میں بمبئی کی طرف ہی جا رہا تھا کہ بغیر ٹکٹ پکڑا گیا۔"

رام دلاری بولی۔ "وہ تو مجھے معلوم ہے۔ تو پھر تم میرے ساتھ ہی بمبئی چلنا۔ میں بمبئی میں ہی رہتی ہوں۔"

تب رام دلاری نے اپنے بارے میں کھول کر بتایا کہ وہ بمبئی کی فلموں میں ایکسٹرا عورتوں کے ساتھ کام کرتی ہے اور بڑا اچھا ڈانس کر لیتی ہے۔ ست پرکاش تھانیدار اس کی پھوپھی کی بیٹی کا خاوند تھا اور آگرہ سے اجین اور پھر اجین سے مان پور کی پولیس چوکی میں آ کر لگا تھا تاکہ اس علاقے کو ڈاکوؤں سے صاف کرے۔ رام دلاری ایک فلم یونٹ کے ساتھ آؤٹ ڈور شوٹنگ میں حصہ لینے کے لئے اجین کے تاریخی مندروں میں آئی ہوئی تھی اور مندر کے قریب ایک جنگل میں یونٹ کی دوسری ایکسٹرا گرلز کے ساتھ مقیم تھی کہ وہاں آدھی رات کو ڈاکہ پڑ گیا۔ ٹھاکر نے اپنے ڈاکوؤں کے ہمراہ ڈاکہ ڈال کر ان کا سب کچھ لوٹ لیا۔ رام دلاری اسے سب عورتوں سے بڑھ کر پسند آ گئی اور وہ اسے اٹھا کر ساتھ ہی لے گیا۔ ست پرکاش تھانیدار نے اجین اور اندور شہر کے درمیانی کوہستان ست پڑا رینج کے سارے پہاڑی جنگلوں کو چھان مارا مگر اسے ڈاکوؤں کا کہیں کوئی سراغ نہ ملا۔

میں نے رام دلاری سے پوچھا۔

"کیا تم مجھے بھی شوٹنگ پر ساتھ لے جایا کرو گی؟"

رام دلاری نے ہنس کر کہا۔

"تمہیں فلم کی شوٹنگ پر بھی لے جاؤں گی اور اپنی سہیلیوں سے بھی ملاؤں گی۔"

میں بڑا خوش ہوا۔ اس سے پہلے میں دو بار گھر سے بھاگ کر بمبئی جا چکا تھا مگر کسی نے مجھے فلم سٹوڈیو میں نہ جانے دیا تھا۔ اب مجھے فلم ایکٹرسوں کو دیکھنے کا بڑا اچھا موقع مل رہا تھا۔ تین دن رام دلاری نے ست پرکاش تھانیدار کے ہاں قیام کیا۔ چوتھے دن ست پرکاش لاری میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر بھارت کے تاریخی شہر اندور آیا۔ اندور سے میں اور رام دلاری بمبئی جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جب تک گاڑی نہیں چلی ست پرکاش پلیٹ فارم پر موجود رہا۔ اندور سے روانہ ہو کر گاڑی ساری رات ست پڑا کی پہاڑیوں اور جنگلوں میں سفر کرتی رہی۔ راستے میں کھنڈوا نام کا شہر بھی آیا۔ دوسرے روز گاڑی ناسک پہنچی تو دن کافی نکل آیا تھا۔ دوپہر کے وقت بمبئی شہر کا

مضافاتی سٹیشن باندرہ بھی گزر گیا۔ رام دلاری نے سامان سمیٹتے ہوئے مجھے کہا۔

"تیار ہو جاؤ۔ بمبئی کا سٹیشن آ رہا ہے۔"

ٹرین بمبئی کے بہت بڑے ریلوے یارڈ میں سے گزر رہی تھی۔ میں کھڑکی م
سے باہر دیکھ رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کچھ فاصلے پر بمبئی کی بلڈنگ
نظر آ رہی تھیں۔ سڑک پر ناریل کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ ٹرین یارڈ میں بل کھا
پٹڑیاں بدلتی بہت بڑے ریلوے سٹیشن میں داخل ہو گئی۔ میں اس سے پہلے دو بار گ
سے بھاگ کر بمبئی آ چکا تھا۔ بمبئی کا سٹیشن میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ دونوں د
جب میں بمبئی کے سٹیشن پر اترا تھا تو مجھے بمبئی پہنچنے کی خوشی بھی ہوئی تھی مگر ا
خیال سے پریشان بھی تھا کہ اتنے بڑے شہر میں کہاں ٹھہروں گا۔ راتیں کہاں بسر ہو
گی۔ کھانے پینے کی مجھے فکر نہیں تھی۔ کیونکہ میں دونوں دفعہ گھر سے پیسے چوری
کے بھاگا تھا۔ لیکن اس بار مجھے اس بات کی پریشانی نہیں تھی کہ میں اتنے بڑے شہر
کہاں رہوں گا۔ رات کہاں بسر کروں گا۔ اس بار رام دلاری میرے ساتھ تھی اور
مجھے اپنے گھر لے جا رہی تھی۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ رام دلاری بمبئی
فلموں میں ایکسٹرا رول ادا کرتی ہے اور اس کی وجہ سے میں فلموں کی شوٹنگ
دیکھوں گا اور فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو بھی ملوں گا۔

ٹرین بمبئی ریلوے سٹیشن کے کشادہ پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک گئی۔ رام دلا
نے مجھے ایک تھیلا پکڑاتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ رہنا۔ ادھر ادھر نہ ہو جانا۔"

میں نے تھیلا پکڑ لیا اور رام دلاری کے ساتھ ڈبے کے باہر نکل آیا۔ رام دلاری نے قلی کو بلا کر اس کے سر پر سامان رکھوایا اور کہا۔

"باہر چلو"

سٹیشن سے باہر ایک طرف بمبئی کی خاص سواری وکٹوریا یعنی بگھیاں قطار میں کھڑی تھیں۔ ایک رومی ٹوپی والا کوچوان دوڑ کر رام دلاری کے پاس آ گیا۔

"میڈم! کدھر جائے گا۔ وکٹوریا خالی ہے۔"

رام دلاری بمبئی کی پرانی رہنے والی تھی اور بڑی تجربہ کار عورت تھی۔ کوچوان کو سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ادھر باجو میں سیمنگٹن روڈ کے ناکے پر جانا ہے۔ بول کیا لے گا؟"

کوچوان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ میڈم بمبئی کی رہنے والی ہے۔ اس نے مناسب کرایہ بتایا اور قلی سے سامان لے کر بگھی یعنی وکٹوریا میں رکھوایا۔ خود بگھی کی اونچی سیٹ پر سانٹا لے کر بیٹھ گیا۔ میں اور رام دلاری بھی وکٹوریا میں بیٹھ گئے۔ وکٹوریا کی چھت طے کی ہوئی تھی - یہ پرانی بگھیوں کی طرح کی آئیل کلاتھ کی چھت تھی جو بارش ہو تو کھول دی جاتی تھی۔ اس وقت بمبئی میں بارش نہیں ہو رہی تھی۔

میں بارش کے انتظار میں تھا۔ میں دونوں دفعہ جب بمبئی آیا تھا تو مون سون کا سیزن تھا اور دونوں دفعہ بمبئی میں ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ وکٹوریا سٹیشن سے نکلتے ہی سیمنگٹن روڈ پر آہستہ آہستہ چل پڑی۔ یہ میں سن چالیس کے زمانے کی بات سنا رہا ہوں۔ اس وقت برصغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ زندگی بڑی سست رفتار اور پرسکون تھی۔ بمبئی کی سڑکوں پر بھی اس زمانے میں اتنا رش نہیں ہوتا تھا۔ سنگ مرمر کی چھوٹی گول میزوں والے ایرانی ریستورانوں کی چائے بڑی خوشبودار ہوتی تھی۔ چھوٹے سے کاؤنٹر پر شیشے کے مرتبانوں میں انگلش بسکٹ' ٹافیاں اور ہاتھی مارکہ سگریٹ بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ ان دنوں بمبئی میں ہاتھی مارکہ اور حیدر آباد دکن کا چار مینار سگریٹ غریبوں مزدوروں کا بڑا مقبول سگریٹ تھا۔ یہ شاید ایک آنے کا پیکٹ ہوتا تھا۔

وکٹوریا سڑک کے کنارے کنارے ست رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ گھوڑے کے سموں کی کلپ کلوپ کی آواز آ رہی تھی۔ پھر وکٹوریا کافی آگے جا کر بائیں جانب گھوم گئی۔ یہ میرے لئے ایک نئی سڑک تھی۔ اس کی دونوں جانب درمیانے درجے کے فلیٹ بنے ہوئے تھے جن کی گیلریوں پر سکھانے کے لئے عورتوں مردوں اور بچوں کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ رام دلاری نے ایک جگہ وکٹوریا رکوا دی۔ یہاں بائیں جانب ایک گلی تھی۔ رام دلاری نے کوچوان سے کہا۔

"بھیا! یہ تھوڑا سامان ادھر لے آؤ۔"

اس گلی کی ایک بوسیدہ سی بلڈنگ کی ایک چالی یا فلیٹ میں رام دلاری رہتی تھی۔ گلی لاہور کی گلیوں کی طرح تنگ نہیں تھی۔ بلکہ کشادہ تھی اور وہاں ایک اونچا درخت بھی تھا۔ رام دلاری سامان اٹھوائے مجھے ساتھ لئے جیسے ہی ایک دو منزلہ پرانی بلڈنگ کے پاس آئی اوپر سے اسے دو تین عورتوں نے دیکھ لیا اور ایک دوسری کو اونچی آواز میں کہا۔

"اری! رام دلاری آ گئی۔"

سب عورتیں نیچے آ گئیں۔ اور رام دلاری سے گلے ملنے لگیں۔ ان میں جوان لڑکیاں بھی تھیں اور ادھیڑ عمر بھی تھیں۔ سب نے ساڑھیاں پہن رکھی تھیں اور ان کے رنگ سانولے اور کالے کالے تھے۔ یہ بمبئی فلم انڈسٹری کی ایکسٹرا گرلز تھیں جو اس چالی یا بلڈنگ میں رام دلاری کے ساتھ رہتی تھیں۔ کسی نے پوچھا۔

"رام دلاری! تو کہاں تھی ری؟"

کسی نے کہا۔

"اری اخبار میں لکھا تھا پولیس تجھے ڈاکوؤں سے چھڑا لائی ہے۔ ڈاکو کیسے تھے؟"

پھر سب کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ رام دلاری نے کہا۔

"مری کیوں جاتی ہو۔ سب بتا دوں گی۔ ذرا دم لینے دو۔"

رام دلاری کے فلیٹ پر تالا پڑا تھا۔ اس نے چابی لگا کر تالا کھولا۔ سامان اندر

رکھوایا۔ کوچوان کو پیسے دے کر رخصت کیا اور کارنس پر کسی دیوی کی تصویر لگی تھی۔ آگے بڑھ کر ساڑھی کے پلو سے تصویر کو صاف کیا اور پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"ممبا دیوی! تیری کرپا ہوئی۔ میں گھر واپس آ گئی۔"

کمرے میں سامان بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ کونے میں لوہے کے پلنگ پر بستر لگا ہوا تھا۔ میلے میلے تکیئے پڑے تھے۔ ایک طرف رسوئی کا سامان پڑا تھا۔ دوسرے کونے میں قد آدم دیوار تھی جس کی دوسری جانب نلکا لگا تھا۔ یہ نہانے اور کپڑے دھونے کی جگہ تھی۔ اسی قسم کی نچلے متوسط طبقے کی بلڈنگوں میں باتھ روم کامن ہوتے ہیں جنہیں بمبئی کی زبان میں سنڈاس کہا جاتا ہے۔ ہر منزل کے لمبے برآمدے کی ایک جانب آدمیوں اور دوسری جانب عورتوں کے باتھ روم یا سنڈاس بنے ہوتے ہیں۔ کمروں کے اندر نہانے اور کپڑے دھونے اور رسوئی وغیرہ کے استعمال کے لئے دیوار کی اوٹ میں نلکا لگا ہوتا ہے۔

میں تھیلا تپائی پر رکھ کر لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ دیواروں پر اسی زمانے کی فلمی ہیروئینوں اور ہیرو کی تصویریں کاٹ کر چسپاں کی ہوئی تھیں۔ رام دلاری نے ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے گرد باندھتے ہوئے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"اٹھو منہ ہاتھ دھو لو۔ تمہیں نئے کپڑے خرید کر دیتے ہیں۔ میرے ساتھ سٹوڈیو پتلون پہن کر جایا کرو گے۔"

دیوار کی اوٹ میں نل کے پاس بیٹھ کر میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ رام دلاری نے بھی منہ دھو کر بالوں میں کنگھی کی ۔نئی ساڑھی ٹرنک میں سے نکال کر پہنی - ساڑھی پہننے سے پہلے اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بڑے بے شرم ہو۔ منہ دوسری طرف کیوں نہیں کرتے؟؟"

میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

اتنے میں اس کی فلم سٹوڈیو کی ایکسٹرا گرل سہیلیاں آ گئیں۔ وہ رام دلاری سے اس کے ساتھ گزرے واقعات سننے کو بے تاب تھیں۔ مگر رام دلاری نے ان سب کو

یہی کہا کہ بس میں آ گئی ہوں۔ ڈاکو لے گیا تھا۔ پولیس نے چھاپہ مارا اور مجھے برآمد کر لیا۔ ایک سانولی سی دبلی پتلی لڑکی نے بسنتی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے رام دلاری سے پوچھا۔

"یہ سائیڈ ہیرو کہاں سے اٹھا لائی ہو؟"

میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ رام دلاری نے مسکرا کر کہا۔

"اری! یہ ہیرو مجھے نہ ملتا تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔ بڑی بہادری دکھائی اس نے۔"

ایک اور عورت کہنے لگی۔

"تیرے جانے سے کورس ڈانس میں ہمارا بھی جی نہیں لگتا تھا۔ سیٹھ بھی تیرا پوچھا کرتا تھا۔"

وہ گنجہ مارواڑی"

"ہاں ہاں"

رام دلاری نے بالوں کے جوڑے میں ربن باندھتے ہوئے کہا۔

"بھگوان کرے اب دو تین فلموں کا کام مل جائے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں رہا۔"

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد رام دلاری کی ایکسٹرا گرل سہیلیاں اپنے اپنے فلیٹوں میں چلی گئیں۔ یہاں سے ہم سرخ رنگ کی بس میں بیٹھ کر بمبئی کے اس علاقے کی ایک کپڑا مارکیٹ کے پاس اتر گئے۔ یہاں ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک دکان سے رام دلاری نے مجھے دو ٹھنڈی پتلونیں اور دو قمیضیں خرید کر دیں۔ ایک چپل بھی خرید کر دی۔

شام کو اس نے چولہے کے پاس بیٹھ کر آلو کی بھاجی بنائی۔ چھوٹے چھوٹے پھلکے پکائے اور میرے ساتھ کھانا کھایا۔ کہنے لگی۔

"ابھی تک میں نے یہاں کسی کو نہیں بتایا کہ تو مسلمان ہے۔ سوچتی ہوں کیوں نہ

میں تمہارا ایک ہندوانہ نام رکھ دوں۔ بات یہ ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ تم اب میرے پاس ہی رہو۔ تم نے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا ہے کہ میں جس کا بدلہ اتارنا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں پڑھاؤں گی۔ اگر نہیں بھی پڑھو گے تو تمہیں فلموں میں چھوٹا موٹا رول دلا دیا کروں گی۔ ہو سکتا ہے تم ہیرو بن جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "میں ہندو نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں"

رام دلاری نے میرے گال پر تھپکی دے کر کہا۔

"ارے پگلے میں کب کہتی ہوں کہ تو ہندو ہے تو مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔ میں تو اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میرے ساتھ ایک مسلمان لڑکے کو رہتے دیکھ کر سب لوگ شک کریں گے تمہارا فرضی ہندوانہ نام رکھ دوں گی تو کوئی شک نہیں کرے گا۔ نام رکھنے سے تم ہندو تھوڑے ہو جاؤ گے۔ دیکھتے نہیں فلم انڈسٹری میں کتنے ہی مسلمان ہیں جنہوں نے اپنے نام ہندوانہ رکھے ہوئے ہیں۔ جے انت کو لے لو۔ وہ پشاور کا مسلمان ہے مگر نام اس نے ہندوؤں والا رکھا ہوا ہے۔ بولو تمہارا کیا نام رکھوں؟"

میں نے کہا۔ "کمار رکھ دو۔ یہ نام مجھے پسند ہے۔"

رام دلاری ہنسنے لگی۔

"وارہ رے میرے ہیرو۔ اچھا ٹھیک ہے آج سے میں تمہیں دوسروں کے سامنے راجکمار کہکر بلایا کروں گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہے"

مجھے راجکمار نام پسند بھی تھا۔ میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب میں نے امرتسر کے پرل ٹاکیز میں ایک فلم دیکھی تھی جس کا نام تھا۔ "آوارہ گرد راجکمار" یہ فلم مجھے بڑی پسند آئی تھی۔ اس میں ایک راجہ کا بیٹا ہوتا ہے جو بھیس بدل کر رعایا کا حال چال معلوم کرنے شہر شہر آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے۔ رام دلاری رسوئی میں چیزیں سمیٹنے لگی۔ میں اپنی نئی چپل کو میلے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر چمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے

کہا۔

"کمار!"

میں سمجھا شاید وہ باہر کسی کو بلا رہی ہے۔ جب دوسری بار اس نے کمار کہکر بلایا تو مجھے فوراً خیال آیا کہ میرا فرضی نام کمار ہے۔ راج کمار۔۔۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"کیا ہے میڈم؟"

اس نے مجھے جھڑک کر کہا۔

"تم مجھے میڈم نہ کہا کرو۔ دیدی کہا کرو۔ اس لئے کہ تم مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح پیارے ہو۔ جانتے ہو؟ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔"

پھر میں نے دیکھا کہ رام دلاری کا چہرہ ایک دم اداس ہو گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگے آئینے میں اپنے ماتھے پر لگے ہوئے دھبے کو رومال سے صاف کر رہی تھی۔ میری طرف پلٹ کر بولی۔

"تم مجھے دیدی کہو گے نا؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں دیدی!"

اس نے میرے پاس آ کر میرا ماتھا چوم لیا۔

"میرا راج کمار بھائی!۔۔۔ چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ رات ہو رہی ہے ہمیں سٹوڈیو چلنا ہے۔ تمہیں پرمیلا جی سے بلاؤں گی۔"

میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"رنجیت سٹوڈیو جانا ہے؟"

وہ ہنس پڑی۔

"ارے! تمہیں رنجیت سٹوڈیو کا نام بھی معلوم ہے؟ پگلے نہیں۔ ہم پرکاش سٹوڈیو جائیں گے۔ ان کی ایک فلم میں کام کر رہی تھی کہ اس کمینے ٹھاکر نے مجھے اٹھا لیا۔ قمیض کے بٹن بند کرو۔"

بمبئی کے بازاروں میں رات کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں کہ ہم اپنی چالی سے نکل کر ایک بس میں سوار ہو گئے۔ اس بس نے ہمیں بمبئی کے ایک مضافاتی علاقے اندھیری پہنچا دیا۔ پرکاش فلم سٹوڈیو اندھیری کے علاقے میں ہی تھا۔ پرکاش فلم کمپنی کے نام سے یہاں سٹنٹ فلمیں بنتی تھیں اور ان کی سٹنٹ فلمیں میں امرتسر میں دیکھا کرتا تھا۔ ان فلموں میں امجد خان کے والد صاحب جے انت کے فلمی نام سے ولن کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔ ان کا اسلامی نام مجھے یاد نہیں رہا۔ فلمی نام جے انت تھا۔ پرکاش فلم کمپنی یا پرکاش مووی ٹون کی فلموں میں ہیرو اوماکانت نام کا ایک ایکٹر ہوتا تھا۔ ہیروئین ایک کرسچن عورت ہوتی تھی جس کا فلمی نام پرمیلا تھا۔

رام دلاری نے مجھے سٹوڈیو کے ایک بڑے فلور میں ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خود ایکسٹرا گرلز کے سپلائر سے باتیں کرنی لگی۔ فلور پر کسی سٹنٹ فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ اداکار جے انت وہاں نہیں تھا۔ ہیرو اوما کانت اور ہیروئین پرمیلا وہاں موجود تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی میک اپ ٹھیک کر رہی تھی۔ میں اسے قریب سے دیکھنے کے شوق میں اٹھ کر صوفے کے پیچھے آ گیا۔ پرمیلا کا چہرہ میک اپ کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ مجھے بڑی خوبصورت لگی۔ تھوڑی دیر بعد شوٹنگ شروع ہو گئی۔ میں بڑی دلچسپی اور حیرانی کے ساتھ پرمیلا اور ہیرو کو اداکاری کرتے دیکھ رہا تھا۔ رام دلاری بھی میرے قریب ہی لوہے کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ کوئی ہیروئین نہیں تھی کہ اس کو صوفے پر بٹھایا جاتا۔ دوسری ایکسٹرا عورتیں بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ جب سین ختم ہوا تو رام دلاری کہنے لگی۔

"شوٹنگ تو ساری رات ہوتی رہے گی۔ چلو اپنی باڑی پر چلتے ہیں۔"

باڑی سے مراد اپنا فلیٹ تھا۔

دوسرے دن ہندوؤں کی کسی دیوی کی پوجا کا تہوار تھا۔ بمبئی شہر میں دیوی کے بت کے بڑے جلوس نکلے ہوئے تھے۔ ایک جلوس ہمارے بازار سے بھی گذرا۔ دیوی کا ایک کالا سیاہ بت ٹرک پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں گیندے کے ہار پڑے تھے۔

ہندو کھڑتالیں بجاتے دیوی کے بھجن گاتے ٹرک کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

شام کو رام دلاری نے مجھ سے کہا کہ میں دیوی درشن کے لئے مندر جا رہی ہوں۔ تم چلو گے؟ میں نے سوچا چل کر دیکھتے ہیں کہ ہندو لوگ دیوی کی پوجا کیسے کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ "ہاں دیدی! میں بھی چلوں گا"

وہ ہنس کر بولی۔

"جانتے ہو جس مندر میں میں جا رہی ہوں وہاں کسی مسلمان کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلمان چلا جائے تو پجاری اسے وہیں قتل کر دیتے ہیں۔ پچھلے سال ایک مسلمان غلطی سے مندر میں چلا گیا تھا پجاری کے آدمیوں نے اسے ترشول مار مار کر ہلاک کر کے اس کا خون دیوی کے چرنوں میں ڈالا تھا۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پولیس کو پتہ نہیں چلا؟"

رام دلاری جو ہندو دھرم کے معاملے میں بڑی کشادہ دل تھی کہنے لگی۔

"ارے کون پوچھتا ہے۔ پولیس میں بھی تو زیادہ ہندو ہی ہیں۔"

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

"نہیں نہیں۔ تم میرے ساتھ مت چلنا۔ کسی کو پتہ چل گیا تو ہندو سینا والے تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔"

مگر میں دیوی کے مندر میں ضرور جانا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر وہاں ایسی کونسی خاص شے ہے کہ وہاں مسلمان داخل نہیں ہو سکتا۔ میں ضد کرنے لگا۔

"میں مسلمان بن کر تھوڑی جاؤں گا۔ میں تو ہندو بن کر تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ تم نے خود ہی تو میرا نام راج کمار رکھا ہے اور فلم سٹوڈیو میں بھی سب کو بتایا ہے کہ میں ہندو ہوں۔"

رام دلاری نے میری ضد اور بے حد اصرار کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ رام دلاری کے کہنے پر میں نے تنگ پاجامہ اور کھدر کا کرتہ پہن لیا۔ اس نے میرے ماتھے پر

سیندور کا ٹیکا بھی لگا دیا اور بولی۔

"خبردار مندر میں کسی سے زیادہ بات نہ کرنا۔ پجاری مہنت میرا واقف ہے۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آ جائے اور تم سے بھی باتیں شروع کر دے۔ اپنا نام راج کمار ہی بتانا۔ میں اسے کہوں گی کہ تم میری موسی کی بیٹی کے لڑکے ہو اور اندور سے بمبئی کی سیر کرنے میرے ہاں آئے ہوئے ہو۔ اب اس کو دماغ میں بٹھا لو۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہ کرنا۔

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تم بالکل فکر نہ کرو دیدی! تم نے جو کہا ہے۔ ویسے ہی کروں گا۔"

میں بمبئی کے اس مندر کا نام بھول گیا ہوں جس میں کوئی مسلمان داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا مندر میں آ نکلتا تو اسے مہنت کے پجاری وہیں قتل کر ڈالتے تھے۔ یہ مندر بمبئی شہر کے ایک گنجان علاقے میں تھا۔ کافی بڑا مندر تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے دروازے تک جانا پڑتا تھا۔ چونکہ وہ پوجا کا کوئی خاص تہوار تھا اس لئے مندر کے اندر اور باہر ہندو عورتوں' بچوں اور مردوں کا ایک ہجوم موجود تھا۔ مندر میں سنکھ اور ٹل بج رہے تھے۔ مندر کے دروازے پر ایک سادھو لمبی جٹائیں چھوڑے ترشول زمین میں گاڑے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا اور ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ رام دلاری نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ سادھو صرف اس لئے وہاں بیٹھا ہے کہ اپنے تجربے اور مشاہدے سے یہ معلوم کرے کہ ہندو پجاریوں میں کوئی مسلمان تو مندر میں داخل نہیں ہو رہا۔ فضا میں لوبان کی تیز بو رچی ہوئی تھی۔ کئی عورتوں کے ہاتھوں میں پیتل کی تھالیاں تھیں جن میں پوجا کی سامگری تھی۔ دیوی کا بت ایک کوٹھڑی میں تھا جس کا دروازہ تنگ تھا۔ دروازے کے باہر ایک پجاری بیٹھا لوگوں سے پیسے وصول کرتا جاتا تھا اور انہیں رتن جو کے دو پھول دے دیتا تھا۔ یہ پھول لے کر ہندو عورتیں اور مرد کوٹھڑی میں داخل ہو جاتے اور دیوی کی پوجا کر کے دوسری طرف سے باہر نکل جاتے۔ رام دلاری نے مجھے باہر ہی کھڑے رہنے کو کہا اور خود دیوی کی پوجا کرنے

کوٹھڑی میں چلی گئی۔

میں ایک آدھ منٹ وہاں کھڑا رہا پھر چل پھر کر مندر کا مشاہدہ کرنے لگا۔ مندر کا دالان کافی بڑا تھا۔ جگہ جگہ دیوی دیوتاؤں کے پتھر کے بت نصب تھے جن کے آگے سے ہندو مرد عورتیں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر گزر جاتیں۔ میرے ماتھے پر رام دلاری نے تلک لگا دیا تھا۔ میرا لباس بھی ہندوانہ تھا۔ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں پڑ سکتا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ پھر بھی یہ سوچ کر دل میں خوف کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی کہ اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ میں مسلمان ہوں تو یہ ہندو مجھے قتل کر دیں گے۔

پھرتے پھراتے میں دالان کے کونے کی طرف نکل گیا جہاں ایک گھنا درخت تھا۔ اس درخت کی جٹائیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ میں ان جٹاؤں کو دیکھنے کے لئے درخت کے قریب آ گیا۔ درخت کا تنا بہت بڑا تھا۔ تنے پر سیندور ملا ہوا تھا۔ میں درخت کے پیچھے گیا تو مجھے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی کسی کو تھپڑ مار رہا ہے۔ ساتھ ہی کسی لڑکی کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔ پھر کسی مرد کی آواز آئی۔ اس نے لڑکی کو گالی دے کر چپ رہنے کو کہا تھا۔ میں نے دائیں جانب دیکھا۔ وہاں ایک پرانی کوٹھڑی تھی جس کی چھت پر گھاس پھوس پڑا تھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ یہ آوازیں کوٹھڑی میں سے ہی آئی تھیں۔ میں کوٹھڑی کی طرف جانے ہی لگا تھا کہ اندر سے دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور دو سادھوؤں ایسے گیروے کپڑوں والے آدمی کوٹھڑی میں سے نکلے۔ انہوں نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور چلے گئے۔ مجھے بڑا تجسس ہوا کہ یہ لوگ اندر کس لڑکی کو تھپڑ مار رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر بند دروازے کے ساتھ کان لگایا۔ اندر سے کسی لڑکی کے آہستہ آہستہ رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں بظاہر انجان بن کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر ٹہلتے ٹہلتے کوٹھڑی کی پچھلی طرف آ گیا۔ یہاں کوٹھڑی کی ایک کھڑکی تھی جو بند تھی اور باہر کی جانب کھڑکی کی چوکھٹ میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ میں کھڑکی کے پاس جا کر کان لگا کر سننے لگا۔

اندر سے لڑکی کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز برابر آ رہی تھی۔ میں نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑکی کے بند پٹ پر انگلی سے ٹھک ٹھک کی۔

لڑکی کے رونے کی آواز بند ہو گئی۔

میں نے ایک دفعہ پھر انگلی سے کھڑکی کے پٹ پر ٹھک ٹھک کی۔ ساتھ ہی میں نے کھڑکی کی سلاخوں سے کان لگا دیا۔ کوٹھڑی میں سے لڑکی کے رونے کی آواز بند ہو گئی تھی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی کھڑکی کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

کھڑکی کے پیچھے سے کسی لڑکی کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"میرا نام عائشہ ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے یہاں سے باہر نکالو۔"

میں نے کہا۔ "کھڑکی کھولو"

اس نے کہا۔ "کھڑکی پر تالا لگا ہے۔"

پھر لڑکی رونے لگی۔ وہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا۔ طبیعت میں جولانیاں تھیں۔ کسی خطرے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ویسے بھی میں ایڈونچر پسند تھا اور رام دلاری کو ڈاکوؤں کے نرغے سے نکالنے کے بعد میں کچھ زیادہ ہی دلیر ہو گیا تھا۔ اور یہاں سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہندوؤں نے دیوی کے مندر میں ایک مسلمان لڑکی کو قید کر رکھا تھا۔ خدا جانے وہ اسے کہاں سے اغوا کر کے لائے تھے اور اس کے ساتھ کیا کرنے والے تھے۔ میں اس وقت اپنے آپ کو کسی فلمی ہیرو کی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے بغیر کچھ

سوچے سمجھے فوراً کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں رات کو آ کر تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔"

کوٹھڑی میں سے لڑکی نے روتے ہوئے کہا۔

"یہ ہندو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے میرے بابا کو خبر کر دو۔ وہ جھونپڑ پٹی میں رہتے ہیں۔ قاسم بھائی ان کا نام ہے۔ تمہیں اللہ رسول کا واسطہ ہے میرے بابا کو بلاؤ۔ مجھے یہاں سے نکالو۔"

لڑکی روئے جا رہی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"روؤ مت۔ میں رات کو آؤں گا۔ تمہیں یہاں سے نکال کر تمہارے بابا کے پاس پہنچا دوں گا۔"

"کیا تم مسلمان ہو؟" لڑکی نے پوچھا۔

"ہاں --- میں رات کو آؤں گا۔"

لڑکی کے رونے کی آواز بند ہو گئی۔ دالان کے برآمدے کی جانب سے ایک سادھو ہاتھ میں کرمنڈل لئے لمبی جٹاؤں والے درخت کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں فوراً کھڑکی سے ہٹ گیا اور دوسری طرف سے ہو کر مندر کی بڑی دیوی والی کوٹھڑی کے باہر اسی جگہ آ کر کھڑا ہو گیا جہاں رام دلاری مجھے چھوڑ گئی تھی۔

عورتیں اور مرد دیوی درشن کے لئے مندر میں جا رہے تھے اور دیوی کے درشن کرنے کے بعد کوٹھڑی سے باہر بھی نکل رہے تھے۔ میری نگاہیں رام دلاری کو تلاش کر رہی تھیں۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میری قمیض پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔

رام دلاری غصے سے بولی۔

"تم کہاں دفع ہو گئے تھے؟"

وہ مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی ایک طرف لے گئی۔

"تمہیں معلوم نہیں تم کہاں آئے ہوئے ہو؟ کہاں چلے گئے تھے؟"

میں نے کہا۔ "دیدی! میں مندر کی سیر کرنے لگا تھا۔"

"بڑا شوق ہے تمہیں سیر کا۔ چلو واپس چلو۔"

ہم مندر سے نکل کر باہر فٹ پاتھ پر آئے تو رام دلاری نے ذرا پیار کے ساتھ کہا۔

"پگلے! دیوی کے مندر میں پجاری اس کھوج میں پھرتے رہتے ہیں کہ کہیں کوئی مسلمان تو اندر جاسوسی کرنے نہیں آگیا۔ تم پر ذرا کسی کو شک پڑ جاتا تو تمہیں تو مرنا ہی تھا۔ ساتھ میں میری جان بھی مصیبت میں پھنس جاتی۔"

اس وقت دوپہر گزر چکی تھی۔ بمبئی کے آسمان پر بادل صبح سے چھائے ہوئے تھے۔ ابھی تک بارش نہیں ہوئی تھی۔ ہم بس میں بیٹھ کر فلیٹ میں واپس آ گئے۔ رام دلاری سبزی ترکاری بنانے میں لگ گئی۔ میں اس کے سامنے چوکی پر بیٹھ گیا۔ وہ بینگن تھالی میں کاٹتے ہوئے کہنے لگی۔

"سوچتی ہوں میں نے یہاں سب کو یہ بتا کر کہ تم ہندو ہو اور میرے رشتے دار ہو غلطی کی۔ کسی وقت بھانڈا پھوٹ گیا تو میں یونہی ماری جاؤں گی۔ مگر خیر اب تم ہندو ہی بنے رہنا مگر اس مندر کی طرف کبھی نہ جانا۔ وہ مسلمانوں کا بوچڑ خانہ ہے۔"

رام دلاری نے مجھے بتایا کہ چونکہ دیوی کے مندر میں مسلمانوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے اس لئے بمبئی کے مسلمانوں میں یہ بات مشہور ہے کہ اس مندر میں ہندو پجاری ہر سال کسی نہ کسی مسلمان کو اغوا کر کے مندر میں لے جاتے ہیں اور اسے دیوی کے آگے قتل کر کے اس کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔

"پچھلے سال اسی بات پر یہاں ہندو مسلم فساد بھی ہو گیا تھا۔ کئی لوگ مارے گئے تھے۔"

اچانک مجھے اس مسلمان لڑکی کا خیال آگیا جس کو ہندوؤں نے اغوا کر کے مندر کی کوٹھڑی میں بند کر رکھا تھا۔ ضرور اسے بھی دیوی کی بھینٹ چڑھانے کے لئے ہندو پجاریوں نے اغوا کیا ہو گا۔ اب مجھے فکر لگ گئی کہ کہیں میرے مندر میں جانے سے

پہلے پہلے پجاری اس لڑکی عائشہ کو قتل نہ کر دیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا میں اس مسلمان لڑکی کو مندر سے نکال سکوں گا؟ میرے دل نے کہا وہ مسلمان لڑکی نہ جانے کس غریب آدمی کے گھر کا چراغ ہے اور ہندو نہ جانے کیسے اسے اٹھا کر موت کے منہ میں لے گئے ہیں۔ مجھے یاد آگیا کہ عائشہ نے کہا تھا کہ اس کا گھر جھونپڑ پٹی میں ہے اور اس کے باپ کا نام قاسم بھائی ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں عائشہ کے باپ کو جا کر خبر کر دوں تو ہو سکتا ہے وہ پولیس کو لے کر مندر میں پہنچ جائے اور اپنی بیٹی کو برآمد کر لے۔ پھر خیال آیا کہ عائشہ کا باپ ایک غریب آدمی ہو گا جو جھونپڑی میں رہتا ہو گا۔ اس کی کون سنے گا اور بقول رام دلاری کے بمبئی کی پولیس میں ہندو زیادہ ہیں اور وہ لوگ مندر کے معاملے میں بالکل دخل نہیں دیتے۔ اگر دخل دیتے بھی ہیں تو مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی طرف داری کرتے ہیں۔

عائشہ کے بارے میں میں نے جان بوجھ کر رام دلاری سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اگرچہ وہ مجھ سے چھوٹے بھائیوں کی طرح پیار کرتی تھی مگر آخر وہ ایک ہندو عورت تھی اور یہ حقیقت اس زمانے اور اسی عمر میں ہی میری آوارہ گردیوں اور ہندوؤں کے ماحول میں زیادہ وقت گزارنے سے مجھ پر واضح ہو گئی ہوئی تھی کہ ہندو آخر ہندو ہی ہوتا ہے۔ اور مسلمان کا معاملہ سامنے آ جائے تو وہ بہت زیادہ ہندو ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مسلمان کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور اسے پھلتا پھولتا اور خوش حال دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ رات ذرا گہری ہو گئی تو میں مندر پہنچ جاؤں گا۔ میں نے رام دلاری سے پوچھا کہ یہاں رات کو کتنی دیر تک لوکل بسیں چلتی ہیں۔ اس نے کہا۔

"رات گیارہ بجے آخری بس یہاں سے گزرتی ہے۔ کیوں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "دیدی! آج میرا فلم دیکھنے کو جی چاہ رہا ہے - پہلا شو دیکھوں گا۔ نو

بجے ختم ہو جائے گا۔ بس مل جائے گی۔"

رام دلاری ہنس کر بولی۔

"دبمبئی آ کر تم بگڑتے جا رہے ہو۔ اچھا۔ جاؤ فلم دیکھ آنا۔ مگر کونسی فلم دیکھو گے؟"

ایسا کرو منروا سینما میں سہراب مودی کی فلم پکار لگی ہے۔ یہ سینما ہماری سیمنگٹن سٹریٹ پر ہی ہے۔ مگر زیادہ دیر نہ لگانا۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"نہیں دیدی! شو ختم ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا۔"

یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ جس کوٹھڑی میں ہندوؤں نے مسلمان لڑکی کو بند کر رکھا ہے اس پر تالا لگا ہے۔ میں تالا نہیں توڑ سکتا تھا۔ مجھے لوہے کی چھوٹی سلاخ کی ضرورت تھی جس کی مدد سے میں کنڈی اکھیڑ سکتا تھا۔ میں نے کمرے کے کونوں کھدروں میں پڑی چیزوں کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے کوئی ایسی چیز دکھائی نہ دی۔ مجھے یاد آ گیا کہ باہر برآمدے کے کونے میں جس طرف سنڈاس تھا ادھر دیوار میں ایک کھتہ بنا ہوا تھا جہاں کچرا اور پرانی چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ میں کسی بہانے اٹھ کر وہاں گیا اور کھتے میں سلاخ تلاش کرنے لگا۔ سلاخ تو نہ ملی لیکن لکڑی کا ایک فٹ لمبا ڈنڈا مل گیا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ یہ روٹی بیلنے والا بیلنا تھا۔ یہ میرے کام آ سکتا تھا۔ میں نے اسے صاف کر کے اپنی قمیض کے اندر چھپا لیا۔ شام ہو رہی تھی۔ رام دلاری نے مجھے پانچ روپے دیئے اور میں بلڈنگ سے نکل کر بازار میں آ گیا۔ میرا پروگرام بھی یہی تھا کہ پہلے فلم دیکھوں گا۔ فلم نو بجے ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد دیوی کے مندر کا رخ کروں گا اور وہاں صورت حال کا جائزہ لوں گا اور جیسے ہی موقع ملا مسلمان لڑکی کو وہاں سے نکال کر بھگا لے جانے کی کوشش کروں گا۔ دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ وہ لڑکی وہاں پر موجود ہو۔ کہیں ہندو اسے کسی دوسری جگہ نہ لے گئے ہوں۔ یا انہوں نے اسے قتل کر کے دیوی کی بھینٹ نہ چڑھا دیا ہو۔

ہندوانہ تلک اسی طرح میرے ماتھے پر لگا ہوا تھا۔ شکل صورت اور لباس سے بھی بس بالکل ہندو لڑکا لگتا تھا۔ لکڑی کا چھوٹا ڈنڈا یعنی بیلنا میں نے کرتے کے اندر چھپا کر رکھ لیا تھا۔ جو لوگ بمبئی رہ چکے ہیں انہیں ضرور علم ہو گا کہ سیمنگٹن روڈ بمبئی سنٹرل کے ریلوے سٹیشن کے سامنے سے گزرتی ہے اور اس سڑک پر جنوب کی طرف چلتے جائیں تو کچھ دور جا کر منروا ٹاکیز کا سینما ہاؤس آ جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سہراب مودی کی فلم "پکار" اس سینما میں نئی نئی لگی تھی اور بڑا رش لے رہی تھی۔ یہ سینما ہاؤس بھی منروا مووی ٹون والوں کا ہی تھا۔ اس کی خوبصورت لابی کی چھت اور فرش پر جگہ جگہ شیشے لگے ہوئے تھے۔ میں بس میں بیٹھ کر منروا ٹاکیز پہنچ گیا۔ بڑا رش تھا۔ بہرحال میں بھی تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر سینما ہاؤس میں جا کر بیٹھ گیا۔ فلم شروع ہوئی۔ فلم ختم ہوئی۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ میں جلدی جلدی سینما ہاؤس سے نکل کر بس شاپ پر آ گیا۔

یہاں سے میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ 'امبے دیوی یا شاید ممبے دیوی کے مندر کو کونسی بس جاتی ہے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ اس مندر کا ان دونوں میں سے کوئی نام تھا۔ اس شخص نے مجھے خاص نمبر کی بس بتائی۔ دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد اس نمبر کی بس آئی تو میں اس میں سوار ہو کر مندر کے چوک میں پہنچ گیا۔ مندر کی روشنیاں سامنے نظر آ رہی تھیں۔ پوجا کے تہوار کی وجہ سے وہاں بڑی رونق تھی۔ میرے ماتھے پر تلک لگا تھا۔ بے دھڑک مندر کے گیٹ میں سے نکل کر دالان میں آ گیا۔ یہاں بھی خوب روشنی تھی۔ دور کونے میں وہ جٹا دھاری گنجان درخت نظر آ رہا تھا جس کے پیچھے کوٹھڑی میں مسلمان لڑکی قید تھی۔ لکڑی کا ڈنڈا میں نے کرتے کے اندر چھپایا ہوا تھا۔ سوچ رہا تھا لڑکی کوٹھڑی میں ہی ہو۔ کہیں مندر کے پجاری اسے نکال کر کسی دوسری جگہ نہ لے گئے ہوں۔ ایک دو منٹ دالان میں یونہی ادھر ادھر چکر لگاتا رہا۔ پھر کوٹھڑی کے عقب میں آ کر جائزہ لیا کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوئی جگہ بھی ہے یا نہیں۔ کوٹھڑی کے پیچھے مندر کی دیوار تھی جو زمین سے پندرہ

بیس فٹ اونچی تھی۔ نیچے ڈھلان تھی جو ایک ویران سی سڑک تک چلی گئی تھی۔ یہاں جگہ جگہ کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا۔

میں درخت کے نیچے آ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ پوجا کی غرض سے آنے والے ہندو مرد عورتیں اسی طرف جا رہے تھے۔ یہاں دو سادھو میرے قریب سے ہو کر گزر گئے۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ کی۔ یہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ دالان میں جو بجلی کے بلب لگے تھے ان کی روشنی یہاں تک پہنچتے پہنچتے کافی مدہم ہو جاتی تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کوٹھڑی کے پیچھے اندھیرا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور بظاہر بڑی بے نیازی سے ٹہلتا ٹہلتا کوٹھڑی کے عقب میں آ گیا۔ پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مسلمان لڑکی کوٹھڑی میں موجود بھی ہے یا نہیں۔۔۔۔ میں نے بند کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ کان لگایا۔ اندر خاموشی تھی۔ میں نے آہستہ سے ٹھک ٹھک کیا۔ اس کے چند لمحوں بعد اندر سے بھی کسی نے کھڑکی پر انگلی مار کر ٹھک ٹھک کیا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"عائشہ تم ہو؟"

"ہاں۔۔۔۔" کوٹھڑی کے اندر سے مسلمان لڑکی کی سہمی ہوئی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی کے ساتھ منہ لگا کر کہا۔

"دروازے کے پاس آ جاؤ۔"

یہ کہہ کر میں پیچھے ہٹ کر واپس درخت کے نیچے آ گیا اور ادھر ادھر منڈلاتے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ کوٹھڑی کے پیچھے جا کر نیچے سڑک کو بھی دیکھا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر جو اونچی عمارت تھی اس کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ حالات بڑے سازگار تھے۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا فوراً کر گزرنا چاہئے تھا۔ ہندوؤں کے نرغے سے ایک غریب مسلمان لڑکی کو نکال لے جانے کے جذبے نے مجھے کچھ زیادہ دلیر بنا دیا تھا۔ میں پیچھے کی طرف سے ہو کر کوٹھڑی کے دروازے پر آیا۔ اب ہچکچانے یا دیر کرنے کا مقام نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے پاس آتے ہی کرتے

کے نیچے سے لکڑی کا ڈنڈا نکالا۔ اسے کنڈے کی سنگلی میں پھنسا کر زور سے اپنی طرف کھینچا۔ دوسری بار زور لگانے سے سنگلی کا کنڈا اپنی جگہ سے اکھڑ گیا۔ لڑکی دروازے کے ساتھ ہی لگ کر کھڑی تھی - اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور میری طرف لپکی۔ یہ ایک دبلی پتلی لڑکی تھی۔ میں نے اسے سرگوشی میں کہا۔ "نیچے بیٹھ جاؤ۔"

میں بھی نیچے بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔ پھر میں آہستہ آہستہ مندر کی عقبی دیوار کی طرف کھسکنے لگا۔ لڑکی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی زمین پر بیٹھے بیٹھے گھٹنوں کے بل میرے پیچھے آنے لگی۔ میں نے دیوار کے پاس جا کر اسے ہاتھ سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ خود اٹھ کر دیوار کی دوسری جانب جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف سڑک خالی تھی۔ میں نے نیچے ہو کر لڑکی سے کہا۔

"عائشہ! دس پندرہ فٹ کی دیوار ہے جلدی سے نیچے کود جاؤ۔ میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔ جلدی کرو۔"

مسلمان لڑکی عائشہ کی حالت یہ تھی کہ اس وقت اگر میں اسے کہتا کہ مقبرہ جہانگیر کے مینار سے کود جاؤ تو وہ وہاں سے بھی کود جاتی۔ وہ دیوار کے اوپر چڑھ گئی۔ پھر دیوار پر چت لیٹے لیٹے اپنی ٹانگوں کو گھما کر نیچے سڑک کی جانب کیا اور ہاتھ دیوار کی منڈیر میں پھنسا کر نیچے کود گئی۔ میں بھی ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر دیوار پر سے دوسری طرف کود گیا۔ لڑکی دیوار سے کودنے کے بعد ڈھلان پر لڑھکتی ہوئی سڑک پر جا کر رکی تھی۔ میں بھی کودنے کے بعد ڈھلان پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑھکتا ہوا سڑک تک چلا گیا۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے عائشہ کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔

"بھاگو"

میں خود بھی سڑک پر ایک طرف بھاگ رہا تھا اور عائشہ کا ہاتھ پکڑے اسے بھی ساتھ ساتھ بھگا رہا تھا۔ اس علاقے سے میں بالکل واقف نہیں تھا۔ جو سڑک سامنے آتی اسی پر ایک جانب اندھیرے میں ہو کر ہم بھاگنا شروع کر دیتے۔ آگے کوئی مارکیٹ

آ گئی۔ وہاں روشنیاں ہو رہی تھیں اور کچھ بند گاڑیاں اور ایک ٹرک بھی کھڑا تھا۔ میں نے عائشہ کو ایک درخت کے پیچھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ہمارے سانس پھولے ہوئے تھے۔ میں نے عائشہ کو دیکھا وہ سانولے رنگ کی غریبانہ سی شکل والی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے سانس لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تمہاری جھونپڑ پٹی کدھر ہے؟ تمہیں اس کا راستہ آتا ہے؟"

عائشہ نے دونوں جانب اور پھر سامنے کی عمارتوں کو دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے مجھے گھر کا راستہ معلوم نہیں ہے۔"

میری نگاہیں چاروں طرف کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔

یہ دیوی کے مندر کے آس پاس کا علاقہ تھا اور وہاں ہمارا زیادہ دیر ٹھہرنا کسی حالت میں بھی ٹھیک نہیں تھا۔ ذرا سانس ٹھیک ہوا تو میں نے عائشہ سے کہا۔

"آ جاؤ۔ کسی دوسری سڑک پر چل کر معلوم کرتے ہیں۔"

ہم اٹھ کر سڑک کے کنارے کنارے تیز تیز چلنے لگے۔ آگے ایک چوک آ گیا۔ یہاں چوک میں کسی آدمی کا بت لگا ہوا تھا۔ عائشہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"یہ پارسی کا بت ہے۔ یہاں سے مجھے راستہ آتا ہے۔"

مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جھونپڑ پٹی کو بس کونسے نمبر کی جاتی ہے یا ٹرام کا روٹ کونسا ہے۔ ہم مندر سے کافی دور نکل آئے تھے۔ اب مجھے ہندوؤں کی پرواہ نہیں تھی۔ یہاں سے میں نے ایک دو آدمیوں سے معلوم کیا۔ پہلے ایک ٹرام پکڑی۔ پھر ایک بس میں بیٹھ کر سفر کیا اور آخر بمبئی شہر کے اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں ایک بہت بڑے پل کے پاس ایک میدان میں جھونپڑیوں کی بستی آباد تھی۔ یہاں اندھیرا بھی تھا اور کہیں جھونپڑیوں میں روشنی بھی ہو رہی تھی۔ عائشہ میرے آگے آگے تیز تیز چل رہی تھی۔ ہم جھونپڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ یہ بڑی گندی جگہ تھی۔ جھونپڑیوں کے درمیان گندے پانی کی نالی تھی۔ عائشہ ایک جھونپڑی میں بے اختیار

گھس گئی۔ تھوڑی دیر میں اندر سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ دوسری جھونپڑیوں میں سے عورتیں باہر نکل آئیں۔ ایک ادھیڑ عمر کا چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی والا آدمی جھونپڑی سے نکل کر میرے پاس آیا۔ اس کے سر پر مسلمانوں والی سفید کروشیئے کی ٹوپی تھی۔ اس نے آتے ہی مجھے گلے سے لگا لیا اور جھونپڑی میں لے گیا۔

جھونپڑی میں لالٹین جل رہی تھی۔ ایک جھلنگا سی چارپائی پر عائشہ اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھی رو رہی تھی۔ ادھیڑ عمر آدمی عائشہ کا باپ قاسم بھائی تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بیٹا! ہم تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکیں گے۔ اگر تم نہ ہوتے تو ہم اپنی بیٹی کو شاید زندگی بھر دوبارہ نہ دیکھ سکتے۔"

عائشہ کے باپ کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ انہیں معلوم تھا کہ انکی بیٹی کو ہندو اٹھا کر امبے دیوی کے مندر میں لے گئے ہیں۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے پولیس کو رپورٹ کیوں نہیں کی تو قاسم بھائی نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"بیٹا! پولیس بھی تو ہندوؤں کی ہے۔ مسلمان تو بس گنتی کے ہیں۔ اگر میں پولیس کو رپورٹ بھی کرتا تو میری کون سنتا؟ مندر کے بڑے پجاری نے مجھے ایک آدمی کے ذریعے یہ پیغام بھی بھجوا دیا تھا کہ اگر پولیس کو اطلاع کی تو تمہاری لڑکی کی لاش جھونپڑ پٹی میں پہنچا دی جائے گی۔"

میں نے قاسم بھائی سے کہا۔

"اب آپ کیا کریں گے۔ مندر کے بڑے پجاری کو پتہ چل گیا کہ مسلمان لڑکی فرار ہو گئی ہے تو وہ سیدھے یہاں آ جائیں گے۔ اس کے متعلق آپ نے کیا سوچا ہے؟"

قاسم بھائی فکر مند ہو کر بولا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مندر کا بڑا پجاری اپنے آدمی یہاں ضرور بھیجے گا۔ ہم غریب مسلمان ہیں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ مندر کے پجاری کو

بڑے بڑے ہندو سیٹھوں کی اور پولیس افسروں کی حمایت حاصل ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"آخر ہندو مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے مندر میں کس لئے لے جاتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ پہلے بھی دو مسلمان لڑکیوں کو یہ لوگ اٹھا کر لے گئے تھے اور پھر ان کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔"

قاسم بھائی ٹھنڈا سانس بھر کر بولا۔

"یہ ہندو پجاری مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے جنوبی ہندوستان کے مندروں میں فروخت کر دیتے ہیں جہاں پجاری انہیں دیوداسیاں بنا کر مندروں میں بند کر دیتے ہیں۔ خدا ان کافروں کو غارت کرے۔"

پھر وہ اپنی بیوی اور عائشہ کی ماں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"راتوں رات یہاں سے نکل چلو۔ باندرہ میں عائشہ کی ماسی کے پاس چلے جاتے ہیں۔"

عائشہ کی ماں دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

"وہ لوگ تو کل ہی آگرہ چلے گئے ہیں۔"

قاسم بھائی کا سر لٹک سا گیا۔ مایوسی کے ساتھ کہنے

"ٹھیک ہے۔ یہاں بیٹھے رہتے ہیں جو ہو گا سہ لیں گے۔"

اچانک میرے اندر ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا۔ میں نے قاسم بھائی سے کہا۔

"عائشہ میری بہن ہے۔ میں عائشہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

قاسم بھائی' عائشہ اور اس کی ماں میری طرف منہ اٹھا کر تکنے لگے۔

قاسم بھائی کہنے لگا۔

"بیٹا! تم خود بمبئی میں پردیسی ہو۔ عائشہ بیٹی کو کہاں چھپاتے پھرو گے؟"

میں نے کہا۔ "آپ لوگ بھی تو عائشہ کو لے کر یہاں نہیں رہ سکیں گے۔ امبے مندر کے پجاری کے غنڈے عائشہ کی تلاش میں یہاں ضرور آئیں گے اور اسے دوبارہ اٹھا کر لے جائیں گے۔"

عائشہ اور اس کی ماں رونے لگیں۔ عائشہ کی ماں نے کہا۔

"ہم یہ جھونپڑی چھوڑ کر کہاں جائیں گے ہمارا اس کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

قاسم بھائی انتہائی پریشانی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

"پولیس اگر غریب مسلمانوں کو نہیں پوچھتی تو کیا ہوا میں بیٹی کو صبح کی نماز کے وقت بڑی مسجد کے امام صاحب کے پاس لے جاؤں گا اور سارا ماجرا بیان کر دوں گا۔ وہ ضرور اس معاملے میں ہماری مدد کریں گے۔"

مجھے قاسم بھائی کی یہ تجویز اچھی لگی۔ میں نے کہا۔

"آپ ابھی امام صاحب کے پاس عائشہ کو لے کر کیوں نہیں چلے جاتے؟ مجھے خطرہ ہے کہ جونہی مندر کے بڑے پجاری کو عائشہ کے فرار کا علم ہوا وہ اپنے غنڈے بھیج کر

اسے پھر اغوا کرنے کی کوشش کرے گا۔"

قاسم بھائی نے جوش میں آتے ہوئے کہا۔

"اجی ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ان ہندوؤں کی پولیس میں بڑی پہنچ ہے مگر ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں ایک ایک کو ایسا مزا چکھاؤں گا کہ پھر کبھی جھونپڑ پٹی کا رخ نہیں کریں گے۔ بیٹی کا معاملہ ہے۔ اسے میں فجر کی نماز پڑھنے جاؤں گا تو ساتھ لیتا جاؤں گا اور امام صاحب کے حوالے کر آؤں گا۔"

میں کچھ مطمئن ہو گیا۔ آخر جھونپڑ پٹی میں اتنے مسلمان رہتے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے ہندو غنڈوں کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں واپس چلنے کے لئے اٹھا تو قاسم بھائی نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے چھوڑنے جھونپڑوں کی اس بستی کے کنارے تک آیا۔ میں نے خدا حافظ کہا تو عائشہ کے باپ نے میرے ماتھے کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔

"بیٹا! یہ تلک مٹا دو۔ اب تمہیں ہندو کافر کا روپ دھارنے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"چچا! ابھی اس کی ضرورت ہے۔"

اور میں جھونپڑ پٹی کی مفلوک الحال آبادی سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ رات زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ایک بس مل گئی۔ لوکل بس نے مجھے ٹرام کے جنکشن تک پہنچایا وہاں سے دوسری بس لے کر میں بیکنگن روڈ والے بس شاپ پر اتر گیا۔

اپنی چالی یعنی فلیٹ میں آیا تو رام دلاری مجھے ڈانٹنے لگی۔

"کہاں چلے گئے تھے تم؟ چھ بجے کا شو نو بجے ختم ہو جاتا ہے اور اب گیارہ بجے والے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "دیدی! بڑا رش تھا۔ کوئی خالی بس نہیں ملی۔ آدھا راستہ پیدل چلا کر آنا پڑا۔"

میں نے دیکھا کہ رام دلاری بڑی بنی سنوری ہوئی تھی۔ اس نے نئی ساڑھی پہن

رکھی تھی۔ سرخی پوڈر بھی خوب لگایا ہوا تھا۔ عطر کی خوشبو بھی آ رہی تھی۔ وہ دیوار میں لگے آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"دیدی! آج شوٹنگ ہے کیا؟"

"ہاں۔" اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

میں نے پرشوق لہجے میں کہا۔

"دیدی! کیا مجھے شوٹنگ پر نہ لے جاؤ گی؟"

رام دلاری نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور مجھے اس کے چہرے پر خوشی کے اثرات دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کہنے لگی۔

"تم کیوں چلو گے میرے ساتھ؟" کیا تم یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ میں گندی نالی میں کیسے زندگی بسر کر رہی ہوں؟ جاؤ پلنگ پر پڑ کر سو جاؤ۔"

میں اسی طرح کونے والے پلنگ پر لیٹ گیا۔ ساتھ والی چالی سے گراموفون پر بجنے والے ایک فلمی گانے ریکارڈ کی آواز آ رہی تھی۔ اتنے میں دروازے پر کسی نے دستک دی۔ رام دلاری نے بلند آواز سے پوچھا۔

"کون ہو؟"

باہر سے کسی نے آواز دی۔

"میں ہوں راموا!"

"آ جاؤ۔"

میں نے پلنگ پر لیٹے لیٹے ایک چھوٹے قد کے کالے آدمی کو اندر آتے دیکھا۔ اس نے گلے میں لال رومال باندھ رکھا تھا۔ وہ بیڑی پی رہا تھا۔ آتے ہی بولا۔

"بائی! سیٹھ کی موٹر آ گئی ہے۔ باہر ناکے پر کھڑی ہے۔"

رام دلاری نے سیٹھ کو گالی دے کر کہا۔

"چلو چلو"

میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میں باہر سے تالا لگا کر جا رہی ہوں۔ دو تین گھنٹے مجھے لگ جائیں گے۔ رسوئی میں پھلکے بھاجی رکھی ہوئی ہے۔"

وہ باہر سے دروازے کو تالا لگا کر چلی گئی۔

میرا ذہن عائشہ کے متعلق سوچنے لگا۔ مندر کے کافروں کو اب تک معلوم ہو چکا ہو گا کہ عائشہ کو کوئی شخص کوٹھڑی سے نکال کر لے گیا ہے۔ ہو سکتا ہے مندر کے بڑے پجاری نے اپنے آدمی عائشہ کو دوبارہ اغوا کرانے کے لئے اس کی جھونپڑی کی طرف بھیج دیئے ہوں۔ اس سارے علاقے میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ایک طرح سے وہ ہندوؤں کا ہی علاقہ تھا۔ دیوی امبے کا مندر بہت اہم مندر تھا اور اس کے بڑے پجاری مہنت کا پولیس میں زبردست اثر و رسوخ تھا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ بقول رام دلاری اس کے اشارے پر مندر میں داخل ہونے والے مسلمان کو قتل کر دیا جاتا تھا اور پولیس خاموش تماشائی بنی رہتی تھی۔ مجھے بے چینی سی لگ گئی۔ میں پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مندر کے غنڈے جھونپڑ پٹی میں پہنچ کر عائشہ کو دوبارہ اغوا کر کے لے گئے ہیں اور اب انہوں نے اسے نہ جانے کہاں بند کیا ہو گا؟ یہ تو مندر کے بڑے مہنت کا کاروبار تھا۔ وہ بقول رام دلاری کے غریب اور بے سہارا مسلمان لڑکیوں کو اپنے آدمیوں کے ذریعے اغوا کر کے مندر میں لاتا تھا اور وہاں سے انہیں جنوبی یا وسطی ہند کے مندروں میں اپنے ایجنٹ کے ہاتھوں بھجوا دیتا تھا جہاں انہیں دیوداسی بنا کر مندر کی چار دیواری کے اندر ایک طرح سے قید میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ان میں ہندو دیوداسیاں بھی ہوتی تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں ہوتی تھیں جنہیں بعض غریب ہندو ماں باپ اپنی کوئی منت پوری ہو جانے کے بعد بیٹی کو مندر کے دیوتا کے ساتھ بیاہ دیتے تھے۔ پتھر کے دیوتا کی جگہ مندر کا پجاری دلہا بن کر آ جاتا تھا اور مندر کی بھینٹ چڑھائی گئی ہندو لڑکی کو اپنی دیوداسی بنا کر رکھ لیتا تھا۔ ایسی کئی دیوداسیوں کو میں نے بیجواڑہ' مجورا اور رامیشورم کے مندروں میں پوجا تہواروں پر رقص کرتے دیکھا ہے۔ ایسے تہواروں کے موقع پر ان دیوداسیوں کو کوئی نشہ پلا دیا جاتا ہے اور وہ بڑے

ش کے ساتھ ہنومان اور شیو دیوتا کے بتوں کے سامنے رقص کرتی ہیں اور ہندو باری ان سے بڑے متاثر ہوتے ہیں۔ ان دیوداسیوں کی کوئی عزت آبرو نہیں ہوتی۔ مندر کے بڑے پجاری کی ملکیت ہوتی ہیں اور وہ اپنا سماجی اثر و رسوخ بڑھانے کے سطے ان دیوداسیوں کی مدد بھی حاصل کرتا رہتا ہے۔

عائشہ ایک بے کس و غریب مسلمان لڑکی تھی۔ ہندو غنڈے اگر جھونپڑ پٹی میں اقو چھریاں لہراتے پولیس کی شہ پر داخل ہوئے ہوں گے تو قاسم بھائی اور دوسرے ریب مسلمان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہوں گے۔ وہ عائشہ کو اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔ مجھے عائشہ کی چیخوں کی' اس کے رونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں پلنگ سے نیچے اتر کر دروازے تک گیا۔ دروازہ بند تھا۔ اسے باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ میرے ندر ایک ایسا طوفان بیدار ہو گیا تھا کہ جو مجھے ابھی اسی وقت عائشہ کی جھونپڑی میں لے جانا چاہتا تھا مگر دروازے پر باہر سے تالا پڑا تھا۔ چالی کی کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی۔ روازے کے اوپر صرف ایک روشندان تھا جس پر لوہے کا جنگلا چڑھا ہوا تھا۔ وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں بے بس سا ہو کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور یہ سوچ کر دل کو تسلیاں دینے لگا کہ ایسا بھی کوئی اندھیر نہیں مچا ہوا کہ ہندو غنڈے بے دھڑک جھونپڑ پٹی میں آ کر ایک لڑکی کو اٹھا کر لے جائیں۔ آخر بستی کے دوسرے مسلمان ضرور میدان میں نکل آئے ہوں گے۔

مجھے بھوک محسوس ہوئی۔ چولہے کے پاس پیتل کی تھالی میں رام دلاری میرے لئے رومال میں تھوڑی سی بھاجی اور تین پھلکے لپیٹ کر رکھ گئی تھی۔ وہیں چوکی پر بیٹھ کر میں نے تین پھلکے کھا لئے' پانی پیا اور پلنگ پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

کمرے میں آہٹ کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ رام دلاری آ گئی تھی اور دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا رہی تھی۔ رات کو وہ پلنگ پر سوتی تھی اور میں نیچے کرسیوں کے پاس دری پر سوتا تھا۔ اس نے ساڑھی بدلتے ہوئے مجھے جگانے کے لئے آواز دی۔

"راج کمار! اٹھو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

میں جلدی سے اٹھا اور نیچے دری پر پڑ گیا۔

"تم نے کھانا کھا لیا تھا؟"

"ہاں دیدی!" میں نے نیند بھری آواز میں کہا۔

رام دلاری نے کپڑے بدلے اور بتی بجھا کر پلنگ پر لیٹ گئی میں نے پوچھا۔

"دیدی! ٹائم کیا ہوا ہے؟"

رام دلاری نے آہستہ سے کہا۔

"دو بج چکے ہیں - سو جاؤ۔"

میرا ذہن عائشہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس لڑکی کو میں نے بہن کہا تھا اور یقین کریں مجھے اس سے بہن کی طرح پیار ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے میں ایک بار پھر نیند کی وادی میں گم ہو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ رام دلاری پلنگ پر گہری نیند سو رہی تھی۔ روشندان میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں رام دلاری کے جاگنے سے پہلے وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے کمرے میں بالٹی کے پاس بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ ماتھے پر ہندوانہ تلک کا جو سرخ نشان لگا تھا اسے رومال سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ اس کی ابھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں دیوی کے مندر میں نہیں بلکہ جھونپڑ پٹی کی بستی میں عائشہ کے بارے میں معلوم کرنے جا رہا تھا کہ کہیں مندر کے لوگ اسے دوبارہ اغوا کر کے تو نہیں لے گئے۔ میں نے آہستہ سے کنڈی کھولی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ دروازے کو دوبارہ آہستہ سے بند کر دیا۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ بلڈنگ کے لوگ جاگ چکے تھے۔ میں سیڑھیاں اتر کر بلڈنگ کے احاطے میں سے گزرتا' گلی میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آ گیا۔

جھونپڑ پٹی کی بستی کے لئے میں نے ہیمنگٹن روڈ کے ناکے سے ایک بس پکڑی۔ پارسی کے بت کے سٹاپ پر اتر گیا۔ وہاں سے ٹرام کار میں سوار ہو کر بڑے گندے نالے کے پل کے قریب اتر گیا۔ گندے نالے کے پل کی دوسری جانب جھونپڑیوں کی

تی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جھونپڑ پٹی کی گندی ر مچاتی گلیوں میں سے گزرتا عائشہ کی جھونپڑی کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ جھونپڑی خالی ی ہے۔ وہاں نہ عائشہ تھی - نہ اس کی ماں اور نہ باپ تھا۔ میں پریشان سا ہو کر وہیں ڑا رہا۔ اتنے میں ایک بوڑھا آدمی ایک جھونپڑی سے نکل کر میری طرف آیا۔ وہ سلمان تھا۔ اس کے گلے میں زرد رومال تھا اور سر پر سفید کروشیئے کی ٹوپی تھی۔ میں نے اسے سلام کیا تو اس نے پوچھا۔

"تم قاسم بھائی کی تلاش میں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔ وہ کہاں ہیں؟"

"میرے ساتھ آؤ۔"

وہ تین جھونپڑیاں چھوڑ کر اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ مجھے چارپائی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور پھر خود ایک موڑھا گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔

"بیٹا! تم نے قاسم بھائی کی بچی کو کافروں کی چنگل سے نکال کر جو نیک کام کیا تھا س کا اجر تمہیں خدا دے گا۔ قاسم بھائی نے تمہارے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا ا۔"

میں نے بڑے میاں کی بات کاٹتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

"اب وہ لوگ کہاں ہیں؟"

بڑے میاں نے کہا۔

"پولیس ان تینوں کو پکڑ کر تھانے لے گئی تھی۔"

"کس جرم میں؟" میں نے پوچھا۔

بڑے میاں نے کہا۔

"قاسم بھائی کا جرم یہ تھا کہ وہ بمبئی کی جھونپڑ پٹی میں رہنے والا غریب اور بے ہارا مسلمان ہے۔ پولیس انگریز کی ہے اور انگریز ہندو کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے شمنی کا سلوک کرتا ہے۔"

میں نے بڑے میاں سے پوچھا کہ پولیس نے انہیں ساتھ لے جانے کی کوئی و بھی تو بتائی ہو گی۔ بڑے میاں نے چہرہ میری طرف اٹھا کر کہا۔

"بیٹا! وجہ کوئی نہیں تھی۔ صرف بہانہ تھا کہ اسے دیوی کے مندر کی قیمتی مور چوری ہو گئی ہے اور مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ یہ مورتی قاسم بھائی کی جھونپڑی می چھپائی گئی ہے۔ پولیس آئی۔ جھونپڑی کی تلاشی لی۔ مورتی نہ ملی تو ان تینوں کو پکڑ تھانے لے گئی۔"

"آپ لوگوں نے کچھ نہ کیا؟"

"کیا کرتے؟" بڑے میاں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم پنجاب سے آئے ہو۔ تمہیں کیا پتہ یہاں کے صوبے میں مسلمان کتنی غرب اور بے کسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ احمد آباد' بروڈہ اور بمبئی کے سار کارخانوں کے مالک ہندو سیٹھ ہیں مسلمان صرف ریڑھی بان ہیں۔ سرکار انگریز کی اور انگریزوں نے ہندو قوم کے آدمیوں کو بڑے بڑے افسر لگایا ہوا ہے۔ اور یہ جو ا دیوی کا مندر ہے اس کا مہنت تو بے حد اثر و رسوخ والا کافر ہے۔ قاسم کی بیٹی کو ا کے اشارے پر اغوا کیا گیا تھا۔ جب تم اسے نکال کر لے آئے تو مندر کے مہنت اپنے خاص پجاری کو پولیس کے ساتھ بھیج کر جھونپڑی پر چھاپہ ڈلوا دیا۔ مقصد قا بھائی کی بیٹی کو دوبارہ اغوا کرانا تھا۔ بستی کے مسلمانوں نے آج جلوس نکالنے کا فیصلہ ہے مگر مجھے معلوم ہے اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔"

میں نے کہا۔ "آپ لوگوں نے تھانے جا کر معلوم نہیں کیا کہ قاسم بھائی اس بیوی اور بیٹی کس حالت میں ہیں؟ کوئی وکیل ہی کر لیں۔"

بڑے میاں نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔

"اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ یہ بات مجھے میرے ستر سال کے تجربے بتائی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ تھانہ کہاں ہے جہاں پولیس ان لوگوں کو لے گئی ہے؟"

بڑے میاں نے تھانے کا نام بتایا۔ ساتھ ہی کہا۔

"برخوردار تم ناسمجھ ہو۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا تھانے مت جانا۔ پولیس مورتی کی چوری کے جھوٹے کیس میں تمہیں بھی پکڑ لے گی۔"

میں نے کہا۔ "آخر ان کا کچھ تو پتہ چلنا چاہئے کہ وہ کہاں ہیں۔ کس حال میں ہیں؟"

بڑے میاں نے ایک لمحے کے لئے مجھے گھور کر دیکھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آخر تمہیں قاسم بھائی سے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ ان کی خاطر تم اپنی جان بار بار مصیبت میں کیوں ڈال رہے ہو؟ پجاریوں کو معلوم ہو گیا کہ تم نے عائشہ کو مندر سے فرار کرایا ہے تو تمہاری خیر نہیں ہے۔"

میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

"میں نے عائشہ کو اپنی بہن کہا ہے۔ اب وہ میری بہن ہے۔ میں ہندو غنڈوں سے اس کی عزت بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دوں گا۔"

بڑے میاں آنکھیں پوری کھولے مجھے تک رہے تھے۔ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"تمہاری مرضی میاں۔ جو جی میں آئے کرو۔"

یہ کہہ کر وہ جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔ میں بھی وہاں سے اٹھا اور بستی کی گندی گلیوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ بڑے میاں کی نصیحت میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ انہوں نے ٹھیک کہا تھا۔ اگر میں تھانے گیا تو پولیس مجھے بھی پکڑ سکتی تھی اور اگر کسی طرح انہیں یہ پتہ چل گیا کہ یہ میں ہی ہوں جو عائشہ کو مندر کی کوٹھڑی کا تالا توڑ کر نکال لے گیا تھا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر سکتے تھے۔ لیکن میں عائشہ اور اس کے ماں باپ کو مصیبت کے وقت اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ عائشہ سے واقعی مجھے اپنی بہنوں کی طرح پیار ہو گیا تھا۔ سڑک کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ

مجھے عائشہ اور اس کے ماں باپ کے حالات معلوم کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اتنے بڑے بمبئی شہر میں میں ایک پردیسی تھا۔ سوائے رام دلاری کے میرا وہاں کوئی ہمدرد اور دوست نہیں تھا۔ رام دلاری سے میں مشورہ یا مدد نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ وہ خود ہندو تھی اور امبے دیوی کی پجارن تھی۔ وہ یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ ایک مسلمان لڑکا امبے دیوی کی دیوداسی کو مندر سے نکال کر لے جائے۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ پولیس سٹیشن چلنا چاہئے۔ وہاں جا کر کسی بہانے معلوم تو کروں کہ عائشہ اور اس کے ماں باپ وہاں موجود بھی ہیں یا نہیں۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میں نے ماتھے پر تلک نہیں لگا رکھا تھا۔ اگر تلک لگایا ہوتا تو میں ہندو بن کر تھانے میں جا سکتا تھا۔ کیونکہ جھونپڑ پٹی کے بڑے میاں نے بتایا تھا کہ تھانے کا انچارج ایک مرہٹہ ہندو ہے۔ میں نے سوچا کہ میں پولیس سٹیشن کے اندر نہیں جاؤں گا۔ دور سے جائزہ لوں گا اور اگر موقع ملا تو کسی سنتری سے عائشہ کے گھر والوں کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے بڑے میاں نے پولیس سٹیشن کا راستہ بتا دیا تھا اور یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ وہاں تک کس نمبر کی بس جاتی ہے۔

میں وہیں سے سڑک کی دوسری جانب ہو گیا۔ کیونکہ اس جانب مجھے لوکل بس سٹاپ کا لال نشان اور فٹ پاتھ پر بنا ہوا چھوٹا سا شیڈ نظر آ رہا تھا۔ دو تین آدمی بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میرے نمبر کی بس وہیں آئے گی۔ دو تین ڈبل ڈیکر بسیں آ کر گزر گئیں۔ آخر میرے نمبر والی بس بھی آ گئی۔ میں بس میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔ بمبئی شہر کی گنجان سڑکوں کے چکر لگانے کے بعد بس ایک سٹاپ پر رکنے لگی تو کنڈکٹر نے اس علاقے کے پولیس سٹیشن کا نام اونچی آواز میں پکارا۔ میں جلدی سے نیچے اتر گیا۔ ایک دکاندار سے پولیس سٹیشن کا پتہ پوچھا اور فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ تھوڑی دور گیا ہوں گا کہ اچانک میرے قدم رک گئے۔ کسی نے پیچھے سے میرا نام لے کر مجھے آواز دی تھی۔

"کہاں جاتا ہے؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے فٹ پاتھ خالی تھی۔ میں کچھ حیران اور کچھ خوف زدہ سا ہو کر آگے چل پڑا۔ جیسے ہی میں نے قدم اٹھائے پیچھے سے پھر اسی مردانہ آواز نے میرا نام لے کر کہا۔

"کہاں جاتا ہے؟"

میرے قدم خود بخود رک گئے۔ مڑ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ پھر یہ آواز کہاں سے آئی تھی؟

آواز میں نے برابر سنی تھی اور آواز دینے والے نے میرا نام بھی لیا تھا مگر میرے پیچھے فٹ پاتھ خالی تھا۔ اسی وقت میرے دل نے کہا کہ یہ کوئی غیبی آواز ہے جو تمہاری راہ نمائی کرنا چاہتی ہے۔ میرے ساتھ پہلے بھی اس قسم کے مافوق الفطرت واقعات پیش آ چکے تھے کہ رات کے وقت کسی جنگل سے گزرتے ہوئے مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی میرے قریب سے ہو کر گزر گیا ہو۔ ایک دفعہ میں منہ اندھیرے امرتسر کے کمپنی باغ میں سیر کر رہا تھا کہ مولسری کے ایک درخت کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے ایسی آواز آئی جیسے کوئی عورت ہلکا سا نقرئی قہقہہ لگا کر میرے قریب سے نکل گئی ہو۔ چنانچہ بمبئی کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے جب مجھے غیبی آواز آئی تو میں حیران ضرور ہوا تھا مگر خوف زدہ بالکل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ میں نے اپنی چلنے کی رفتار آہستہ کر لی اور غیبی آواز کا انتظار کرنے لگا۔ میں چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ وہی آواز پھر سنائی دی۔ مگر اب یہ آواز بڑے قریب سے آئی تھی جیسے کوئی غیبی شخص میرے ساتھ چل رہا ہو۔ غیبی آواز نے کہا۔

"او پنجابی! املی والے تکیئے میں جا۔ وہاں کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"یہ تکیہ کہاں ہے؟"

غیبی آواز نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اب یہ بھی میں تمہیں بتاؤں؟ جا' چوک کے پار املی والا تکیہ ہے۔"

اس کے بعد آواز غائب ہو گئی۔ میں چلتے چلتے چوک میں پہنچ گیا میں نے فٹ پاتھ پر رک کر دائیں بائیں اور سامنے دیکھا چوک کے پار مجھے ایک جگہ ایک گھنا درخت دکھائی دیا جس کے نیچے ایک چھوٹا سا احاطہ بنا ہوا تھا۔ احاطے میں مجھے ایک مزار بھی نظر آیا جس پر سبز رنگ کا جھنڈا لگا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی املی والا تکیہ ہے۔ یہ ایک ایسا ہی مزار تھا جس قسم کے مزار ہمیں برصغیر کے تقریباً ہر شہر میں کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں۔ احاطے میں ایک جانب کچھ فقیر بیٹھے تھے۔ ایک طرف پھول بیچنے والے کا کھوکھا تھا۔ کچھ لوگ وہاں کھڑے پھولوں کے ہار خرید رہے تھے۔ فضا میں اگربتیوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میں نے درخت کو دیکھا۔ یہ املی کا درخت ہی تھا۔ مجھے املی کے درخت کی پہچان تھی۔ امرتسر میں مجیٹھہ روڈ پر املی کا ایک گھنا درخت ہوا کرتا تھا۔ میں اسکول سے بھاگ کر وہاں جا کر درخت سے کچی املی توڑ کر کھایا کرتا تھا۔ لاہور کے باغوں میں مجھے کہیں املی کا درخت نظر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کسی گھر کے آنگن میں اگا ہوا ہو۔

میں مزار کے پہلو میں آیا تو دیکھا اینٹوں کے چھوٹے سے چبوترے پر ایک فقیر بیٹھا تھا۔ وہ مجذوب لگتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔ میں اس کے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے مجھے آواز دی۔

"او پنجابی! اس عورت سے بات کر جس کو تو ڈاکوؤں سے بچا کر لایا تھا۔"

میرے قدم اپنے آپ رک گئے۔ میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"محترم میں اس سے کیا پوچھوں؟"

مجذوب نے تلخ لہجے میں کہا۔

"یہی پوچھ کہ تمہاری بہن عائشہ کہاں ہے؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"محترم آپ ہی بتا دیجئے کہ عائشہ کہاں ہے؟"

مجذوب غصے میں آگیا۔ گرج دار آواز میں بولا۔

"میں نے ساری دنیا کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا دفع ہو جا یہاں سے - جاتا ہے کہ نہیں؟"

مجذوب کے پاس ایک ڈنڈا پڑا تھا۔ وہ مجھے مارنے کے لئے اٹھا۔ میں بھاگ کر مزار کے احاطے سے باہر آگیا۔ میں ایک طرف رک کر غور کرنے لگا۔ پولیس سٹیشن جاتے ہوئے میں پہلے ہی جھجک رہا تھا۔ ایک تو اس لئے کہ وہاں سے مجھے عائشہ کے بارے میں پوری معلومات حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ اگر پولیس والوں کو ذرا بھی مجھ پر شبہ ہو گیا تو وہ مجھے وہیں پکڑ لیں گے۔ مجذوب نے مجھے بڑا درست مشورہ دیا تھا۔ رام دلاری اس سلسلے میں میری مدد کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے پولیس سٹیشن جانے کا خیال دل سے نکال دیا اور وہیں سے واپس چل پڑا۔ جب چالی میں پہنچا تو رام دلاری جاگی ہوئی تھی اور چولہے کے پاس بیٹھی چائے بنا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ڈانٹنے لگی۔

"تم دروازہ کھلا چھوڑ کر کہاں صبح صبح چلے جاتے ہو؟" تمہاری کھوپڑی میں بھیجہ ہے کہ نہیں؟ جانا تھا تو مجھے جگا دیا ہوتا۔"

میں اس سے معافی مانگنے لگا۔

"دیدی! میں پارک میں سیر کرنے نکل گیا تھا۔ غلطی ہو گئی۔ معاف کر دو۔ اب ایسا نہیں کروں گا۔"

رام دلاری نے پیار بھرے غصے کے ساتھ پوچھا۔

"ناشتہ کیا ہے کہ نہیں؟"

میں اس کے پاس چوکی پر بیٹھ گیا۔

"نہیں دیدی! ناشتہ تمہارے ساتھ کروں گا۔"

رام دلاری ہنس پڑی۔ میرے آگے کپ رکھتے ہوئے بولی۔

"میں کیا کروں۔ تم مجھے اپنے چھوٹے بھائی لگتے ہو۔ تم نے ماتھے پر تلک کیوں

نہیں لگایا؟ اچھا نہ لگاؤ۔ تم مسلمان ہو۔ مجھے مسلمان بڑے اچھے لگتے ہیں۔ میں بھگوان سے پرارتھنا کیا کرتی ہوں کہ میرا دوسرا جنم کسی مسلمان کے گھر میں ہو۔ مگر معلوم نہیں دوسرا جنم ہو گا بھی کہ نہیں لو' یہ بند بھی کھاؤ۔"

میں رام دلاری کے ساتھ اصل بات کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھی۔ میں نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"دیدی! میں تم سے ایک بڑی ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

رام دلاری نے میری طرف دیکھے بغیر اپنی خالی پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا پیسوں کی ضرورت ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

"تو پھر بتاؤ کیا بات ہے؟"

اور میں نے رام دلاری کو عائشہ کے بارے میں شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان بیان کر دی۔ جب میں ساری کہانی بیان کر چکا تو رام دلاری نے میرا کان کھینچتے ہوئے کہا۔

"تو اس جھنجٹ میں کیوں پڑ رہا ہے رے؟ تجھے کیا لینا ہے اس سے؟"

میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"دیدی! عائشہ ایک غریب مسلمان لڑکی ہے۔ امبے دیوی کے ہندو پجاری اسے اغوا کر کے اس کی زندگی تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ عائشہ مسلمان ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ میں نے اسے بہن کہا ہے۔ بہن نہ بھی کہتا جب بھی میں اسے ہندو غنڈوں سے بچانے کے لئے جان کی بازی لگا دیتا۔"

رام دلاری میرا منہ تک رہی تھی۔ میری گفتگو سے زیادہ میرے پرجوش لہجے کا اس پر زیادہ اثر ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"کہتا تو ٹھیک ہے۔ اگر تو ڈاکوؤں کے چنگل سے مجھے نکالنے کے لئے میری مدد کر سکتا ہے تو ایک مسلمان لڑکی کو بدمعاش پجاریوں سے بچانا تیرا فرض بنتا ہے۔ اسے

دیوی تو بڑی اچھی ہے۔ مگر یہ جو اس کے پجاری ہیں یہ چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں میں ان سب کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ مسلمانوں کے تو جان کے دشمن ہیں۔"

میں نے کہا۔ "دیدی! بتاؤ تم میری مدد کرو گی نا؟"

رام دلاری بولی۔

"تو نے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا ہوا ہے کہ جس کا بدلہ میں ساری زندگی نہیں اتار سکتی میں تمہاری مدد ضرور کروں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ میں آج ہی مندر جاؤں گی اور بڑے مہنت سے مل کر معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ عائشہ کو پولیس کہاں لے گئی ہے۔ مہنت کو سب کچھ معلوم ہو گا۔ یہ اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے۔"

میں مطمئن ہو گیا۔ مگر چاہتا تھا کہ رام دلاری ابھی مندر جا کر عائشہ اور اس کے ماں باپ کا سراغ لگانے کی کوشش کرے۔ رام دلاری نے بھی انسانی ہمدردی کا پورا ثبوت دیا۔ وہ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو گئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر ماتھے پر نئی بندی لگائی اور میری طرف پلٹ کر بولی۔

"تو چالی میں ہی رہنا۔ باہر ہرگز نہ جانا۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔"

رام دلاری چلی گئی۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

رام دلاری کافی دیر لگا کر آئی۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ گیلری میں اس کے قدموں کی آواز آئی تو میں جاگ رہا تھا۔ جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ اس نے پرس پلنگ پر پھینکا اور بیٹھ گئی۔ میں نے عائشہ اور اس کے ماں باپ کے بارے میں پوچھا تو اس نے اٹھ کر مٹی کی صراحی میں سے پانی پیا اور بولی۔

"میری مانو اور ان لوگوں کا خیال دل سے نکال دو۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے بے چینی سے سوال کیا۔

"وہی ہوا جس کا مجھے یقین تھا۔ لڑکی کو تو مندر کے مہنت نے پولیس سے لے کر غائب کر دیا ہے۔ باقی اس کے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ بمبئی کی جھونپڑ پٹی چھوڑ کر کہاں چلے گئے ہیں۔"

"تمہیں مندر کے پجاری نے کچھ نہیں بتایا؟"

رام دلاری میرے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی اور بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگی۔

"مہنت اتنا احمق نہیں ہے کہ وہ مجھے بتا دیتا کہ عائشہ کو اس نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ بڑا مکار آدمی ہے۔ یہ بھی میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ عائشہ کو پولیس نے اس کے حوالے کر دیا تھا جسے اس نے کسی جگہ پہنچا دیا ہے۔ ورنہ وہ تو کچھ بھی بتانے کو تیار نہیں تھا۔ میں تمہیں اب بھی یہی کہوں گی کہ اپنی جان کسی مصیبت میں نہ پھنسا دینا اس لڑکی کا خیال چھوڑ دو۔ تم ابھی دیوی کے مہنت کو نہیں جانتے۔ وہ مسلمانوں کا تو جانی دشمن ہے۔"

میں نے غصے میں آ کر کہا۔

"میں بھی اس کا جانی دشمن ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور ایک مسلمان بہن کی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانا میرا فرض ہے۔ میں تمہارے ہندو کافروں سے بالکل نہیں ڈرتا۔"

رام دلاری نے پہلی بار مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ ہنس کر بولی۔

"میرا بھیا کتنا بہادر ہے۔"

پھر وہ مجھے بڑے پیار کے ساتھ سمجھانے لگی کہ میں آگ سے نہ کھیلوں جب اسے یقین ہو گیا کہ میں عائشہ کا سراغ ضرور لگاؤں گا اور اسے ہندوؤں کے چنگل سے نکال کر اس کے ماں باپ کے پاس پہنچا کر دم لوں گا تو وہ ایک دفعہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔ پلنگ سے اٹھ کر دروازے کے پاس گئی۔ دروازے کا ایک پٹ کھول کر باہر دیکھا۔ دروازہ بند کیا اور میری طرف پلٹ کر بولی۔

"بھگوان کے لئے اتنی اونچی نہ بول۔ یہاں ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ رام دلاری نے پرس میں سے پان کی پڑی نکال کر پان کھایا اور کھرے کی دیوار کے پاس جو لکڑی کی کرسی رکھی تھی اس پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

"تم اب کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "یہی کہ کسی طرح عائشہ کا کھوج لگاؤں اور اسے اس کے ماں باپ کے پاس پہنچاؤں۔ یہ ہندو کافر اس کی زندگی کو جہنم بنا دیں گے۔ میں انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

رام دلاری کسی سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ لمحے وہ چپ رہی۔ پھر سر اٹھا کر کہنے لگی۔

"تو نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ مجھے بھی تیرے لئے بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ فکر نہ کرو مجھے آج شام تک کی مہلت دے دو۔ میں تمہیں اتنا ضرور معلوم کر دوں گی کہ عائشہ کو مندر کے پجاریوں نے کہاں پہنچا دیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "تم کہاں سے معلوم کرو گی؟"

رام دلاری نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جانوں۔ میرا کام!"

رام دلاری خود جرائم پیشہ نہیں تھی۔ مگر بمبئی کی فلمی دنیا کے جس طبقے سے اسکا تعلق تھا وہ طبقہ جرائم پیشہ لوگوں کی زد میں ضرور تھا۔ یوں رام دلاری کا بھی بمبئی کے جرائم پیشہ افراد سے ایک لنک بن گیا ہوا تھا۔ رات کو اس کی پرکاش سٹوڈیوز اندھیری میں شوٹنگ تھی۔ وہ دوپہر کے بعد ہی فلیٹ سے نکل گئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئی تھی۔ میں شام تک بمبئی کے بازاروں میں آوارہ گردی کرتا اور عائشہ اور اس کے ماں باپ کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو واپس چالی میں آ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس زمانے میں کسی کسی گھر میں ٹیلی فون لگا ہوتا تھا۔ ورنہ میں رام دلاری کو فون کر کے ضرور پوچھ لیتا کہ اس نے مسلمان لڑکی کا سراغ لگایا ہے یا نہیں۔۔۔

حسب معمول رام دلاری سٹوڈیوز سے جب واپس آئی تو رات کے دو بج چکے تھے۔ میں سو گیا تھا۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ رام دلاری نے آتے ہی کہا۔

"میں نے عائشہ کا سراغ لگا لیا ہے۔ مگر ابھی سو جاؤ۔ صبح بتا دوں گی۔ مجھے بڑی نیند آ رہی ہے۔ کورس ڈانس کرتے کرتے میرا سارا جسم درد کرنے لگا ہے۔"

میں اسی وقت کوئی خوش خبری سننے کو بے تاب تھا۔ مگر رام دلاری واقعی سخت تھکی ہوئی تھی۔ میں پلنگ سے اٹھ کر نیچے دری پر آ گیا۔ رام دلاری نے ساڑھی بدلی اور پلنگ پر بے سدھ ہو کر پڑ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ باقی رات میں نے کچھ جاگ کر کچھ سو کر گزار دی۔

دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب رام دلاری سو کر اٹھی۔ اٹھتے ہی کہنے لگی۔

"چائے بنا دو بھیا!"

میں نے کہا۔ "میں نے ناشتہ بھی تیار کر رکھا ہے دیدی!"

"نہیں - میں صرف چائے پیوں گی۔"

میں چائے تیار کرنے لگا۔ رام دلاری اتنی دیر میں منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہو چکی تھی۔ میں نے چائے کی پیالی اس کو دی اور وہ سوال پوچھا جو ساری رات میرے دماغ میں چکر لگاتا رہا تھا۔

"دیدی! عائشہ کا کیا پتہ چلا؟"

رام دلاری نے چائے کا گھونٹ بھر کر سر کو آہستہ آہستہ نفی کے انداز میں ہلایا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

"چھوٹے بھیا! اصل ٹھکانے کا تو بس کھوج نہیں لگا سکی۔ اتنا ضرور پتہ لگا لیا ہے کہ مندر کے مہنت نے انتقامی طور پر عائشہ کو جنوبی علاقے کے کسی مندر میں دیوداسی بنانے کی بجائے مندر کے ایک جرائم پیشہ پجاری گنگولی کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے جو اسے لے کر چاردھا کے رجواڑے کی طرف چلا گیا ہے۔"

جب میں نے رام دلاری سے کہا کہ میں عائشہ کی تلاش میں چاردھا راجواڑے کی طرف جاؤں گا تو وہ مجھے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ بھگوان جانے یہ رجواڑا کس طرف ہے۔ کہاں ہے۔ اور گنگولی جرائم پیشہ گینگ کا لیڈر ہے۔ تم اس کا مقابلہ کیسے کرو گے۔ جھونپڑ پٹی کی اس مسلمان لڑکی کو بھول جاؤ۔ آج رات منروا سٹوڈیوز میں میری ڈانس کی شوٹنگ۔

ہے میرے ساتھ چلنا۔ تمہیں سہراب مودی اور چھایا دیوی سے ملاؤں گی۔"

مگر میں عائشہ کی تلاش میں چاردھا رجواڑے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ رجواڑا کہاں ہے اور بمبئی سے کس طرف ہے۔ میں نے سوچا کہ املی والے کٹنے کے مجذوب سے راہ نمائی حاصل کرنی چاہئے۔ اس بزرگ نے پہلے بھی میری مدد کی ہے۔ وہ اب بھی ضرور میری مدد کرے گا۔

چنانچہ میں رام دلاری کو کھانا تیار کرتا چھوڑ کر باہر نکل آیا اور سیدھا املی والے کٹنے میں پہنچا۔ مولسری کے درخت کے نیچے وہ مجذوب اسی حالت میں بیٹھا آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔ ڈنڈا اس کے پاس پڑا تھا۔ اس مجذوب کی جلالی طبیعت کی وجہ سے کوئی شخص اس کے قریب نہیں آتا تھا۔ میں بے دھڑک اس کے پاس چلا گیا اور جاتے ہی سلام کر کے اپنا مدعا بیان کیا۔ مجذوب نے پہلے تو سنی ان سنی کر دی۔ جب میں نے بڑے ادب سے اپنا مدعا دہرایا تو وہ غضبناک انداز میں بولا۔

"میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ بھاگ جا نہیں تو سر پھوڑ دوں گا۔"

اس نے ڈنڈا پکڑ لیا۔ مگر میں اپنی جگہ سے نہ ہلا اور کہا۔

"آپ چاہے میرا سر پھوڑ دیں مگر میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔"

مجذوب نے ڈنڈا زمین پر رکھ دیا اور گردن کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے کہا۔

"چاردھا رجواڑے کے باہر جنگل میں ایک مسجد ہے۔ وہاں جا کر دو نفل ادا کر۔ باقی تو جان تیرا کام۔۔۔"

میں نے مزید کچھ پوچھنا چاہا تو مجذوب ڈنڈا پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا۔

"جاتا ہے کہ نہیں۔ مار ڈالوں گا۔ دفع ہو جا۔"

میں وہاں سے بھاگ گیا۔ میں نے سوچا کہ ریلوے سٹیشن پر چل کر ریلوے کے کسی آدمی سے پوچھتے ہیں کہ یہ چاردھا رجواڑا بمبئی سے کس طرف کو ہے۔ ہماری سیمنگٹن روڈ پر بمبئی سنٹرل کا ریلوے سٹیشن تھا۔ میں بس کے ذریعے سیمنگٹن روڈ کے سٹاپ پر پہنچا تو سامنے ایرانی ریستوران تھا۔ اس ریستوران کا مسلمان مالک میرا واقف

بن گیا تھا۔ میں دن میں ایک آدھ بار وہاں بیٹھ کر چائے ضرور پیتا تھا۔ اس کا نام سلام بھائی تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اس سے بات کی جائے۔ میں ریستوران میں آ گیا۔

سلام بھائی مجھے دیکھ کر ہنس کر بولا۔

"کیوں بھائی! کسی فلم میں کام ملا کہ نہیں؟"

اسے معلوم تھا کہ میں پنجاب سے فلم میں کام کرنے کے لئے بمبئی آیا ہوں اور رام دلاری کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ باقی اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں کاؤنٹر کے قریب خالی سٹول پر سلام بھائی کے پاس ہی بیٹھ گیا اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس سے چاردھا رجواڑے کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولا۔

"کیوں بھائی! وہاں تیرا کون ہے؟ یہ رجواڑا تو بڑی دور ہے۔"

میں نے سلام بھائی سے کہا کہ میرا ایک رشتے دار چاردھا میں رہتا ہے۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ میں وہاں کی سیر کرنا چاہتا ہو۔ مگر مجھے پتہ نہیں کہ اس طرف کونسی ریل گاڑی جاتی ہے۔

ایرانی ریستوران کے مالک سلام بھائی نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ریل گاڑی میں بیٹھ کر اگر بھوپال سے جھانسی کی طرف جائیں تو راستے میں للت پور سٹیشن سے ذرا پہلے ایک ریلوے سٹیشن آتا ہے جس کا نام دیوگڑھ ہے۔ یہاں سے اتر جائیں تو جنگل میں سے دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد چاردھا رجواڑے کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔

"مگر اکیلے مت جانا۔" سلام بھائی نے کہا۔ "جنگل میں جو دو میل کا راستہ ہے وہ بڑا خطرناک ہے۔ وہاں دن کے وقت بھی خونخوار شیر چیتے چلتے پھرتے رہتے ہیں۔"

مگر میں جانتا تھا کہ یہ خطرناک سفر مجھے اکیلا ہی طے کرنا ہو گا۔ میں ایرانی ریستوران سے اٹھ کر سیدھا بمبئی سنٹرل کے ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔ وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ جھانسی کی طرف گاڑی رات کے سوا نو بجے چلے گی۔ مجھے یہی گاڑی پکڑنی تھی۔

میں رام دلاری کے فلیٹ پر واپس آگیا۔

میرے پاس دس پندرہ روپے ہی تھے جو میں نے بچا کر رکھے ہوئے تھے۔ رام دلاری نے کھانا تیار کر لیا تھا اور وہ اپنی ساڑھی استری کر رہی تھی - مجھے اندر آتا دیکھ کر بولی۔

"کہاں گئے تھے؟"

میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ میں ٹرین کا ٹائم معلوم کرنے سنٹرل سٹیشن گیا تھا اور اب میں رات کی گاڑی سے عائشہ کی تلاش میں چاردھا ریاست کی طرف جا رہا ہوں۔ رام دلاری دری پر بیٹھی ساڑھی پر کوئلوں والی استری پھیر رہی تھی۔ یہ سن کر اس نے استری اینٹ پر رکھ دی اور مجھے گھور گھور کر تکنے لگی۔

"تو تم باز نہیں آؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "دیدی! میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ اب میں تمہارے کہنے سے بھی نہیں رکوں گا۔"

رام دلاری خاموشی سے دوبارہ استری کرنے لگی۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ اس نے میرے فیصلے کو تسلیم کر لیا ہے۔ کہنے لگی۔

"اتنا مجھے معلوم ہے کہ تم نڈر لڑکے ہو۔ میری خاطر تم خطرناک جنگل میں سے رات کے اندھیرے میں گزر کر تھانے پہنچ گئے تھے۔ لیکن میرے چھوٹے بھیا وہ جو رام

لنگولی پجاری ہے وہ بہت خطرناک غنڈہ ہے اور اس کا پورا گینگ ہے۔ میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم کو کچھ ہو گیا تو مجھے بڑا دکھ ہو گا۔"

میں نے رام دلاری کو یہ بالکل نہ بتایا کہ میں املی والے تکیے کے مجذوب سے بھی مل آیا ہوں۔ وہ پوچھنے لگی۔

"تم چاردھا میں کہاں جاؤ گے۔ کس سے جا کر ملو گے۔ وہاں تو تمہیں کوئی بھی نہیں جانتا۔"

میں نے کہا۔ "اللہ مالک ہے۔ خدا کوئی نہ کوئی سبب پیدا کرے دے گا"

"تمہارے پاس کرایہ ہے؟"

"ہاں۔ پندرہ روپے ہیں۔"

اس زمانے میں پندرہ روپے بڑی خاصی رقم ہوتی تھی۔ پھر بھی ایک ایسے سفر کے لئے ناکافی تھی جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ مجھے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑے گی۔ اس بات کو رام دلاری نے محسوس کر لیا تھا۔ وہ اٹھ کر الماری کے پاس گئی۔ الماری سے ایک ٹین کا چھوٹا ڈبہ نکال کر اسے کھولا اور مجھے مزید پندرہ روپے دے کر بولی۔

"یہ بھی اپنے پاس رکھو۔ تمہیں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے روپے رکھ لئے۔ رام دلاری نے ساڑھی تہہ کر کے پلنگ پر رکھی اور مجھے پاس بٹھا کر کہنے لگی۔

"تم جس مسلمان لڑکی کا کھوج لگانے جا رہے ہو۔ بھگوان کرے کہ وہ تمہیں مل جائے۔ لیکن تم اسے لے کر کہاں جاؤ گے؟ تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس کے ماں باپ کہاں چلے گئے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں اسے پولیس کی حفاظت میں دے دوں گا۔"

"نہیں نہیں نہیں" رام دلاری نے جلدی سے کہا۔ "بھگوان کے لئے ایسی غلطی نہ کرنا۔ تم اسے لے کر سیدھا بمبئی میرے پاس آ جانا۔ میں یہاں اس کے ماں باپ کا

کھوج لگا لوں گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔"

اس زمانے میں ریل کے کرائے زیادہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ یا یوں سمجھ لیں کہ اس زمانے کے مطابق ہی ہوا کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے لاہور سے بمبئی کا تھرڈ کلاس کا ریل کا کرایہ بارہ تیرہ روپے ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ رام دلاری نے مجھے ڈبے میں سے مزید دس روپے نکال کر دیئے اور بولی۔

"یہ بھی اپنے پاس رکھ لو۔ واپسی پر تمہیں عائشہ کے لئے بھی تو ریل کا ٹکٹ لینا ہو گا۔" اور وہ مسکرا دی۔

"میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم عائشہ کو ڈھونڈھ لو گے۔ اچھا اب میرے ساتھ بازار چلو۔ میں تمہیں مارکیٹ سے نئی پتلون اور قمیض لے دوں گی۔ تمہارے یہ کپڑے پرانے ہو گئے ہیں۔"

رام دلاری نے مجھے میل خورے کلر کی موٹے کپڑے کی ایک پتلون اور قمیض لے دی۔ جوتے میرے بالکل ٹھیک حالت میں تھے۔ یہ کینوس کے فلیٹ شو تھے۔ جن کا لڑکوں میں اس زمانے میں بڑا رواج تھا۔ رام دلاری نے مجھے یہ بھی کہا کہ اپنے پاس ایک شکاری چاقو ضرور رکھ لے۔ میں تجھے خرید دیتی ہوں۔ مگر میں نے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوپہر کو چالی میں آ کر میں کھانا کھا کر سو گیا۔ رام دلاری اپنے کام سے کہیں چلی گئی۔ مجھے رات کو سوا نو بجے والی گاڑی پکڑنی تھی۔ رام دلاری کی بھی رات کو شوٹنگ تھی اور اسے منروا سٹوڈیوز جانا تھا۔ وہ تیسرے پہر آئی تو میں جاگ چکا تھا۔ آتے ہی کہنے لگی۔

"چھوٹے بھیا! میں نے عائشہ کے ماتا پتا کا پتہ معلوم کر لیا ہے۔ وہ دیولالی کے محلہ کٹھواڑہ میں اپنے کسی رشتے دار کے پاس چلے گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ دیولالی کہاں ہے؟"

رام دلاری کہنے لگی۔ "جب بمبئی سے چلو گے تو تمہاری ٹرین پہلے کلیان ٹھہرے

گی۔ اس کے بعد دوسرا بڑا سٹیشن دیولالی آئے گا ارے وہ بہت بڑی چھاؤنی بھی ہے۔ انگریزوں نے وہاں اپنی فوج کی بارکیں بنا رکھی ہیں۔ وہاں بارودخانہ بھی ہے۔ تم وہاں اتر جانا اور محلہ کٹھواڑہ پوچھ کر علی بھائی کے گھر چلے جانا۔ عائشہ کا باپ قاسم بھائی تمہیں وہیں ملے گا۔"

یہ میرے لئے ایک خوش خبری تھی۔ اسی طرح کم از کم میں عائشہ کے ماں باپ کو اتنی تسلی ضرور دے سکوں گا کہ میں ان کی بیٹی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ میں نے رام دلاری سے کہا۔

"دیدی! اگر میں عائشہ کو اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تو پھر میں واپسی پر اسے اس کے ماں باپ کے پاس ہی چھوڑتا آؤں گا۔"

رام دلاری بولی۔

"ہاں ہاں۔ اسے وہیں اس کے گھر چھوڑ آنا یہاں بمبئی لانے کی کیا ضرورت ہے۔ بھگوان کرے کہ تم زندہ سلامت واپس آ جاؤ۔ مجھے تو یہی فکر ہے کہ تم ابھی نوجوان سے ہو اور تمہارا واسطہ بڑے بدمعاشوں سے پڑے گا۔"

میں نے کہا۔ "دیدی! تم فکر کیوں کرتی ہو۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔"

رام دلاری نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"مجھے تمہاری یہ بات بڑی اچھی لگتی ہے۔ تمہیں اپنے خدا پر بڑا بھروسہ ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔"

رام دلاری رات آٹھ بجے کے قریب سٹوڈیو شوٹنگ پر چلی گئی۔ مجھے تاکید کر گئی کہ سفر پر جاتے ہوئے چالی یعنی فلیٹ کی چابی باہر گیلری والے گملے کے نیچے رکھ دینا۔ میں نے بھی کوئی ساڑھے آٹھ بجے فلیٹ کا دروازہ بند کر کے تالا لگایا۔ چابی گیلری میں کونے والے پام کے گملے کے نیچے چھپا کر رکھی اور بس میں بیٹھ کر بمبئی سنٹرل پہنچ گیا۔

اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بمبئی شہر میں ہلکی ہلکی بونداباندی ہو رہی تھی۔ ریلوے سٹیشن پر کافی رش تھا۔ جس ٹرین پر مجھے سوار ہونا تھا وہ ایکسپریس

ٹرین نہیں تھی۔ ایکسپریس ٹرینیں دیوگڑھ کے سٹیشن پر نہیں رکتی تھیں۔ پہلے مجھے سیدھا دیوگڑھ ہی جانا تھا۔ مگر اب میں پہلے عائشہ کے ماں باپ کے پاس جا رہا تھا جو دیولالی میں رہتے تھے۔ میں نے دیولالی کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔ میں بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرین چل پڑی۔ بمبئی شہر کے مضافاتی سٹیشن کافی دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلے بمبئی کا مضافاتی سٹیشن باندرہ آیا اس کے بعد گاڑی کلیان پر آ کر ٹھہر گئی۔

کلیان بمبئی سے شمال مشرق کی جانب جاتے ہوئے بمبئی کا آخری مضافاتی سٹیشن ہے۔ یہاں سے ٹرین چلی تو رات کافی گہری ہو گئی تھی۔ ٹرین کی رفتار بھی تیز ہو شروع ہو گئی تھی۔ مجھے ایک قلی نے بتایا تھا کہ دیولالی ٹرین آدھی رات کے بعد پہنچے گی۔ کلیان سے نکلنے کے بعد ست پڑا کا نیم پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ مگر اندھیرا ہونے کی وجہ سے باہر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اگرچہ یہ ایکسپریس ٹرین نہیں تھی مگر پھر بھی بہت چھوٹے چھوٹے سٹیشن چھوڑتی جاتی تھی۔ میں ڈبے میں کھڑکی سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کھلی کھڑکی میں سے بارش میں بھیگی ہوئی ٹھنڈا ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ گرمیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ ابھی برسات شروع نہیں ہوئی تھی۔ مجھے نیند آنے لگی۔ ڈبے میں کافی رش تھا۔ مسافر بستر بچھا کر سیٹوں پر سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک گجراتی سیٹھ سے کہا کہ دیولالی سے ایک سٹیشن پہلے مجھے جگا دینا۔ اور میں کھڑکی سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کر کے سو گیا۔ ٹرین چل رہی ہو تو نیند بڑی جلدی آ جاتی ہے۔ مجھے بھی جلدی نیند آ گئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر سویا رہا ہوں گا کہ ٹرین ایک دھچکے سے رک گئی اور میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے دیکھا میرے ساتھ جو گجراتی سیٹھ بیٹھا ہوا تھا وہ وہیں سیٹ پر سمٹ سمٹا کر گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا باہر اندھیرا تھا۔ دور کہیں کہیں روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے ایک مسافر سے پوچھا۔

"گاڑی کیوں رک گئی ہے؟"

اس نے کہا۔ "سگنل ڈاؤن نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کونسا سٹیشن آ رہا ہے"

"دیولالی"

میں ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ ٹرین کو دھچکا لگنے سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ ورنہ خدا جانے دیولالی کے سٹیشن پر بھی میری آنکھ نہ کھلتی۔ اور وہ سٹیشن بھی گزر جاتا۔ میں نے ٹائم پوچھا۔ معلوم ہوا کہ رات کا ڈیڑھ بجنے والا ہے۔ تین چار منٹ بعد سگنل ڈاؤن ہو گیا - ٹرین چل پڑی۔ پھر دیولالی کے سٹیشن پر رک گئی۔ میں نے پلیٹ فارم پر سٹیشن کا نام جو اردو میں لکھا ہوا تھا پڑھ لیا تھا۔ یہ دیولالی ہی تھا۔ اس زمانے میں سٹیشنوں کے نام اردو اور انگریزی میں لکھے جاتے تھے۔ آج کل انڈیا میں سٹیشنوں کے نام اکثر ہندی میں لکھے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے جنکشنوں کے نام ہندی کے ساتھ انگریزی میں بھی لکھے جاتے ہیں آج کل تو دیولالی بہت بڑا شہر بن گیا ہو گا۔ اس وقت یہ چھوٹا سا شہر تھا اور وہاں اسلحہ کا سپلائی ڈپو تھا۔ فوج کی چھاؤنی بھی تھی۔

سٹیشن بھی کوئی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ میں ٹرین سے اتر گیا۔ ٹرین آگے نکل گئی۔ سٹیشن سے باہر آ کر میں نے ایک یکے والے سے پوچھا۔

"بھائی یہاں کٹھواڑہ محلہ کہاں ہے۔ مجھے وہاں جانا ہے۔"

یکے والا بولا۔

"ایک روپیہ لوں گا۔ کٹھواڑہ محلے میں پہنچا دوں گا۔"

میں نے سوچا کہ آدھی رات کو محلے میں کس سے علی بھائی کا مکان پوچھوں گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں باقی جو رات رہ گئی ہے وہیں سٹیشن پر ہی گزار دوں۔ چنانچہ میں سٹیشن کی ڈیوڑھی میں آ کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں وہیں بنچ پر لیٹ کر سو گیا۔ جس وقت آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ کوئی ٹرین

آکر ابھی رکی تھی۔ مسافر سامان اٹھائے نکل رہے تھے۔ میں جلدی سے اٹھا اور اسی درخت کی طرف بڑھا جہاں تین چار خالی یکے کھڑے تھے۔ سواریوں والے تانگے میں بیٹھنے کی بجائے میں نے سالم تانگہ کرایا اور محلہ کھواڑہ پہنچ گیا۔ شہر کے مکان پرانے اور بوسیدہ تھے۔ سب کی چھتیں ڈھلواں تھیں اور دیوار بارشوں کی وجہ سے کالی ہو رہی تھی۔ دور ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔

محلہ کھواڑہ ایک غریب محلہ تھا۔ میں نے ایک آدمی سے علی بھائی کے مکان کا پوچھا تو اس نے کہا۔

"چھ سات مکان چھوڑ کر علی بھائی کا گھر آ جائے گا۔"

علی بھائی کا مکان چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ تنگ دروازے پر بوریا لٹک رہا تھا۔ باہر ایک بچہ مٹی سے کھیل رہا تھا۔ اس وقت بارش نہیں ہو رہی تھی۔ مکان کے اندر سے ایک بوڑھا آدمی باہر نکلا۔ میں نے اس سے علی بھائی کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"آواز دو۔ وہ اندر ہی ہے۔"

میں نے آواز دی تو ایک سوکھا سا مریل آدمی بیڑی پیتا بوریا اٹھا کر باہر آیا اور مجھے اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیوں میاں۔ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "آپ کے ہاں قاسم بھائی ٹھہرے ہوئے ہیں مجھے ان سے ملنا ہے۔ میں بمبئی سے آیا ہوں۔"

اندر قاسم بھائی نے میری آواز سن لی تھی۔ وہ فوراً باہر آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر گلے لگایا اور میرا نام لے کر کہا۔

"بیٹا! تم یہاں کیسے آ گئے؟ اندر آؤ۔ آؤ۔"

پھر اس نے میرا علی بھائی سے تعارف کرایا۔ اندر عائشہ کی ماں چارپائی پر بیمار پڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"بیٹا! عائشہ کا کچھ پتہ چلا؟"

میں نے کہا۔ "چچی جان میں اسی کا پتہ چلانے جا رہا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ خدا نے چاہا تو آپ کی بیٹی آپ کے پاس ضرور واپس لے آؤں گا۔"

عائشہ کی ماں مجھے دعائیں دینے لگی۔ لیکن علی بھائی اور قاسم بھائی کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ میرے اس دعوے کو مجذوب کی بڑ سمجھ رہے ہیں اور انہیں میری کسی بات پر بھی بھروسہ نہیں تھا۔ لیکن مجھے وہ کیا سمجھ رہے ہیں اور انہیں کیا سمجھنا چاہئے؟ مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ میرے جسم میں توانائی کی زبردست لہریں گردش کر رہی تھیں۔ میرا عزم کسی چٹان سے بھی زیادہ مضبوط تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں عائشہ کو اس کے ماں باپ کے پاس پہنچا کر رہوں گا۔ آج میں ان دنوں کا خیال کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اس وقت میرے اندر میرے ارادوں کی انرجی اور توانائی ہی طوفانی انداز میں کام نہیں کر رہی تھی بلکہ یہ میرا جنون بھی تھا۔

میں اپنے اندر اتنی طاقت محسوس کر رہا تھا کہ میں کسی پہاڑ سے بھی ٹکر لے سکتا تھا۔ یہ میرے جنون اور میرے عزم کی طاقت ہی تھی جس نے مجھے پل سے چھلانگ لگانے کے بعد طوفانی ندی سے زندہ سلامت باہر نکال لیا تھا۔ اور میں اندھیری رات میں خطرناک جنگل میں سے گزر گیا تھا۔ یہی وہ انرجی اور برقی توانائی تھی جو مجھے بچپن ہی میں گھر سے نکال کر وطن سے دور بے سروسامانی کے عالم میں جنگلوں، پہاڑوں اور اجنبی شہروں میں اڑائے اڑائے لئے پھرتی تھی اور پردیس کے مصائب اور تکلیفوں کا بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ یہ میری دیوانگی تھی۔ میرا عشق تھا۔ میرا جنون تھا۔ یہی جذبہ اور جنون لے کر میں ایک بے سہارا مسلمان لڑکی کو ہندوؤں کے چنگل سے نکالنے کے لئے بمبئی سے اکیلا ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔ عائشہ کے والد اور علی بھائی کو اگر میری باتوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا اور وہ میرے دعووں کو اگر مجذوب کی بڑ سمجھ رہے تھے تو اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ نہ صرف یہ کہ ان کی اپنی توانائیاں ختم ہو چکی تھیں بلکہ وہ میری توانائیوں اور میرے جذبہ جنون کی طاقت کا بھی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔

وہ رات میں نے ان لوگوں کے کوارٹر میں بسر کی اور دوسرے روز انہوں نے مجھے

جھانسی جانے والی گاڑی میں سوار کرا دیا۔ یہ ٹرین بھی پسنجر ٹرین تھی اور دیوگڑھ ٹھہرتی تھی۔ دیولالی سے جھانسی تک برا لمبا سفر ہے اور ٹرین ست پڑا کے سینکڑوں میل پھیلے ہوئے پہاڑی جنگلوں میں سے گزرتی ہے۔ ان جنگلوں میں دریا جھیلیں ندی نالے اور بڑے گھنے جنگل آتے ہیں۔ سارا دن ٹرین چلتی رہی۔ اس دوران ناسک' جل گاؤں اور بھوساول کے شہر آئے اور گزر گئے۔ ٹرین پسنجر تھی اس کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ راستے میں کوئی ایکسپریس ٹرین کراس کرتی تو ہماری گاڑی کو ایک طرف کھڑا کر دیا جاتا - یوں رات کے دس گیارہ بجے ٹرین برہان پور کے سٹیشن پر پہنچی۔ یہاں سے چلی تو اگلی منزل کھنڈوا اور ہوشنگ آباد کے شہر تھے۔ یہ شہر دوسرے دن آئے۔ اب اگلا بڑا شہر بھوپال تھا۔ بھوپال کے سٹیشن پر گاڑی کافی دیر رکی رہی۔ اس سے آگے جھانسی کا تاریخی شہر آتا تھا۔ میں نے دیوگڑھ کا ٹکٹ لے رکھا تھا۔ دیوگڑھ کا سٹیشن جھانسی اور للت پور سے تھوڑا پہلے آتا تھا۔ یہ سارا راستہ جنگلاتی تھا۔ کبھی پہاڑیاں قریب آ جاتیں۔ کبھی دور ہو جاتیں اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ایک مسافر سے پوچھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ دیوگڑھ کوئی ایک گھنٹے بعد گاڑی پہنچے گی۔ اس وقت دن ڈھلنے لگا تھا۔ آسمان بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ بھوپال سے ٹرین چلی تو بارش ہونے لگی تھی۔ دیوگڑھ کے قریب پہنچتے پہنچتے بارش رک گئی تھی۔

میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد سر باہر نکال کر آگے دیکھ لیتا تھا کہ دیوگڑھ کا اسٹیشن آیا ہے کہ نہیں۔۔ گاڑی نے ایک برساتی نالے کا پل عبور کیا تو میرے پاس بیٹھے ہوئے مسافر نے کہا۔

"یہاں سے ریاست جھانسی کی سرحد شروع ہو گئی ہے۔"

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد دیوگڑھ کا سٹیشن آگیا۔ چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ پلیٹ فارم پر کافی مسافر سامان لئے کھڑے تھے۔ ٹرین رکی تو میں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی مگر دن کی روشنی سمٹنے لگی تھی۔ یہاں سے مجھے چاردھا رجواڑے کی طرف جانا تھا۔ میں نے سٹیشن سے باہر آ کر ایک یکے والے سے چاردھا رجواڑے کا پوچھا تو

اس نے کہا۔

"بابو! ادھر اس وقت کوئی یکہ نہیں جاتا راستے میں شام ہو جائے گی جنگل میں شیر بھالو کا خطرہ ہے۔"

مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رات ہونے سے پہلے پہلے چاردھا رجواڑے پہنچ جاؤں۔ میں وہ رات دیوگڑھ کے ویران سے سٹیشن پر بسر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے یکے والے کو زیادہ پیسوں کا لالچ دیا تو وہ تیار ہو گیا۔ میں یکے میں سوار ہو گیا۔ ریلوے سٹیشن کا پھاٹک عبور کرنے کے بعد یکہ ڈھلانی راستے سے گزرنے لگا۔ دونوں جانب اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ آگے کھیت آ گئے۔ کھیتوں میں فصل کھڑی تھی۔ اونچے اونچے درختوں کے سیاہ خاکے سے نظر آ رہے تھے۔ کوچوان نے مجھ سے پوچھا کہ میں چاردھا میں کس سے ملنے جا رہا ہوں۔ میں نے یونہی کہہ دیا کہ میرا ایک دوست وہاں فاریسٹ آفیسر ہے اس کے پاس جا رہا ہوں۔ گھوڑا مریل سا تھا۔ ایک خاص رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ کوچوان اسے تیز چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دن کی روشنی لمحہ بہ لمحہ ماند پڑتی جا رہی تھی۔ کھیت ختم ہوئے تو درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے درمیان ایک پکا راستہ بنا ہوا تھا۔ یکہ اس پر چلا جا رہا تھا۔ شام کے سائے اترنے لگے تھے۔ ٹھنڈی ہوا بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ گھاس کا ایک میدان آگیا - یہاں برساتی نالے کا ایک پرانا پل تھا۔ یکہ پل پر سے گزر گیا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا۔ درختوں کے وہ سیاہ خاکے جو پہلے دور نظر آتے تھے اب قریب آ گئے تھے۔ میں نے کوچوان سے پوچھا کہ چاردھا ابھی کتنا دور ہے۔ کوچوان نے ان درختوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ان درختوں کے پار ہے۔"

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا جب یکہ گھنے درختوں کے جھنڈوں میں داخل ہو گیا۔ یہ اصل میں ایک بارانی جنگل تھا جہاں قسم قسم کے درخت اگے ہوئے تھے۔ کوچوان نے یکے کی دونوں لالٹینیں روشن کر دی تھیں۔ جنگل میں اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے وہ کچھ خوف محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک دو بار اس نے اسی خوف کا اظہار بھی کیا۔ ڈر

مجھے بھی لگ رہا تھا کہ کسی طرف سے کوئی شیر یا چیتا نکل آیا تو اس سے بچنا مشکل ہو جائے گا۔ جنگل میں ذرا کھلی جگہ آئی تو کوچوان نے یکہ روک کر کہا۔

"لو جی بابو جی! آگیا چاردھا کا رجواڑا۔"

میں نے شام کے گہرے اندھیرے میں چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

"مگر یہ تو جنگل ہے۔"

کوچوان نے یکہ موڑ لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"بابو جی! یکہ اس کے آگے نہیں جائے گا۔ وہ جو کیکڑ کے درختوں کا جھنڈ نظر آ رہا ہے - اس کے پیچھے چاردھا کا ڈاک بنگلہ ہے سواریاں یہاں تک ہی جاتی ہیں۔"

اسے پیسے میں دے چکا تھا۔ کوچوان نے مجھے اتار دیا او آناً فاناً اکا لے کر جدھر سے آیا تھا ادھر کو بھاگ گیا۔ میں اس سنسان ڈراؤنے جنگل میں اکیلا رہ گیا۔ جنگل سے مجھے زیادہ خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ جنگلوں کا میں عادی ہو گیا ہوا تھا۔ خطرہ صرف کسی شیر چیتے کا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیکڑ کے جھنڈ کے پیچھے جو ریسٹ ہاؤس ہے جلدی جلدی وہاں پہنچنا چاہئے۔ اس کے بعد وہ مسجد تلاش کروں گا جہاں مجذوب بزرگ کی ہدایت کے مطابق مجھے دو نفل ادا کرنے تھے۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ درختوں کے جھنڈ میں سے گزر کر دوسری طرف آیا تو وہاں کوئی ریسٹ ہاؤس نہیں تھا۔ اندھیرے میں ایک چھوٹا سا تالاب دکھائی دیا ساتھ ہی شپ شپ کی آواز سنائی دی۔

میں ذرا آگے بڑھا تو آواز ایک دم رک گئی۔

میں وہیں رک گیا۔

جنگل میں رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ مگر تالاب چونکہ ذرا کھلی جگہ پر تھا اس لئے وہاں اندھیرے میں بھی تھوڑا بہت نظر آ رہا تھا۔ شپ شپ کی آواز میری دائیں جانب سے آئی تھی۔ اس طرف ایک بہت بڑا درخت تالاب پر اتنا جھکا ہوا تھا کہ اس کے ایک ٹہن کی شاخیں پانی میں آدھی ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ کوئی جانور تالاب میں پانی پی رہا ہو گا۔ اس نے اندھیرے میں مجھے دیکھ لیا ہو گا یا میری بو سونگھ لی ہو گی اور پانی پینا چھوڑ کر بھاگ گیا ہو گا۔ اس وقت آسمان پر بادل کافی گہرے ہو چکے تھے مگر رات کا اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے مجھے اس کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ پتہ مجھے اس وقت چلا جب اچانک بادلوں میں بجلی چمک اٹھی۔ جس وقت بجلی چمکی اس وقت میری نگاہیں تالاب پر جھکے ہوئے درخت پر جمی ہوئی تھیں۔ بجلی اتنی زور سے چمکی کہ جنگل ایک سیکنڈ کے لئے روشن ہو گیا۔ اس روشنی میں میں نے ایک عورت کو تالاب کے کنارے پانی میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے سیاہ بال کھلے تھے اور وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب شپ شپ کی آواز آنی ایک دم بند ہو گئی تھی اور ساتھ ہی آسمانی بجلی نے چمک کر سارے ماحول کو ایک سیکنڈ کے لئے روشن کر دیا تھا۔ بجلی کی چمک غائب ہوتے ہی جنگل کا اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا۔ میں نے عورت کو صاف دیکھا تھا۔ وہ کمر تک تالاب کے پانی میں بیٹھی ہوئی شاید نہا رہی تھی۔ وہ ضرور دونوں ہاتھوں

سے پانی اپنے اوپر ڈال رہی تھی جس کی مجھے آواز آئی تھی۔ خدا جانے اندھیرے
اس عورت نے مجھے کیسے دیکھ لیا تھا کہ وہ نہاتے نہاتے ایکدم سے رک گئی اور بجلی
چمک نے مجھے یہ منظر دکھایا کہ وہ گردن موڑے میری جانب تک رہی تھی۔

ایک لمحے کے لئے تو مارے خوف کے میرا جسم سن ہو گیا۔ بھاگنا چاہا مگر پاؤں
من کے بھاری ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ جنگل کی کوئی چڑیل ہے جو تالاب
نہانے آئی ہے اور اس نے مجھے دیکھ لیا ہے اب وہ مجھے پکڑنے کے لئے اٹھ کر میری
طرف آئے گی۔ جنگل کی تاریک ابر آلود رات کے اس ڈراؤنے منظر کا یہ ایک قدر
رد عمل تھا جو مجھ پر ہوا تھا۔ اتنے میں بجلی دوبارہ چمکی۔ میری نگاہیں ابھی تک ا
طرف تھیں۔ بجلی کی چمک میں میں نے دیکھا کہ وہ عورت اب تالاب میں نہیں تھی
اب تو مجھے پورا یقین ہو گیا کہ یہ کوئی آسیب یا چڑیل تھی جو ابھی تالاب میں نہا ر
تھی اور مجھے دیکھ کر غائب ہو گئی ہے۔ اتنی دیر میں میرے ہوش و حواس بحال ہو
تھے۔ میں تیزی سے تالاب کی دوسری طرف کو بھاگا اور جھاڑیوں میں سے ہوتا
تالاب کے دوسرے کنارے کی طرف نکل گیا۔

اس لمحے آسمان پر بادل اتنی زور سے گرجا کہ معلوم ہوا جیسے بیک وقت کئی تو
چل گئی ہوں۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی درختوں کے پتوں پر بارش کی موٹی
بوندیں درختوں کی شاخوں میں سے ہوتی ہوئی مجھ پر بھی گرنے لگیں۔ بارش ایک
موسلا دھار ہونے لگی۔ میں ایک درخت کے نیچے دبک گیا۔ بادل گرج رہے تھے۔
اتنے زور سے کڑاکے کی گونج کے ساتھ چمکی کہ درختوں کے اوپر جتنا آسمان مجھے نظ
رہا تھا وہ روشنی میں بالکل سفید ہو گیا اور بجلی کی شاخ دار روشن لکیریں دیر تک
آتی رہیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے جس درخت کے نیچے میں نے پناہ لے رکھی تھی اس پر
گر پڑی ہو۔ حالانکہ اگر اس درخت پر بجلی گرتی تو میں بھی درخت کے ساتھ جل
راکھ ہو چکا ہوتا مگر حقیقت یہ ہے کہ بجلی کی کڑک اور ڈراؤنی چمک نے میرے ذ
کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں گھبرا کر درخت سے نکل کر ایک طرف کو بھاگا۔ میرا پاؤں ا

جگہ زمین سے باہر نکلی ہوئی کسی درخت کی جڑ سے ٹکرایا اور میں جھاڑیوں میں منہ
کے بل گر پڑا۔ بادل زور سے گرجا۔ میں جھاڑیوں کو پکڑ کر اٹھا اور بارش میں بھیگتا ان
درختوں سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔

بجلی ایک بار چمکی تو مجھے ایک جانب زمین سے ذرا بلندی پر ایک جھونپڑی سی
دکھائی دی۔ میں اندازے سے اس کی طرف دوڑ پڑا۔ بارش کے اس خوفناک طوفان
سے پناہ لینے کے لئے مجھے اس سے اچھی جگہ جنگل میں اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔
میں بارش میں شرابور ہو چکا تھا۔ بجلی چمکتی تو جنگل روشن ہو جاتا۔ دوسرے لمحے اتنا گہرا
اندھیرا چھا جاتا کہ مجھے اپنا ہاتھ بھی نظر نہ آتا۔ جھونپڑی میں نے دیکھ لی تھی۔ میں اسی
کی طرف اندازے سے بڑھ رہا تھا۔ اب جو بجلی چمکی تو میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا
ٹیلہ ہے جس کے اوپر ایک کوٹھڑی ہے۔ کوٹھڑی کی چھت مخروطی ہے اور اس کوٹھڑی
تک جانے کے لئے ٹیلے کی ڈھلان پر سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جو بجلی کی چمک میں مجھے
موسلا دھار بارش میں بھیگتی صاف نظر آئی تھیں۔ میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ سیڑھیاں
پتھر رکھ کر بنائی گئی تھیں۔ میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر جھونپڑی کے دروازے پر
آ گیا۔

جس کو میں جھونپڑی سمجھ رہا تھا یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ بند دروازے کے
اوپر چھوٹا سا چھجہ نیچے کو جھکا ہوا تھا جہاں سے بارش کا پانی آبشار کی طرح گر رہا تھا۔ میں
نے دروازے کو اندر کی طرف دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ ایک ہلکی سی
چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ اندر بھی اندھیرا تھا۔ میں جلدی سے اس
اندھیرے ماحول میں داخل ہوتے ہی بیٹھ گیا۔ کم از کم اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں طوفانی
بارش سے بچ گیا تھا۔ مجھے اس وقت فوری طور پر اسی چیز کی ضرورت تھی۔ میرے
کپڑے بارش میں بھیگ چکے تھے۔ سر کے بالوں سے ابھی تک پانی کی بوندیں ٹپک رہی
تھیں۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا۔ رومال کو گیلے بالوں پر پھیرا۔
اسے نچوڑ کر دوبارہ اپنا چہرہ اور آنکھیں پونچھیں اور کوٹھڑی کے ماحول کا جائزہ لینے کی

کوشش کی مگر اندھیرے میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ کوٹھڑی کی فضا میں البتہ ایک عجیب نامانوس سی بو ضرور محسوس ہوئی۔ میں نے اس بو پر غور کیا تو یہ سیندور کی بو تھی۔ جب میں سکول میں پڑھتا تھا تو اپنے کسی ہندو دوست کے ساتھ کسی مندر میں جاتا تو وہاں یہ بو بہت پھیلی ہوتی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ سیندور کی بو ہے۔ ہندو لوگ اور خاص طور پر ہنومان کی پوجا کرنے والے ہنومان کی مورتی پر سیندور کا لیپ کر دیا کرتے ہیں۔ ہنومان کا چہرہ بندر کا اور دھڑ انسان کا ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں گرز پکڑا ہوتا ہے۔ سیندور کے لیپ کی وجہ سے وہ سرخ ہو جاتا تھا اور مندر کی تنگ کوٹھڑی میں سیندور کی تیز بو پھیلی ہوتی تھی۔ بالکل یہی بو کوٹھڑی کی فضا میں موجود تھی۔ اگرچہ یہ بو تیز نہیں تھی۔ کھلے دروازے میں سے بارش میں بھیگی ہوئی ہوا کے تھپیڑے آتے تو یہ بو تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو جاتی۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے یہاں کسی زمانے میں ہنومان کی کوئی مورتی رکھی ہو۔

میں اب اس انتظار میں تھا کہ بارش رکے تو میں اس مسجد کو تلاش کروں جو مجھے بمبئی کے املی والے تکیئے کے مجذوب بزرگ نے بتائی تھی اور کہا تھا کہ وہاں دو نفل ادا کرنا۔ میرا خیال تھا کہ میں رات اسی مسجد میں ہی بسر کروں گا۔ قدرتی طور پر خدا کے گھر میں میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتا تھا۔ بارش نہ ہو رہی ہو تو جنگل کتنا ہی اندھیرا اور گھنا کیوں نہ ہو مجھے اس سے اتنا ڈر کبھی نہیں لگا تھا کہ میں چل پھر بھی نہ سکوں۔ ہاں وہاں کوئی شیر چیتا یا ریچھ نہ پھر رہا ہو۔ مگر بارش رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ بڑی زور دار آواز کے ساتھ مینہ برس رہا تھا۔ اتنا ضرور فرق پڑ گیا تھا کہ بادلوں کی گرج ہلکی پڑ گئی تھی اور بجلی دیر دیر بعد چمکتی تھی۔ ایک بار بجلی چمکی تو میں نے کوٹھڑی کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ میں نے ایک سیکنڈ کی روشنی میں دیکھا کہ کوٹھڑی چھوٹی سی ہے۔ البتہ کونے میں مجھے ایک چھوٹا سا دروازہ ضرور دکھائی دے گیا تھا۔ اس دروازے کی موجودگی سے مجھے خوف ضرور محسوس ہوا۔ مجھے ایسا لگنے لگا کہ اندھیرے میں کوئی نہ کوئی چڑیل اس دروازے میں سے نکل کر دبے پاؤں میری طرف بڑھے گی

ر مجھے دبوچ لے گی اور اس کے ہاتھوں کی گرفت سے میرا سارا جسم سرد ہو کر سن ہو ائے گا۔ ہو سکتا تھا کہ یہ وہی چڑیل ہو جس کو میں نے تالاب میں نہاتے ہوئے دیکھا ا۔ اب میں نے اندھیرے میں ہی اپنا رخ کونے والی دیوار کے دروازے کی طرف کر ا۔ اندھیرے میں مجھے وہ دروازہ بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کسی وقت بجلی چمکتی تو روازے کا ایک دھندلا سا خاکہ نظر آ جاتا۔ میں نے دروازے پر نظر جما دی۔ اگلی بار لی چمکی تو میں نے غور سے دیکھا۔ دروازہ چھوٹا تھا اور اس کے کواڑ بند تھے۔

یہ دروازہ کس طرف جاتا ہے؟ کیا اس کوٹھڑی کے اندر بھی کوئی کوٹھڑی ہے؟ میں وچنے لگا۔ ہو سکتا ہے اندر کوئی چھوٹی سی کوٹھڑی ہو۔ جنگل کے دیہات میں اس قسم ل چھوٹی کوٹھڑیاں اناج وغیرہ رکھنے کے لئے بنا دی جاتی ہیں۔ میں اپنے آپ کو حوصلہ ینے لگا کہ یہ اندر والی کوٹھڑی بھی اناج کی کوٹھڑی ہو گی جو اس کسان نے آدھی بنائی و گی جو کبھی اس کوٹھڑی میں رہتا ہو گا۔ میں نے اس کوٹھڑی کا خیال دل سے نکال دیا ر باہر جنگل کی طرف رخ کر لیا اور انتظار کرنے لگا کہ بارش ذرا رکے تو میں وہاں سے نکل کر مسجد کی تلاش میں جاؤں۔ مگر یہ کوئی شہر کی بارش نہیں تھی۔ ہندوستان کے شرقی علاقے ست پڑا کے پہاڑی سلسلے کی بارش تھی۔ یہاں مون سون کی بارشیں شروع ہوتی ہیں تو کئی کئی دن تک آسمان بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے اور ساری ساری ات موسلا دھار مینہ برستا رہتا ہے۔ ان جنگلوں میں راتوں کی بارش کا ایک اپنا طلسم وتا ہے۔ آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ جنگل کی بارش میں ہی پیدا ہوا تھا اور اسی رش میں مرجائے گا۔

اب نہ تو بجلی ہی چمک رہی تھی اور نہ بادل ہی گرج رہے تھے۔ مگر بارش پہلے ے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میں نے ہمت ہار دی اور باقی ساری رات اسی کوٹھڑی میں بسر رنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ بارش اور ٹھنڈی ہواؤں کی جہ سے سردی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دوں۔ اس طرح کوٹھڑی کی فضا نیم گرم ہو جائے گی اور میں گیلے کپڑوں کے ساتھ

بھی دیوار سے ٹیک لگا کر سو سکوں گا۔ پھر یہ سوچ کر یہ ارادہ ترک کر دیا کہ دروا
کیا تو کہیں تالاب والی پر اسرار عورت یا چڑیل اندھیرے میں کسی طرف سے نکا
مجھے دبوچ نہ لے۔ میں نے کوٹھڑی کے دروازے کا ایک پٹ پہلے ہی سے بند کر
تھا۔ اس طرح سے بارش کی بوچھاڑ کوٹھڑی میں نہیں آ رہی تھی۔

میری قمیض اور پتلون میرے جسم کی گرمی سے اتنی زیادہ گیلی نہیں رہی
فلیٹ شوز میں نے اتارے نہیں تھے۔ میں نے وہیں دروازے کی چوکھٹ کے
اندر کی جانب ذرا سا نیچے کھسک کر اس طرح ٹیک لگا لی کہ میں سو سکتا تھا۔ میر
آنکھیں بند کر لیں۔ مگر جلدی سے کھول دیں اور کونے والے چھوٹے درواز
طرف اندھیرے میں گھور کر دیکھنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ چھوٹا پراسرار د
بھی مجھے گھور کر دیکھ رہا ہو۔ کم بخت یہ بند دروازہ مجھے سونے نہیں دے رہا تھا۔
اپنے آپ کو بتیرا کہتا کہ یہ چھوٹی اناج والی کوٹھڑی کا دروازہ ہے اس کے اندر کوئی
بھوت نہیں رہتا۔ تم آرام سے سو جاؤ۔ مگر اسی قسم کے ماحول میں انسان کے اند
جو ایک قدرتی خوف بیدار ہو جاتا ہے وہ مجھے سونے نہیں دے رہا تھا۔ سونا تو دو
بات ہے آنکھیں بھی بند کرنے نہیں دے رہا تھا۔ میں نے سوچا چلو آج کی رات
کر ہی گزار دیتے ہیں۔ بارش نہیں رکتی تو نہ رکے۔ میں نے اپنی آنکھیں
رکھیں۔ کبھی باہر جنگل کی طرف دیکھنے لگتا اور کبھی گردن موڑ کر کوٹھڑی کے کو
دیوار والے چھوٹے دروازے کی طرف دیکھ لیتا۔ کمرے کی فضا میں جو سیندور کی
ہلکی بو رچی ہوئی تھی مجھے محسوس ہوا کہ وہ بو زیادہ آنے لگی ہے۔ پہلے تو میں نے
خیال نہ کیا لیکن جب بو زیادہ تیز ہو گئی اور مجھے اپنے حلق میں اترتی ہوئی محسو
ہونے لگی تو میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا منہ دروازے سے باہر نکال کر بارش میں بھیگتی
میں لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

میں حیران تھا کہ یہ بو ایکدم تیز کیسے ہو گئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا
اپنے قدرتی ڈر خوف پر میں نے کافی حد تک قابو پا لیا تھا۔ سکول میں دینیات کے پ

جو دو تین عربی کی آیات پڑھی تھیں اور جو یاد رہ گئی تھیں کسی وقت وہ پڑھ کر
اوپر پھونکیں مار لیتا تھا۔ اس سے مجھے کافی حوصلہ مل جاتا تھا۔ ایک بار میں نے
ازے کے باہر دو تین گہرے سانس لے کر منہ اندر کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ سیندور
تیز بو غائب ہو گئی ہے اور اب فضا میں پہلے والی نارمل بو واپس آ گئی ہے۔ میں نے
کا شکر ادا کیا اور چوکھٹ کی دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ کیونکہ معلوم
ں کتنی رات گزر چکی تھی اور مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے
ڑی سی جھپکی ہی لی تھی کہ کھڑاک کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔

ٹھک ٹھک کی آواز آ رہی تھی۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آواز کہاں
آ رہی ہے۔ میں دیوار سے الگ ہو کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے
یہ آواز کوٹھڑی کے کونے والے چھوٹے دروازے سے آ رہی تھی۔ دوسری طرف
ے کوئی دروازے پر زور زور سے ہاتھ مار رہا تھا۔ میں بت بنا اندھیرے میں جس
ب سے آواز آ رہی تھی ادھر دیکھ رہا تھا۔ کوئی تھوڑی دیر بعد دروازے پر
ب دے رہا تھا۔ پھر کسی عورت کی کمزور سی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو۔"

پہلے میں ڈر گیا۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے دروازے کے پیچھے جو چھوٹی کوٹھڑی
وہاں کسی نے کسی عورت کو بند کر رکھا ہو۔ میں اٹھ کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا
نے والے دروازے تک گیا۔ یہ دروازہ ایک طاق کی طرح بنا ہوا تھا۔ میں نے
ازے کی کنڈی کو ٹٹولا تاکہ اسے کھول دوں۔ یہ دیکھ کر میرے بدن میں خوف کی لہر
ڑ گئی کی دروازے کی کنڈی پہلے سے ہی کھلی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ
ا۔

دروازے کی دوسری طرف سے عورت نے دستک دی اور کمزور آواز میں کہا۔

"دروازہ کھولو۔"

میں نے اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دروازہ کھلا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی عورت کے گہرا سانس بھرنے کی آواز سنائی دی اور پھر گہر خاموشی چھا گئی۔ میں نے مزید ہمت سے کام لیتے ہوئے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ مجھے سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ اندھیرا گ سیاہ تھا۔ دروازے کے کھلتے ہی سیندور کی تیز بو کا ایک جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ سیندور کی بو تیز ہونے لگی تھی۔ میں کوٹھڑی کے بڑ دروازے کے پاس آ گیا۔ میں نے منہ باہر نکال کر لمبے لمبے دو چار سانس لئے۔ با جنگل میں بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔

میں حیران بھی تھا اور ڈرا ہوا بھی تھا۔ آخر وہ عورت کون تھی جو دروازے پیچھے سے آوازیں دے رہی تھی اور جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ کہاں غائب ہو گ تھی۔ کہیں وہ کوٹھڑی میں موجود ہی نہ ہو۔ میں اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھنے لگا کوٹھڑی خالی تھی۔ سیندور کی بو ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ میں نے ہاتھ باہر نکال بارش کا اندازہ لگایا۔ بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے اپنے چہرے کے بالک پاس کسی کے سرد آہ بھرنے کی آواز سنائی دی۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے گئے۔ پھر جیسے کسی نے مجھے دھکا دیا ہو۔ میں گرتے گرتے بڑی مشکل سے سنبھلا او میں نے کوٹھڑی کے باہر بارش میں چھلانگ لگا دی۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا پراسرا کوٹھڑی کے ٹیلے سے اتر کر درختوں کی طرف بھاگنے لگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ یہ کوٹھڑی آسیب زدہ تھی اور وہاں کسی چڑیل کا بسیرا تھا۔ ضرور یہ وہی چڑیل تھ جس کو میں نے تالاب میں نہاتے ہوئے دیکھا تھا۔

میں بارش میں دوڑتا جا رہا تھا۔ بارش اور رات کا اندھیرا میرا راستہ روک رہا تھا میں بار بار جھاڑیوں میں الجھتا۔ مگر میں برابر دوڑ رہا تھا۔ میں تالاب کے پاس نکل آیا میرے کپڑے ایک بار پھر بارش میں شرابور ہو رہے تھے۔ میں تالاب کے پہلو سے ہو ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں دوڑنے کی بجائے تیز تیز چل

لگا۔ کافی دور نکل آنے کے بعد ایک گنجان درخت کے نیچے بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہاں میں بارش سے تھوڑا بہت محفوظ ہو گیا تھا۔ جب سانس ذرا نارمل ہوا تو سامنے والے درختوں کی طرف دیکھا۔ مجھے یقین سا تھا کہ جس مسجد کی مجھے تلاش ہے وہ ان درختوں کی طرف ہی ہے۔ میں اٹھا اور بارش کی پرواہ کئے بغیر چلنے لگا۔ تھوڑی سی کھلی جگہ آ گئی۔ اندھیرے میں مجھے اتنا ضرور نظر آنے لگا تھا کہ میں سمت درست رکھ سکوں۔ یہاں اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ بارش کی بوچھاڑیں پڑ رہی تھیں۔ کھلی جگہ ختم ہوئی تو ایک بار پھر درخت شروع ہو گئے۔ میرے پاؤں کے نیچے زمین سخت ہونے لگی تھی۔ یہ پتھریلا علاقہ تھا۔ اندھیرے اور بارش میں درختوں کے دھندلے دھندلے خاکے سے نظر آ رہے تھے۔ ایک جگہ بانس کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس باڑھ کا مطلب تھا کہ آگے ضرور کوئی گاؤں تھا۔ خوش قسمتی سے بارش ایک دم رک گئی۔

بانس کی باڑھ شاید کھیتوں کے کنارے کنارے لگی ہوئی تھی۔ مگر اندھیرے میں مجھے کھیت دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک باڑہ آ گیا۔ میں باڑے میں گھس گیا باڑے کی چھت اور دیواریں بانس کی بنی ہوئی تھیں۔ یہاں مویشی ہونے چاہئے تھے مگر باڑہ بالکل خالی تھا۔ مجھے جنگل میں سانس لینے کی محفوظ جگہ ضرور مل گئی تھی۔ زمین پر سوکھی گھاس کی دو تین ڈھیریاں لگی تھیں۔ میں ایک ڈھیری کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنی قمیض اتار کر نچوڑ کر دوبارہ پہنی۔ یہ جگہ اچھی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہاں باقی رات بیٹھا رہوں گا اور جب صبح ہو گی تو مسجد کی تلاش میں چل پڑوں گا۔ رات کے اندھیرے میں مسجد تلاش کرنا مشکل کام تھا۔ جب کہ مجھے اس کے محل وقوع کا بھی علم نہیں تھا۔ باڑے کی فضا میں ہلکی ہلکی گرماہٹ تھی۔ گھاس بھی میرے نیچے سوکھی تھی۔ میں گھاس پر ٹانگیں سمیٹ کر لیٹ گیا۔ گیلی قمیض اور گیلی پتلون کی وجہ سے مجھے سردی لگ رہی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ میرا جسم گرم ہوتا گیا اور پھر نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے کسی چیونٹی نے بڑے زور سے کاٹا تھا۔ میں اپنی پنڈلی کو زور زور سے ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ آسمان پر بادلوں کے پیچھے صبح کا اجالا جھلکنے لگا تھا۔ بارش بھی بدستور رکی ہوئی تھی۔ میں باڑے سے باہر نکل آیا۔ باہر ایک چھوٹا سا راستہ شمال مشرق کی طرف چلا گیا تھا۔ میں اس پر چلنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ اگر یہاں مویشیوں کا باڑہ بنا ہوا ہے تو آگے کوئی نہ کوئی گاؤں ضرور ہو گا۔ مگر گاؤں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ دن کا اجالا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں چاروں طرف تاڑ کے اونچے اونچے چھتریوں والے درخت چاروں طرف کھڑے تھے۔ کچا رستہ کچھ دور جا کر درختوں کے ایک ذخیرے میں داخل ہو گیا۔ ان درختوں میں سے رات کی بارش کا پانی ابھی تک ٹپک رہا تھا۔ جب میں درختوں کے ذخیرے سے باہر آیا تو بائیں جانب مجھے ایک چار دیواری دکھائی دی۔ چار دیواری کے قریب گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مسجد ہے۔ دیواروں کے کونوں پر چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ مسجد کا دروازہ غائب تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ آخر میں اس مسجد کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مسجد کا صحن ذرا اونچا تھا۔ میں نے جوتے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ مسجد کے صحن کے آگے صرف ایک برآمدہ سا بنا ہوا تھا جس کی چھت پر دیوار کے ساتھ ایک سیڑھی جاتی تھی۔ برآمدے کے فرش پر دو چار ناریل کی پرانی چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کونے میں ایک چوبچہ تھا جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں مجھے دو نفل ادا کرنے تھے۔ مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے چوبچے کے پاس بیٹھ کر پانی چلو میں لے کر غور سے دیکھا۔ پانی شفاف تھا۔ میں نے ایک گھونٹ پیا۔ پانی میٹھا تھا۔ پانی پینے کے بعد میں نے وضو کیا اور پھر برآمدے میں چھت کے نیچے جا کر دو نفل ادا کئے اور ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا مانگی کہ میں جس نیک مقصد کو لے کر بمبئی سے چلا ہوں وہ مجھے اس مقصد میں کامیاب کرے۔ چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر کر میں چٹائی پر ہی قبلہ رو ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ املی والے تکیے کے مجذوب نے مجھے یہاں دو نفل ادا کرنے کی جو ہدایت کی تھی تو اس میں ضرور

کوئی نہ کوئی مصلحت ہو گی۔ اب میں وہاں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ وہ مصلحت کیا ہو سکتی ہے۔ اس وقت دن کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے مسجد کے دروازے کے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ اچانک ایک عورت مسجد کے سامنے سے گزری۔ اس نے میری طرف نگاہ ڈالی اور وہیں رک کر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے مسکرا کر اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ اس کی مسکراہٹ اور اشارے میں کوئی ایسی طلسمی طاقت تھی کہ میں اٹھ کر مسجد سے باہر آ گیا۔ میرے دل نے کہا۔ واپس مسجد میں چلے جاؤ۔ مگر وہ عورت جو بڑی خوبصورت تھی کچھ اس انداز سے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی کہ میں نے دل کی آواز پر کوئی دھیان نہ دیا اور عورت کے قریب جا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میری طرف مسلسل دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ مجھ پر جیسے اس کی مسکراہٹ نے ایک سحر سا طاری کر دیا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک بار پھر اس سے پوچھا کہ اس نے مجھے باہر کیوں بلایا ہے۔ یہ عورت لباس سے مدھیہ پردیش کے جنگلوں میں رہنے والے آدھی باسی قبیلے کی کوئی عورت لگتی تھی اس نے گھٹنوں سے اوپر تک کمر کے گرد سیاہ رنگ کی ساڑھی لپیٹ رکھی تھی۔ پاؤں میں چاندی کے کڑے تھے۔ کلائیوں میں بھی چاندی کے کڑے تھے۔ گلے میں سرخ اور سیاہ منکوں کی مالا تھی۔ جسم پر صرف ایک چولی تھی۔ بالوں کا سر کے پیچھے جوڑا بنا رکھا تھا جس میں کسی درخت کا سرخ پھول لگا تھا۔ ان قبیلوں کی عورتیں عام طور پر کالے رنگ کی معمولی شکل و صورت کی عورتیں ہوتی ہیں۔ مگر اس عورت کا رنگ بھی زیادہ کالا نہیں تھا۔ گہرا سانولا تھا۔ نقش بھی بڑے اچھے تھے۔ وہ آدی باسی قبیلے کی عورتوں سے بڑی مختلف عورت تھی۔ اس کی نسواری رنگ کی آنکھوں میں ایک تیز چمک تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کے جسم کے طلسم کا اسیر ہو چکا تھا۔ اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مجھے ایک گرم لہر اپنے جسم میں دوڑتی محسوس ہوئی۔

میرے اندر سے ایک بار پھر وہی آواز آئی۔

"واپس مسجد میں چلے جاؤ۔"

مگر میں نے ایک بار پھر اس آواز پر کوئی دھیان نہ دیا۔ عورت نے میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

اس کی آواز میں بھی جیسے کوئی جادو تھا۔ وہ اپنی نظریں میرے چہرے سے بالکل نہیں ہٹا رہی تھی۔ اس نے اس دوران ایک بار بھی دوسری طرف نہیں دیکھا تھا۔ میرے اندر دو طاقتوں میں گویا ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی۔ ایک طاقت مجھے واپس مسجد کی طرف کھینچ رہی تھی اور دوسری طاقت مجھے اس پراسرار عورت کے ساتھ جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ میری جوانی کے ابتدائی ایام کا زمانہ تھا۔ میں کوئی نمازی پرہیزگار نوجوان بھی نہیں تھا۔ اچھا کام بھی کر لیتا تھا اور برائی کی طرف بھی راغب ہو جاتا تھا۔ کوئی اچھا کام کرتا تو دل کو سکون سا ملتا۔ گناہ کرتا تو دل بوجھل ہو جاتا اور پھر گڑگڑا کر خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگتا۔ یہ سلسلہ ایک عرصے سے چل رہا تھا۔ اس وقت میں اپنی تمام تھوڑی بہت اچھائیوں اور زیادہ برائیوں کے ساتھ اس پراسرار جنگلی عورت کے سامنے موجود تھا اور دل پر شیطانی جذبات نے قبضہ کر لیا تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ میرا ہاتھ کبھی نہ چھوڑے۔ جب اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا تو میں بے اختیار اس کے ساتھ چل پڑا۔ میں نے اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہی ہے اور اسے مجھ سے کیا کام ہے۔ کل رات کی بارش کی وجہ سے کہیں کہیں درختوں پر سے ابھی تک پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ پاؤں سے ننگی تھی اور کچے راستے پر کیچڑ سے ہٹ کر گھاس پر چل رہی تھی۔ اس نے میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ وہ مجھے اس طرف لے جا رہی تھی جدھر سے میں رات کو چل کر مسجد میں آیا تھا۔ ایک جگہ وہ دائیں طرف درختوں میں مڑ گئی۔ ذرا آگے جا کر ایک جھونپڑی آ گئی۔ یہ بانس کی چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اس پر ناریل کی شاخوں کی ڈھلواں چھت پڑی ہوئی تھی۔ وہ مجھے جھونپڑی کے اندر لے گئی۔ جھونپڑی کی زمین پر سوکھے پتے بچھے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بٹھایا اور بولی۔

"تمہیں بھوک لگی ہو گی۔ تمہارے لئے کچھ کھانے کو لے آتی ہوں۔"

بھوک مجھے واقعی لگی ہوئی تھی۔ میں اس بات پر بھی حیران تھا کہ وہ عورت بڑی صاف ہندی زبان میں بات کر رہی تھی۔ وہ آدمی باسی قبیلوں کی زبان نہیں بول رہی تھی۔ وہ جھونپڑی سے نکل کر باہر گئی تو میں نے چاروں طرف دیکھا۔ جھونپڑی کی دیوار بانسوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ کونے میں مٹی کے دو مٹکے پڑے تھے۔ ایک مٹکے کے اوپر سوکھے ناریل کا کھوپا الٹا رکھا ہوا تھا۔ یہ کھوپا عام طور پر پانی یا دیہات میں تاڑی پینے کے کام آتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ عورت کھانا کہاں سے لائے گی۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہاں کہیں قریب ہی ان کے قبیلے کا گاؤں ہو۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ عورت واپس آ گئی۔

اس کے ہاتھ میں کیلے کے پتوں میں لپٹی ہوئی کوئی شے تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے کیلے کے پتوں کا بنڈل کھولا تو میں نے دیکھا کہ اس میں زرد رنگ کے موٹے چاول تھے جن پر چھوٹے چھوٹے آلوؤں کا سالن پڑا تھا۔

"کھاؤ۔ پھر تم سے بات کروں گی۔"

وہ عورت کون تھی اور اس کے اندر کس قدر منفی طاقتیں تھیں ۔ ابھی تک مجھے اس کا بالکل احساس نہیں ہوا تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ جنگلی قبیلے کی کوئی عیش پسند عورت ہے جس نے ایک نوجوان کو دیکھا اور اسے بلا کر عیش پرستی کے خیال سے اپنے ساتھ جھونپڑی میں لے آئی ہے۔ اس وقت تک میں بھی اپنے ہوش میں آ چکا تھا۔ میرے دل میں اس عورت کو دیکھ کر جو گناہ کا خیال پیدا ہوا تھا اس کو دل سے نکال کر خدا سے اپنے گناہ کی معافیاں مانگ رہا تھا اور یہی فیصلہ کیا تھا کہ چاول وغیرہ کھانے کے بعد میں جھونپڑی سے نکل کر سیدھا مسجد میں واپس چلا جاؤں گا۔ کیونکہ میرا خیال ابھی تک اسی طرف لگا ہوا تھا کہ بمبئی کے مجذوب نے مجھے جو مسجد میں دو نفل ادا کرنے کے لئے کہا تھا تو اس میں ضرور کوئی مصلحت تھی اور وہاں سے مجھے ضرور کوئی ایسا غیبی اشارہ ملے گا جو مسلمان لڑکی عائشہ کو تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہو گا۔

میں جلدی جلدی چاول کھانے لگا۔ میں نے اس عورت کا شکریہ بھی ادا کیا۔ وہ مٹکے میں سے پانی نکال کر لے آئی۔ میں نے پانی پی کر پوچھا۔

"کیا تم اسی جھونپڑی میں رہتی ہو؟ تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میری طرف مسلسل تک رہی تھی اور تھوڑا تھوڑا مسکرا رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا اگر جواب نہیں دیتی تو نہ دو۔ مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں تو تھوڑا بہت کھا پی کر یہاں سے رفوچکر ہو جاؤں گا۔ لیکن میں جس بھیانک چکر میں پھنسنے والا تھا اس کی مجھے خبر نہیں تھی۔ میں نے زمانے کی بڑی مار کھائی ہے۔ بڑے بڑے نشیب و فراز سے گزرا ہوں۔ ہر قسم کے حالات دیکھے ہیں۔ بستر سنجاب و سمور پر بھی سویا ہوں اور فٹ پاتھوں پر بھی راتیں بسر کی ہیں۔ شرافت کا ماحول بھی دیکھا ہے اور گناہ کی دلدلوں سے بھی بمشکل بچا ہوں۔ میں نے ان سارے تجربات سے ایک ہی سبق سیکھا ہے اور وہ سبق میں نوجوان نسل تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ وہ سبق یہ ہے کہ جب کبھی گناہ کا خیال دل میں آئے تو اسے اپنے ارادے کی ساری طاقت کا زور لگا کر فوراً دل سے نکال کر پھینک دیں۔ اور توبہ استغفار کریں۔ گناہ کی طرف قدم بھی نہ بڑھائیں۔ یہ ہرگز نہ سوچیں کہ کوئی بات نہیں۔ پھر کیا ہوا۔ میں زیادہ آگے نہیں جاؤں گا۔ بس دو چار قدم چل کر واپس آ جاؤں گا۔ نہیں نہیں۔ ایسا ہرگز ہرگز نہ سوچیں۔ گناہ کے راستے پر آدمی ایک بار چل پڑے تو پھر اس کا واپس آنا محال ہو جاتا ہے۔ اس لئے اول تو دل میں گناہ کا خیال بھی نہ لائیں لیکن بندہ بشر ہے۔ اگر گناہ کا خیال آ بھی جائے تو اسے فوراً دل سے نکال کر پھینک دیں۔ ایسے ماحول میں بھی نہ بیٹھیں جہاں گناہوں کی ترغیب کا امکان ہو۔ جس گاؤں میں آپ کو نہیں جانا اس گاؤں کا کسی سے راستہ بھی نہ پوچھیں۔ میں یہ غلطی کر بیٹھا تھا اور پھر اس کا مجھے جو خمیازہ بھگتنا پڑا اس کے تصور ہی سے آج میری روح کانپ اٹھتی ہے۔

اس وقت میرے دل میں گناہ کا خیال موجود تھا۔ جب میں مسجد سے نکل کر اس پراسرار جنگلی عورت کے پیچھے چل پڑا تھا۔ جب میں جھونپڑی میں بیٹھا چاول کھا رہا تھا

اس وقت میں نے گناہ کے خیال کو دل سے ضرور نکال دیا تھا اور یہی فیصلہ کیا تھا کہ میں تھوڑے بہت چاول کھا کر واپس جنگل والی مسجد میں چلا جاؤں گا۔ لیکن مجھ سے وہی خطرناک غلطی ہو گئی تھی کہ میں گناہ کے راستے پر قدم بڑھا چکا تھا۔ اور گناہ کے راستے پر چل نکلا تھا جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ چنانچہ جب میں نے کھانا کھالیا تو عورت سے کہا۔

"تمہارا شکریہ! اب میں واپس جاتا ہوں۔ مسجد میں مجھے اپنے ایک ساتھی کا انتظار ہے۔ وہ آنے ہی والا ہو گا۔"

جنگلی عورت نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے سانس میں ایسی آواز تھی جیسے خشک پتوں پر سانپ چل رہا ہو۔ میں جانے کے لئے اٹھا تو اس عورت نے جو ابھی تک پتوں کے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر نیچے بٹھا لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ میں مردوں ایسی طاقت تھی۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ میں کچھ خوفزدہ سا ہو کر بیٹھ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ آج میرے ساتھ جنگل کی سیر کرو۔ پھر میں تمہیں جہاں کہو گے چھوڑ آؤں گی۔"

میں نے خوف کو دل سے نکال کر باہر پھینک دیا اور اس عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟ تمہاری زبان جنگلی قبیلے کی عورتوں والی نہیں ہے۔ تم بڑی صاف ہندی زبان بولتی ہو۔ تمہارا رنگ روپ بھی جنگلی قبیلے کی عورتوں کی طرح نہیں ہے۔ کیا تم کوئی بھوت پریت ہو؟"

وہ ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں عجیب قسم کی گھنٹیوں کی آواز مجھے سنائی دی۔ کہنے لگی۔

"اگر میں بھوت پریت ہوتی تو تمہیں اب تک کھا گئی ہوتی۔"

پھر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہنے لگی۔

"میں ساتھ والے گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں۔ مسجد کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ تم پر نظر پڑی۔ تم اچھے لگے۔ تمہیں اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ اس سے زیادہ تم اور پوچھ کر کیا کرو گے؟"

میں نے کہا۔ "تم اتنی جلدی کھانا کہاں سے لے آئی تھیں؟ یہاں آس پاس تو مجھے کوئی گاؤں نظر نہیں آیا۔"

اس نے کہا۔

"میں مہینے میں ایک آدھ بار اکیلی جنگل کی سیر کرنے نکل پڑتی ہوں۔ یہ جھونپڑی میں نے اسی لئے بنوائی ہوئی ہے۔ یہاں میں کھانا پکا کر رکھ لیتی ہوں۔ رات پڑ جائے تو اس جھونپڑی میں سو بھی جاتی ہوں۔"

میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جنگل کی سیر پھر کبھی کر لوں گا۔ اس وقت مجھے مسجد میں پہنچنا ہے۔ میرا دوست وہاں آنے ہی والا ہو گا۔"

اس عورت نے گردن ایک طرف جھکا کر بڑے خاص انداز سے کہا۔

"اگر تم کسی خاص چیز کی تلاش میں یہاں آئے ہو تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔"

میں ذرا ٹھٹک گیا۔ واقعی یہ عورت میری مدد کر سکتی تھی۔ عائشہ کو لے کر جرائم پیشہ پجاری گنگولی اسی علاقے میں آیا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے اس عورت کے ذریعے مجھے پجاری گنگولی کا کوئی سراغ مل جائے۔ پھر بھی میں نے اسے اپنے دل کا راز نہ بتایا اور اسے مزید ٹٹولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں کسی چیز کی تلاش میں آیا ہوں؟"

عورت مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں تمہارے دل کا حال تمہارے چہرے پر سے پڑھ رہی ہوں۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم کوئی خاص مقصد لے کر ان جنگلوں میں آئے ہو۔ اور ہاں۔ مجھے ہاتھ دیکھنا

بھی آتا ہے۔ لاؤ میں تمہارا ہاتھ دیکھتی ہوں۔"

ہاتھ دکھانا آدمی کی بڑی کمزوری ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے آگے کر دیا۔ اس نے میرے ہاتھ کی لکیروں کو غور سے دیکھا۔ ان پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ہاتھ کی لکیریں بتا رہی ہیں کہ تم کسی مسلمان لڑکی کی تلاش میں یہاں آئے ہو۔"

میں تو اپنی جگہ سے ایک بار ہل گیا۔ اس عورت کو کیسے پتہ چل گیا تھا کیا ہاتھ کی لکیریں اتنا کچھ بتا دیتی ہیں؟ کیا واقعی وہ دست شناسی کی ماہر تھی؟ میں نے اپنی ہتھیلی کو مزید کھولتے ہوئے کہا۔

"کیا میرے ہاتھ کی لکیریں بتا سکتی ہیں کہ وہ مسلمان لڑکی اس وقت کہاں ہے؟"

اس نے میرے ہاتھ کی ہتھیلی کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بند کر دیا اور بولی۔

"ہاتھ کی لکیریں تو نہیں بتا سکتیں مگر میں بتا سکتی ہوں۔

میں نے بے تاب ہو کر کہا۔

"پھر مجھے بتاؤ۔ مسلمان لڑکی اس وقت کہاں ہے۔ کس حال میں ہے؟"

عورت ایک دو سیکنڈ کے لئے خاموش ہو گئی۔ میری طرف مسلسل تکتی رہی۔ پھر آہستہ سے سانس بھر کر کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اس مسلمان لڑکی سے ملاتی ہوں۔"

مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ مجھے اس مسلمان لڑکی کے پاس لے چلو۔"

وہ ہنس پڑی۔

"میرا نام روپا ہے۔ تم میرا نام لے کر مجھے بلاؤ۔"

میں نے فوراً کہا۔

"ہاں روپا! مجھے اس لڑکی کے پاس لے چلو۔ کیا تم اسے مل چکی ہو؟"

اب میں بھی اس پراسرار عورت کو روپا کے نام سے ہی یاد کروں گا۔

روپا ہنس کر بولی۔

"کیوں نہیں؟ مجھے تو اس کا نام بھی معلوم ہے۔ اس کا نام عائشہ ہے نا؟"

میں خوشی سے اچھل پڑا۔

"ہاں ہاں۔ یہی نام ہے اس لڑکی کا۔ بے چاری مصیبت کی ماری ہے۔ غریب لڑکی ہے۔ ایک بدمعاش اسے اٹھا کر یہاں لے آیا ہے۔ اس کے ماں باپ کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔"

روپا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آؤ میرے ساتھ۔ تمہیں عائشہ سے ملاتی ہوں۔"

میں اس کے ساتھ جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ اب وہ عورت مجھے کوئی بھوت پریت قسم کی عورت نہیں لگ رہی تھی بلکہ میں اسے علم نجوم یا جوتش کے علم کا ماہر سمجھنے لگا تھا۔ جنگلوں میں جو قبیلے خاص طور پر وسطی اور جنوبی ہند کے جنگلی قبیلے آباد ہیں ان کے ہاں ایسے لوگ اکثر پائے جاتے ہیں جو جادو ٹونے اور جوتش کے علم کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے بعض قیافے بالکل سچ نکلتے ہیں۔ یقیناً اس عورت روپا نے بھی جو اپنے آپ کو کسی جنگلی قبیلے کے سردار کی بیٹی بتاتی تھی یہ علم حاصل کر رکھا ہو گا۔ آسمان پر نئی کالی گھٹائیں آنا شروع ہو گئی تھیں اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ اب پھر بارش ہو گی۔ وہ مجھے لے کر اس راستہ پر جا رہی تھی جس راستے سے میں آیا تھا۔ ہم مویشیوں کے خالی باڑے کے قریب سے بھی گزرے۔ جب جنگل والا پرانا تالاب آیا جہاں رات کے وقت میں نے ایک عورت کو نہاتے ہوئے دیکھا تھا تو میں نے روپا سے پوچھا۔

"ابھی کتنی دور چلنا ہو گا؟"

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑے محبت بھرے لہجے میں بولی۔

"کیا تھک گئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ میں نے ویسے ہی پوچھا تھا۔"

ہم اونچے اونچے گھنے درختوں کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ وہ ایسے چل رہی تھی جیسے اس جنگل کے چپے چپے سے واقف ہو۔ ایک جگہ گھنے درختوں سے باہر نکلے تو میرا دل زور سے دھڑکا۔ میرے سامنے وہی آسیب زدہ ٹیلہ تھا جس کے اوپر رات والی کوٹھڑی دن کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھی۔ میرے قدم آہستہ ہو گئے۔ روپا اسی ٹیلے کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا مسلمان لڑکی اسی کوٹھڑی میں ہے؟"

روپا نے رک کر میری طرف دیکھا۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔ مگر میں تمہیں یہاں بٹھا کر اسے لے آؤں گی۔ تم ڈرتے کیوں ہو؟ یہاں کوئی شیر باگھ نہیں رہتا۔ آؤ۔"

میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ جب ہم ٹیلے والی آسیب زدہ کوٹھڑی کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو بجلی چمکی اور بادل زور سے گرجے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دل میں کہا۔ "یاخدا! تو ہی میری حفاظت کرنا۔"

مگر خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ میں نے خود اپنی حفاظت نہیں کی تھی۔ پھر خدا میری حفاظت کیوں کرتا۔ مجھے مسجد سے نکل کر اس عورت کے پیچھے نہیں لگ جانا چاہئے تھا۔ مسجد میری پناہ گاہ تھی۔ میں وہاں پر خود بھی اپنی حفاظت کر رہا تھا اور خدا نے بھی مجھے اپنی حفاظت میں رکھا ہوا تھا۔ میں اپنے نفس کے کہنے پر مسجد سے اٹھ کر اس عورت کے ساتھ ہو گیا اور یوں میں نے اپنے آپ کو شیطان کے آگے ڈال دیا تھا اور اپنی حفاظت سے غافل ہو گیا تھا۔ اب میرے ساتھ بھی وہی کچھ ہونے والا تھا جو اپنے نفس کا غلام بن جانے والوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

دن کی روشنی میں کوٹھڑی کی مخروطی چھت اور بوسیدہ دیواریں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں نے روپا سے پوچھا۔

"کیا یہ کوئی مندر ہے؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔"

وہ کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کوٹھڑی میں دن کی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میری نگاہ سب سے پہلے کوٹھڑی کے کونے والے چھوٹے رواز ے کی طرف گئی - دروازہ بند تھا۔ یہ وہی دروازہ تھا جس کے پیچھے سے رات کے قت کسی عورت کے دستک دینے اور پھر مدد کے لئے پکارنے کی آواز آئی تھی۔ میں ں میں کچھ ڈر سا ضرور محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے محسوس کیا فضا میں سیندور کی بو وجود نہیں ہے۔ میں نے روپا کو بالکل نہ بتایا کہ میں طوفانی بارش والی گزشتہ رات کا یک حصہ اس کوٹھڑی میں بسر کر چکا ہوں۔ روپا کونے والے دروازے کو غور سے دیکھ ہی تھی۔

بادلوں میں ایک بار پھر زوردار گرج کی آواز پیدا ہوئی۔ روپا نے میری طرف ایک ڑ کر دیکھا اور کہا۔

"تم یہاں بیٹھو۔ میں مسلمان لڑکی عائشہ کو لے کر آتی ہوں۔"

میرا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ میں روپا سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ عائشہ کو کہاں سے ے گی؟ یا کیا وہ دروازے کی دوسری جانب کسی چھوٹی کوٹھڑی میں بند ہے؟ میں وہیں ھٹ کے قریب بیٹھ گیا جہاں رات کو بیٹھا ہوا تھا۔ میری آنکھیں روپا پر لگی ہوئی ں۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ کونے والے دروازے کے پاس گئی۔ دروازہ کھولا اور جھک . دروازے کے دوسری جانب اتر گئی۔ اس کے اترنے کے انداز سے معلوم ہوا کہ سری طرف سیڑھیاں نیچے کسی تہہ خانے میں جاتی ہیں۔ اس نے اپنے پیچھے دروازہ کر دیا تھا۔ دروازے کے کھلتے ہی مجھے وہی سیندور کی منحوس بو ایک بار پھر آئی تھی۔ واز ہ بند ہونے کے بعد آہستہ آہستہ یہ بو غائب ہو گئی۔ اس جنگلی عورت روپا کے ے میں میرا ذہن بالکل صاف ہو چکا تھا۔ پہلے میں اسے ضرور ایک پراسرار عورت تا تھا لیکن اب یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ ہاتھ کی ریکھاؤں کے علم کی ماہر ہے

اور ہو سکتا ہے کہ تھوڑا بہت کالا جادو کرنا بھی جانتی ہو۔ اس کوٹھڑی کے بارے میں بھی دن کی روشنی میں رات کے سارے واقعات موہوم سے لگنے لگے تھے اور میں انہیں محض اپنا وہم سمجھنے لگا تھا۔ رات کا وقت ہو۔ گھنا جنگل ہو۔ بارش ہو رہی ہو تو آدمی کا ذہن خود بخود توہمات کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ سب کچھ میرے وہم کا کرشمہ ہو اور رات کو کسی نے بھی چھوٹے دروازے پر دستک نہ دی ہو۔ کسی عورت نے مجھے دروازے کی دوسری طرف نہ بلایا ہو۔ اور میرے منہ کے قریب آ کر گہرا سانس نہ لیا ہو۔ باقی سیندور کی بو کا جہاں تک تعلق تھا تو وسطی اور جنوبی ہند کے جنگلوں میں اکثر اس طرح کے چھوٹے چھوٹے پرانے مندر یا مڑھیاں ہوتی ہیں جہاں پجاری دیوار پر کسی دیوی دیوتا کی شکل بنا کر اس پر سیندور مل دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کوٹھڑی میں بھی کسی نے ایسا ہی کیا ہو گا۔

میری اسی حقیقت پسندانہ سوچ نے میرے ذہن کو توہمات اور بھوت پریت چڑیلوں کے خیالات سے بالکل پاک کر دیا اور میں اب بے چینی سے روپا کی واپس کا انتظار کر رہا تھا کب وہ عائشہ کو لے کر دوسری کوٹھڑی یا تہہ خانے سے باہر آتی ہے۔ سیاہ گھٹاؤں نے جنگل کے درختوں میں دن کے وقت بھی اندھیرا سا کر دیا تھا۔ بادل برابر تھوڑی تھوڑی دیر بعد گرج رہے تھے۔ پھر موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں اور ایک دو منٹ بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش کی بوچھاڑیں کوٹھڑی میں آ رہی تھیں۔ میں چوکھٹ سے ہٹ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ میں بار بار کونے والے دروازے کی طرف دیکھتا۔ مگر دروازہ اسی طرح بند تھا۔ بارش کی آواز نے کافی شور مچا رکھا تھا۔ کوٹھڑی کی چوکھٹ کے اوپر باہر کی جانب جو چھجہ لگا تھا اس پر سے بارش کا پانی شور مچاتا ہوا نیچے گر رہا تھا۔ مدھیہ پردیش کے جنگلوں میں برسات کے موسم میں بڑی موسلادھار بارشیں ہوتی ہیں۔ بادل کئی کئی دن تک چھائے رہتے ہیں۔ بارش رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ میرا دھیان جنگلی عورت روپا کی طرف لگا ہوا تھا جو عائشہ کو لینے تہہ خانے میں گئی ہوئی تھی۔ بارش کے شور میں مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے کونے والے دروازے پر زور

ے دستک دی ہو۔ ساتھ ہی مجھے روپا کی آواز سنائی دی۔

"نیچے آؤ۔ عائشہ بے ہوش پڑی ہے۔"

میں دوڑ کر چھوٹے دروازے کی طرف گیا۔ جلدی سے اسے کھولا۔ نیچے سیڑھیاں
تی تھیں اور ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ میں جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا تہہ
نے میں اتر گیا۔ تہہ خانے میں نہ روپا تھی نہ عائشہ۔ دیوار کے ساتھ ایک لالٹین
شن تھی۔ میں حیران و پریشان ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک پھنکار کی آواز گونجی اور
ب سیاہ کالا سانپ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کا پھن پھیلا ہوا تھا اور سرخ زبان
فناک پھنکار کے ساتھ بار بار باہر نکل رہی تھی۔ وہشت کے مارے میرا سارا بدن سن
و گیا۔ سانپ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔

موت میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ سانپ مسلسل میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں ذہن ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ سانپ کی آنکھوں کی مقناطیسی کشش نے مجھ پر سحر سا طاری کر دیا تھا۔ اچانک میرے اندر ایک طاقت سی بیدار ہو گئی۔ میں نے تیزی سے ایک طرف چھلانگ لگائی۔ عین اسی وقت سانپ نے بھی مجھ پر چھلانگ لگا دی اور میری گردن پر ڈس دیا۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا پھر یہ اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا اور اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ شاید میں گر پڑا تھا۔

کچھ پتہ نہیں میں کب تک وہاں بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ میری آنکھوں کے سامنے چمکدار ستارے گردش کر رہے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ میں سانپ کے ڈسنے سے مر چکا ہوں اور یہ موت کے بعد کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ میں نے دل میں کلمہ شریف کا ورد کرنا شروع کر دیا اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ میری آنکھوں کے آگے جو ستارے گردش کر رہے تھے وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ پھر وہ ایک مرکز پر جمع ہو گئے اور اسی مرکز نے ایک چھوٹے سے شعلے کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ چھوٹا سا شعلہ دیوار پر لگی ہوئی لالٹین کا شعلہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں زندہ تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ میں مرا نہیں تھا۔ میں نے بچپن میں سنا تھا کہ جسے سانپ ڈس لے اسے بڑی پیاس لگتی ہے۔ مجھے پیاس بھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے

یہ بھی سنا ہوا تھا کہ سب سے زہریلا سانپ پھنیئر سانپ ہوتا ہے یعنی کوبرا سانپ۔۔۔۔ اور جسے یہ سانپ ڈسے اس کا سارا جسم ایک منٹ کے اندر اندر پگھل جاتا ہے۔ مگر میرا جسم بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تہہ خانہ خالی تھا۔ دیوار کے ساتھ لگی لالٹین جل رہی تھی۔ مگر اس کی لو دھیمی ہونے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں کافی دیر تک وہاں بے ہوش پڑا رہا تھا۔

میرا ہاتھ اپنی گردن کی طرف اٹھ گیا۔ سانپ نے میری گردن پر ڈسا تھا۔ میں نے گردن پر ہاتھ پھیر کر اچھی طرح دیکھا۔ وہاں سانپ کے ڈسنے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ سانپ ڈس جائے تو جہاں وہ ڈسے وہاں اس کے دانتوں کے نشان ضرور پڑ جاتے ہیں اور وہاں سے جگہ بھی ابھر آتی ہے۔ مگر میری گردن بالکل صاف تھی۔ میرا سر بھی نہیں چکرا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ تھوڑا سا غور کرنے پر میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ یقیناً یہ جنگلی عورت روپا کوئی بھوت پریت یا بدروح تھی جس نے مجھے دیکھا اور اپنے ساتھ لے کر یہاں آ گئی۔ بدروح ہونے کی وجہ سے اسے میرے دل کا حال بھی معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے نیچے بلایا اور سانپ بن کر میری گردن پر ڈس لیا۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر اس نے مجھے زندہ کیسے چھوڑا؟ زندہ کیوں چھوڑا؟ ہو سکتا ہے وہ مجھے مارنا نہ چاہتی ہو۔ لیکن اگر بدروح روپا مجھے ہلاک نہیں کرنا چاہتی تھی تو پھر مجھ سے کیا چاہتی تھی؟ میں نے یہ سوچ کر اپنے ذہن سے بدروح روپا کا خیال جھٹک دیا کہ یہ کوئی بھوت پریت قسم کی مخلوق تھی جو اب دفع ہو گئی ہے۔ میں تہہ خانے سے نکل کر کوٹھڑی میں آیا تو بارش رک چکی تھی۔ بادل اسی طرح جھکے ہوئے تھے۔ دن کی روشنی سے میں نے اندازہ لگایا کہ دن کافی گزر چکا ہے۔ میں اللہ کا نام لے کر مسجد کی طرف چل پڑا۔ مسجد میں آ کر میں نے وضو کر کے مزید دو نفل ادا کئے اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ مجھے احساس تھا کہ میں سیدھی راہ سے بھٹک گیا تھا۔ خدا کے حضور توبہ استغفار کرنے سے میرے دل کا بوجھ

ہلکا ہو گیا۔ میں کسی غیبی اشارے کے انتظار میں ایک بار پھر مسجد کے برآمدے میں ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

کافی دیر بیٹھا رہا۔ وہاں کوئی نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ اب اپنی ہمت سے کام لینا چاہئے۔ چنانچہ میں نے خدا کے حضور دو بار دعا مانگی اور مسجد سے باہر آ گیا۔ اب میں شمال مشرق کی طرف چلنے لگا۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق چاردھا رجواڑے کی سرحد وہیں سے شروع ہوتی تھی۔ چلتے چلتے گھنا جنگل ختم ہو گیا اور کھیت شروع ہو گئے۔ کھیتوں میں ایک دو آدمی اور عورتیں کام کرتی نظر آئیں۔ مجھے گنگولی نام کے پجاری کی تلاش تھی جو عائشہ کو لے کر اسی رجواڑے میں آیا تھا۔ اس کا سراغ مجھے کسی مندر سے ہی مل سکتا تھا۔ میں کھیتوں میں کام کرتے ایک کسان کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ یہاں کوئی مندر وغیرہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اپنی زبان میں بتایا کہ آگے رجواڑے کا بڑا شہر ہے وہاں مندر بھی ہے دھرم شالہ بھی ہے۔ میں اس سے پورا راستہ سمجھ کر آگے روانہ ہو گیا۔ موسلا دھار بارشوں نے علاقے کے تال تلیا سب بھر دیئے تھے۔ ندیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ مگر علاقہ پہاڑی ہونے کی وجہ سے راستوں میں پانی کہیں نہیں جمع ہوا تھا۔ یہ اس قسم کا پہاڑی علاقہ بھی نہیں تھا کہ بہت زیادہ اترائیاں چڑھائیاں ہوں۔ چھوٹے چھوٹے نشیب و فراز ضرور تھے۔ کہیں کھلی جگہ اور کھیت آ جاتے تھے۔ دن کی روشنی شام کے دھندلکے میں بدل رہی تھی۔ چلتے چلتے میں ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ بانس اور گھاس پھوس کی جھونپڑیوں والا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دو دیہاتی عورتیں ناریل کی چھال کی رسی بٹ رہی تھیں۔ میں نے ان سے شہر کے بارے میں پوچھا۔ وہ ہنسنے لگیں اور ایک طرف اشارہ کر دیا۔ میں ادھر کو چل پڑا۔

دور سے مجھے کسی شہر کی فصیل نظر آنے لگی۔ پہلے تو میں انہیں درختوں کی قطار سمجھا مگر قریب جانے پر معلوم ہوا کہ وہ شہر کی پرانی فصیل ہے۔ فصیل اونچے ٹیلے پر تھی مگر شہر اس کے دامن میں اور کچھ پہاڑی ڈھلان پر آباد تھا۔ یہ کوئی بڑا شہر نہیں

تھا۔ بڑا قصبہ تھا۔ ایک ندی شہر کے قریب سے ہو کر گزرتی تھی۔ ندی کے کنارے ایک مندر تھا جس کا آدھا چبوترہ خشکی پر تھا اور آدھا ندی کے پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ قریب ہی سرخ کھپریل کی ڈھلواں چھتوں والے کچھ کوارٹر تھے۔ اس علاقے کے ہندو مرد اور عورتیں مندر کی طرف جاتی نظر آ رہی تھیں۔ میں اس شہر یا قصبے کے بازاروں میں گھومنے پھرنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ میں ساری آبادی میں گھوم گیا۔ مجھے کہیں کوئی مسجد نظر نہ آئی۔ میرا خیال تھا کہ یہاں اگر کوئی مسجد ہو تو میں اس مسجد کے پیش امام صاحب سے مل کر اس سے مدد مانگوں مگر وہاں کوئی مسجد ہی نہیں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ قصبے میں ہندوؤں کی اکثریت ہے یا شاید وہاں کوئی مسلمان ہی نہیں رہتا۔ شام ہو رہی تھی۔ مجھے رات گزارنے کی بھی فکر تھی۔ میں قصبے کے مندر کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے ایک دکان کے اندر سے ہلکا ہلکا دھواں نکلتا نظر آیا۔ قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک کالا کلوٹا سا آدمی بڑی سی انگیٹھی جلا کر بیٹھا ہے۔ انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ اوپر سلور کا کالا سیاہ دیگچہ رکھا ہوا تھا۔ دکان کے آگے زمین پر تین چار دیہاتی قسم کے لوگ آمنے سامنے بیٹھے کیلے کے پتوں پر چاول اور بھاجی ڈالے کھا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ قصبے کا ہوٹل ہے۔ دکان چھوٹی سی تھی۔ اندر دھواں بھرا ہوا تھا۔ مجھے بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ میرے پاس پیسے تھے۔ میں نے بھی کیلے کے پتے پر چاول اور بھاجی لی اور ایک طرف زمین پر بیٹھ گیا۔ میری بش شرٹ اور پتلون سے صاف لگ رہا تھا کہ میں شہر کا رہنے والا ہوں۔ ایک دو آدمیوں نے مجھے غور سے دیکھا پھر اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ ان کی زبان تامل تلیگو نہیں تھی وہ ٹھیٹ دیہاتی ہندی بول رہے تھے جس میں مراٹھی اور گجراتی الفاظ کی آمیزش تھی۔ مراٹھی اور گجراتی زبان کے لفظ میں پہچان لیتا تھا۔

ایک بوڑھا دیہاتی میرے قریب ہی بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں شہر سے آیا ہوں؟ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے ایک شکاری دوست سے ملنے آیا تھا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ بھوپال چلا گیا ہے۔ اب میں بھی بھوپال واپس چلا جاؤں

گا۔ بوڑھا تجربہ کار تھا۔ کہنے لگا بابو تمہاری زبان بھوپال والوں کی نہیں ہے۔ میں نے کہا۔

"میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ بھوپال میں چھٹیاں گزارنے اپنے تایا کے گھر آیا ہوا ہوں۔ کیا تم مسلمان ہو؟"

"ہاں"

بوڑھا اپنے کرتے سے ہاتھ صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک پوٹلی کھول کر اس میں سے بیڑی نکال کر سلگائی اور بولا۔

"رات ہو رہی ہے۔ دیوگڑھ نہیں پہنچ سکو گے راستے میں جنگل پڑتا ہے۔ رات کہاں گزارو گے؟"

میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ بوڑھا مجھے رات گزارنے کا کوئی ٹھکانہ بتا دے میں نے کہا۔

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔ یہاں کوئی دھرم شالہ بھی نہیں ہے۔"

بوڑھے نے کش لگا کر کھانستے ہوئے کہا۔

"مندر کی دھرم شالہ تو ہے۔ مگر وہاں کوئی مسلمان نہیں ٹھہر سکتا۔ ایسا کرو اسی دکان میں رات کو پڑ کر سو رہو۔ میں دکاندار سے کہے دیتا ہوں۔"

دکان کے اندر جو دھواں بھرا ہوا تھا میں اس کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ دوسرے میں نے دھرم شالہ کا سن کر اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں دھرم شالہ میں ہندو بن کر رات گزار لوں گا۔ رام دلاری کے کہنے پر میں ہندو بن کر پہلے بھی اداکاری کر چکا تھا اور مجھے اس کا تجربہ ہو گیا ہوا تھا۔ میں نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور کھانا کھانے کے بعد ہوٹل والے کو پیسے دے کر آگے چل دیا۔ مندر بازار کی نکڑ پر ندی کنارے واقع تھا۔ چھوٹا سا مندر تھا۔ میں نے اپنا ہندوانہ نام جگدیش سوچ لیا تھا۔ مندر میں مجھے ایک پجاری مل گیا جس نے مجھے مہنت کے پاس پہنچا دیا۔ مہنت دھوتی پہنے چارپائی پر بیٹھا کھرل میں کچھ گھوٹ رہا تھا۔ سوائے میلی سی دھوتی کے اس کے جسم پر اور کچھ

نہیں تھا۔ ماتھے پر تین سفید لکیریں پڑی تھیں۔ میں نے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کہا کہ میں بھوپال سے ایک دوست کی تلاش میں یہاں آیا تھا وہ نہیں ملا۔ رات دھرم شالہ میں گزار کر صبح واپس بھوپال جانے کا ارادہ ہے۔ مہنت نے ایک بار بھی میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ جب میں بات ختم کر چکا تو کھرل کو چارپائی کے نیچے رکھتے ہوئے مجھ سے نام پوچھا۔ میں نے اپنا نام جگدیش بتایا۔

"ویشنو ہو؟"

مہنت کے اس سوال پر میں تذبذب میں پڑ گیا۔ لیکن زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کہہ دیا۔ ہاں جی ویشنو ہوں۔ اس نے میرے ساتھ آئے ہوئے پجاری سے کہا۔

"مرلی اسے دھرم شالہ کے ورانڈے میں کھٹیا ڈال دو۔"

کوارٹر نما دھرم شالہ ساتھ ہی احاطے میں ایک طرف تھی۔ برآمدے میں ایک بانس کی چارپائی ڈال دی گئی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ مندر میں ایک بلب جل رہا تھا۔ پوجا کرنے والی ایک عورت باہر نکل رہی تھی۔ اس کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ مچھر تنگ کر رہے تھے۔ کچھ میرا ذہن خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ جس مقصد کو لے کر میں آیا تھا اس کی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ابھی تک پجاری گنگولی کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ یہی وہ آدمی تھا جو عائشہ کو بمبئی سے لے کر چاردھا کے رجواڑے میں آیا تھا۔ صورت حال نے کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی تھی۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ صبح اس مندر کے کسی پجاری سے باتوں ہی باتوں میں گنگولی پجاری کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہت ممکن ہے کہ یہاں سے مجھے اس کا کوئی کھوج مل جائے۔

برآمدے میں جس دیوار کے ساتھ میری چارپائی بچھی تھی اس دیوار میں ایک کھڑکی بھی تھی جس پر سلاخیں لگی تھیں اور جو بند تھی۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔

ندی کی جانب سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی جو بڑی خوشگوار تھی۔ مجھے نیند آنے لگی ایک پل کے لئے آنکھ لگی تو مچھروں نے جگا دیا۔ مگر نیند کا غلبہ شدید تھا۔ مچھر کا رہے اور میں سو گیا۔ مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ اچانک کھڑاک سا ہوا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے لیٹے لیٹے نیم وا آنکھوں سے برآمدے میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی میں دو آدمیوں کو دیکھا جو ایک صندوق کو گھسیٹتے ہوئے کوٹھڑی کے دروازے کی طرف رہے تھے۔ یہ وہی کوٹھڑی تھی جس کی کھڑکی میری چارپائی کے اوپر کھلتی تھی۔ میں نے ان دونوں آدمیوں کو پہچان لیا۔ ان میں ایک مندر کا مہنت تھا اور دوسرا وہ پجاری تھا مجھے مہنت کے پاس لے گیا تھا۔ میں ان لوگوں کا کوئی مہمان تو تھا نہیں کہ وہ خیال رکھتے کہ شور سے میری آنکھ نہ کھل جائے۔ وہ صندوق کو گھسیٹتے ہوئے کوٹھڑی کے اندر لے گئے۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر مچھروں نے حملہ کر دیا۔ میں اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ندی کی طرف سے جھینگروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان آدمیوں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ کوٹھڑی کے اندر سے ان کے باتیں کرنے کی آواز با کھڑکی کے پیچھے سے مجھے دھیمی مگر صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ آپس میں کسی بات جھگڑ رہے تھے۔ مہنت کی آواز میں نے پہچان لی - وہ پجاری سے کہہ رہا تھا۔

"ماتا رام سے کہہ دینا۔ اب میں اس کا مال مندر میں نہیں چھپاؤں گا۔ کیا دیا اس نے مجھے؟ وہ تمہارا گنگولی تھا۔ میں نے دو دن اسے اپنے پاس رکھا۔ سالا جاتی دفعہ لڑکی کو بھی ساتھ لے گیا۔"

پجاری کی آواز آئی۔

"گورو دیو مجھے کیا معلوم تھا کہ گنگولی کے دل میں کھوٹ ہے۔"

مہنت نے گنگولی کو گالی دے کر کہا۔

"لڑکی کو اس نے بیروگڑھ کے پٹیل کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔ چار ہزار میں بیچا ہے اس نے۔ میں تو کہتا ہوں کہ کسی طرح لڑکی کو پٹیل کے گھر سے نکال کر لے آؤں۔ دیوگڑھ کا رائے صاحب مجھے اسی لڑکی کے پانچ ہزار آسانی سے دے

دے گا۔ مسلمان لڑکی کا بھاؤ زیادہ لگتا ہے۔"

پھر وہ پجاری کو گالیاں دیتا کوٹھڑی کے باہر آ گیا۔ میں ان کے باہر نکلنے سے پہلے چارپائی پر لیٹ گیا تھا مگر میں نے آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھول رکھی تھیں۔ مہنت آگے آگے تھا۔ پجاری پیچھے پیچھے - دونوں برآمدے میں سے گزر کر مندر کی طرف چلے گئے۔ میں قدرت کی شان پر حیران رہ گیا۔ مجھے برآمدے میں چارپائی پر لیٹے لیٹے عائشہ کا سراغ مل گیا تھا۔ اسے گنگولی نے بیروگڑھ کے کسی پٹیل کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ گجرات کاٹھیاواڑ کے صوبے میں پٹیل دولت مند زمیندار کو کہتے ہیں۔ بیروگڑھ کا یہ پٹیل ضرور کاٹھیاواڑ کے صوبے سے مدھیہ پردیش میں آ کر آباد ہو گیا ہو گا۔ صبح اٹھتے ہی میں اسی پائے کی چھوٹی سی دکان پر ناشتہ کرنے چلا گیا۔ مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ بیروگڑھ وہاں سے کتنی دور ہے اور کس طرف ہے۔ یہ معلومات مجھے بغیر کسی دقت کے حاصل ہو گئیں۔ بیروگڑھ وہاں سے مشرق کی جانب کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ تھا جہاں گجانند نام کا ایک ہندو کاٹھیاواڑی سیٹھ قصبے کا سب سے امیر زمیندار تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگوں کو سود پر رقم بھی دیتا ہے اور ساہوکار بھی ہے۔ بیروگڑھ تک وہاں سے بیل گاڑیاں جاتی تھیں۔ میں بھی سواریوں والی ایک بیل گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گاڑی کے آگے دو مریل سے بیل جتے ہوئے تھے جو نپی تلی چال کے ساتھ جھاڑیوں درختوں میں گھرے ہوئے کچے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ جنگل کی خاموشی میں ان کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ پندرہ میل کا فاصلہ بیل گاڑی نے دو تین گھنٹوں میں طے کیا۔ راستے میں ایک جگہ گاڑی بان پان بیڑی پینے کے لئے بھی رک گیا تھا۔ بیل گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایک کسان سے میں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ گجانند پٹیل کا مکان قصبے کے کونے میں تالاب کے کنارے واقع ہے اور پکا مکان ہے۔ اس کی دکان قصبے کے ساہوکارہ بازار میں ہے جو قصبے کا ایک ہی بازار ہے۔ میں بیروگڑھ پہنچا تو دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔ موسم ابر

آلود تھا۔ بارش صبح سے بند تھی۔ بیروگڑھ کا قصبہ گاؤں سے ذرا بڑا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے پٹیل کی دکان کا پتہ معلوم کیا اور قصبے کے ساہوکارہ بازار میں آ گیا۔ گجانند پٹیل ادھیڑ عمر کا پلپلا سا ہندو تھا۔ توند باہر نکلی ہوئی تھی۔ دھوتی بنیان پہنے' ماتھے پر تلک لگائے وہ دکان میں بیٹھا کسی عورت کا بہی کھاتے پر انگوٹھا لگوا رہا تھا۔

میں نے اس سود خور پٹیل کو دکان پر ہی چھوڑا اور سیدھا اس کے گھر کی تلاش میں قصبے کے تالاب کی طرف چل دیا۔ قصبے کے باہر ایک ہی تالاب تھا جس کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ عورتیں سیڑھیوں پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ تالاب کے پاس ہی ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا۔ جس کے کلس پر زرد رنگ کا جھنڈا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے اس سے گجانند پٹیل کے گھر کا پتہ پوچھا تو اس نے لاٹھی سے تالاب کے مشرقی کونے والے پکے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ یہ وہی مکان تھا جس کے بارے میں مجھے پہلے بھی بتایا گیا تھا کہ تالاب کے کونے والا پکا مکان پٹیل کا ہے۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ پٹیل خود گھر پر نہیں ہے۔ دکان پر ہے۔ مگر گھر پر اس کی بیوی بچے' نوکر چاکر ضرور ہوں گے۔ عائشہ بھی ضرور وہیں ہو گی۔ ان سب کے سامنے میں نہ تو عائشہ سے کوئی بات کر سکتا تھا نہ اسے بھگا کر لے جا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ عائشہ مجھے دیکھتے ہی فرط جذبات سے پکار اٹھے۔ بھیا مجھے یہاں سے نکالو۔ اور پٹیل کے آدمی مجھے بھی پکڑ لیں۔ اس کے لئے کسی منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ سب سے پہلے تو مجھے اس بات کا علم ہو جانا چاہئے کہ عائشہ پٹیل کے گھر میں ہی ہے۔ اس کے بعد اسے وہاں سے نکال لے جانے کی ترکیب سوچی جائے۔

اس علاقے میں قصبوں دیہاتوں کے مکان کشادہ ہوتے ہیں اور ہندوؤں کے مکانوں کے دروازے عام طور پر کھلے ہی ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں بے پردگی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ان کی عورتیں تالابوں میں مردوں کے سامنے بھی کپڑے اتار کر اشنان کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ بلکہ ہندوؤں کے بعض فرقوں کا خیال ہے کہ عورت کے عریاں بدن پر غیر مرد کی نگاہ پڑ جانے سے عورت کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ یہ باتیں میں

خاص طور پر پاکستان کی نئی نسل کے نوجوانوں کے لئے لکھ رہا ہوں جو ہندو تہذیب کے ان پہلوؤں سے ناواقف ہیں۔ پٹیل قصبے کا امیر آدمی تھا۔ اس کے مکان کے گرد تین چار فٹ کی پکی چار دیواری تھی مگر دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ کچا صحن صاف نظر آ رہا تھا۔ صحن کی ایک جانب گائے بندھی ہوئی تھی۔ برآمدے میں چارپائی بچھی تھی۔ وہاں کوئی آدمی یا عورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں مکان کے سامنے کچھ فاصلے پر نیم کے پیڑ کے پیچھے کھڑا مکان کو دیکھ رہا تھا۔ ایک عورت گیلے کپڑے لے کر آئی اور صحن کی رسی پر ڈالنے لگی۔ وہ عائشہ نہیں تھی۔ اتنے میں ایک دبلا پتلا سا لڑکا گھوڑے کی باگ تھامے سڑک پر چلتا ہوا آیا اور گھوڑے سمیت مکان کے صحن میں داخل ہو گیا۔ یہ ضرور پٹیل کا بیٹا ہو گا۔ میں نے سوچا۔ ایک بوڑھا دیہاتی مجھے گھورتا ہوا گزر گیا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ میں درخت کے پیچھے چھپ کر پٹیل کے مکان میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میں جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا اور بازار میں دوسری طرف نکل گیا۔ آگے کھیت آ گئے۔ کھیت میں ایک کنواں بھی تھا جہاں سے عورتیں پیتل کے مٹکوں میں پانی بھر رہی تھیں۔ میں الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ کھیت کے کنارے کنارے ایک طرف چل پڑا۔ اگر میں بے دھڑک پٹیل کے گھر میں داخل ہو کر شور مچا دوں کہ پٹیل مری بہن کو اغوا کر کے لے آیا ہے تو کوئی میری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ پٹیل اثر رسوخ والا آدمی ہے وہ تو الٹا مجھے پولیس کے ذریعے حوالات میں بند کرا دے گا۔ چلتے چلتے کھیت ختم ہوا تو آگے ایک گہری کھڈ آ گئی۔ میں دائیں طرف مڑ گیا۔ یہاں ایک درخت کے نیچے کسی کا مزار سا بنا ہوا نظر آیا۔ قبر پر گوٹے کی جھالریں پڑی تھیں۔ قبر کے اوپر بھی گوٹے کی جھالریں درخت کی شاخوں سے لٹک رہی تھیں۔ پاس ہی ایک چھوٹی سی جھونپڑی کے باہر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ ہندوؤں کے گڑھ میں کسی مسلمان کے مزار کو دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے بوڑھے کو جا کر سلام کیا۔ اس نے ناریل منہ سے ہٹا کر وعلیکم السلام کہا۔ میں اس کے پاس بڑے ادب سے بیٹھ گیا اور پوچھا۔ یہ کس بزرگ کا مزار ہے۔ بوڑھے نے ان بزرگ کا نام بتایا اور مجھ سے پوچھا۔

"تم اجنبی دکھائی دیتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو برخوردار؟"

بوڑھے کی اردو بڑی صاف تھی۔ میں نے وہی کہانی دہرا دی کہ اپنے ایک شکاری دوست سے ملنے آیا تھا۔ یہاں آ کر پتہ چلا کہ وہ یہاں سے جا چکا ہے۔

"کھانا کھایا تم نے؟"

"جی ہاں۔۔۔ بازار سے کھا لیا تھا۔"

بوڑھے نے ناریل کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"ہندوؤں کا جھٹکا کھایا ہو گا۔ اسلام میں جھٹکا گوشت حرام ہے۔"

میں نے فوراً کہا۔

"جی نہیں۔ میں نے سبزی کھائی تھی۔"

بوڑھے نے کہا۔

"واپس چاردھا جانا ہے تو ابھی چلے جاؤ پھر بیل گاڑی نہیں ملے گی۔"

میں نے اس مسلمان بوڑھے سے جان بوجھ کر ہندو مندروں کے پجاریوں کی مسلم دشمنی کی باتیں شروع کر دیں۔ بوڑھا کہنے لگا۔

"برخوردار! اس قصبے بیروگڑھ میں صرف میں ہی ایک مسلمان ہوں۔ اپنے بزرگوں کے مزار پر ان کی امانت لئے بیٹھا ہوں۔ ہندو یہاں بھی مجھے طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ ساتھ والے گاؤں سے مسلمان نذرانے چڑھانے آتے ہیں تو ہندو انہیں بھگا دیتے ہیں۔"

جب مجھے پوری طرح سے تسلی ہو گئی کہ بڑے میاں پر اعتبار کیا جا سکتا ہے تو میں نے اصل کہانی کھول کر بیان کر دی۔ بوڑھے نے ناریل جھونپڑی کے بانس کے ساتھ لگا دیا اور اپنا جھریوں بھرا چہرہ میری طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم بڑا نیک کام کرو گے۔ پٹیل بڑا بدمعاش بدکار ہے۔ میں اگر جوان ہوتا تو ابھی اسے جا کر قتل کر ڈالتا۔"

میں نے کہا۔

"بابا جان! کوئی ایسی ترکیب کریں کہ اگر عائشہ نام کی لڑکی پٹیل کے گھر میں ہے تو اسے یہ خبر ہو جائے کہ میں اسے لینے یہاں آ گیا ہوں۔"

بڑے میاں بولے۔

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ پٹیل کے گھر میں جو گھاٹن عورت کپڑے وغیرہ دھونے کا کام کرتی ہے وہ ہے تو ہندنی مگر میری بڑی مریدنی ہے۔ میں اس سے جاسوسی کرواتا ہوں۔ اس کا بیٹا پیچھے کھیتوں میں کام کرتا ہو گا۔ میں اسے بھیج کر اس کی ماں کو بھی بلوا لیتا ہوں۔ تم یہاں بیٹھو۔ ہاں میں گھاٹن کے ساتھ واپس آؤں تو تم مزار کے پیچھے چھپ جانا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں یہاں دیکھے۔"

یہ کہہ کر بڑے میاں اٹھ کر جھونپڑی کے پیچھے کھیتوں کی طرف چل دیئے۔ میں مزار سے ہٹ کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ یہاں سے مجھے وہ کھیتوں میں جاتے نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں میں فصل کاٹی جا رہی تھی۔ ایک جگہ دو تین کسان کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکا بڑے میاں کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ پھر بڑے میاں اس لڑکے کو ساتھ لئے گاؤں کی طرف چل دیئے۔ میں وہیں درخت کی اوٹ میں بیٹھا رہا۔ جب بور ہو گیا تو اٹھ کر درختوں کے پیچھے آ گیا۔ یہاں چھوٹا سا تالاب تھا جس میں جھاڑ جھنکاڑ پڑا تھا۔ پتھر کی سیڑھیاں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ میں سیڑھیوں میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کہاں میں پنجاب سے نکل کر بمبئی سیر کرنے آ رہا تھا اور حالات مجھے کہاں سے کہاں لے آئے ہیں۔ لیکن میں ایڈونچر ضرور محسوس کر رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو میری نوجوانی کی عمر تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے بھی میں برما اور لنکا کے جنگلوں میں گھوم پھر چکا تھا۔

اچانک مجھے وہی سیندور کی بو محسوس ہوئی جو پہلی بار مندر والی کوٹھڑی میں بارش کی رات کو آئی تھی۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ یہ کسی جنگلی جڑی بوٹی کی بو ہو گی۔ لیکن جب بو تیز ہوتی گئی تو میں گھبرا کر تالاب کی سیڑھیوں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے ہی میں پلٹ کر واپس مزار کی طرف جانے لگا ایک پھنکار کی آواز آئی اور میں نے اپنے سامنے جو کچھ دیکھا اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

مجھ سے کوئی چار قدم کے فاصلے پر ایک کالا سیاہ ناگ پھن اٹھائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

خوف سے مجھے پسینہ آ گیا۔ کالا ناگ بار بار منہ سے سرخ دو شاخہ زبان باہر نکال رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف کھسکتا چلا آ رہا تھا۔ درخت پر بیٹھا ہوا کوئی پرندہ اچانک شور مچاتا ہوا پھڑپھڑا کر اڑا۔ سانپ نے جلدی سے پھن سمیٹا اور جھاڑیوں میں گھس گیا۔ میں اس قدر خوف زدہ ہو گیا ہوا تھا کہ تھوڑی دیر تک وہیں بت بنا کھڑا رہا۔ پھر دوڑ کر مزار کی طرف آ گیا۔ مجھے کھیتوں کی طرف سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ مزار کا بزرگ ایک آدمی سے باتیں کرتا مزار کی طرف چلا آ رہا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہ آدمی جس سے بڑے میاں باتیں کر رہے تھے تالاب کے پاس آ کر ان سے جدا ہو گیا۔ اب بڑے میاں اکیلے چلے آ رہے تھے۔ میں پھر بھی درخت کی اوٹ سے باہر نہ نکلا۔ جھونپڑی کے پاس آ کر انہوں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی اور مجھے آواز دی۔ میں درخت کی اوٹ سے نکل کر ان کے پاس آ گیا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ۔"

میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔ میں ان کی زبان سے یہ خوش خبری سننے کو بے تاب

تھا کہ عائشہ پٹیل کے گھر پر ہی ہے۔ بڑے میاں نے تھیلی میں سے بیڑی نکال کر سلگائی اور کہنے لگے۔

"ایک بات کا تو ثبوت مل گیا ہے کہ مسلمان لڑکی پٹیل کے پاس ہی ہے مگر وہ اس کے گھر میں نہیں ہے۔ میں پٹیل کے گھر سے گھاٹن مریدنی کو باہر بلا کر ایک طرف لے گیا تھا۔ میں نے اس سے ساری باتیں معلوم کر لی ہیں۔ لڑکی کا نام عائشہ ہی ہے۔ مگر وہ پٹیل کے گھر میں نہیں ہے۔"

"پھر کہاں ہے؟" میں نے ناامید ہو کر پوچھا۔

بڑے میاں کہنے لگے۔

"یہ بات میری مریدنی یعنی گھاٹن کو بھی معلوم نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پٹیل نے اسے کسی جگہ رکھا ہوا ہے۔ وہ کسی روز گھر سے شہر جاتا ہے اور دوسرے دن واپس آتا ہے۔ ضرور وہ وہیں جاتا ہے جہاں اس نے لڑکی کو چھپایا ہوا ہے۔"

میں نے مایوس ہو کر سر جھکا لیا۔ بڑے میاں کہنے لگے۔

"تم فکر کیوں کرتے ہو۔ میری مریدنی بڑی ہوشیار گھاٹن ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پٹیل کی دکان پر اس کا ایک خاص ملازم ہے اس ملازم کو سارا معلوم ہے کہ لڑکی کو پٹیل نے کہاں رکھا ہے۔ گھاٹن نے کہا ہے کہ وہ اس ملازم سے یہ راز معلوم کر کے آج رات کو مزار پر آئے گی۔"

تھوڑی دیر بعد شام ہو گئی۔ بادلوں کی وجہ سے جلدی اندھیرا ہو گیا۔ مزار پر بڑے میاں نے چراغ جلا دیئے۔ جھونپڑی میں بھی لالٹین روشن ہو گئی۔ خدا جانے کہاں سے ایک آدمی کھانا لے کر آ گیا۔ میں نے اور بڑے میاں نے جھونپڑی کے باہر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ جھونپڑی کے اندر بانس کی چارپائی پر بڑے میاں کا میلا سا بستر پہلے سے لگا ہوا تھا۔ انہوں نے بستر میں سے ایک دری نکال کر فرش پر بچھا دی اور ایک چادر تکیہ دے کر کہا۔

"میاں تم یہاں سو جاؤ۔"

میں نے پوچھا۔

"گھاٹن کس وقت آئے گی؟"

مجھے اسی کی فکر لگی تھی۔ بڑے میاں نے کہا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اگر اس نے پٹیل کے ملازم سے راز اگلوا لیا تو آ جائے گی نہیں تو بات کل پر جا پڑے گی۔"

میں سخت مایوسی کے عالم میں دری پر گھٹنے بانہوں میں لے کر بیٹھ گیا۔ بڑے میاں اٹھ کر مزار کی طرف چلے گئے۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ گھاٹن نہیں آئے گی۔ پٹیل کا ملازم اسے کبھی یہ راز نہیں بتائے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ گھاٹن کے ساتھ پٹیل کے ملازم کے ایسے مراسم ہیں کہ وہ اس کے آگے انکار کر ہی نہیں سکتا۔

رات کو ہوا بند تھی۔ حبس سا ہو رہا تھا۔ بادلوں نے ایک گھٹن سی پیدا کر دی تھی۔ مچھر بہت تنگ کر رہے تھے۔ بڑے میاں نے جھونپڑی کے باہر دھونی لگا دی۔ اس سے مچھروں کی طرف سے تھوڑا آرام ہو گیا۔ میں کچھ دیر مزار کے پاس یونہی بیٹھا رہا۔ بڑے میاں بھی وہیں بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے۔ جب بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگا تو اٹھ کر جھونپڑی کے اندر چلا آیا۔ جھونپڑی میں بڑا حبس تھا۔ مگر میں کیا کرتا۔ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ گھاٹن کا انتظار تھا۔ مگر اس کے آنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ آخر میں نے دل میں یہی سوچ لیا کہ صبح اٹھ کر پٹیل کے ملازم کا سراغ لگاؤں گا اور خود ہی اس سے یہ راز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ پٹیل نے عائشہ کو کہاں چھپایا ہوا ہے۔

لیٹے لیٹے کبھی مجھ پر غنودگی سی طاری ہو جاتی اور کبھی کوئی مچھر کاٹتا تو میں بیدار ہو جاتا۔ جانے کتنی رات گزر چکی تھی۔ بڑے میاں ابھی تک باہر مزار پر ہی تھے۔ باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیروگڑھ گاؤں کی طرف سے کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آ جاتی تھی۔ اتنے میں مجھے باتیں کرنے کی مدھم سی آواز آئی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ جھونپڑی میں لالٹین جل رہی تھی۔ باتیں کرنے کی آواز جھونپڑی کے قریب

آئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بڑے میاں کسی عورت سے باتیں کر رہے تھے۔ عورت کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ میں جھونپڑی سے باہر جانے کے لئے اٹھ ہی رہا تھا کہ بڑے میاں ایک عورت کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہوئے - ان کے ساتھ ایک گہرے سانولے رنگ کی موٹی تازی عورت تھی جس نے لال باڈر والی کالی ساڑھی اس طرح پہن رکھی تھی کہ ساڑھی کا ایک پلو لنگوٹ کی طرح پیچھے کمر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ یہ مہاراشٹر کی دیہاتی مراٹھی عورتوں کا خاص پہناوا ہے۔ اس قسم کی ساڑھیوں والی مراٹھی گھاٹنیں بمبئی کی لوکل ریل گاڑیوں میں موسمیاں اور کیلے وغیرہ بیچتی بھی نظر آ جاتی ہیں۔ یہ پٹیل کے گھر میں کام کرنے والی گھاٹن تھی۔ اس کے کانوں میں بالیاں تھیں اور ناک میں بڑا سا لونگ پہنا ہوا تھا جس کا شیشہ لالٹین کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

بڑے میاں کی یہ گھاٹن مریدنی عائشہ کے بارے میں پوری معلومات لے کر آئی تھی۔ اسے پٹیل کے ملازم سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ اس بدمعاش پٹیل نے عائشہ کو واقعی گنگولی پجاری سے خریدا تھا اور بیروگڑھ گاؤں سے شمال کی جانب وہاں سے تیس میل دور نانده کے دشوار گزار گھنے جنگل میں چھپا رکھا تھا جہاں پٹیل کے کوئلے کے بھٹے تھے۔ ان بھٹوں میں لکڑی جلا کر کچا کوئلہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ اس کا لاکھوں کا کاروبار تھا اور وہ مدھیہ پردیش کے شہروں میں کوئلہ سپلائی کرتا تھا۔ جنگل میں ایک جگہ رکھوالی ندی کے کنارے پٹیل نے اپنے لئے ایک پکی چار دیواری والی کوٹھڑی بنوا رکھی تھی۔ پٹیل مہینے میں دو ایک بار جنگل میں اپنے بھٹوں پر آتا تو اسی کوٹھڑی میں قیام کرتا۔ گھاٹن نے بتایا کہ پٹیل نے عائشہ کو وہیں رکھا ہوا ہے اور پٹیل کی عدم موجودگی میں اس کے ہٹے کٹے جرائم پیشہ ملازم لڑکی کی رکھوالی کرتے ہیں اور ان کے پاس بندوقیں بھی ہوتی ہیں۔ جب گھاٹن ساری باتیں بیان کر چکی تو بڑے میاں نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"برخوردار! تمہیں سارے حالات کا علم ہو گیا ہے اب بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے۔

میں تو تمہیں مشورہ دوں گا کہ جلدی میں قدم نہ اٹھاؤ۔ تم اکیلے اس لڑکی کو وہاں سے نکال کر نہیں لے جا سکتے۔"

میں نے کہا۔

"جناب میں تو اکیلا ہی ہوں۔ مجھے کہیں سے کسی کی مدد ملنے کی بھی امید نہیں ہے۔ یہ کام تو مجھے اکیلے ہی کرنا پڑے گا۔ باقی اللہ مالک ہے۔"

گھاٹن بھی بیڑی پی رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"سیٹھ ابھی پرسوں ہی جنگل کے بھٹوں کا پھیرا لگا کر واپس آیا ہے۔ اب وہ تین چار دن بعد دوبارہ جائے گا۔ جب وہ وہاں ہوتا ہے تو اس کے بدمعاش ملازم بندوقیں لئے سوروں کی طرح کوٹھڑی کے آس پاس جنگل میں پہرے پر ہوتے ہیں۔ اب وہ وہاں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں لڑکی کو نکال لے جانے کا موقع مل جائے مگر تم اکیلے اتنے گھنے جنگل میں کیسے جاؤ گے؟ رات کو سنا ہے وہاں شیر آ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اللہ مالک ہے۔"

گھاٹن نے بزرگ بڑے میاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بابا! اب میں جاتی ہوں۔ میں نے آپ کا حکم پورا کر دیا ہے۔ میرے لئے اپنے بھگوان سے پرارتھنا ضرور کرنا۔ میرا مالک روز تاڑی پی کر آتا ہے اور مجھے بڑا مارتا ہے۔۔۔"

گھاٹن نے بیڑی کا گہرا کش لگا کر اس کا دھواں اپنے نتھنوں سے نکالتے ہوئے مجھے ایک بار پھر جنگل میں پٹیل کے بھٹوں کا سارا نقشہ اچھی طرح سمجھایا اور یہ بھی بتایا کہ بیروگڑھ سے مجھے کس طرف جانا ہو گا اور پھر نانده کا جنگل شمال میں تیس میل کے فاصلے پر کس جگہ سے شروع ہوتا ہے۔ میں نے اس کی ساری باتیں ذہن میں اچھی طرح سے بٹھالیں۔ جب وہ بڑے میاں کے گھٹنوں پر ہندوؤں کی طرح اپنا ماتھا ٹیک کر چلی گئی تو انہوں نے نئی بیڑی سلگائی اور مجھ سے پوچھا۔

"بتاؤ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

میں نے کہا۔ "میاں جی! میں تو عائشہ کو بدمعاشوں سے چھڑانے اور اس کے ماں پ کے پاس واپس لانے کا ارادہ بنا کر بمبئی سے نکلا ہوں میں اپنے ارادے پر قائم ں۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

بڑے میاں پر میرے پختہ عزم کا بہت اثر ہوا۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر میری رف دیکھ کر کہا۔

"برخوردار! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ مجھے یقین ہے تم انشاء اللہ اپنے نصد میں ضرور کامیاب ہو گے۔ اب سو جاؤ۔ صبح صبح بیروگڑھ سے نانده کی طرف بیل ڑیاں جاتی ہیں۔ میں تمہیں جگا دوں گا۔"

میں وہیں دری پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ یقت یہ ہے کہ میرے وسائل کچھ بھی نہیں تھے۔ بس صرف ایک اللہ کا بھروسہ تھا ر اسی مالک کے بھروسے پر میں ایک مسلمان لڑکی کو کافروں سے چھڑانے کے لئے ئ سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ میرے پاس صرف ایک چاقو تھا جس سے میں جھاڑیاں اور ختوں کی بڑھی ہوئی شاخیں ہی کاٹ سکتا تھا۔ تھری ناٹ تھری کی رائفل چلانی مجھے م دلاری نے جنگل میں ٹھاکر ڈاکو کے ڈیرے پر سکھا دی تھی۔ مگر میرے پاس کوئی ئفل بھی نہیں تھی۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں انہی خیالوں میں الجھا رہا۔ پھر مجھے ر آ گئی۔

جاگ اس وقت کھلی جب بڑے میاں مجھے شانے سے ہلاتے ہوئے کہہ رہے ے۔

"اٹھو میاں۔ تمہارے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

میں جلدی سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جھونپڑی میں لالٹین جل رہی ں۔ میں جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ منہ اندھیرے کا وقت تھا۔ بادلوں میں سے طلوع ؑ سے پہلے کی دھندلی سفیدی جھانکنے لگی تھی۔ بڑے میاں نے چولہے پر میرے لئے ئے تیار کر رکھی تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ بڑے میاں کے ساتھ خالی بند کھایا۔

چائے پی۔ بڑے میاں نے اپنی گتھلی میں سے دس روپے نکال کر مجھے دیتے ہو
کہا۔

"یہ اپنے پاس رکھو۔ تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔"

میرے پاس کچھ روپے تھے لیکن میں نے بڑے میاں سے دس روپے بھی شکر
کے ساتھ لے لئے۔ وہ مجھے ساتھ لے کر گاؤں کے دوسرے کنارے ایک جگہ پر آ
جہاں پہلے سے تین چار دیہاتی مرد اور دو عورتیں گٹھڑیاں سنبھالے بیٹھی تھیں۔ ا
آدمی چھکڑے کے آگے بیل جوت رہا تھا۔ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نہیں پ
تھی۔ بڑے میاں ذرا پیچھے ہی رک گئے اور کہا۔

"یہ بیل گاڑی تمہیں نانده گاؤں کے کنارے تک لے جائے گی۔ میں نہیں چ
کہ یہ لوگ مجھے تمہارے ساتھ دیکھیں۔ جاؤ۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔"

یہ کہہ کر بڑے میاں وہیں سے واپس چل دیئے۔

تھوڑی دیر بعد میں بیل گاڑی میں دوسرے دیہاتی مسافروں کے ساتھ بیٹھا تھا
گاڑی بیروگڑھ کی سرحد سے نکل کر کھیتوں کے درمیان ہچکولے کھاتی آہستہ آہستہ
جا رہی تھی۔ گاڑی بان نے مجھ سے تین روپے کرایہ لیا تھا۔ ایک بوڑھا دیہاتی مجھ
پوچھنے لگا کہ میں نانده کس کے گھر جا رہا ہوں۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔ نانده کے جنـ
میں میرا ماموں فاریسٹ آفیسر ہے اس کے پاس جا رہا ہوں۔

دوسرے دیہاتیوں پر بھی میرا رعب سا بیٹھ گیا۔ گاڑی بان نے میری طرف گر
گھما کر دیکھا اور کہا۔

"بابو جی نے تمہارے لئے گھوڑا کیوں نہیں بھیجا۔ جنگل کے تو جمعداروں کے پا
بھی گھوڑے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ماموں کو میرے آنے کی خبر نہیں ہے۔"

اس کے بعد کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ بیل گاڑی کھیتوں میں سے نکـ
گھاس کے ایک ویران میدان میں سے گزرنے لگی۔ پھر ایک ندی کا پل آ گیا۔ ا

ے بعد پھر دھان اور مکی کے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس وقت تک دن نکل آیا
ا مگر چونکہ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اس لئے دھوپ نہیں نکلی تھی۔ ٹھنڈی
شگوار ہوا چل رہی تھی۔ گاڑی بان اور دوسرے دیہاتی بیڑیاں پی رہے تھے۔ دونوں
یہاتی عورتیں بیل گاڑی کے بانسوں سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھیں۔ کھیت ختم
وئے تو پتھر کی چٹانیں شروع ہو گئیں۔ ان چٹانوں پر سبز رنگ کی کائی جمی ہوئی تھی۔
وئی چٹان چھوٹی تھی کوئی بڑی تھی۔ یہاں زمین پر پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ان پتھروں
ے درمیان بیل گاڑیوں کے واسطے راستہ بنا ہوا تھا۔ سارا راستہ سنسان تھا۔ گاڑی بان
یہاتی بولی میں کوئی لوک گیت گانے لگا۔ بیل گاڑی سست رفتار سے جا رہی تھی۔
چانک مجھے خیال آیا کہ اگر کسی چٹان کے پیچھے سے اچانک کوئی شیر یا چیتا نکل کر حملہ
ر دے تو وہاں کہرام بپا ہو سکتا تھا۔ درندہ ایک آدھ مسافر کو تو ضرور اٹھا کر لے جائے
گا۔ شاید اسی خوف کو دور کرنے کے لئے گاڑی بان گانے لگا تھا۔

چٹانیں ختم ہو گئیں۔ بیل گاڑی اب اونچے نیچے نیم پہاڑی راستے پر چلی جا رہی
ی۔ کہیں درختوں کے جھنڈ آ جاتے۔ کہیں چٹیل میدان آ جاتا۔ درخت اتنے گھنے
تھے کہ ان کے نیچے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ بیل گاڑی ایک نپی تلی رفتار کے ساتھ
ھوڑے تھوڑے ہچکولے کھاتی چلی جا رہی تھی۔ دوسرے مسافروں کی طرح مجھ پر بھی
نودگی طاری ہونے لگی۔ میں کبھی سو جاتا۔ کبھی اچانک بیدار ہو کر ماحول کا جائزہ لینے
لگتا۔ ایک بار کچھ زیادہ دیر تک ہی غنودگی کے عالم میں رہا۔ گاڑی کو دھچکا لگا تو میں
یدار ہو گیا۔ گاڑی ایک جھیل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ذرا آگے جا کر جنگل کے
باسیوں کا چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں والا گاؤں آ گیا۔

بیل گاڑی رک گئی۔ گاڑی بان نے کہا۔

"یہاں جل پانی کر کے آگے جائیں گے۔"

بیروگڑھ سے نانده گاؤں کی طرف بیل گاڑیاں اسی گاؤں میں سے ہو کر جاتی
ھیں۔ جنگل کے باسیوں نے ایک جھونپڑی میں مسافروں کے لئے کھانے پینے کا انتظام

کیا ہوتا تھا۔ گاڑی کے بیل کھول دیئے گئے۔ دوسرے دیہاتیوں کے پاس بیٹھ کر میں نے بھی جل پانی کیا۔ جل پانی یہ تھا کہ کیلے کے پتے پر کھچڑی سی ڈال کر میرے آگے زمین پر رکھ دی گئی۔ کھچڑی میں مرچیں بہت تھیں۔ مگر مجھے بھوک لگ رہی تھی مٹی کے کٹورے میں سے پانی پی پی کر میں کھچڑی کھاتا اور خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ گاڑی بان نے یہاں ایک گھنٹہ لگا دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد گاڑ کے آگے بیل جوتے گئے اور ہم ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ کسی وقت مجھ خیال آتا کہ میں چندر گپتا کے زمانے میں آ گیا ہوں۔ ماڈرن زمانے کی کوئی نشانی را میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بہت جلد مجھے ماڈرن زمانے کی نشانی ریلوے لائن سگنل دکھائی دیا اور میں قدیم زمانے سے نکل کر جدید زمانے میں آ گیا۔ یہ سگنل ریلو لائن کے ساتھ لگا تھا۔ وہاں ایک ریلوے کراسنگ بھی تھی۔ بیل گاڑی ریلوے لائ کے اوپر سے گزری تو میں نے دیکھا کہ ریل کی پٹڑی دور تک چلی گئی تھی۔ شاید کوئی برانچ لائن تھی۔ یا ہو سکتا ہے مین لائن ہی ہو۔ میں نے ریلوے لائن کے بار میں کسی دیہاتی سے کچھ نہ پوچھا۔ مجھے ڈر تھا کہ ایک بات پوچھنے پر دیہاتی اپنی باتی شروع کر دیں گے۔ اور پھر ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا مجھے کافی تجر ہو چکا تھا۔

ریلوے لائن کی دوسری طرف جنگلی جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کا میدا شروع ہو گیا۔ میں نے گاڑی بان سے پوچھا کہ نانده ابھی کتنی دور ہے۔ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"آ جاوے گا بابو۔ ابھی تو پردھان کے آموں کے باغیچے بھی نہیں آئے۔"

خدا جانے یہ پردھان کون تھا۔ کوئی زمیندار ہی ہو گا۔ اس کے آموں کے بار ہوں گے جہاں سے ہماری بیل گاڑی کو ابھی گزرنا تھا۔ دو باتوں کی طرف سے میں بڑ مطمئن تھا۔ ایک تو یہ کہ ابھی تک بارش نہیں ہوئی تھی اور دوسری بات یہ تھی کہ راستے میں کوئی جنگل نہیں آیا تھا۔ آموں کے باغ کا مطلب بھی یہی تھا کہ آباد

قریب ہی ہو گی۔

پردھان کے آموں کا باغ کوئی دو گھنٹے بعد آیا۔ یہ کئی ایکڑوں میں پھیلا ہوا باغ تھا۔ بیل گاڑی اس کے کنارے کنارے جا رہی تھی۔ آگے ایک برساتی نالے کی چڑھائی آ گئی۔ بیل گاڑی چڑھائی کی دوسری طرف آئی تو دور کسی گاؤں کے مکان دکھائی دینے لگے۔ یہاں کھیت بھی تھے۔ میں بڑا خوش ہوا۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر سے اس گاؤں کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"بھیکم گڑھ ہے۔ آگے نانده ہے۔"

بھیکم گڑھ کے گاؤں میں بیل گاڑی تھوڑی دیر کے لئے رکی۔ وہاں سے روانہ ہوئی تو کوئی دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد نانده کے قصبے میں پہنچ گئی۔ یہی اس کی منزل تھی۔ اس وقت دن کی ابر آلود روشنی میں شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا گھلنے لگا تھا۔ نانده چھوٹا سا قصبہ تھا۔ پتھر کی دیواروں والے مکان ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ سب مکانوں کی چھتیں ٹوٹی پھوٹی کھپریلوں کی تھیں۔ جھونپڑیاں بھی جگہ جگہ نظر آ رہی تھیں۔ گاؤں کے باہر یہاں بھی ایک بڑا تالاب تھا جہاں عورتیں پانی بھی بھر رہی تھیں اور بیٹھی کپڑے بھی دھو رہی تھیں۔ کیلے تاڑ اور پپیتے کے درختوں کے جھنڈ جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ کئی مکانوں میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ بیل گاڑی ایک پرانی حویلی کے اونچے دروازے کے باہر آ کر رکی تھی۔ دوسرے دیہاتی مسافر اپنے اپنے گھروں کی طرف جا چکے تھے۔ میرا کوئی گھر نہیں تھا۔ میں وہیں ایک طرف ہو کر ایک درخت کے گرد بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ گاڑی بان بیلوں کو کھول کر ان کے آگے چارہ ڈال رہا تھا۔ اس نے مجھے اکیلا بیٹھے دیکھا تو پوچھا کہ میں کس کا انتظار کر رہا ہوں؟ میں نے کہا۔

"بھائی انتظار کس کا کرنا ہے۔ نانده کے جنگل میں اپنے ماموں فاریسٹ آفیسر کے ریسٹ ہاؤس میں جانا ہے۔"

گاڑی بان بولا۔

"میاں رات کے وقت جاؤ گے تو شیر باگھ کھالیں گے تمہیں۔ رات یہیں پڑ کر سو رہو۔ صبح چلے جانا۔

گاڑی بان بڑا اچھا آدمی تھا۔ اس نے مجھے اپنی بیل گاڑی میں رات کو سونے کی اجازت دے دی۔ اس نے مجھے حویلی کے اندر سے کھانا بھی لا کر کھلایا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ نانده کا جنگل یہاں سے کس طرف ہے۔ اس نے بتایا کہ شمال میں دو میل آگے جاؤ گے تو نانده کا جنگل شروع ہو جائے گا۔

"مگر یہ جنگل تو بہت بڑا ہے۔ تمہارے ماموں کا ڈاک بنگلہ کہاں ہے؟ اس نے تمہیں کوئی اتہ پتہ نہیں دیا۔"

میں نے کہہ دیا کہ وہاں قریب ہی کچا کوئلہ بنانے کے بھٹے لگے ہیں۔ اس پر گاڑی بان نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"تو یوں کہو کہ پٹیل کے بھٹوں کے پاس جاؤ گے۔"

تب اس نے مجھے سارا راستہ سمجھا دیا کہ پٹیل کے بھٹے جنگل میں کس طرف ہیں۔ مجھے کس طرف سے جنگل میں داخل ہونا ہو گا اور بھٹوں پر جا کر پٹیل کے کارندوں سے ڈاک بنگلے کا پوچھ لینا ہو گا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ کیونکہ مجھے تو پٹیل کے بھٹوں کا ہی پتہ درکار تھا اور وہ مجھے مل گیا تھا۔

رات میں نے حویلی کے دروازے پر بیل گاڑی میں کچھ سوتے کچھ جاگتے اور کچھ مچھر مارتے گزار دی۔ صبح گاڑی بان نے مجھے لال مرچوں کی چٹنی کے ساتھ روٹی کھلائی۔ چائے پلائی اور میں نانده کے جنگل کی طرف چل پڑا۔ ایک کچا راستہ جنگل کی طرف جاتا تھا۔ جنگل میں کٹائی کے بعد درختوں کے شہتیر تختے اور پٹیل کے کوئلوں کی بوریوں سے لدے ہوئے چھکڑے اسی راستے سے نانده گاؤں آتے تھے۔ راستہ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ دونوں جانب بیل گاڑیوں کے پہیوں کے نشان بنے ہوئے تھے جن کے درمیان گھاس کی ابھری ہوئی پگ ڈنڈی سی بن گئی تھی۔ دونوں جانب کھیڑ اور کیکر کے درخت تھے۔

دو تین کوس چلنے کے بعد جنگل کا رقبہ شروع ہو گیا۔ پہلے درخت دور دور تھے۔ پھر ان کے جھنڈ قریب آتے گئے۔ ایک برساتی نالہ آگیا۔ گاڑی بان نے کہا تھا کہ اسی نالے کی دوسری جانب بائیں طرف درختوں کے ساتھ ساتھ چلتے جانا۔ آگے ایک مڑھی آئے گی۔ مڑھی ایک چھوٹا سا چبوترہ ہوتا ہے جہاں کسی ہندو سادھو وغیرہ کی ہڈیاں دفن ہوتی ہیں۔ برساتی نالے پر بانسوں کو جوڑ کر ایک پل بنا دیا گیا تھا۔ میں پل پر سے گزر کر بائیں جانب درختوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد سادھو کی مڑھی آگئی۔ گاڑی بان نے کہا تھا کے یہاں سے جنگل میں داخل ہو جانا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور یہاں سے جنگل میں داخل ہو گیا۔ بیل گاڑیوں اور چھکڑوں کے لئے بنا ہوا راستہ آگے نکل گیا تھا۔ میں اب نانده کے جنگل میں داخل ہو چکا تھا۔ پہلے تو مجھے یہ جنگل بھی عام جنگلوں کی طرح لگا۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس جنگل میں کچھ زیادہ خاموشی ہے۔ یقین کریں درختوں پر سے کسی پرندے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ درخت اتنے گنجان تھے کہ اوپر جا کر ان کی شاخیں ایک دوسرے سے مل گئی تھیں۔ جنگل میں دن کے وقت بھی اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ جو شے مجھے خوف زدہ کر رہی تھی وہ اس جنگل کی خاموشی تھی۔ واقعی جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایک ہیبت ناک سناٹا تھا۔ جنگلی جھاڑیوں کے درمیان ایک پگ ڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ یہاں سے لوگ گزرتے ہیں۔ ایک جگہ ایسی آواز آئی جیسے کوئی جنگلی جانور کسی کے پیچھے دوڑ پڑا ہو۔ میں ڈر کر وہیں رک گیا اور درختوں کے تنوں میں دیکھنے لگا۔ ایک بار پھر خوفناک سناٹا چھا گیا۔ اتنی ڈرا دینے والی ہیبت ناک خاموشی میں نے آج تک کسی جنگل میں محسوس نہیں کی تھی۔ فضا میں گیلی گھاس اور گلے سڑے پتوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یہ بھی دھڑکا لگا تھا کہ کسی طرف سے اچانک کوئی شیر ریچھ یا چیتا نہ نکل آئے۔ اللہ کے نام کا ورد کرتا دیکھ بھال کر جنگل میں چلا جا رہا تھا۔ اچانک سامنے ایک ندی آ گئی۔

یہ وہی ندی ہو سکتی تھی جس کے بارے میں گھاٹن نے بتایا تھا کہ رکھالی ندی

کے کنارے پٹیل نے پکی چاردیواری کے اندر اپنی خاص کوٹھڑی بنا رکھی ہے۔ میں وہاں رک گیا۔ ندی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ایک جانب اس کے اوپر کسی درخت کا کٹا ہوا تنا ڈال کر پل بنا دیا ہوا تھا۔ میں نے ندی کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا - تھوڑا سا پانی بھی پیا۔ اور درخت کے تنے کے اوپر سے گزر کر ندی کی دوسری طرف آ گیا۔ دوسرے کنارے پر جا کر میں نے دیکھا کہ کیکر کے بے شمار درخت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ یہ وہی درخت تھے جن کو بھٹوں میں جلا کر کچا کوئلہ بنایا جاتا تھا۔ یہاں پہلی بار مجھے کچے کوئلے کے دھوئیں کی ہلکی ہلکی بو محسوس ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ پٹیل کے کوئلوں کے بھٹوں کا علاقہ قریب ہی تھا۔ میں محتاط ہو کر چلنے لگا۔

ندی پار کرتے مجھے کچے کوئلوں کی جو بو محسوس ہوئی تھی وہ کبھی غائب ہو جاتی اور کبھی بڑی تیز ہو جاتی۔ جنگل میں جو چھوٹی سی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی اور جس پر میں چل رہا تھا وہ جھاڑیوں میں غائب ہو گئی تھی۔ میں کوئلوں کی بو کے ساتھ ساتھ اندازے سے چل رہا تھا۔ ایک جگہ اونچی اونچی گھاس تھی۔ میں نے گھاس کو پرے ہٹایا۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ یہاں کوئلوں کی بو تیز ہو گئی۔ یہی وہ ندی تھی جس کے کنارے پر پٹیل نے اپنی خاص کوٹھڑی بنائی ہوئی تھی اور گھاٹن کے بیان کے مطابق مسلمان لڑکی اسی کوٹھڑی میں قید تھی۔ میں ندی کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف چلنے لگا۔ مجھے دو آدمیوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ کسی نے آواز دے کر کسی کو پکارا تھا۔ میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ چکا تھا۔

اب مجھے وہ کوٹھڑی تلاش کرنی تھی جس میں عائشہ قید تھی۔ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز بند ہو گئی۔ پھر کلہاڑے سے لکڑیاں کاٹنے کی آواز آنے لگی۔ ندی کے کنارے اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ میں نے جھاڑیوں کو ہٹا کر دوسری طرف دیکھا۔ ایک جگہ درختوں میں سے دھوئیں کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ یہی بدمعاش پٹیل کے

ئلوں کے بھٹے تھے۔ ابھی تک مجھے اس کوٹھڑی کی چار دیواری نظر نہیں آئی تھی۔
ں بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا ندی کے ساتھ ساتھ آگے کی طرف چلنے لگا۔ ندی گھوم
ں۔ یہاں مجھے پتھر کی ایک دیوار نظر آئی جو ندی کے دوسرے کنارے ذرا ڈھلان میں
ر کو اٹھی ہوئی تھی۔ یہ پٹیل کی کوٹھڑی کی چاردیواری کی دیوار تھی - دیوار کے اوپر
ختوں کی ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ اس طرف چار دیواری کا دروازہ نہیں تھا۔ مجھے
ی پار کرنی تھی۔ میں اوپر کی طرف گیا۔ ایک جگہ موٹے موٹے بانس ڈال کر ندی پر
ں بنایا ہوا تھا۔ میں پل پر سے گزر کر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے مجھے
ر دیواری صاف نظر آ رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ رات کے وقت چار دیواری
لانگ کر اندر جاؤں اور کوٹھڑی میں سے کسی طرح عائشہ کو نکال کر لے آؤں۔ مجھے
ل کے جرائم پیشہ نوکروں کا بھی ڈر تھا جو بقول گھاٹن کے بندوقیں اٹھائے ہر وقت
رے پر ہوتے ہیں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سر پر پیچھے سے کسی نے کوئی
اری چیز زور سے ماری۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ اٹھے۔ مجھے چکر آیا اور
ں کے بعد کوئی ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ زمین پر بٹھا رکھا ہے اور ایک آدمی میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا ہے۔ میرے سر کا پچھلا حصہ سخت درد کر رہا تھا۔ یہ ایک تنگ سی کوٹھڑی تھی۔ لیمپ جل رہا تھا۔ مجھے ہوش میں آ دیکھ کر جو آدمی میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا اس نے زور سے مجھے دو تین اوپر تلے طمانچے مارے اور گالیاں دیتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں بے - تو کہاں سے آیا ہے۔ تجھے کس سالے نے بھیجا ہے؟"

اس کے بعد پھر مجھ پر تھپڑوں کی بارش شروع ہو گئی۔ جن دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا انہوں نے مجھے فرش پر لٹا دیا اور ٹھڈے مارنے لگے۔ میری چیخیں نکلنے لگیں۔ میں نے دہائی دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔ میں جنگل میں راستہ بھول کر ادھر آ گیا تھا۔"

اب ان تینوں نے گالیاں بکتے ہوئے میری پٹائی شروع کر دی۔ میرا برا حال ہو گیا تھا۔ جب وہ مجھے مار مار کر تھک گئے تو ایک نے کہا۔

"یہ ضرور گنگولی بدمعاش کا آدمی ہے۔ اسی سالے نے اسے عورت کی ٹوہ لگانے یہاں بھیجا ہو گا۔"

دوسرا بولا۔

"اس کو یہیں رکھو۔ سیٹھ بیروگڑھ سے آئے گا تو اسے اس کا چہرہ دکھا کر گولی مار

دیں گے۔"

تیسرا کہنے لگا۔

"میں تو کہتا ہوں اس کو ابھی گولی مار دو سیٹھ کو اس کی لاش دکھا دیں گے وہ ہمیں انعام و اکرام دے گا۔"

پہلے والا بولا۔

"ابے نہیں۔ ابھی نہیں - دو دن کی تو بات ہے - سیٹھ کو دکھا کر اسے گولی ماریں گے۔ بند کر دو اس حرامزادے کو۔"

یہ تینوں آدمی ہٹے کٹے تھے۔ ان کے پاس بندوقیں بھی تھیں جو انہوں نے کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ لگا رکھی تھیں۔ ان تینوں نے باری باری مجھے ٹھڈے مارے اور مجھے کوٹھڑی میں ادھ موا کر کے پھینک کر چلے گئے۔ باہر سے انہوں نے تالا لگا دیا۔ میرا سارا جسم درد کر رہا تھا۔ پسلیوں کے نیچے سانس لیتے ہوئے ایسی ٹیس پڑتی تھی کہ میں سر پر لگی ہوئی چوٹ کی درد بھول گیا - میں فرش پر سیدھا پڑا تھا۔ مجھے اپنے منہ میں نمک کا ذائقہ محسوس ہوا۔ میں نے قمیض کو منہ کے ساتھ دبا کر اسے لیمپ کی روشنی میں دیکھا۔ میرے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ واقعی ان لوگوں نے مجھے بہت مارا تھا۔

میں آنکھیں بند کئے فرش پر سیدھا پڑا رہا۔ میرے جسم کا ہر حصہ درد کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے دل میں گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا تو میری مدد فرما۔ میں ایک نیک مقصد لے کر یہاں آیا ہوں۔ مجھ سے اگر کوئی گناہ ہو گیا ہے تو مجھے معاف فرما دے۔ یااللہ! مجھے معاف فرما دے۔ میں اسی ایک جملے کو بار بار دل میں دہرانے لگا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ پھر مجھ پر غنودگی یا نیم بے ہوشی سی طاری ہونے لگی اور میں سو گیا یا بے ہوش ہو گیا۔

جب دوبارہ ہوش آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم پر جو چوٹیں لگی تھیں ان

کی درد بہت کم ہو گئی ہے حالانکہ جسم ٹھنڈا ہو جانے کے بعد اس درد میں اضافہ ہو جانا چاہئے تھا۔ پسلیوں کے نیچے سانس لینے سے جو ٹیس اٹھتی تھی اس کی شدت بھی کم ہو گئی تھی۔ یہ ایک معجزہ ہی تھا۔ خدا نے میری فریاد سن لی تھی اور میرے گناہوں کو معاف کر دیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اس وقت سچے دل سے خدا سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ کبھی کوئی گناہ نہیں کروں گا۔ بلکہ گناہ کا خیال بھی دل میں نہیں لاؤں گا۔

اس کے باوجود جسم کی حالت ایسی ضرور تھی جیسے کسی نے مجھے مدھول دیا ہو۔ اس وقت مجھے مدھول کا کوئی اردو متبادل لفظ نہیں مل رہا۔ معافی چاہتا ہوں۔ سر کے پچھلے حصے میں جہاں ان لوگوں نے کسی بھاری شے کی ضرب لگائی درد کی ہلکی ہلکی ٹیس ضرور اٹھ رہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ زمین پر سے اپنے آپ کو سمیٹا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ دیواریں بانس جوڑ کر نہیں بنائی گئی تھیں میں نے دیوار پر انگلی پھیر کر دیکھا۔ یہ مٹی کی دیوار تھی دروازے کے اوپر چھت کے قریب ایک چھوٹا سا روشندان بنا تھا جس میں سلاخیں لگی تھیں۔ کونے میں ایک طاق تھا جس میں مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ کوٹھڑی کی فضا مٹی کے تیل کی بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی۔ میری ساری جیبیں خالی تھیں۔ یہ لوگ میرے پیسے اور چاقو سب نکال کر لے گئے تھے۔

وقت کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ دن ہے یا رات۔ روشندان میں باہر سے دن کی روشنی نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ رات ہو گئی تھی۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس کے مارے حلق بھی خشک ہو رہا تھا۔ مگر کوٹھڑی بالکل خالی تھی۔ پانی کا کوئی گھڑا وغیرہ وہاں نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ وہ میری بھرپور نوجوانی کا زمانہ تھا۔ میری رگوں میں جوانی کا خون گردش کر رہا تھا اور طبیعت میں ایڈونچر کا جوش بھرا ہوا تھا۔ میں بے بسی کی موت نہیں مر سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک شبہ نہیں تھا کہ میں پٹیل ہی کے بھٹوں پر تھا اور یہ اسی کے کارندے

جو مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ وہ جو آپس میں باتیں کر رہے تھے وہ بھی میں سن لی تھیں۔ ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ پٹیل نے ایک عورت کو ولی نامی بدمعاش سے خرید کر یہاں ڈال رکھا ہے اور اس بات کا انکشاف بھی ہوا تھا گنگولی پجاری یہاں سے اس عورت یعنی عائشہ کو اغوا کرانے کی فکر میں ہے۔ ظاہر وہ اس لئے عائشہ کو اغوا کرانا چاہتا ہو گا کہ اسے آگے کسی دوسرے کے ہاتھ خت کر دے۔ میرے لئے اتنی معلومات ہی بہت تھی کہ عائشہ اسی جگہ پر ہے۔

عائشہ کو وہاں سے نکالنا ایک الگ مسئلہ تھا۔ سب سے پہلے تو مجھے اس کوٹھڑی ، جان بچا کر فرار ہونا تھا تاکہ آزاد ہو کر میں عائشہ کو وہاں سے نکالنے کی کوئی تدبیر سکوں۔ بظاہر کوٹھڑی سے نکلنے کا کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوٹھڑی بند ہ۔ دروازہ بھاری لکڑی کا تھا۔ باہر سے اس پر تالا پڑا تھا۔ دروازے کے اوپر جو شندان تھا اس پر سلاخیں لگی تھیں اور اس میں سے کوئی دبلی پتلی بلی ہی باہر نکل ی تھی۔ لیکن میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے ہر حالت میں وہاں سے ر ہونا ہے۔ میں فرار کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ دیواریں کچی تھیں۔ مگر میرے پاس کوئی ی چیز نہیں تھی کہ جس سے دیوار کھرچ کر اس میں سوراخ کر کے باہر نکل سکوں۔ ں نے انگلی کے ناخن سے دیوار کی مٹی کھرچی۔ ذرا سی کوشش میں میرے ناخن درد نے لگے۔ یہ کام میں نہیں کر سکتا۔ کوٹھڑی کے باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا ت کافی گہری ہو چکی ہے۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس آیا اور کوئی درز تلاش نے لگا جس کے ساتھ آنکھ لگا کر باہر کچھ دیکھ سکوں۔ دروازہ بڑا مضبوط اور بھاری ۔ کسی جگہ بھی مجھے اس میں کوئی درز یا سوراخ نظر نہ آیا۔ اٹھ کر چلنے سے میری بوں کے نیچے دوبارہ ٹیسیں پڑنے لگیں۔ میں بیٹھ گیا۔ بھوک اور پیاس بھی لگ رہی ی۔ میں نانده گاؤں سے ناشتہ کر کے چلا تھا اور دن کے کوئی نو دس بجے کے قریب ل میں پٹیل کے کونلوں کے بھٹوں پر پہنچا تھا۔ ان لوگوں نے وہاں میرے سر پر کوئی نی چیز مار کر مجھے بے ہوش کر کے اٹھایا تھا۔ اب رات ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا

کہ میں دن کے نو دس بجے کا بے ہوش پڑا تھا اور اب رات کو ہوش آیا تھا۔ اسی ۔
مجھے بھوک اور پیاس لگ رہی تھی۔

میں غور کرنے لگا کہ یہ لوگ مجھے پٹیل کے آنے تک اسی کوٹھڑی میں بند رکھیں
گے۔ اور زندہ بھی رکھیں گے۔ ظاہر ہے پھر وہ میری زندگی کا رشتہ برقرار رکھنے ۔
لئے مجھے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کو ضرور دیں گے۔ لیکن ابھی تک انہوں نے مجھے پا
تک پینے کو نہیں دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی نہ کسی طرح رات گزر بسر کرنی ہی پڑ
گی۔ شاید صبح کو یہ لوگ کچھ کھانے پینے کو دیں میں آہستہ سے فرش پر بیٹھ گیا
آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ آنکھیں درد کر رہی تھیں۔ ج
بھی تھوڑا تھوڑا دکھ رہا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ بس غنودگی سی طاری رہی اور خ
جانے کب تک طاری رہی۔

پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

کوئی باہر سے دروازے کا تالا کھول رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ روشندان میں ۔
دن کی سفید روشنی اندر آ رہی تھی۔ دو ہٹے کٹے آدمی دروازہ کھول کر اندر داخ
ہوئے۔ دروازہ کھلنے سے دن کی روشنی بھی اندر آ گئی۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں ر
کا گچھا پکڑا ہوا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ انہوں نے لیمپ بجھا دیا۔
وہی رات والے لوگ تھے۔ ایک نے مجھے گردن سے پکڑ کر میرا منہ زمین کے ساتھ
دبا اور زور سے دھول مار کر بولا۔

"سالے بتاتا کیوں نہیں تجھے کس نے بھیجا تھا۔"

دوسرا آدمی جس کے ہاتھ میں رسی کا گچھا تھا بولا۔

"ابے مرلی پیچھے ہٹ۔ پہلے مجھے اس کی گردن میں رسا تو ڈالنے دے۔"

انہوں نے میری گردن میں رسا ڈال کر اسے اس طرح باندھ دیا جیسے مجھے پھان
دینے لگے ہوں۔

"چل بے باہر نکل۔۔۔۔۔"

وہ مجھے رسی سے کھینچتے ہوئے کوٹھڑی سے باہر لے آئے۔ باہر اچھا خاصا دن نکلا
تھا۔ آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ تازہ ہوا میں آتے ہی میری جان
جان آئی۔ وہاں چاروں طرف درخت ہی درخت تھے۔ یہ قیدیوں والی کوٹھڑی پٹیل
ڈیرے کے کسی ویران کونے میں تھی۔ وہ مجھے رسی سے کھینچتے ہوئے گالیاں بکتے
وں کے پیچھے ندی پر لے آئے۔ ندی پر لے جا کر انہوں نے مجھے وہاں پر بٹھا دیا
کہا کہ یہاں بیٹھ کر منہ ہاتھ دھو لے۔ زیادہ دیر لگائی تو ندی میں ڈبو دیں گے۔ وہ
وہاں چھوڑ کر رسی کو لمبا کرتے ہوئے کچھ فاصلے پر جا کر درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔
ان کے ہاتھ میں تھی۔ رسی کا پھندا میرے گلے میں تھا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا
ہوتا تھا۔

میں نے جلدی سے ندی میں ہاتھ ڈال کر پانی پیا۔ پھر منہ ہاتھ دھویا۔ تھوڑی
ڑی دیر بعد جس آدمی نے میری رسی پکڑ رکھی تھی وہ اسے کھینچ لیتا تھا اور میری
دن کو جھٹکے لگتے تھے۔ منہ ہاتھ دھونے سے فارغ ہو کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں
تہ آہستہ واپس چلنے لگا۔ وہ زور سے رسی کھینچ رہے تھے۔ میں دوڑ کر ان کے پاس
گیا۔

دونوں قہقہہ مار کر ہنسے اور مجھے گالیاں دینے لگے۔ پھر دوسرے آدمی نے پوٹلی
ل کر مجھے دو روٹیاں دیں جو باسی تھیں۔ ان پر آم کا اچار رکھا ہوا تھا۔ میں وہیں
کر روٹی کھانے لگا۔ اس وقت وہ روٹی پلاؤ زردے سے زیادہ لذیذ معلوم ہو رہی
۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگے۔

"سچ سچ بتا دے تجھے اس بدمعاش گنگولی نے ہی یہاں بھیجا ہے ناں؟"

"ارے پٹیل کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں ساری بات بتا دے۔ ہم وعدہ کرتے
کہ پٹیل سے تیری جان بخشی کرا دیں گے۔"

میں ہر بات کے جواب میں یہی کہتا کہ میں راستہ بھول کر جنگل میں ادھر نکل آیا
۔ نانده میں اپنے شکاری دوست سے ملنے آیا تھا وہ نہ ملا تو واپس جانے کی بجائے سوچا

جنگل کی سیر کر لوں۔ اس پر ایک بدمعاش نے اٹھ کر مجھے زور سے تھپڑ مارا۔ میرے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔ میرا خون کھول اٹھا۔ میں کھا جانے والی نظروں انہیں گھورنے لگا۔

"ابے گھورتا ہے؟"

وہ مجھے رسی کے زور زور سے جھٹکے دینے لگے۔ میں نے رسی کو دونوں ہا سے پکڑ لیا۔ اس پر وہ غصے میں آکر وہیں مجھے مارنے پیٹنے لگے۔ میں بے بس تھا۔ کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر وہ مجھے جھاڑیوں میں گھسیٹتے ہوئے کوٹھڑی میں آئے۔ مجھے بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ میرے ہاتھ اور کہنیاں چھل گئی تھیں۔ کا شکر ہے کہ انہوں نے میری گردن سے رسی کا پھندا نکال دیا تھا۔ میری گردن کی رگڑ سے درد کر رہی تھی۔ میری کمر بھی درد کر رہی تھی۔ وہاں ان کے کے تھے۔ مجھے جتنی گالیاں یاد تھیں میں نے انہیں دے دیں اور بیٹھ کر وہاں سے ہونے کی ترکیبوں پر غور کرنے لگا۔ روٹی میں نے ایک ہی کھائی تھی -دوسری ز گر پڑی تھی جو میں نے پھر نہیں اٹھائی تھی۔ انہوں نے مجھے اٹھانے کی مہلت نہیں دی تھی۔ تھوڑی بہت روٹی کھانے اور سیر ہو کر پانی پینے سے میری کھوئی توانائی کچھ بحال ہو گئی تھی۔ مگر وہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی ترکیب سمجھ میں نہ رہی تھی۔

وہ دن اور رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن اسی طرح پٹیل کے دونوں کارن جن میں سے ایک نام مرلی تھا اور دوسرے کا نام مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا میری گ میں رسی ڈال کر مجھے ندی پر منہ ہاتھ دھلانے لے گئے۔ وہیں انہوں نے مجھے رات باسی روٹی کھانے کو دی اور میرے گلے میں پھندا ڈالے مجھے کھینچتے ہوئے واپس کو میں لے آئے۔

وہ بیروگڑھ سے پٹیل کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ تیسرے دن دوپہر کے پٹیل آ گیا۔ باہر سے لوگوں کی آوازیں کچھ زیادہ ہی آنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ

بدمعاشوں کا سرغنہ پٹیل آ گیا ہے۔ تیسرے پہر مجھے اسی حالت میں پٹیل کے سامنے پیش کیا گیا کہ میری گردن میں پھندا پڑا تھا اور رسی مرلی کے ہاتھ میں تھی۔ موٹا پٹیل اپنے جنگل والے مکان کی چار دیواری کے اندر برآمدے کے آگے بانس کی کرسی پر بڑی سی توند نکالے بیٹھا تھا۔ میں نے جاتے ہی اسے پہچان لیا۔ یہ بیروگڑھ والا پٹیل ہی تھا جسے میں نے اس کی ساہوکارے کی دکان پر دیکھا تھا۔ میں نے برآمدے کی طرف دیکھا۔ پٹیل کے مکان یا کوٹھڑی کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ برآمدے میں مٹی کے لبوترے مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ ہر مٹکے کے اوپر سلور کا کٹورا اوندھا پڑا تھا۔ میری نگاہیں عائشہ کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ پٹیل مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے سامنے زمین پر بٹھا دیا گیا۔ مرلی نے کہا۔

"سیٹھ یہی وہ لڑکا ہے جسے گنگولی نے جاسوسی کرنے یہاں بھیجا ہے۔"

پٹیل مسلسل مجھے غصے بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ وہ مجھے گردن سے پکڑ کر پٹیل کی کرسی کے قریب لے گئے۔ پٹیل نے زور سے میری ٹھوڑی پر لات ماری۔ میں پیچھے ہو کر گر پڑا۔ وہ بھی مجھے گالیاں دینے لگا۔ پھر گنگولی پجاری کو گالی دیتے ہوئی بولا۔

"اس کو پوری رقم مل گئی تھی تو پھر عورت کے پیچھے کیوں لگا ہے۔ بول! تیرے ساتھ کون کون میرے بھٹوں پر آیا ہے؟"

میں نے پٹیل کے آگے بھی وہی من گھڑت کہانی دہرا دی جو میں اس کے کارندوں کو سنا چکا تھا۔ سیٹھ نے اپنے کارندوں سے کہا۔

"یہ اس طرح نہیں بکے گا۔ اس کی ٹھکائی کرو۔"

وہاں پٹیل کے دوسرے نوکر اور باڈی گارڈ بھی بندوقیں کندھوں سے لٹکائے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھے لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔ میں اپنے جسم کو گیند کی طرح سمیٹ کر وہیں گول مول ہو کر بیٹھا مار کھاتا رہا۔ پٹیل نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ٹھہر جاؤ۔"

اس کے آدمی وہیں رک گئے۔ میرا بدن مار کھا کھا کر عادی سا ہو گیا تھا اب مجھے گھونسوں اور ٹھڈوں کی چوٹیں زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ لیکن میرا خون پہلے سے زیادہ کھول رہا تھا اور میں نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ اگر میں زندہ بچ گیا تو ان لوگوں سے اس ذلت کا بدلہ ضرور لوں گا۔ پٹیل نے مجھ سے گنگولی پجاری اور اس کے آدمیوں کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی۔ میری جانے بلا کہ گنگولی پجاری کہاں تھا اور اس کے آدمی کون تھے۔ میں تو صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ بمبئی کے مندر کے بڑے مہنت نے عائشہ کو گنگولی نام کے ایک پجاری کے ہاتھ بیچ دیا تھا جس نے اسے آگے پٹیل کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ یہ تو مجھے یہاں آ کر ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ گنگولی دوبارہ عائشہ کو پٹیل کے ڈیرے سے اغوا کرنے کی فکر میں ہے۔ میرے بیان پر کسی کو اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ اس دوران میری نگاہیں برآمدے کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں کہ شاید وہاں عائشہ کی شکل نظر آ جائے۔ مگر وہ شاید مکان کے اندر بند تھی۔

آخر پٹیل نے گالی دے کر اپنے کارندے مرلی اور اس کے ساتھی سے کہا۔

"اس کو لے جا کر ٹیلے والی غار میں چھوڑ آؤ - جاؤ۔ مگر اندھیرا ہو جانے دو۔۔۔"

پٹیل کے کارندے رسی سے مجھے کھینچتے ہوئے واپس کوٹھڑی میں لے آئے۔ انہوں نے میری گردن سے پھندا کھول دیا اور کوٹھڑی کو باہر سے تالا لگا دیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ ٹیلے والے غار میں مجھے کس لئے بند کر رہے ہیں۔ شاید اس غار میں ریچھ یا کوئی دوسرے جنگلی جانور رات کو بسیرا کرتے ہوں اور یہ چاہتے ہوں کہ میں غار کے درندوں کی خوراک بن جاؤں۔ اس طرح ان پر بھی قتل کا الزام نہیں آئے گا اور میرا کام بھی تمام ہو جائے گا۔ میں بے چین سا ہو کر اٹھ کر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگا۔ مجھے اپنے اوپر اس قیدی کا گمان ہو رہا تھا جسے موت کی سزا سنا دی گئی ہو اور رات کو پھانسی ملنے والی ہو۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر موت ایک بار تو میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے مجھے ٹیلے والے غار میں پھینک کر یہ لوگ اس کا منہ پتھر سے بند کر کے چلے جائیں۔ اگر ایسا ہی ہوا تو میں کسی نہ کسی طرح پتھر ہٹا کر غار سے نکل بھاگوں گا۔ مگر ان بدمعاشوں سے مجھے زندگی کی امید نہیں تھی کوٹھڑی کے روشندان میں سے دن کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دن کی اتنی روشنی بھی غائب ہو گئی۔ کوٹھڑی میں اندھیرا ہو گیا۔ کسی نے آ کر لیمپ بھی نہیں جلایا تھا۔ اتنے میں تالا کھلنے کی آواز آئی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس وقت میں بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ یہ لوگ یقیناً مجھے ٹیلے پر لے جا کر قتل کرنے والے تھے۔ غار میں بند کرنے کا ایک بہانہ ہی تھا۔

وہی دونوں بدمعاش کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ دروازہ کھلنے پر مجھے باہر شام کی ملگجی روشنی نظر آئی۔ ابھی رات نہیں پڑی تھی۔ انہوں نے میری گردن میں رسی کا پھندا ڈال دیا اور مجھے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ دونوں کے کاندھوں سے بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ وہ مجھے شوٹ کرنے کا پروگرام بنا کر آئے تھے۔ خوف سے میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے ٹیلے کی طرف لئے جا رہے تھے۔ یہ ٹیلہ ندی کے پاس ہی تھا۔ ندی اس کے دامن سے گھوم کر گزرتی تھی۔ شام کی ملگجی روشنی رات کے اولین اندھیرے میں ڈھل رہی تھی۔ میں ان کی منت سماجت کرنے لگا کہ میں بے قصور ہوں۔ میرا کسی گنگولی نام کے آدمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ مرلی نے میرے گلے میں بندھی ہوئی رسی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ ٹیلہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ وہ مجھے ٹیلے کے اوپر لے آئے۔ جہاں مجھے کوئی غار نظر نہ آیا۔ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک درخت تھا۔ وہ مجھے درخت کے ساتھ باندھنے لگے تو موت کے خوف سے میرا جسم سرد پڑ گیا۔ میں ان سے رحم کی بھیک مانگنے لگا مگر ان پر میری گڑگڑاہٹ کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے درخت سے باندھنے کے بعد مرلی نے بندوق سنبھال لی۔ اس کا ساتھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ بولا۔

"مرلی! اڑا دے۔"

میں نے اپنا سانس روک لیا۔ خدا جانے میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ موت میرے سامنے کھڑی تھی۔ مرلی نے بندوق میں کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ یہ دو نالی بندوق تھی۔ اس نے بندوق اٹھائی کہ میرا نشانہ لے کہ اتنے میں ایسی زبردست پھنکار کی آواز آئی کہ میں بھی کانپ گیا۔ دوسرے لمحے مرلی کا بندوق والا ہاتھ اوپر اٹھ گیا اور وہ چکرا کر گرا۔ اسی لمحے میں نے ایک پھن دار کالے سانپ کو دیکھا جو خدا جانے کہاں سے نکل کر وہاں آگیا تھا اور اس نے مرلی کو ڈس لیا تھا۔ مرلی کے ساتھی نے سانپ کو دیکھا تو اس پر فائر جھونک دیا۔ گھبراہٹ میں نشانہ خطا گیا۔ سانپ نے اس پر حملہ کر دیا مگر وہ خوش قسمت نکلا کہ وہاں سے چھلانگ لگا کر ٹیلے کی دوسری طرف لڑھک گیا۔ مرلی جھاڑیوں کے سامنے زمین پر اوندھا پڑا تھا اور بالکل بے حس و حرکت تھا۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اس درخت کے سامنے آگیا جس کے ساتھ میں بندھا ہوا تھا۔ میں مرلی کی بندوق کی گولی سے بچ گیا تھا مگر اب یہ سانپ مجھے ڈسنے والا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یقین تھا کہ سانپ میرے پاؤں یا پنڈلی پر ضرور ڈس لے گا۔ جب ایک منٹ گزر گیا اور کچھ نہ ہوا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ رات کے دھندلے دھندلے اندھیرے میں وہاں سانپ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔

خدا نے مجھے موت کے منہ سے باہر نکال لیا تھا۔ جس رسی سے میں بندھا ہوا تھا میں نے اسے کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ چونکہ مجھے انہوں نے شوٹ کر دینا تھا اس لئے درخت کے ساتھ رسی کو زیادہ گانٹھیں دے کر نہیں باندھا تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے میں نے رسی کھول کر ایک طرف پھینکی اور ٹیلے سے اتر کر ندی کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ میں نے یہ بھی دیکھنے کی کوشش نہ کی کہ مرلی سانپ کے ڈسنے سے مرچکا ہے یا ابھی زندہ ہے۔ ظاہر ہے وہ مرگیا تھا۔ اگر زندہ ہوتا تو بندوق اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ مجھے بھاگتا دیکھ کر وہ ضرور مجھ پر فائر کرتا۔

میں اندھا دھند بھاگا جا رہا تھا۔ جھاڑیوں سے الجھ رہا تھا۔ گڑھوں میں پاؤں پڑ رہے تھے۔ مگر موت کا خوف مجھے بھگائے لئے جا رہا تھا۔ پٹیل کا ڈیرا وہاں سے زیادہ دور نہیں

ا۔ مرلی تو مرگیا تھا مگر اس کا ساتھی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
ے لازماً اپنے آدمیوں کو لے کر واپس مرلی کے پاس اور مجھے قتل کرنے کے لئے آنا
۔ اس بدمعاش کو پتہ تھا کہ میں درخت کے ساتھ بندھا ہوا ہوں۔ رات کا اندھیرا گہرا
تا جا رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ندی کا پانی مجھے دھندلا دھندلا نظر آ رہا
ا۔ میں اس کے اندازے سے ندی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اونچی گھاس اور
اڑیاں قدم قدم پر میرا راستہ روک رہی تھیں مگر میں بھاگتا جا رہا تھا۔ میں کافی آگے
ں گیا تو ایک جگہ دم لینے کے لئے بیٹھ گیا۔ میرا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ مگر
ندہ بچ نکلنے کی خوشی نے میرے جسم میں نئی توانائی بھر دی تھی۔

ایک آدھ منٹ سانس لینے کے بعد میں پھر دوڑنے لگا۔ ندی کچھ دور آگے جا کر
گل کی طرف مڑ گئی تھی۔ آگے گھنے درختوں والا اندھیرا جنگل شروع ہو گیا تھا۔ میں
ی ندی کے ساتھ ہی جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب میں نے دوڑنا بند کر دیا تھا اور
بلدی جلدی چل رہا تھا۔ میں پٹیل کے ڈیرے سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا
ا۔ مگر جنگل گھنا ہونے کی وجہ سے میری رفتار سست پڑ گئی تھی۔ بار بار کوئی درخت یا
نگلی جھاڑیاں سامنے آ جاتی تھیں۔ اندھیرے جنگل میں اتنی دور نکل آنے پر مجھے
وف محسوس ہونے لگا۔ کسی جانب سے بھی کوئی درندہ نکل کر مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔
یں ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر ماحول کا
جائزہ لینے لگا۔ کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا کہ کسی طرف سے کسی جنگلی درندے
کی آواز تو نہیں آ رہی۔ جنگل میں اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ
یہاں کسی درخت کے اوپر بیٹھ کر رات گزار دیتا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ میں پٹیل کے
ڈیرے سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ ان کا ایک ساتھی بھی میری وجہ سے مر گیا ہے۔
پٹیل کے آدمی بندوق لے کر میری تلاش میں ضرور نکل پڑے ہوں گے انہیں جنگلوں
کا وسیع تجربہ ہے وہ مجھے یہاں تلاش کر لیں گے۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر چلنا شروع
کر دیا۔ ندی مجھ سے کچھ دور ہو گئی تھی۔ اب وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ جنگل میں

کوئی راستہ تو تھا نہیں - بس اندازے سے مشرق کی طرف منہ کر کے میں جھاڑیوں سے الجھتا گھاس کو پرے ہٹاتا چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے میں جنگل کے درمیان ایک کھلی جگہ پر پہنچ گیا۔ یہاں درخت فاصلے پر اگے ہوئے تھے اور اندھیرے میں تھوڑا تھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میں تیز تیز چلتا اس کھلی جگہ سے نکل گیا۔ سامنے پھر گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ میں تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ مجھے ایسی آواز کا شبہ سا ہوا جیسے کوئی انسان کراہ رہا ہے۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور آواز پر کان لگا دیئے۔

آواز کسی انسان کے درد سے کراہنے کی تھی اور کہیں قریب ہی سے آ رہی تھی۔ میں وہیں بیٹھا جنگل کے سناٹے اور اندھیرے میں اس آواز کو غور سے سننے لگا۔

ایسے لگتا تھا کہ کوئی زخمی ہے اور درد سے کراہ رہا ہے۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ مجھے اپنی جان بچانے کی فکر کرنی چاہئے اس وقت خود میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ لیکن انسان ہونے کے ناطے یہ مجھ سے گوارا نہ ہو سکا کہ ایک آدمی جنگل میں زخمی پڑا ہو اور میں اس کی کوئی مدد نہ کروں۔ کم از کم دیکھنا تو چاہئے یہ کون ہے اور اسے کس نے زخمی کیا ہے۔ یہ سوچ کر جدھر سے آواز آ رہی تھی میں اس کی طرف بڑھا۔ آواز تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد آتی تھی۔ آخر میں آواز کے تعاقب میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں رات کے اندھیرے میں ایک چبوترے کا دھندلا خاکہ سا نظر آیا۔ چبوترے کے اوپر بارہ دری سی بنی ہوئی تھی - انسان کے کراہنے کی آواز اسی بارہ دری میں سے آ رہی تھی۔

میں ہمت کر کے چبوترے کے پاس چلا گیا۔ مجھے ڈر بھی لگا کہ کہیں یہ کوئی چڑیل یا بھوت نہ ہو جو اس قسم کی آواز نکال کر جنگل سے گزرنے والوں کو اپنی طرف بلاتا ہو اور پھر انہیں کھا جاتا ہو۔ کراہنے کی آواز پھر آئی۔ آواز سے لگتا تھا کہ کوئی زخمی ہے اور درد کی شدت سے کراہ رہا ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ چبوترے پر چڑھنے کے لئے ایک طرف پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں اندھیرے میں غور سے دیکھ دیکھ کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ چبوترے پر بارہ دری کے پاس فرش پر مجھے ایک انسان لیٹا ہوا نظر آیا۔

درد کی وجہ سے وہ اپنا بازو اوپر اٹھاتا اور پھر نیچے گرا دیتا تھا۔ میں نے دور ہی اسے آواز دے کر پوچھا کہ وہ کون ہے اور اسے کیا ہوا ہے۔ زخمی نے کراہتے ہو جواب دیا۔

"مجھے جنگلی ریچھ نے زخمی کر دیا ہے۔ مجھے میرے خان بابا کے پاس لے چلو۔"

آواز آدمی کی نہیں کسی نوجوان لڑکے کی تھی۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گ اندھیرے میں جھک کر اسے دیکھا۔ واقعی یہ میری عمر کا ایک نوجوان لڑکا تھا جس کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ نچلا دھڑ خون میں لت پت تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ پر ہ لگایا تو لڑکے نے درد سے کراہتے ہوئے میرا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔

"خدا کے لئے یہاں ہاتھ نہ لگاؤ۔ مجھے اٹھا کر میرے خان بابا کے پاس لے جاؤ۔

"کیا تم مسلمان ہو؟" میں نے اس لڑکے سے پوچھا۔ کیونکہ اس نے خدا کا نام تھا۔

"ہاں میں مسلمان ہوں۔ میرے باپ کا نام بھورے خان ہے۔ وہ جنگل میں پرا تالاب کے پاس رہتا ہے۔ مجھے میرے بابا خان کے پاس لے چلو نہیں تو میں مر جا گا۔"

رات کا وقت۔ اجاڑ سنسان جنگل۔ چاروں طرف اندھیرا۔ لڑکا دبلا پتلا تھا مگر اس کا لمبا تھا جس کی وجہ سے دور سے دیکھنے پر مجھے لگا تھا کہ کوئی آدمی لیٹا ہوا ہ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

"پرانا تالاب یہاں سے کس طرف ہے اور کتنی دور ہے؟"

لڑکے نے کہا۔ "چبوترے سے اتر کر مشرق کی طرف چلو۔ آگے ایک خ برساتی نالا آئے گا اس کی دوسری جانب پرانا تالاب ہے۔ ہائے ریچھ نے میری ٹانگو پنجے مارے ہیں۔ خدا کا شکر ہے تم آ گئے۔ مجھے لے چلو۔"

لڑکا بار بار میری منت کر رہا تھا۔ اس کے جسم سے کافی خون بہہ چکا تھا جس وجہ سے اس کی آواز میں نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے اس کے بازو کے

ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر اس طرح ڈال لیا کہ اس کا سر اور بازو میری پشت پر اور ٹانگیں آگے کی جانب لٹکنے لگیں۔ لڑکے کا بوجھ زیادہ نہیں تھا۔ بوجھ زیادہ بھی ہوتا تو میں اسے اس کے بابا خان کے پاس لے جانے کا عہد کر چکا تھا۔ میں اس حالت میں اسے جنگل میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اگر وہ وہیں رہتا تو رات کے کسی حصے میں اس کے خون کی بو پر کوئی نہ کوئی جنگلی درندہ آ کر اسے ضرور ہڑپ کر جاتا۔

میں سنبھل سنبھل کر چبوترے سے نیچے اتر آیا اور مشرق کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ میرے سامنے کوئی سڑک یا پگ ڈنڈی تو تھی نہیں - جھاڑیوں اور جنگلی گھاس کے بیچ میں سے ہو کر گزر رہا تھا۔ میں نے چند قدم چلنے کے بعد لڑکے سے پوچھا۔

"تم آدھی رات کو جنگل میں ادھر کیوں آ گئے تھے؟"

لڑکے نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"میرے بابا خان نے آج رات واپس ڈیرے پر آنا تھا۔ میں نے سوچا میں جنگل میں آگے جا کر اپنے باپ سے ملتا ہوں۔ غلطی ہو گئی۔ بندوق ساتھ نہیں لایا۔ چبوترے کے پاس ریچھ نے حملہ کر دیا۔"

"تمہارے پاس بندوق بھی ہے؟"

"ہاں۔ ہم سب کے پاس بندوق ہوتی ہے۔"

مجھے کچھ تشویش ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا تم پولیس میں کام کرتے ہو؟"

"ہائے مجھ سے بولا نہیں جاتا۔ جلدی چلو میرے اللہ!"

اس کے بعد لڑکے کی آواز نہ آئی۔ میں نے دو تین بار اسے بلایا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ اسے آپ انسانی ہمدردی سمجھ لیں چاہے یہ سمجھ لیں کہ مجھ پر ایک مصیبت پڑ گئی تھی۔ اب مجھے ہر حالت میں اس لڑکے کو اس کے باپ کے پاس پہنچانا تھا۔ بندوق کے ذکر سے مجھے لگا کہ اس کا باپ پولیس کا کوئی افسر ہے پرانے تالاب کے پاس جنگل میں کوئی پولیس کی چوکی یا اس کا اپنا کوارٹر ہو

گا۔ ساتھ نوکر بھی ہوں گے جن کے پاس بندوقیں ہوں گی۔ دل میں سوچا کہ چلو یہ بھی اچھا ہے میں ان کی مدد سے عائشہ کو پٹیل کی قید سے رہائی دلا سکوں گا۔

اگرچہ لڑکا دبلا پتلا تھا اور اس کا کوئی زیادہ وزن بھی نہیں تھا پھر بھی اتنا بوجھ ضرور تھا کہ میرا سانس پھول گیا۔ میں سانس لینے کے لئے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ لڑکا بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے میں نے کاندھے پر ہی ڈال رکھا تھا۔ اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ جس ریچھ نے اس لڑکے پر حملہ کیا تھا کہیں وہ آس پاس ہی نہ ہو اور اچانک حملہ نہ کر دے۔ میں اس ڈر سے اٹھ کھڑا ہوا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ اندھیرے میں مجھے درختوں اور جھاڑیوں کے سلیٹی رنگ کے ہیولے ضرور نظر آ رہے تھے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ برساتی نالہ کہاں ہے۔ میں جھاڑیوں کو ایک ہاتھ سے پرے ہٹاتا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ سمت میں نے مشرق کی طرف قائم رکھی تھی۔ جنگلوں میں رات کے وقت چلنے پھرنے کا مجھے بھی تھوڑا بہت تجربہ ہو چکا تھا۔

ایک جگہ جھاڑیاں اچانک ختم ہو گئیں۔ میں نے رک کر آگے دیکھا۔ آگے ایک کھائی تھی۔ شاید یہی برساتی نالا تھا - اس کی دیواریں سیدھی نہیں تھیں۔ کافی ڈھلان تھی۔ میں نے بے ہوش لڑکے کو دوسرے کندھے پر ڈال لیا۔ میرا پہلے والا کندھا سن ہو گیا تھا۔ ڈھلان پر کافی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میں انہیں پکڑ پکڑ کر برساتی نالے کی ڈھلان اتر گیا۔ نالے کی تہہ میں پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اسی طرح جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر میں نالے کی دوسری ڈھلان بھی چڑھ گیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر میں تھک کر بیٹھ گیا۔ سانس پھول رہا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر سانس درست کیا اور دوبارہ آگے چل پڑا۔ میں نے اپنا رخ اسی طرف کر رکھا تھا جس طرف لڑکے نے بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے کہا تھا۔

اب مجھے پرانے تالاب کی تلاش تھی۔ خدا جانے یہ تالاب کہاں تھا۔ رات کو تالاب نظر بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ لیکن میں ہمت کر کے چلا جا رہا تھا۔ جنگل چھدرا ہونے لگا تھا۔ خالی زمین اندھیرے میں نظر آ

رہی تھی۔ دور مجھے درختوں کی سیاہی میں روشنی سی ٹمٹماتی دکھائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ لڑکے کا باپ کا یہی کواٹر ہے۔ میں اس روشنی کی سمت چلنے لگا۔ راستہ سیدھا نہیں تھا۔ کبھی جھاڑیوں کی وجہ سے مجھے دائیں طرف مڑنا پڑتا کبھی بائیں طرف مڑ جاتا۔ ٹمٹماتی ہوئی روشنی کبھی نظروں سے غائب ہو جاتی اور کبھی پھر نظر آنے لگتی۔

درخت ایک بار پھر قریب قریب آنے لگے تھے۔ میری نگاہ ٹمٹماتی روشنی پر تھی۔ اچانک وہ روشنی غائب ہو گئی۔ چند قدم چلنے کے بعد روشنی پھر نظر آنے لگی۔ یہ کسی لالٹین کی روشنی تھی جو کسی جگہ لٹکی ہوئی تھی۔ اچانک جھاڑیوں میں سے دو آدمی نکل کر میرے سامنے آ گئے۔

"کون ہو بے تم؟ یہ کس کو اٹھایا ہوا ہے؟"

میں رک گیا۔ مگر مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ میں نے بے ہوش لڑکے کو زمین پر ڈال دیا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گیا اور ہانپتے ہوئے کہا۔

"بھائیو اگر تم پولیس والے ہو تو یہ بھورے خان پولیس افسر کا بیٹا ہے۔ میں اسے جنگل سے اٹھا کر لایا ہوں۔"

ان دونوں آدمیوں کی آنکھیں لال لال تھیں۔ انہوں نے سروں پر ڈاٹھے باندھ رکھے تھے اور ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ یہ سنتے ہی انہوں نے لپک کر لڑکے کو اٹھا لیا اور زور زور سے آوازیں دیں۔

"او شبراتی' او دھنوا۔ ادھر آؤ بے خان جی کا بیٹا مل گیا ہے۔"

کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں سے دو تین آدمی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ان کے حلئے بھی ویسے ہی تھے اور ان کے پاس بھی بندوقیں تھیں۔ میرے دل میں شک سا پیدا ہوا کہ یہ لوگ پولیس کے آدمی نہیں لگتے۔

"یاخدا تیرا شکر ہے۔ ارے جلدی سے اسے ڈیرے پر لے چلو۔ ارے دھنوا! تو پلیا کی طرف جا اور خان جی کو خبر کر دے کہ چھوٹے خان جی مل گئے ہیں۔ بھاگ کر جا خان جی اس کی تلاش میں ادھر گئے ہیں۔"

ایک آدمی دوسری طرف کو دوڑا۔

انہوں نے بے ہوش لڑکے کو اٹھالیا تھا اور جس طرف روشنی ہو رہی تھی ادھر ا چلنے لگے۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ ایک نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھا۔

"کیوں بے چھوٹے خان کو کس نے زخمی کیا ہے - ہمیں بتا ہم ابھی اس کا کام تما کئے دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس پر ریچھ نے حملہ کیا تھا۔ یہ بڑا زخمی تھا۔ میں نے اس کے کراہنے کی آواز سنی تو اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے اپنا ٹھکانہ بتا دیا تھا۔ میں اسی طرف اسے لے کر جا رہا تھا۔"

اس آدمی نے زور سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"شاباش رے! تو نے بڑا کمال کر دکھایا چل۔ ہمارے ساتھ چل تو بھی۔"

پہلے تو میں نے سوچا کہ بھاگ جاؤں۔ پھر دیکھا کہ بھاگنے کا مقام نہیں تھا۔ اے میں مجھے ایک تالاب نظر آیا۔ تالاب اس طرح نظر آیا کہ دوسری جانب درختوں میں روشنی ہو رہی تھی اس کا عکس تالاب کے پانی پر پڑ رہا تھا۔ بے ہوش لڑکے کو اٹھا یہ لوگ تالاب کے دوسرے کنارے آ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ یہاں آ کر دیکھا کہ درختوں کے نیچے چھ سات چھولداریاں یعنی چھوٹے چھوٹے خیمے لگے ہو ہیں۔ یہاں اور بھی آدمی خیموں میں سے باہر نکل آئے۔ وہ بے ہوش لڑکے کو فو ایک چھولداری کے اندر لے گئے۔ میں وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چھولداریوں کے درمیان ایک درخت کے تنے کے ساتھ لالٹین روشن تھی۔ اندھیرے میں مجھے کچھ گھوڑوں کے کھر زمین پر مارنے اور کھر کھر کرنے کی آوازیں آئیں تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ یہ لوگ یقیناً کوئی ڈاکو تھے۔ مجھے اس لئے بھی ان سے خوف محسوس ہوا کہ میں نے ان کے سردار کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ وہ میرے ساتھ کسی قسم تشدد آمیز سلوک نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی ان کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن میں وہاں

بھاگنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

ایک آدمی پانی سے بھرا ہوا مٹی کا پیالہ لے کر میرے پاس آ گیا۔

"لے بے پانی پی لے۔ تو بڑا بہادر لڑکا ہے۔ کیا نام ہے تیرا؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ وہ ہنس کر بولا۔

"مسلمان کا بچہ ہے۔ جب ہی اتنا بہادر ہے۔"

میں نے پانی پیا تو کچھ جان میں جان آئی۔ اتنے میں دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی ہی دیر میں دو گھڑ سوار درختوں جھاڑیوں میں سے نمودار ہوئے۔ ایک گھڑ سوار جلدی سے گھوڑے پر سے چھلانگ لگا کر اترا۔ اس کے کاندھے پر بندوق لگی تھی۔ اس نے پکار کر پوچھا۔

"کہاں ہے میرا بیٹا؟"

دوسرے آدمی اسے اور دوسرے گھڑ سوار کو چھولداری میں لے گئے۔ یہ پہلے والا اونچا لمبا بھاری بھرکم ڈیل ڈول والا آدمی اس زخمی لڑکے کا باپ اور ڈاکوؤں کا سردار بھورے خان ہی ہو سکتا تھا۔ میں اکیلا پتھر پر بیٹھا تھا۔ یہ لوگ کافی دیر تک چھولداری کے اندر رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکے کی مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ پھر بھورے خان چھولداری سے نکل کر باہر آیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈال کر پوچھا۔

"ابے شبراتی! وہ لڑکا کہاں ہے جو میرے بیٹے کو جنگل سے اٹھا کر لایا ہے؟"

شبراتی بھورے خان کو میرے پاس لے آیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھورے خان کو سلام کیا۔ اس نے میرے سلام کا جواب دیا ور مجھے گھور کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دونوں بازو کھول کر مجھے اپنے ساتھ لگا کر بھینچ لیا۔ اس کی کمر کے ساتھ کارتوسوں کی جو بیلٹ بندھی تھی وہ میری پسلیوں میں چبھنے لگی۔ میں نے سانس روک لیا۔

بھورے خان نے مجھے بھرپور انداز میں دو تین بار تھاپی دی اور کہا۔

"بیٹا تو نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ چل آ میرے ساتھ خیمے میں آ جا۔"

بھورے خان کے خیمے میں بھی ایک لیمپ روشن تھا۔ زمین پر چٹائی بچھی تھی۔ کونے میں پانی کی صراحی سلور کے گلاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دوسرے کونے میں چھ سات بندوقیں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ چٹائی پر گاؤ تکیئے ادھر ادھر پڑے تھے۔ بھورے خان نے اپنی بندوق اور میگزین کی بیلٹ اتار کر دیوار سے لٹکا دی اور چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھاری تن و توش کا آدمی تھا۔ آنکھوں کا رنگ گہرا بادامی تھا۔ بھنوئیں گھنی تھیں۔ چوڑے ناک کے نیچے بڑی بڑی مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ ایک آنکھ کے پاس زخم کا لمبا نشان نیچے تک آیا ہوا تھا۔ سیاہ بالوں کے پٹے تھے اس نے صدری اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ میں نے لڑکے کا حال پوچھا تو وہ ہنس کر بولا۔

"ارے وہ بھورے خان کا بیٹا ہے۔ کچھ نہیں ہوتا اسے۔ ریچھ نے ران کا گوشت پنجے مار مار کر ادھیڑ ڈالا ہے۔ ہمارے وید جی نے مرہم لگا دیا ہے۔ صبح تک ہوش آ جائے گا۔ اچھا یہ بتا تو کون ہے اور تو جنگل میں رات کے وقت کیا کر رہا تھا؟ مجھے تو تو پولیس کا بھیجا ہوا آدمی لگتا ہے جو میری ٹوہ میں ادھر آیا تھا۔"

میں کچھ کہنے لگا تو بھورے خان ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے سر کے بالوں میں زور سے ہاتھ پھیر کر بولا۔

"ابھی تو سو جا۔ صبح تم سے باتیں ہوں گی۔ کچھ بھی ہو تو نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ ورنہ پولیس کا بھیجا ہوا کوئی آدمی بھورے خان کے ٹھکانے سے زندہ بچ کر نہیں گیا۔"

وہ چھولداری سے نکلتے ہوئے رک گیا۔ میری طرف پلٹ کر دیکھا اور پوچھا۔

"ارے تجھے بھوک تو نہیں لگی؟"

پھر ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کم بخت کو بھی مجھ پر پولیس کے آدمی ہونے کا شک ہو رہا تھا۔ خیر ایسی کوئی بات نہیں۔ ڈاکوؤں کی کمین گاہ کے آس پاس کوئی اجنبی چلتا پھرتا پکڑا جائے تو ڈاکو یہی سمجھتے ہیں کہ اسے پولیس نے ان کا سراغ لگانے کے لئے بھیجا ہو گا۔ بہرحال اس بات کا مجھے اطمینان تھا کہ یہ لوگ مجھے

کچھ نہیں کہیں گے۔

میں وہیں چٹائی پر لیٹ گیا۔ اتنے میں چھولداری کا پردہ ہٹا اور ایک آدمی میرے لئے روٹیاں لے آیا۔ تین روٹیاں تھیں جن پر بھنے ہوئے مرغ یا مرغی کی دو ٹانگیں رکھی تھیں۔ روٹیوں کی چنگیر میرے سامنے رکھ کر وہ آدمی یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ پانی صراحی میں سے پی لینا۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ بڑے مزے سے دو روٹیاں بھنے ہوئے مرغ کے ساتھ کھائیں۔ پانی پیا اور گاؤ تکئے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ کچھ بھورے خان کے بیٹے کا بوجھ اٹھانے سے اور کچھ پٹیل کے آدمیوں نے میری جو پٹائی کی تھی اس سے جسم سخت درد کر رہا تھا۔ پیٹ بھر کر کھانا اور سونے کو آرام دہ جگہ ملی تو لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب کافی دن نکل آیا تھا۔ چھولداری کے پردے میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ باہر بھورے خان کے آدمیوں کے چلنے پھرنے ایک دوسرے سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ آسمان پر سے بادل اتنے دنوں کے بعد چھٹ گئے تھے اور دھوپ درختوں میں سے چھن چھن کر نیچے آ رہی تھی۔ بھورے خان ایک درخت کے نیچے بانس کی کھاٹ پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ دو ڈاکو اس کے پیچھے بندوقیں اٹھائے کھڑے تھے۔ ایک ڈاکو اس کے پاؤں کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ بھورے خان نے مجھے دیکھا تو دور سے آواز دے کر بلایا۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا تو اس نے مجھے اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیا اور جو آدمی زمین پر بیٹھا تھا اسے کہا۔

"جا بے - لڑکے کے لئے ناشتہ لے آ۔"

وہ آدمی چلا گیا تو بھورے خان میری طرف متوجہ ہوا۔

"تم نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا تو اس نے میرا نام لے کر کہا۔

"دیکھ بے! تو نے میرے بیٹے کی جان بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو

میں ضرور چکاؤں گا ہی۔ لیکن تجھے بھی بتانا ہو گا کہ پولیس نے تجھے میرا سراغ لگانے کے لئے اکیلا بھیجا تھا یا تیرے ساتھ کوئی اور بھی خفیہ والوں کا آدمی تھا۔"

پھر اس نے اپنے باڈی گارڈوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"لو جی اب پولیس والوں نے نوجوان لڑکوں کو بھی میری جاسوسی کرنے کے لئے بھرتی کر لیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "خان جی! میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے کسی پولیس نے نہیں بھیجا۔ میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔"

بھورے خان کی بھنوئیں چڑھ گئیں۔

"تو پھر آدھی رات کو تو جنگل میں کیا کرتا پھر رہا تھا؟"

بھورے خان نے اپنے ایک آدمی کو آواز دے کر بلایا اور کہا۔

"ذرا اس لڑکے کی تلاشی تو لو۔"

اس آدمی نے میری تلاشی لی۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اب وقت آگیا ہے کہ میں اس آدمی کے آگے پوری کہانی کھول کر بیان کر دوں۔ میں نے کہا۔

"خان جی! اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں آدھی رات کو جنگل میں کیا کر رہا تھا تو پھر سنئے۔ میں آپ کو شروع سے آخر تک سب کچھ سچ سچ بتائے دیتا ہوں۔ آپ کو اختیار ہو گا کہ میری داستان سن کر اس پر اعتبار کریں یا نہ کریں۔"

میں نے مختصر الفاظ میں بھورے خان کو اپنی ساری داستان بیان کر دی۔ ٹھاکر ڈاکو اور رام دلاری کا بھی ذکر کیا کہ کس طرح میں اسے ڈاکوؤں کے ڈیرے سے نکال کر لایا۔ اس کے بعد بمبئی آنے اور بمبئی کے بڑے مندر کا ذکر کیا اور اسے بتایا کہ کس طرح مندر کے بڑے مہنت نے بمبئی کے ایک غریب مسلمان محنت کش کی بیٹی عائشہ کو اغوا کروا کر مندر کی کوٹھڑی میں بند کر دیا اور پھر میں نے کیسے اسے وہاں سے نکال کر اس کے ماں باپ کے پاس پہنچایا اور کمینے مہنت نے کس طرح اس غریب بے کس و

ر مسلمان لڑکی کو پولیس کے ذریعے وہاں سے بھی اٹھوایا اور گنگولی نام کے ایک حاش پجاری کے ہاتھ بیچ دیا جو اسے لے کر چاردھا سٹیٹ کی طرف نکل گیا۔ پھر میں ں طرح مسلمان لڑکی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا اور کس طرح بیروگڑھ سے نانده ، قصبے میں پہنچا۔ کیونکہ مجھے خبر ملی تھی کہ بیروگڑھ کے پٹیل نے لڑکی کو گنگولی سے ید کر نانده کے جنگل میں اپنے ڈیرے پر قید کر رکھا ہے۔

میں نے شروع سے آخر تک ساری کہانی بیان کر دی اور اسے بتایا کہ کس طرح ں کے آدمی مجھے ہلاک کرنے کے لئے ٹیلے پر لے گئے۔ پھر کس طرح میں وہاں سے ن بچا کر بھاگا اور جنگل کے اندھیرے میں ایک جگہ سانس لینے کے لئے رکا تھا کہ مجھے ی انسان کے کراہنے کی آواز آئی۔

"وہ آپ کا بیٹا چھوٹے خان جی تھا - وہ سخت زخمی تھا اور خون کافی بہہ چکا تھا۔ ں وقت آپ کا بیٹا ہوش میں تھا۔ اس نے مجھے آپ کے ڈیرے کا ٹھکانہ بتایا اور میں ے کاندھے پر ڈال کر آپ کے ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ آگے جو کچھ ہوا وہ آپ ، آدمیوں نے آپ کو بتا دیا ہو گا۔"

جب میں بھورے خان کو اپنی داستان سنا رہا تھا تو اس کی بھوری آنکھوں والے خت چہرے پر بدلتے ہوئے تاثرات کا بھی مشاہدہ کر رہا تھا۔ جب اس نے میری زبانی ا کہ پٹیل نے ایک مسلمان لڑکی کو اپنے ڈیرے پر قید کر رکھا ہے تو اس کی بھوری کھوں میں شعلے سے چمکنے لگے تھے۔ جب میں نے اپنی ساری کہانی سنا ڈالی تو بھورے ن نے میرا گریبان پکڑ لیا۔

"کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟"

میں نے فوراً جواب دیا۔

"اگر اس میں ذرا بھی جھوٹ نکلے تو بے شک مجھے شوٹ کر دیں۔"

بھورے خان نے میرا گریبان چھوڑ دیا۔ چارپائی سے اچھل کر اٹھا اور اپنے باڈی ڈ کی طرف دیکھ کر غضب ناک آواز میں بولا۔

"ہم ابھی پٹیل کے بھٹوں پر جائیں گے گھوڑے نکالو۔"

باڈی گارڈ نے دبی زبان میں کہا۔

"خان جی! ذرا اندھیرا ہو لینے دیں۔"

بھورے خان نے باڈی گارڈ کو زور سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"مسلمان لڑکی کی عزت سولی پر لٹکی ہوئی ہے اور تم کہتے ہو ذرا اندھیرا ہو لینے دو۔"

یہ کہہ کر بھورے خان اپنی چھولداری میں گھس گیا۔ باہر آیا تو میگزین کی بیلٹ باندھ رہا تھا اور بندوق اس کے کاندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے گرج کر حکم دیا۔

"گھوڑے نکالو۔"

پھر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔"

بھورے خان ڈاکو کے ڈیرے سے تین گھوڑے اپنی منزل کو روانہ ہوئے۔ ایک گھوڑے پر بھورے خان بیٹھا تھا۔ دوسرے گھوڑے پر اس کا ساتھی ڈاکو سوار تھا اور تیسرے گھوڑے پر میں تھا۔ تینوں گھوڑے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ گھنے جنگل میں وڑے قدم قدم چلتے جب ایک کھلی جگہ پر آئے تو بھورے خان نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا دوڑنے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہمارے گھوڑے بھی دوڑنے لگے۔ جس گھوڑے پر میں بیٹھا تھا وہ اپنے ساتھیوں کی بو پر اپنے آپ راستہ بناتا دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا مگر دن کی روشنی کافی تھی۔ ہم جنگل کے ایک شارٹ کٹ یعنی آسان راستے سے گزر کر نانده کے جنگل میں آ گئے۔ بھورے خان نے گھوڑے کو روک لیا اور اپنے ساتھی ڈاکو سے کہا۔

"پٹیل کا بھٹہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ بندوق تیار رکھنا۔"

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو نانده کے گھنے جنگل میں ڈال دیا۔ یہ لوگ جنگل میں جس راستے سے آئے تھے وہ میرے لئے اجنبی تھا۔ جب ہمارے گھوڑے ایک پرانے تالاب کے قریب سے گزرے تو مجھے کچے کوئلوں کی بو آئی۔ ہمارے گھوڑے قدم قدم چلتے گھنی جھاڑیوں اور درختوں کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ بھورے خان نے رائفل کاندھے پر ڈال رکھی تھی۔ جب وہ ندی ہم نے پار کی جس کی دوسری طرف پٹیل کا

جنگل والا مکان اور کوٹلوں کا بھنہ تھا تو بھورے خان گھوڑے سے اتر پڑا۔ ہم نے گھوڑے ایک جگہ باندھ دیئے بھورے خان میری طرف متوجہ ہوا۔ آہستہ سے بولا۔

"پٹیل کی کوٹھڑی کس طرف ہے؟ اس کا بھنہ تو ان درختوں کے پیچھے ہے۔"

میں نے کہا۔ "کوٹھڑی ندی کے کنارے پر ہے۔"

بھورے خان نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد پٹیل کے مکان کی دیوار دکھائی دی۔ میں نے اس طرف اشارہ کیا تو بھورے خان نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے ایک طرف ہونے کو کہا۔ میں جلدی سے دیوار کے کونے والے درخت کے تنے کے پیچھے ہو گیا۔ یہاں سے مجھے پٹیل کے مکان کے سامنے والا صحن صاف نظر آ رہا تھا۔ یہاں پٹیل کے تین غنڈے بڑے اطمینان سے بیٹھے شاید دارو پی رہے تھے۔

بھورے خان اور اس کا ساتھی ڈاکو موت کے فرشتے بن کر ان کے سر پر پہنچ چکے تھے۔

میں نے دیکھا کہ دونوں ڈاکو مکان کی دوسری دیوار سے نکل کر اچانک ان غنڈوں کے سامنے آ گئے۔ بھورے خان کی رائفل سے دو بار شعلے نکلے۔ دو دھماکے ہوئے اور دو غنڈے زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ تیسرے کی گردن پر دوسرے ڈاکو نے بندوق کی نالی لگائی اور پوچھا۔

"کہاں ہے پٹیل؟"

اتنے میں مکان کے اندر سے بندوق کا فائر آنے لگا۔ اس دوران بھورے خان مکان کے پیچھے جا چکا تھا۔ اس کے ساتھی ڈاکو نے تیسرے غنڈے کی گردن میں بندوق کا [illegible] کر دیا۔ وہ گرا۔ ساتھی ڈاکو چھلانگ لگا کر ایک درخت کے پیچھے زمین پر پیٹ کے بل لیٹ گیا اور مکان کے دروازے کی جانب گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ بھورے خان کی آواز جنگل میں گونجی۔

"پٹیل! جان کی سلامتی چاہتا ہے تو باہر نکل آ۔ میں بھورے خان بول رہا ہوں۔ میرے آدمیوں نے تیرے ڈیرے کو گھیرے میں لے لیا ہوا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی بھورے خان کی رائفل نے اوپر تلے تین چار فائر کر دیئے۔ اس کا ساتھی ڈاکو پہلے ہی فائرنگ کر رہا تھا۔ جنگل رائفل اور بندوق کے دھماکوں سے گونج رہا تھا۔ بھورے خان کے الفاظ نے اپنا کام دکھا دیا۔ چند لمحوں بعد ہی میں نے دیکھا کہ پٹیل اپنے دو باڈی گارڈ غنڈوں کے درمیان ہاتھ اوپر اٹھائے کانپتا ہوا مکان میں سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ اس کے باڈی گارڈز نے اپنی بندوقیں نیچی کر رکھی تھیں۔

بھورے خان نے دیوار کی اوٹ سے بلند آواز میں دونوں باڈی گارڈز کو حکم دیا کہ بندوقیں پھینک دو۔ دونوں غنڈوں نے بندوقیں پھینک دیں۔ بھورے خان رائفل پکڑے دیوار کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس کا ساتھی ڈاکو درخت کے تنے کے پیچھے ہی گھات لگائے لیٹا رہا۔

بھورے خان نے پٹیل کے دونون محافظ غنڈوں کو زمین پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ جیسے ہی وہ زمین پر بیٹھے بھورے خان کی رائفل نے پے در پے دو فائر کئے۔ دونوں غنڈے وہیں اوندھے ہو کر گر گئے۔ پٹیل تو تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے سامنے اس کے پانچ محافظ غنڈوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اور بھورے خان اس کی موت کا پیغام لئے موجود تھا۔

بھورے خان نے اپنے ساتھی کو آواز دے کر پاس بلایا اور پٹیل کی توند پر رائفل کی نالی لگاتے ہوئے پوچھا۔

"مسلمان لڑکی کہاں ہے؟"

پٹیل ہاتھ جوڑے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں اس نے کہا۔

"اندر -- اندر ہے گورودیو!"

اب بھورے خان نے مجھے آواز دی کہ آ جاؤ۔ میں قریب آیا تو بھورے خان نے مجھے کہا۔

"اندر جا کر لڑکی کو پہچانو اور باہر لے آؤ۔"

میں جلدی سے مکان کے چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بمبئی کی جھونپڑیوں کی بستی والی لڑکی عائشہ سہمی ہوئی دیوار کے ساتھ لگ کر زمین پر بیٹھی

ہے۔ مجھے دیکھا تو اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ حیران ہو کر بولی۔

"خدا کے لئے مجھے یہاں سے لے چلو۔ یہ گولیاں کیوں چل رہی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "سب کچھ بتا دوں گا۔ ابھی تم میرے ساتھ باہر آؤ۔"

میں اسے باہر لے آیا اور بھورے خان سے کہا۔

"یہی عائشہ ہے۔ میں اسے پہچانتا ہوں۔"

بھورے خان نے اپنے ساتھی ڈاکو سے کہا۔

"کیوں بھئی اس پٹیل کو کیا سزا ملنی چاہئے؟"

ساتھی ڈاکو نے کہا۔

"خان جی میرا تو خیال ہے کہ اسے چھوڑ دیں۔"

بھورے خان نے رائفل پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں یار میرا بھی یہی خیال ہے کہ اسے معاف کر دیتے ہیں۔ جا بے پٹیل۔ تجھے معاف کیا۔ جا مکان کے اندر چلا جا۔"

پٹیل کو تو یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں بھی حیران تھا کہ بھورے خان نے اسے کیوں معاف کیا ہے۔ پٹیل نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر بھورے خان کا شکریہ ادا کیا اور شکریہ ادا کرتا ہوا واپس مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی اس نے پیٹھ موڑی بھورے خان کی رائفل نے شعلہ اگلا۔ دھماکے کے ساتھ گولی بدمعاش پٹیل کی کمر میں سوراخ ڈالتی اس کے پیٹ کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ پٹیل منہ کے بل گرا اور اپنے ہی خون میں لت پت ہو کر ٹھنڈا ہو گیا۔

عائشہ میرے پاس کھڑی خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ بھورے خان نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بیٹی اس کافر کو اس کے گناہوں کی سزا ملی ہے۔ گھبراؤ مت۔ تجھے تیرے ماں باپ کے پاس پہنچا دیں گے۔"

وہیں سے پٹیل کی ایک گھوڑی کھول کر اس پر عائشہ کو بٹھایا اور ہمارا قافلہ واپس

روانہ ہو گیا۔ ڈیرے پر آ کر بھورے خان نے عائشہ سے کہا۔

"بیٹی! تو میری بیٹی کی طرح ہے۔ سمجھ لے تو اپنے باپ کے ڈیرے پر آ گئی ہے۔"

عائشہ کو الگ چھوٹا سا خیمہ دے دیا گیا۔ باہر ایک آدمی کا پہرہ لگا دیا گیا۔ بھورے خان نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے اس بچی کے ماں باپ کس شہر میں رہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے۔ میں ان سے مل کر اس جنگل میں آیا تھا۔"

پھر میں نے بھورے خان کو شہر کا نام اور محلے کا سارا پتہ بتا دیا۔ بھورے خان نے عائشہ سے اس کی تصدیق کی - عائشہ نے کہا۔

"ہاں اس شہر میں میری ایک خالہ رہتی ہے۔ میرے ابا امی بمبئی چھوڑ کر یہیں آ گئے ہوں گے۔"

دوسرے روز بھورے خان نے ہمارے ساتھ اپنے دو آدمی کر دیئے۔ یہ دونوں بڑے خونی ڈاکو تھے۔ مگر انہوں نے بڑا شریفانہ لباس پہن لیا تھا۔ مگر اپنے شریفانہ لباس کے اندر انہوں نے ایک ایک ریوالور ضرور رکھ لیا تھا۔ ہم صبح صبح عائشہ کو لے کر ڈیرے سے نکلے۔ چاردھا گاؤں سے ہم بس میں سوار ہو کر ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ وہاں سے ایک پسنجر ٹرین میں سوار ہوئے۔ راستے میں ایک ٹرین بدلنی پڑی۔ شام ہو رہی تھی جب ہم عائشہ کی خالہ کے شہر میں داخل ہوئے۔ عائشہ کو اپنی خالہ کے گھر کا پتہ معلوم تھا۔ میں نے بھی مکان دیکھا ہوا تھا۔ جب ہم عائشہ کو لے کر گھر میں داخل ہوئے تو عائشہ کا باپ اور ماں اور خالہ عائشہ کو دیکھ کر رونے لگ پڑے یہ خوشی کا رونا تھا۔ ماں تو بار بار اپنی بیٹی کو سینے سے لگاتی اور خدا کا شکر ادا کرتی۔ انہوں نے ہمارا بے حد شکریہ ادا کیا۔ ہمارے لئے بیٹھک میں زمین پر بستر لگا دیئے گئے۔ غریب آدمی تھے۔ بستر کیا لگانے تھے۔ بس دری بچھا کر سرہانے رکھ دیئے گئے۔ عائشہ کے باپ کو میں نے خونی ڈاکوؤں کی بابت بھی بتلایا کہ یہ گاؤں کے شریف دیہاتی ہیں۔ انہوں نے عائشہ کو

بدمعاش پٹیل کے گھر سے نکلوانے میں میری بڑی مدد کی ہے اور اپنی حفاظت میں لڑکی کو یہاں تک لائے ہیں۔

دونوں خونی ڈاکو چپ تھے۔ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ ہر بات کا جواب ہوں ہاں میں دیتے اور خاموش رہتے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد ہم بیٹھک میں سونے لگے تو ایک خونی ڈاکو نے مجھ سے پوچھا۔

"ہم منہ اندھیرے چلے جائیں گے۔ کسی سے ملیں گے نہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم اس طرح چلے گئے تو میں میزبان کو کیا کہوں گا کہ مہمان راتوں رات کہاں غائب ہو گئے؟"

دونوں ڈاکو اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے گھورنے لگے۔ دوسرے ڈاکو نے کہا۔

"ہم تمہارے میزبان کے نوکر نہیں ہیں کہ ان سے اجازت مانگ کر جائیں۔"

پہلے والا ڈاکو اپنے ریوالور کو سرہانے کے نیچے رکھتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"میں بھی واپس اپنے گھر پنجاب چلا جاؤں گا۔"

اس نے مجھے بڑی مزیدار پیش کش کی - کہنے لگا۔

"تم ہماری ٹولی میں کیوں نہیں شامل ہو جاتے؟ پنجاب کے لوگ بڑے جی دار ہوتے ہیں۔ بہادر ہوتے ہیں۔ تم بڑی اچھے ڈاکو بن سکتے ہو۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"میں ڈاکو نہیں بننا چاہتا۔"

"تو پھر کیا بننا چاہتے ہو؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"میں ڈاکٹر بن کر قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ ایک بولا۔

"ڈاکٹر تو ہم سے زیادہ خونی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہر ڈاکٹر ایسا نہیں ہوتا۔"

دوسرے ڈاکو نے کہا۔

"میری نصیحت مانو اور ہمارے گروہ میں شامل ہو کر ڈاکو بن جاؤ۔ ہمارے علاقے ں ڈاکوؤں کا مستقبل بڑا شاندار بن جاتا ہے۔ ویسے بھی اس علاقے میں ڈاکوؤں کی ی مانگ ہے۔ غریب لوگ تو ڈاکوؤں کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

" ابھی تو میں اپنے وطن پنجاب جاؤں گا۔ اگر وہاں جا کر ڈاکو بننے کا خیال آیا تو بدھا بھورے خان کے ڈیرے پر پہنچ جاؤں گا۔"

میری بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ دونوں ڈاکوؤں کے خراٹوں کی آوازیں گونجنے یں۔ اس کے بعد میں بھی سو گیا۔ رات کے پچھلے پہر کسی نے میرا کندھا ہلا کر مجھے ٹا دیا۔ بیٹھک کی بتی جل رہی تھی۔ دونوں ڈاکو واپس جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ س ڈاکو نے میرا کاندھا ہلایا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"ریل کا کرایہ ہے؟"

حقیقت یہ تھی کہ مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا - میں نے جیبیں ٹٹول کر دیکھا۔ یرے پاس چار پانچ روپے ہی باقی رہ گئے تھے اسی ڈاکو نے مجھے بیس روپے دیئے اور ہا۔

"یہ اپنے پاس رکھو۔ ان پیسوں میں پنجاب پہنچ جاؤ گے۔"

اس کے بعد انہوں نے ریوالور کھول کر چیک کئے۔ انہیں اپنی قمیضوں کے اندر ھپایا اور مجھ سے سلام دعا لئے بغیر بیٹھک سے باہر گلی میں نکل گئے۔ اسی رات میں ی عائشہ کی خالہ کے گھر سے اپنے وطن کے لئے روانہ ہو گیا۔ عائشہ کا باپ مجھے ٹیشن تک چھوڑنے آیا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ میرے بیٹے تم کو خدا نے رحمت کا

فرشتہ بنا کر ہمارے گھر بھیج دیا تھا۔ اگر تم نہ ہوتے تو ہماری بیٹی خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ میں اسے یہی کہتا کہ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوا ہے۔ اگر وہ مجھے توفیق عطا نہ کرتا تو میں کبھی اتنی ہمت نہ کر سکتا تھا۔

رات کے نو بج رہے تھے کہ میری ٹرین دلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ دلی سے مجھے پنجاب کے لئے دوسری ٹرین پکڑنی تھی۔ اگلے دن صبح کے وقت میں دلی پہنچ گیا۔ وہاں سے ایک گھنٹے بعد میں پنجاب میل میں جسے اس زمانے میں طوفان میل بھی کہا کرتے تھے بیٹھا اور اپنے شہر امرتسر پہنچ گیا۔ گھر والے اس دوران مجھے نہ جانے کہاں کہاں تلاش کر کر کے تھک چکے تھے۔ ویسے انہیں میری آوارہ گرد سیلانی طبیعت کا علم تھا لیکن اتنی دیر میں کبھی گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ جب میں نے انہیں اپنے سفر کی الف لیلے کی داستان سنائی تو کسی کو یقین نہ آیا۔ میرے دوست بڑے مزے لے لے کر ڈاکوؤں کے واقعات سنتے رہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری عالمگیر جنگ اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ اس وقت جاپان جنوب مشرقی ایشیا میں آگے بڑھتا ہوا آسام کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا۔ جاوا سماٹرا' فلپائن اس کے قبضے میں آ چکے تھے۔ مگر ہندوستان پر جنگ کی تباہ کاریوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔ بلکہ یہاں کے لوگ فوجی میٹریل کی سپلائی کے ٹھیکے لے کر بڑے امیر بن گئے تھے اور ملٹری کنٹریکٹرز کا ایک نیا امیر طبقہ پیدا ہو گیا تھا جن کے ہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ کچھ روز میں امرتسر میں رہا۔ اس کے بعد پھر میرے پاؤں میں کھجلی ہونے لگی۔ پاؤں میں جو چکر پڑا تھا وہ گردش میں آ گیا۔ اور میں ایک روز چپکے سے گھر سے نکل کر امرتسر کے ریلوے سٹیشن پر پہنچا اور پشاور سے آنے والی فرنٹیئر میل میں بیٹھ کر دلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس بار میری منزل کلکتہ تھی۔ کلکتے میں اس سے پہلے بھی تین چار مرتبہ جا چکا تھا۔ وہاں ہمارے کچھ رشتے دار کشمیری شالوں کا دھندا کرتے تھے۔ مگر میں ان کے ہاں جا کر ٹھہرتا نہیں تھا۔ ٹھہرتا میں اپنے ایک دوست کے پاس تھا۔ میرے اس دوست کا

نام جان تھا۔ پورا نام مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ کیا تھا۔ جان محمد یا محمد جان تھا۔ بہرحال میں اسے جان ہی کہتا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے تھوڑا بڑا تھا اور کلکتے میں اپنے بڑے بھائی کے پاس اس کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس کا بھائی ہانگ کانگ سنگاپور سے سیلولائیڈ کی شیٹیں منگوا کر پنجاب کے شہروں میں سپلائی کرتا تھا۔ اس کا کلکتے کے مشہور بازار لوئر چت پور روڈ کی سراج بلڈنگ میں دفتر تھا۔ وہیں ایک کمرے میں اس کی رہائش بھی تھی۔

جن دنوں میں بمبئی کے جنگلوں کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے سفر کے بعد کلکتے پہنچا تو ان دنوں جان کے بڑے بھائی کی فیملی نیپال گئی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر جان بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"تم کب آئے۔ خط لکھ کر بتا دیتے میں سٹیشن پر لینے آ جاتا۔"

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"خط لکھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ تھوڑی دیر پہلے خیال آیا کہ کلکتے کی سیر کی جائے اور سٹیشن پر آ کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ تم سناؤ۔ بھائیجان کی فیملی کہاں ہے؟"

جان اس وقت دری پر بیٹھا سیلولائیڈ کی شیٹیں گن رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"وہ تو سارے نیپال گئے ہوئے ہیں۔ یہاں کلکتے میں بڑی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں کہ جاپان کی فوجیں کلکتے پہنچنے والی ہیں۔ انگریز یہاں سے بھاگ رہا ہے۔ بھابی اپنے بچوں کے ساتھ گھبرا رہی تھی۔ بھائی جان نے کہا کہ امرتسر جا کر کیا کرو گی۔ نیپال چلے چلتے ہیں۔ وہاں اپنا مکان بھی ہے۔ بس وہ نیپال چلے گئے۔ تم بتاؤ کھانا کھایا ہے کہ میں بازار سے منگواؤں؟"

میں نے کہا۔ "کھانا میں نے بردوان کے سٹیشن پر ہی کھا لیا تھا۔"

"تمہارا سامان کہاں ہے؟"

جان نے مجھ سے سوال کیا۔ پھر خود ہی اپنے سوال پر شرمسار سا ہو کر بولا۔

"میں بھول گیا تھا کہ سامان تو تم کبھی ساتھ لے کر نہیں چلتے۔ ذرا ٹھہرو۔ تھوڑا

کام باقی رہ گیا ہے۔ ابھی امجدیہ ہوٹل چل کر چائے پیتے ہیں۔"

جو لوگ پاکستان بننے سے پہلے کلکتے میں رہے ہیں انہیں معلوم ہو گا کہ امجدیہ ہوٹل کلکتے کی بھاری مسلم اکثریت والی آبادی ذکریا سٹریٹ میں واقع تھا۔ یہاں کی مسلم اکثریت میں بنگالی مسلمانوں کے علاوہ پنجاب کے خاص طور پر امرتسر کے شال باف' شال مرچنٹ کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ہمارے رشتے دار بھی ذکریا سٹریٹ میں ہی رہتے تھے۔ میں ان سے سلام دعا لینے ایک آدھ بار ضرور چلا جاتا تھا مگر ان کے ہاں ٹھہرا کبھی نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے بگڑا ہوا آوارہ لڑکا سمجھتے تھے اور اکثر طنزیہ انداز میں مجھ سے بات کرتے۔ مثلاً مجھے دیکھتے ہی کہتے۔

"اچھا آ گئے ہو گھر سے بھاگ کے؟ آپو جی کو بتا کر آئے ہو کہ نہیں؟ کلکتے سے واپسی کا کرایہ ہے کہ نہیں؟"

چنانچہ اس بار بھی میں کلکتے گیا تو اپنے دوست جان کے پاس ہی ٹھہرا۔ بلکہ میں نے رشتے داروں کے ہاں جانے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ جان جب کام سے فارغ ہو گیا تو ہم ذکریا سٹریٹ والے امجدیہ ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس ہوٹل کا کھانا اور چائے بڑی مشہور تھی۔ ہم نے چائے پی اور امرتسر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے جان کو اپنے بمبئی والے ایڈونچر کی باتیں سنائیں تو اسے بالکل یقین نہ آیا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر بولا۔

"گپ نہ لگایا کرو۔"

ہم نے اسی روز دوپہر کے بعد دریا کی سیر کا پروگرام بنا لیا۔ کلکتے میں دریائے ہگلی بہتا ہے۔ اس کا اصل نام دریائے جمنا ہے مگر کلکتے آتے آتے اس کا نام ہگلی پڑ جاتا ہے۔ گنگا کی طرح ہندو لوگ اس دریا کو بھی مقدس سمجھتے ہیں اور درگا پوجا کے تہوار پر درگا دیوی کے بانس اور کاغذ کے بنے ہوئے بت اسی دریا میں بہاتے ہیں۔

مئی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ پنجاب میں تو اس مہینے میں گرم لوئیں چلتی ہیں مگر بنگال میں یہ مون سون کا موسم ہوتا ہے اور بارشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس روز بھی

سمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہم دریا پر پہنچے تو بڑی خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی ی۔ یہاں پر دریا کا ایک گھاٹ بھی تھا وہاں سے ہم نے ایک کشتی کرائے پر لی۔ بنگالی ح ساتھ ہی تھا۔ ہم کشتی میں بیٹھے دریا کا نظارہ کرنے لگے۔ گھاٹ پر لوگ دریا میں لانگیں بھی لگا رہے تھے۔ حالانکہ دریا مون سون کے سیزن میں چڑھا ہوا ہوتا ہے مگر الی لڑکے بڑے ماہر تیراک ہوتے ہیں۔ ہم کشتی میں ایک بار دریا کے دوسرے کنارے گئے پھر واپس آ گئے۔ ابھی ہماری کشتی گھاٹ کے پاس ہی تھی کہ ایک جانب اچانک ر بلند ہوا۔ لوگ بنگلہ زبان میں مدد کے لئے پکار رہے تھے۔ ہم نے اس طرف دیکھا ہ ایک لڑکا دریا میں ڈوب رہا تھا۔ وہ سر باہر نکال کر زور سے ہاتھ ہلاتا اور دریا کی ریں اسے اپنے اندر کھینچ لیتیں۔ اس کا فاصلہ ہماری کشتی سے کوئی بمشکل تیس چالیس ٹ ہو گا۔ خدا جانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور ڈوبتے ہوئے کے کی طرف بڑھا۔ تیرنا میں نے بچپن میں ہی اپنے والد صاحب سے سیکھ لیا تھا۔ بلکہ نہوں نے مجھے زبردستی سکھا دیا تھا۔ امرتسر کی نہروں میں میں تیرتا ہوا ایک پل سے دوسرے پل کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ میں تیرنے میں بڑا ماہر ہو گیا تھا۔ مگر نہروں میں رنا اور سیلابی دریا میں تیرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ لیکن یہ میرا جذبہ تھا۔ کے کو بچانے کا میرا ارادہ تھا کہ جس نے مجھے دریا کی بپھری ہوئی موجوں میں بھی کے کے پاس پہنچا دیا۔

میرے دادا بھی بڑے اچھے تیراک تھے۔ انہوں نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ اگر وئی آدمی دریا میں ڈوب رہا ہو تو اسے کیسے بچانا چاہئے۔ انہوں نے کہا تھا۔

"جو آدمی ڈوب رہا ہو۔ کبھی اس کے سامنے کی طرف سے مت آنا۔ وہ تو ڈوب ہا ہے۔ وہ اپنی بانہیں تمہاری گردن میں ڈال کر تمہیں بھی ساتھ لے ڈوبے گا۔ ہمیشہ وبتے آدمی کے پیچھے سے آؤ اور اپنا ایک بازو اس کی ٹھوڑی کے نیچے لے جا کر اس کا نہ پانی سے باہر نکال کر اسی طرح ایک بازو سے تیرتے ہوئے اسے کنارے کی طرف لے جانے کی کوشش کرو۔"

میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ کوئی بنگالی لڑکا تھا۔ عمر بارہ تیرہ سال ہو گی۔ پتلا جسم تھا۔ میں نے نیچے سے بازو ڈال کر اس کا منہ پانی سے باہر کر دیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ لڑکا نیم بے ہوش تھا۔ اتنے میں جان کشتی ہمارے قریب لے آیا۔ کشتی کے ملاح اور جان نے مل کر ہم دونوں کو کھینچ کر کشتی میں ڈال لیا۔ کنارے پر لڑکے کے رشتے دار پریشان حال کھڑے تھے۔ لڑکا بچ گیا تھا۔ جلدی سے اسے لٹا کر اس کے پیٹ میں گیا ہوا پانی نکالا۔ لڑکے کے رشتے دار پڑھے لکھے بنگالی لگتے تھے۔ ان میں سے ایک میرے پاس آیا اور انگریزی میں میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔ ہندوستان کے جنوبی اور مشرقی صوبوں میں شروع ہی سے انگریزی عام بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ میں شکل سے ہی بنگالی نہیں لگتا تھا۔ اس لئے لڑکے کے انکل نے انگریزی میں مجھ سے بات کی تھی۔ ان صوبوں کی بچپن ہی سے آوارہ گردی کے دوران مجھے بھی انگریزی آ گئی تھی۔ اس نے مجھے بنگالی لڑکے کے گھر کا ایڈریس ایک چٹ پر لکھ کر دیا اور کہا۔

"گھر ضرور آنا۔ کمل کی ماتا اور پتا جی کو تم سے مل کر بڑی خوشی ہو گی۔"

وہ لوگ لڑکے کو گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ جان مجھ پر برس پڑا۔

"تم پاگل ہو گئے تھے کیا؟ تمہیں دریا میں چھلانگ لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں تمہارے گھر والوں کو کیا جواب دیتا۔۔۔؟"

میں آگے سے صرف ہنستا رہا۔ ہم واپس سراج بلڈنگ والے فلیٹ پر آ گئے۔ میں نے جان کو چٹ پر لکھا ہوا پتہ دکھایا۔ جان کو اتنی انگریزی نہیں آتی تھی مگر وہ انگریزی کے حرف پڑھ لیتا تھا۔ چٹ کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"یہ کونو ٹولہ سٹریٹ کا ایڈریس ہے۔ تمہیں وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

لیکن میں اس بنگالی لڑکے کے گھر جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ مجھے ایک بنگالی گھر کے رہن سہن کو دیکھنے کا موقعہ ملے گا اور دوسرے اس لئے بھی کہ وہاں میری آؤ بھگت ایک ہیرو کی طرح ہو گی۔

چنانچہ اگلے روز میں دس گیارہ بجے ٹرام میں بیٹھ کر بنگالی لڑکے کے گھر کی طرف ل پڑا۔ اس لڑکے کا نام اس کے انکل نے کمل بتایا تھا۔ مکان کا نمبر اور سٹریٹ کا نمبر ی چٹ پر لکھا ہوا تھا۔ میں کلکتے کے بازاروں اور علاقوں سے کافی واقف ہو چکا تھا۔ ں کمل کے مکان پر پہنچ گیا۔ یہ مکان بلکہ فلیٹ ایک کشادہ مگر گنجان آبادی والی گلی ں تھا۔ یہ پہلی منزل کا فلیٹ تھا۔ میں فلیٹ کے دروازے کے قریب گیا تو مجھے اندر سے بین کی آواز آئی۔ جیسے کوئی سپیرا بین بجا رہا ہو۔ میں نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ وڑی دیر بعد دروازہ کھلا - سامنے بنگالی لڑکے کمل کا وہی انکل کھڑا تھا جس نے مجھے یٹ کا ایڈریس دیا تھا۔ وہ خندہ پیشانی سے ملا اور مجھے اندر لے جا کر کمرے میں بٹھایا ر اب بنگلہ اردو میں بولا۔

"کاجل کو ناگ دیوتا رات کو آ کر سونگھ جاتا ہے۔ وہ بیمار پڑ گئی ہے۔ سپیرا ناگ یوتا کے منتر سے کاجل کا علاج کر رہا ہے۔ کاجل کمل کی بڑی بہن ہے۔ تم بیٹھو۔ میں تمہارے لئے چائے بھجواتا ہوں۔"

چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دیوار پر درمیان میں درگا دیوی کی تصویر لگی تھی۔ ایک طرف بھاش چندر بوس کی تصویر والا کیلنڈر لگا تھا۔ بھاری صوفہ سیٹ کا کپڑا میلا ہو گیا ہوا تھا۔ یہاں سپیرے کے بین کی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کمل کا انکل چلا گیا تھا۔ درمیان میں ایک دروازہ تھا جس پر پردہ گرا ہوا تھا۔ بین کی آواز اس طرف سے آ رہی تھی۔ میرے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ دیکھنا چاہئے سپیرا کیا کر رہا ہے۔ میں اٹھ کر دروازے کی ایک طرف آیا اور پردے کو کنارے پر سے ذرا سا ہٹا کر دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف بھی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دو تین عورتیں اور بنگالی مرد بیٹھے تھے۔ درمیان میں زمین پر بچھی ہوئی صف پر ایک سانولے رنگ کی نوجوان لڑکی ہاتھ باندھے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال کھلے تھے۔ سامنے ایک سپیرا منہ پھلا پھلا کر بین بجا رہا تھا اور دوسرا سپیرا ہاتھ میں کالا سانپ پکڑے بار بار سانپ کا پھن لڑکی کے منہ کے پاس لے جا کر جلدی سے پیچھے کر لیتا تھا۔ مجھے یوں لگا

جیسے میں کسی پراسرار سانپوں کے مندر میں آ گیا ہوں۔ بنگالی لڑکے کمل کا انکل ایک عورت کے پاس جھک کر اسے کچھ کہہ رہا تھا۔

میں جلدی سے واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے بین کی آواز کے ساتھ سانپ کی پھنکار کی آواز بھی سنائی دی۔

سانپ کی پھنکار کی آواز کے ساتھ ہی سپیرے کے بین بجانے کی آواز بھی تیز ہو گئی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سپیرا پھن دار سانپ کو نچا رہا ہے۔ لڑکی کی چیخ کی آواز بلند ہوئی۔ میں نہ رہ سکا۔ دوڑ کر دروازے کے پاس آیا۔ پردے کو ذرا سا ہٹا کر ریکھا۔ اس وقت یہ منظر تھا کہ بنگالی لڑکی جس کا نام بقول بنگالی لڑکے کے انکل کے کاجل تھا صف پر بے ہوش پڑی تھی اور سپیرے نے سانپ کا منہ اس کے ماتھے سے لگا رکھا تھا۔ دوسرا سپیرا جھوم جھوم کر بین بجائے جا رہا تھا۔ وہاں بیٹھی ہوئی عورتیں' ادھیڑ عمر بنگالی مرد اور کمل کا انکل دم بخود کھڑے یہ سارا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ سپیرے نے بن بجانی بند کر دی۔ بنگلہ زبان میں کوئی منتر اونچی آواز میں پڑھا اور سانپ کو دوسرے پیرے کے ہاتھ سے لے کر پٹاری میں بند کر دیا۔ نیم بے ہوش لڑکی کاجل کو اس کے تا پتا اور انکل اٹھا کر چلاتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ میں ایک بار پھر اپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں اکیلے بیٹھے مزید دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ اس ے بعد بنگالی لڑکے کمل کا انکل کاجل کے ماتا پتا جی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ں نے بنگلہ زبان میں میری طرف اشارہ کر کے انہیں کچھ کہا۔ دونوں نے ہاتھ جوڑ کر ھے پرنام کیا۔ ان میں ایک بنگالی لڑکے کمل کا باپ تھا اور ایک ماتا جی تھیں۔ یہ لوگ ردو زبان اچھی طرح سے بول لیتے تھے۔ اس کی وجہ انہوں نے بعد میں بتائی کہ وہ ں پندرہ برس دلی رہ چکے تھے۔ وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگے کہ میں نے ان کے بیٹے

کمل کو دریا میں ڈوبنے سے بچایا۔

تینوں میرے پاس بیٹھ گئے اور مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ کاجل ان کی بیٹی تھی اور کمل کی بڑی بہن تھی۔ کاجل کا باپ کلکتہ کے ایک سکول میں ٹیچر تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر وہ عمر کے حساب سے زیادہ بوڑھا لگتا تھا۔ چونکہ باتیں بڑی صاف اردو میں ہو رہی تھیں اس لئے میں نے کاجل کے بارے میں پوچھا کہ اسے سانپ رات کو آ کر کیوں سونگھ جاتا ہے۔ کمل اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ اس کی ماتا نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ حیران تھی کہ یہ بات مجھے کس نے بتائی ہے۔ کاجل کے انکل نے بنگلہ زبان میں عورت سے کچھ کہا۔ یہی کہا ہو گا کہ یہ بات میں نے اسے بتائی ہے۔ ماتا جی نے آہستہ سے سرہلایا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر اردو میں کہا۔

"کاجل بیٹی کو دو برس پہلے ہم بلیشور کے ناگ مندر میں ناگ دیوتا کے درشن کرانے لے گئے تھے۔ وہاں ہماری بیٹی کاجل بھگوان ناگ کو پسند آ گئی۔ اب ہفتے میں ایک بار کسی بھی رات کو ناگ دیوتا آ کر کاجل کی پنڈلی پر منہ رکھ کر اسے سونگھتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔"

کاجل کا باپ فکر مند تھا - کہنے لگا۔

"کاجل بیمار رہنے لگی ہے۔ یہ سپیرے خاص ناگ مندر کے سپیرے تھے۔ یہ کہتے ہیں کہ کاجل کو ناگ مندر میں لے جا کر دو تین مہینے رکھنا پڑے گا تب وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

کاجل کی ماں عام ہندو عورتوں کی طرح توہم پرست اور دیوی دیوتاؤں سادھو سنتوں پر اندھا یقین رکھنے والی عورت تھی۔ کہنے لگی۔

"کوئی ہرج نہیں۔ اگر ناگ دیوتا کی یہی مرضی ہے تو ہم کاجل کو بلیشور کے ناگ مندر میں چھوڑ آئیں گے۔ یہ تو ہمارے دھن بھاگ ہیں کہ ناگ دیوتا کو کاجل پسند آ گئی ہے۔"

کاجل کا انکل بھی ترقی پسند قسم کا آدمی تھا اور ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔

کہنے لگا۔

"بھابی اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کاجل کا علاج میں اپنے دوست ڈاکٹر سے کراؤں گا۔ وہ دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔"

کاجل کی ماں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"تم چپ رہو جی۔ تم کیا جانو ناگ دیوتا پوجا پاٹھ کیا ہوتی ہے۔ تم ناستک ہو۔"

یہ کہہ کر کاجل کی ماں اٹھ کر چلی گئی۔ اتنے میں بنگالی لڑکا کمل بھی آ گیا۔ مجھے دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر چائے پی۔ کلکتے کے مشہور رس گلے کھائے۔ میں پھر کسی دن آنے کا وعدہ کر کے واپس سراج بلڈنگ کی طرف چل دیا۔

بنگالی لڑکی کاجل کو ہر ہفتے کی کسی رات کو سانپ آ کر پنڈلی پر منہ رکھ کر اسے سونگھ جاتا مجھے بڑی پراسرار بات لگی تھی۔ میں نے اس بنگالی لڑکی کو اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ دونوں ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کئے فرش پر بیٹھی تھی۔ ایک سپیرا بین بجا رہا تھا۔ دوسرا سپیرا سانپ کا پھن اس کے چہرے کے پاس لا کر پیچھے لے جاتا تھا۔ یہ منظر ہندوستان کی قدیم داستانوں کی طرح کا منظر تھا۔ ہندو قوم بے انتہا توہم پرست ہے اور ان کی دیومالا کی کہانیاں جانوروں' آدھے انسانوں' آدھے جانوروں اور بھوت پریت اور بدروحوں سے اس بری طرح سے وابستہ ہیں کہ انہیں الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پس منظر میں مجھے بنگالی لڑکی کاجل بڑی اچھی لگی تھی۔

اس سے آپ ہرگز یہ مطلب نہ نکالیں کہ مجھے کاجل سے محبت ہو گئی تھی۔ ابھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری نوجوانی کی عمر تھی اور اس عمر کا تقاضا بھی تھا کہ مجھے کاجل ایسی پراسرار لڑکی یا جس کے ساتھ پراسرار واقعات منسلک ہیں وہ لڑکی مجھے اچھی لگے۔ میں تو دوسرے روز ہی کاجل کو ایک نظر دیکھنے کے لئے اس کے گھر کی طرف چل پڑتا لیکن دل میں خیال آیا کہ وہ لوگ کہیں کسی شک میں نہ پڑ جائیں۔ اس لئے تین دن ڈال کر کاجل کے گھر گیا۔ اس وقت کاجل کا بھائی کمل اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا لڈو کھیل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دونوں بڑے خوش ہوئے۔ ان کی ماتا جی بھی آ

گئیں۔ انہوں نے مجھے پیار کیا اور بولیں۔

"بیٹا تم کمل کے پاس بیٹھو میں تمہارے لئے شربت بنا کر لاتی ہوں۔"

میری بے قرار نگاہیں پراسرار بنگالی لڑکی کاجل کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ کمل کے پتا جی کہنے لگے۔

" کمل بیٹا تم دونوں لڈو کھیلو میں ذرا بازار سے ہو کر آتا ہوں۔"

جب میں اور کمل اکیلے رہ گئے تو میں نے لڈو کی گوٹیاں ٹھیک طرح سے لگاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

" کمل تمہاری دیدی کا کیا حال ہے؟ رات کو ناگ دیوتا تو اسے سونگھنے نہیں آیا؟"

کمل بولا۔ "دیدی سے پوچھ کر بتاؤں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہاری دیدی کو سانپ کاٹتا نہیں کیا؟"

وہ کہنے لگا۔ "بھیا وہ کوئی سانپ تھوڑے ہے۔ وہ تو بلیشور مندر کا ناگ دیوتا جی ہیں۔ جس کو وہ اچھا سمجھتے ہیں اسے بالکل نہیں کاٹتے۔ ہماری دیدی کو ناگ دیوتا نے پسند کر لیا ہے۔"

اس بنگالی لڑکے کمل پر بھی اس گھرانے کی صدیوں کی دیومالائی روایات کا اثر تھا۔ وہ ناگ دیوتا کو سانپ سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ مجھے بھی ناگ دیوتا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو وہاں کاجل کو ایک نظر دیکھنے کے لئے آ گیا تھا۔ میں نے آخر کمل سے پوچھ ہی لیا کہ اس کی دیدی کاجل کہاں ہے۔ وہ بولا۔

"دیدی تو بس اپنے پلنگ پر پڑی رہتی ہے۔ کبھی کبھی اٹھ کر باہر آتی ہے۔ اس نے تو کالج جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

معلوم ہوا کہ کاجل کلکتے کے ایک کالج میں سیکنڈ ایئر کی سٹوڈنٹ تھی۔ جب سے راتوں کو سانپ کے سونگھنے کا چکر چلا یا ناگ دیوتا کے پجاریوں نے یہ چکر چلایا تھا وہ بیمار رہنے لگی تھی اور اس کا کالج جانا بھی ختم ہو گیا تھا۔ گھر کا ملازم لڑکا شیشے کے جگ

میں شربت لے کر آ گیا۔ میں نے اور کمل نے مزے سے شربت پیا۔ کچھ دیر میں اس کے ساتھ لڈو کھیلتا رہا۔ صرف اس امید پر کہ شاید کاجل اپنے کمرے سے نکل کر وہاں آ جائے۔ مگر کاجل نہ آئی۔ میں نے کمل سے کہا۔

"میں پرسوں آؤں گا اور نئی لڈو لاؤں گا یہ لڈو پرانی ہو گئی ہے۔ اس کے رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں۔"

کمل خوش ہو کر بولا۔ "ہاں بھیا ضرور لانا۔"

نئی لڈو کا تو ایک بہانہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں کاجل کا دیدار کرنا چاہتا تھا۔ دو دن کا وقفہ ڈالنا میری لئے مشکل ہو گیا۔ تیسرے دن میں نے بازار سے ایک نئی لڈو خریدی اور کاجل کے گھر جا پہنچا۔ ایک بات کی وضاحت، کرنا ضروری سمجھتا ہوں - اس زمانے میں بھی کلکتہ کے بنگالی ہندو' خاص طور پر ذرا پڑھے لکھے بنگالی ہندو گھرانوں کا ماحول آزاد ہوتا تھا۔ ایک ویسے ہی ہندوؤں میں عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ کلکتہ کے پڑھے لکھے ہندو گھرانوں میں تو لڑکیاں ہارمونیم بھی بجاتی ہیں اور رقص کرنا بھی سیکھ لیتی ہیں۔ عام طور پر وہ ہارمونیم پر اپنے عزیزوں ور مہمانوں کے سامنے رابندر ناتھ ٹیگور کے گیت گا کر سناتی ہیں۔ ان گیتوں کی طرز بھی رابندر ناتھ ٹیگور کی بنائی ہوئی ہوتی ہے اور اس صنف موسیقی کو رابندر سنگیت کہتے ہیں۔ اسی روز میں بنگالی لڑکی کاجل کے گھر لڈو لے کر گیا تو کاجل اپنے ماتا پتا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ ہارمونیم سامنے میز پر رکھا تھا۔ ہارمونیم پر کاجل کی انگلیاں چل رہی تھیں اور وہ رابندر ناتھ ٹیگور کا کوئی بنگلہ گیت گا رہی تھی۔ کمل نے میرے لئے دروازہ کھولا تھا۔ میں پرنام کر کے ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ کاجل نے اودھے رنگ کی سادہ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سر کے بالوں کے درمیان سے مانگ نکلی ہوئی تھی اور پیچھے جوڑے میں موتیئے کے پھول سج رہے تھے۔ اس کے سانولے چہرے پر ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ موسیقی کے سر بھی بڑے اداس تھے۔ رابندر سنگیت گاتے ہوئے کاجل مجھے اور بھی اچھی لگی۔ اس کے اداس چہرے اور اس کے ہونٹوں سے نکلنے والی اداس موسیقی نے

مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری کر دی کہ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میرا جسم کسی پھول کی خوشبو بن کر بارش میں بھیگتے جنگلوں میں پرواز کر رہا ہے۔ گیت ختم ہوا تو کاجل نے ہارمونیم میز پر پیچھے کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مجھے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔

اس کے باپ نے کاجل سے میرا تعارف کرایا تو وہ اپنے بھائی کی جان بچانے کے لئے میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ اس کی آواز میں بھی ایک خواب کی سی کیفیت تھی یا مجھے یہ کیفیت محسوس ہوئی تھی۔ کاجل کے باپ نے چھوٹے بیٹے اور میرے دوست کمل کو بازار سے کچھ مٹھائی وغیرہ لینے کے لئے بھیج دیا - اس کی ماتاجی چائے بنانے اندر چلی گئیں۔ کاجل بھی اردو میں ہی بات کرتی تھی۔ اگرچہ اس کا اردو بولنے کا لہجہ بھی اپنے ماتا پتا اور انکل کی طرح بنگالی تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کلکتے میں کہاں ٹھہرا ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں لوئرچیت پور روڈ پر اپنے ایک دوست کے پاس رہتا ہوں۔ اس کے باپ نے پوچھا۔

"کلکتے کب تک ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"کالج میں چھٹیاں ہیں۔ ایک مہینہ تو ضرور ٹھہروں گا۔"

میں نے کاجل سے پوچھا کہ اب اس کی طبیعت کیسی ہے۔ اس نے اداس سی آوز میں کہا۔

"اب ٹھیک ہوں۔"

اس کے پتا جی نے کاجل سے کہا۔

"جاؤ بیٹی رسوئی میں ماتا جی کا ہاتھ بٹاؤ۔"

کاجل اچھا پتا جی کہہ کر ساڑھی سنبھالتی اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد کاجل کے پتا جی کہنے لگے۔

"مجھے تو یہ سب فراڈ لگتا ہے۔ مگر اس کی ماں کو کون سمجھائے۔ کسی ڈاکٹر کو گھر

میں نہیں گھسنے دیتی۔"

میں نے کہا۔ "مگر انکل چندر بابو تو کہہ رہے تھے کہ ہر ہفتے رات کو ایک کالا ناگ آ کر کاجل کی پنڈلی سونگھ جاتا ہے۔"

کاجل کے پتا جی نے سر کو بے نیازی سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اجی یہ بھی تو فراڈ ہو سکتا ہے یہ سب ناگ مندر کے پجاریوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ ایک سانپ کو سدھایا بھی تو جا سکتا ہے۔ میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ مگر کیا کروں۔ کاجل کی ماں کے آگے بے بس ہوں۔ بھگوان سے ہر وقت اپنی بچی کی صحت کے لئے پرارتھنا کرتا رہتا ہوں۔"

میں گھنٹہ دو گھنٹے بیٹھ کر چلا آیا۔ کاجل کے اداس چہرے کا نقش میرے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ دل یہی چاہتا کہ میں ہر وقت اسے دیکھتا رہوں۔ مگر ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی میں دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی چیز لے کر کمل سے ملنے کے بہانے کاجل کے گھر پہنچ جاتا۔ وہ اکیلی بھی مجھ سے بات کر لیتی اور سب کے سامنے بھی کھلے دل سے بات کر لیتی تھی۔ میں بھی اس سے بات کرتے ہوئے بالکل نہیں گھبراتا تھا۔ جب دل پاک صاف ہو دل میں کوئی چور نہ ہو تو پھر آدمی بے دھڑک بات کر لیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کے معصوم حسن کا رعب آپ کی زبان کو تھوڑی دیر کے لئے خاموش کر دے یا آپ کوئی بات کرتے کرتے اصل موضوع کو بھول جائیں۔ یہ میں اپنے تجربے کی بات کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ میں نے حسن معصوم کے کئی پیکروں سے پاک دل اور پاک نگاہوں کے ساتھ محبت کی ہے اور ان کے سامنے بات کرتے ہوئے کئی بار ایسا ہوا کہ میں گفتگو کا موضوع بھول گیا۔ محبت میں میری ہمیشہ یہی حالت ہوتی تھی کہ جیسے کوئی بچہ ساون کی بارش میں بھیگتا باغ میں دوڑتا چلا جا رہا ہو۔

ایک دن دوپہر کے بعد میں کاجل کے گھر گیا تو کلکتے میں بارش ہو رہی تھی۔ صبح سے ساون کی جھڑی لگی تھی۔ کلکتے کی گلیوں کی سڑکیں بھی پکی تھیں۔ وہ اس طریقے سے بنائی گئی تھیں کہ برسات چاہے تین دن لگی رہے نہ تو وہاں کیچڑ ہوتا تھا اور نہ

کہیں پانی کھڑا ہوتا تھا۔ بڑا رومانٹک ماحول تھا۔ بازاروں میں بنگالی چھتریاں لگائے گزر رہے تھے۔ عورتوں نے بالوں میں جو موتیئے کے پھولوں کے یا ترناری کے پھولوں کے جو گجرے لگائے ہوئے تھے فضا میں ان کی ہلکی ہلکی خوشبو کی لہر کسی وقت قریب سے ہو کر گزر جاتی تھی۔ ریستورانوں میں بیٹھے لوگ چائے پی رہے تھے۔ میں ٹرام میں بیٹھ کر گیا تھا۔ کاجل کی گلی والے موڑ پر ٹرام سے اتر کر بارش میں بھیگتا تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے گھر پہنچا تھا۔ کاجل نے دروازہ کھولا تو مسکرا کر بولی۔

"ارے آپ تو بھیگ گئے ہیں۔ اندر آ جائیں۔ ماتا جی رسوئی میں ہیں۔ کمل ماسٹر جی کے گھر گیا ہوا ہے۔۔۔"

پھر وہ ماتا جی کو آوازیں دیتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں میرے لئے چائے لے کر آ گئی۔ اس کی ماتا جی بھی آ گئیں۔ میں اپنے ساتھ انگلش بسکٹوں کا ٹین کا بڑا خوبصورت ڈبہ لے گیا تھا۔ اس کی ماتا جی بولیں۔

"تم نے یہ تکلیف کیوں کی بیٹا۔ اری کاجل دیکھو تمہارے بھیا تمہارے لئے کیا لائے ہیں؟ ذرا اسے کھولو تو۔"

کاجل نے ڈبہ کھول کر بسکٹ نکال کر پلیٹ میں سجا دیئے۔ کہنے لگی۔

"یہ تکلیف کیوں کی آپ نے؟"

میں نے کہا۔ "یہ تو میں اپنی خوشی سے لایا ہوں۔ کمل کب آئے گا؟"

ماتا جی بولیں۔ "ماسٹر جی سے ٹیوشن پڑھنے گیا ہے آنے ہی والا ہو گا۔"

ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھلی تھی۔ اس میں سے کسی وقت بارش کی آواز آ جاتی تھی۔ کاجل کاسنی رنگ کی ساڑھی میں تھی۔ وہ کسی کام سے دوسرے کمرے میں گئی تو میں نے اس کی ماتا جی سے کہا۔

"اب کاجل پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے۔"

ماتا جی کا چہرہ اداس ہو گیا کہنے لگیں۔

"لگتا ہے ناگ دیوتا جی ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ کئی روز سے انہوں نے

درشن نہیں دیئے۔"

معلوم ہوا کہ دو تین ہفتوں سے رات کو سانپ نہیں آیا۔ کاجل کی صحت ٹھیک ہو رہی تھی مگر اس کی ماتا جی کو افسوس تھا کہ ناگ دیوتا اس سے ناراض ہو گئے ہیں۔ کہنے لگی۔

"سوچتی ہوں کاجل کو ساتھ لے کر بلیشور جی کے مندر میں جا کر اسے اشنان کراؤں۔ ناگ دیوتا کی پوجا کراؤں۔ شاید دیوتا ہم پر مہربان ہو جائیں۔ ہمیں شما کر دیں۔"

کاجل کے پتا جی یا اس کا انکل چندر بابو ہوتا تو میں توہم پرستی کے خلاف کوئی بات بھی کرتا۔ مگر کاجل کی ماتا جی تو توہمات کا پتلا تھیں۔ وہ اپنے خاوند اور کاجل کے پتا جی کی طرح کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ یہ سب کچھ فراڈ ہے اور کسی بنگالی سپیرے نے اپنے طور پر یا کسی پجاری کے کہنے پر سانپ کو کاجل کے کپڑے کسی طریقے سے سنگھا کر سانپ کو اس کے پیچھے لگا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس سکیم کے پیچھے ان کا کوئی خاص مقصد چھپا ہوا ہو۔ یہ مقصد ابھی تک نہ میں سمجھ سکا تھا نہ کاجل کے باپ اور اس کے انکل چندر بابو کی سمجھ میں آیا تھا۔ جس شخص نے بھی کاجل کے کپڑے یا اس کی کوئی پرانی ساڑھی سانپ کو سنگھا کر سانپ اس کے پیچھے لگا دیا تھا اسے خوب معلوم تھا کہ کاجل کے گھر والے سانپ کو ناگ دیوتا کا اوتار سمجھتے ہیں سانپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ ویسے بھی مشرقی اور جنوبی ہند میں سانپ کو ناگ دیوتا ہی سمجھا جاتا ہے۔ وہاں کسی گھر میں سانپ نکل آئے تو اس کو مارنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جان بچانے کے لئے لوگ گھر سے باہر ضرور آ جاتے ہیں۔ پھر کسی سپیرے کو بلوا کر سانپ اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ کئی جگہوں پر سانپ کے ڈسنے سے موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ توہم پرست ہندو یہی سمجھتے ہیں کہ ناگ دیوتا نے مہربان ہو کر اس عورت یا آدمی کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔ ہماری نئی نسل نے تو ہندو کو دیکھا بھی نہیں ہے ان کے گھروں کی معاشرت اور ان کی مذہبی توہم پرستیوں کو اگر دیکھا جائے جو آج بھی اسی

شدت سے قائم ہیں تو آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ ایک مسلمان اور ہندو میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اتنے میں کاجل کے پتا جی بھی آ گئے۔ چھتری بند کر کے اسے کونے میں لگاتے ہوئے بولے۔ "بڑا پانی برس رہا ہے۔"

پھر مجھے دیکھا تو مسکرا کر کہا۔

"ارے بھئی کمل ابھی تک نہیں آیا؟ مہمان کے لئے رس گلے منگوانے تھے۔"

وہ دھوتی کے پلو کو ٹھیک کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے اور ماتا جی سے کہا۔

"میرے لئے بھی چائے بنا دو۔"

کاجل کی ماتا نے چائے کی پیالی بنا کر اپنے خاوند کے آگے رکھی اور ساڑھی لپیٹتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے جان بوجھ کر ناگ دیوتا والا موضوع چھیڑ دیا اور کاجل کے باپ سے کہا کہ میرے خیال میں اب سانپ اس گھر میں کبھی نہیں آئے گا۔

کاجل کے پتا جی نے چائے کا گھونٹ بھرا اور بولے۔

"بھائی تم کاجل کی ماتا جی کو نہیں جانتے۔ اب اسے یہ وہم لگ گیا ہے کہ ناگ دیوتا ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہ کاجل کے پاس نہیں آتے۔ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ اس کی بیٹی سانپ کے نہ سونگھنے سے صحت مند ہو رہی ہے۔ وہ تو پاگل ہو گئی ہے۔ ادھر جاپانی فوجیں آسام کی سرحدوں کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ انڈیمان پر انہوں نے قبضہ کر لیا ہے اور یہ عورت ناگ دیوتا کی پوجا کر رہی ہے۔ مائی فٹ! میں تو کہتا ہوں یہ سب کچھ فراڈ ہے۔"

میں نے انہیں یہ بالکل نہ بتایا کہ کاجل کی ماتا کاجل کو بلیشور کے ناگ مندر میں لے جانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ میں نے سوچا مجھے ادھر کی بات ادھر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اسے کاجل کو بلیشور کے مندر میں لے جانا ہو گا تو اس کے پتا جی کو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ میں تو وہاں صرف اداس بنگالی لڑکی کاجل کے درشن کرنے جاتا تھا۔ اور میں اس کے صرف درشن ہی کرنا چاہتا تھا۔

مزید کچھ روز گزر گئے۔ اب میرا کاجل کے گھر میں باقاعدہ آنا جانا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے کلکتے کے دوست جان کو یہ سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے مجھے ایک ہی بات کہی تھی کہ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا۔ بنگال کا جادو جس پر چل جائے پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ میں نے اس وقت اپنے دوست کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن بعد میں اس کی بات سچی ثابت ہوئی۔ ایک دن موسم بڑا خوشگوار تھا۔ کلکتے کے آسمان پر ساون کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں نے کولوٹولہ سٹریٹ کے چوک میں سے رجنی گندھا کے پھولوں کا گلدستہ خریدا اور کاجل کے مکان پر پہنچ گیا۔ وہاں صرف کاجل کا باپ اور کاجل کا چھوٹا بھائی کمل ہی تھے۔ معلوم ہوا کہ کاجل کی ماتا جی اپنی بیٹی کو لے کر بلیشور کی بجائے کتمار کے ناگ مندر میں گئی ہوئی ہیں۔ میں نے گلدستہ کمل کو دیا جو اسے لے کر دوسرے کمرے میں گلدان میں لگانے چلا گیا۔ کاجل کا والد کچھ پریشان پریشان سا لگ رہا تھا کہنے لگا۔

"کاجل کی ماں کہیں میری بچی کی زندگی برباد نہ کر دے۔ یہی فکر لگا رہتا ہے مجھے۔۔۔"

میں نے پوچھا کہ یہ کتمار کا ناگ مندر کہاں پر ہے۔ کاجل کے باپ نے کہا۔

"کاکسز بازار کے دکھن میں ہے۔ مجھے تو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ وہاں سے برما کی سرحد شروع ہوتی ہے اور برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہے۔ کاکسز بازار میں انگریزوں کی فوج نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر حملہ ہو گیا تو جاپان کاکسز بازار پر منٹوں میں قبضہ کر لے گا۔ یہ لوگ جلتی آگ میں چلے گئے ہیں۔ میں نے لاکھ منع کیا کہ بیٹی کو لے کر وہاں نہ جاؤ مگر میری سنتا کون ہے۔"

"کیا ماتا جی کاجل کو لے کر اکیلی گئی ہیں؟"

"چندر بابو ساتھ گیا ہے۔ مگر وہ کیا کرے گا۔ اگر جاپانی آ گئے تو وہ تو ان تینوں کو پکڑ کر شوٹ کر دیں گے یا جزیرہ انڈیمان میں لے جا کر قید میں ڈال دیں گے۔"

معلوم ہوا کہ ایک روز پہلے شام کے وقت دو بنگالی سپیرے آئے اور کہنے لگے۔

ہمیں کستھار ناگ مندر کے مہنت نے بھیجا ہے۔ مہنت جی کے سپنے میں ناگ دیوتا انسانی روپ میں آئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ کلکتے جا کر کاجل کے ماتا پتا سے کہو کہ ہم ان سے سخت ناراض ہیں کیونکہ انہوں نے ہماری دیوداسی کاجل کا ڈاکٹری علاج شروع کروا دیا ہے۔"

ناگ دیوتا نے مہنت جی کے ذریعے پیغام بھیجا ہے کہ کاجل دیوداسی کو لے کر فوراً ہمارے مندر میں پہنچو۔ اس کے بعد ہم کاجل کی ساری تکلیفیں دور کر دیں گے۔ چنانچہ ضعیف الاعتقاد ماتا جی نے اسی وقت کاجل کو ساتھ لیا اور کستھار کی طرف روانہ ہو گئیں۔

کستھار کاکسز بازار کے انتہائی جنوب میں سمندر کے ساحل پر واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو اپنے ناگ مندر کی وجہ سے مشہور ہے۔ اگر آپ ہندوستان کے نقشے پر ایک نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ کستھار کے آگے برما کے شمالی علاقے اراکان کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی فکر لگی کہ واقعی کہیں یہ لوگ جاپانیوں کی قید میں نہ پھنس جائیں۔ یہ ساحلی قصبہ ہندوستان کی جنوب مشرقی سرحد کے عین اوپر تھا۔ دوسری طرف برما کے شمالی صوبے اراکان کی سرحد شروع ہو جاتی تھی اور پورے برما پر جاپانی فوجیں قبضہ کر چکی تھیں۔ کاجل کا باپ خود بڑا پریشان تھا مگر اپنی توہم پرست بنگالی بیوی کے آگے مجبور تھا۔ وہ یہی کر سکتا تھا کہ اپنے چھوٹے بھائی چندر بابو کو اس کے ساتھ بھیج دیا اور اسے تاکید کر دی کہ اگر وہاں حالات تشویش ناک ہوں تو کاجل اور اس کی ماتا جی کو لے کر اسی وقت واپس آ جائے۔ مگر حالات جس قسم کی تشویش ناک صورت اختیار کر چکے تھے اس کا کاجل کے باپ کو بھی پوری طرح علم نہیں تھا۔

آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ایک ہفتہ گزر گیا نہ چندر بابو کاجل اور اس کی ماتا کو لے کر خود واپس آیا نہ اس کا کوئی خط ہی آیا۔ جب پندرہ بیس دن گزر گئے تو کاجل کے باپ نے پولیس میں رپورٹ درج کرا دی۔ جنوب میں انگریزوں کی ہندوستانی فوجیں جاپانی یلغار سے شکست کھا کر بھاگ رہی تھیں۔ جاپانیوں نے انڈیمان یعنی کالے پانی کے

سارے جزیروں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ جاپانی فوجوں کا زیادہ دباؤ اوپر شمال میں آسام کے سرحدی علاقے کوہیما اور امپھال کی طرف تھا۔ پولیس نے رپورٹ تو درج کر لی لیکن کاجل کے باپ سے بنگالی تھانے دار نے یہ ضرور کہا کہ آپ پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ نے ان حالات میں اپنی بیٹی اور بیوی کو کستھار کی طرف کیوں بھیج دیا۔ وہاں سے تو لوگ بھاگ کر کلکتے کی طرف آ رہے ہیں۔ یہ سن کر کاجل کے باپ کے رہے سہے ہوش بھی گم ہو گئے۔ میں خود کاجل کے لئے سخت پریشان تھا کہ خدا جانے یہ نازک سی اداس چہرے والی بنگالی لڑکی کس حال میں ہو گی۔ طبیعت میں ایڈونچر پہلے سے موجود تھا۔ سر میں کاجل کے عشق کا بھوت بھی تقریباً سوار ہو چکا تھا۔ چنانچہ ایک روز میں نے کاجل کے باپ سے کہا کہ میں کاجل اور اس کی ماتا کا پتہ کرنے کستھار کے ناگ مندر جاؤں گا۔ کاجل کا باپ میرے اس فیصلے سے متاثر ضرور ہوا مگر اسے یقین نہیں آتا تھا کہ میں ان لوگوں کو تلاش کر سکوں گا۔ خود بھی مجھے احساس نہیں تھا کہ میں نے کسقدر احمقانہ اور سنگین فیصلہ کیا ہے اور آگے چل کر مجھ پر کیسی بھیانک مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ جب میں نے کاجل کے باپ سے کہا کہ میں ضرور جاؤں گا اور میں فیصلہ کر چکا ہوں تو اس نے مجھے روپے دیئے اور کہا۔

"بھگوان تیری رکھشا کرے جاتے ہی خط ضرور لکھ دینا۔"

یہاں سے میری ایک اور ناقابل فراموش اور خطرناک ترین ایڈونچر کا آغاز ہوتا ہے۔

مجھ پر اس بنگالی لڑکی کاجل کا جادو چل گیا تھا۔

میں اس کے طلسم میں گرفتار ہو کر ایک بڑے ہی خطرناک سفر پر روانہ ہو گیا۔ جانے سے پہلے میرے کلکتے کے دوست جان نے مجھے سختی سے منع کیا کہ میں عقل سے کام لوں۔ مگر میری عقل تو ہندو بنگالی لڑکی کاجل کے جادو نے ماؤف کر دی تھی۔ حاتم طائی کے قصے میں ایک کوہ ندا کا ذکر ہے۔ پورے چاند کی رات کو اس پہاڑ سے ایک آواز آتی ہے۔ اس آواز کو سن کر گاؤں کا ایک نہ ایک آدمی کوہ ندا کی طرف اپنے آپ بڑھتا چلا جاتا تھا۔ وہ پہاڑ کے غار میں داخل ہو جاتا اور پھر اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ہندو بنگالی لڑکی کاجل میری لئے کوہ ندا کی آواز تھی اور میں بے اختیار ہو کر اس کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مہم میں کاجل کے باپ اور بھائی کی پریشانی سے بھی متاثر تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ کاجل کی محبت مجھے کالے پانیوں کے ساحلی جزیروں کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔

یہ قیام پاکستان سے پہلے کا زمانہ تھا۔ سارا بنگال ایک ہی تھا۔ کلکتے سے اس زمانے میں کاکسز بازار تک چھوٹے جہاز چلا کرتے تھے میں بھی ایک چھوٹے بحری جہاز میں سوار ہو گیا۔ یہ جہاز کلکتے کی مشہور بندرگاہ خضر پور جیٹی سے دریائے ہگلی میں ساحل

، ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ یہ دریا کے ڈیلٹے کا علاقہ تھا۔ جنگ کی وجہ سے جہاز کھلے وں میں سفر نہیں کرتے تھے۔ جہاز میں بہت کم مسافر سوار تھے۔ زیادہ تر کاکسز بازار ، مقامی لوگ تھے۔ کاکسز بازار تک پہنچتے پہنچتے سمندر بھی آگیا تھا۔ یہ کالا سیاہ سمندر ۔ اس کو کالا پانی کہتے ہیں۔ ویسے تو پانی سفید ہوتا ہے مگر دیکھنے سے وہ تارکول کی ح کالا سیاہ نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ بعض لوگ یہ بتاتے ہیں کہ وہاں سمندر کے نیچے لی سیاہ پہاڑیاں ہیں جن پر کالی گھاس اگی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے سمندر کا پانی سطح سیاہ نظر آتا ہے۔ بہرحال میں کاکسز بازار پہنچ گیا۔

کتھار ناگ مندر یہاں سے آگے ایک سرحدی اور ساحلی گاؤں میں تھا۔ کاکسز ار کے ایک گھاٹ سے میں ایک سواریوں والی بڑی کشتی میں سوار ہو گیا۔ یہ کشتی ی ساحل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ جنگ کا کچھ نقشہ میں نے کاکسز بازار میں ہی یکھ لیا تھا۔ بڑی بڑی دکانیں اور سٹور بند پڑے تھے۔ تاجر لوگ اپنا کاروبار سمیٹ کر لتے جا چکے تھے۔ فضا میں خوف و ہراس کی کیفیت طاری تھی۔ لوگ یہی کہتے تھے کہ پانی فوج کسی بھی وقت کاکسز بازار میں داخل ہو سکتی ہے۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ پانی اوپر آسام کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ خلیج ال میں ان کے ایک دو بحری جنگی جہاز ضرور دیکھے گئے تھے۔ مگر کاکسز بازار کی طرف پانیوں نے ابھی توجہ نہیں دی تھی۔ ویسے بھی یہ علاقہ برما کے باڈر سے کچھ فاصلے پر ا لیکن میں جس جگہ یعنی کتھار گاؤں جا رہا تھا وہ برما کے باڈر کے عین اوپر واقع تھی ر اس کے مغرب کی طرف سمندر تھا اور مشرق کی جانب برما کا باڈر تھا۔ جہاں جاپانیوں نے قبضہ کیا ہوا تھا۔

ایک طرح سے موت کے منہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر اس وقت میرے دماغ ں تھوڑی سی بھی عقل موجود ہوتی تو میں کبھی کلکتے سے روانہ نہ ہوتا۔ لیکن مجھ پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ بڑی کشتی میں کچھ اور مسافر بھی بیٹھے تھے۔ یہ سب دیہاتی قسم کے لوگ تھے۔ ان کے لباس برمی اور بنگالی کلچر کی نمائندگی کرتے تھے۔ کشتی میں چاول

اور دیگر سامان کی بوریاں بھی لدی ہوئی تھیں۔ آسمان پر بادل جھکے ہوئے تھے مگر خدا کا کرم ہی رہا کہ بارش نہ ہوئی۔ ورنہ کشتی میں بارش سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

کشتی کستھار گاؤں کے چھوٹے سے گھاٹ کے ساتھ جا کر لگ گئی۔ یہ ایک مختصر سا ساحلی گاؤں تھا۔ بانس کے مکان اور جھونپڑے ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک چلے گئے تھے۔ جگہ جگہ کیلے اور شریفے کے درختوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ گاؤں کے مکان بھی زیادہ تر بانس کی دیواروں والے تھے جو زمین سے دو تین فٹ بلند مچانوں پر بنائے گئے تھے۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں کھانے پینے کے سامان کی دو چار دکانیں کھلی تھیں۔ باقی دکانیں بند تھیں۔ مجھے ایک دکان کے اندر سکھ سردار جی بیٹھے نظر آئے۔ میں بڑا خوش ہوا کہ کم از کم اس سے پنجابی زبان میں تو بات کر سکوں گا۔ دکان کے باہر ہومیوپیتھ ڈاکٹر کا بورڈ لگا تھا۔ سردار جی ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہے تھے۔ وہ آرام کرسی پر صرف جانگیہ اور بنیان پہنے بیٹھے تھے۔ عمر پچاس کے قریب ہو گی۔

میں دکان میں داخل ہوا تو سردار جی نے کتاب پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے عینک کے شیشوں کے اوپر سے میری طرف دیکھا اور بولے۔

"کیوں بابو کیا بات ہے؟"

وہ خالص اردو بنگلہ میں بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے میں نے پنجابی میں کہا کہ یہاں ایک ناگ مندر ہے مجھے اس کی تلاش ہے۔ میری زبان سے پنجابی کے الفاظ سنتے ہی سردار جی مسکرائے کتاب ایک طرف رکھ دی اور بانس کا موڑھا میری طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو بادشاہو۔ تسی اتھے کتھے آ گئے؟"

میں نے انہیں بنگالی لڑکی کاجل کے بارے میں ساری بات بیان کر دی اور کہا کہ اس کی ماں اور چچا اسے لے کر یہاں کے ناگ مندر میں آئے تھے پھر واپس کلکتہ اپنے گھر نہیں پہنچے۔ مجھے اس کے باپ نے ان کی تلاش میں بھیجا ہے۔"

سردار جی نے کاجل کے بنگالی باپ کو گالی دیتے ہوئے کہا۔

"اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا اس نے تمہیں بلدی کے بتھے لگن کے واسطے یہاں بھیج دیا۔"

پھر آنکھ مار کر مجھ سے پوچھا۔

"سچ سچ بتا یار۔ کہیں اس بنگالی لڑکی پر تو عاشق تو نہیں ہو گیا؟ میرا دل کہتا ہے کہ ہ پر بنگال کے جادو کا اثر ہو گیا ہے۔ گرو مہاراج بنگال کے جادو سے بچائیں۔ میری رف دیکھ! ایک بنگالی عورت نے مجھ پر بھی جادو کر دیا تھا۔ وہ خود تو پرلوک سدھار گئی لکن میں چوبیس برس سے یہاں بیٹھا مکھیاں مار رہا ہوں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ نے ٹھیک پہچانا سردار جی! بات کچھ ایسی ہی ہے۔"

سردار جی نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"پنجابی منڈے عشق کرن توں باز نئیں آ سکدے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری کاجل کا حلیہ کیسا ہے؟"

میں نے سردار جی کو کاجل کا حلیہ بتا دیا تو وہ بنگالی عورتوں کو گالیاں دینے لگے۔ لے۔

"مائیں ساری ہندو بنگالنیں ایسی ہی چپ چپ غم خور غم خور سی ہوتی ہیں۔ بس ن کی اسی اداسی پر آدمی مارا جاتا ہے۔ یہی بنگال کا جادو ہے۔ ایک بار تم ان عورتوں سے بیاہ کر لو۔ تمہارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ تم چاہے انہیں مار مار کر ادھ موا کر دو۔ آگے سے بولتی ہی نہیں۔ بس ہاتھ جوڑ کر مار کھاتی رہیں گی۔"

پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔

"فکر نہ کرو۔ اگر وہ اس گاؤں میں ہوئے تو میں ان کا پتہ لگا لوں گا۔ ایک سپیرا میرا پرانا واقف ہے۔ میں اسے بلا کر پتہ کروں گا۔ ویسے ناگ مندر کا بڑا مہنت اور کچھ پجاری تو جاپانیوں کے ڈر سے بھاگ گئے ہیں۔ مندر میں ناگ دیوتا جی اکیلے ہی رہ گئے

ہیں۔"

سردار جی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں؟"

سردار جی نے اسی وقت میرے لئے ایک آدمی کو بھیج کر کچھ کھانے کے لئے منگوایا اور دکان کے کونے میں جا کر کرتا اور چار جانے والی چانگامی دھوتی پہننے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ بولتے جا رہے تھے۔

"ابھی تو مون سون شروع ہوا ہے یہاں۔ ذرا وقت گزر جانے دو ایسا حبس ہوتا ہے کہ نانی یاد آ جاتی ہے۔"

میں کھانا کھا رہا تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔

"جب سے بنگالی پتنی سورگباش ہوئی ہے بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ ایک عورت گھر کا کام کاج کر جاتی ہے۔ ایک بات ہے یہاں کی دیسی شراب۔۔۔"

پھر مجھے گھور کر دیکھا اور انگلی نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"خبردار شراب کو کبھی ہاتھ نہ لگانا۔ یہ بڑی بری بلا ہے۔ گرو مہاراج اس سے بندے کو دور ہی رکھے۔"

میں نے جاپانیوں کے بارے میں پوچھا تو سردار جی نے کہا۔

"جاپانی یہاں سے تھوڑی دور ہی بیٹھے ہیں۔ ابھی ان کا ادھر آنے کا ارادہ نہیں لگتا۔ ان کا سارا زور اوپر امپھال کی طرف ہے۔ یہاں تو وہ جب چاہیں آ کر قبضہ کر سکتے ہیں۔ انگریزوں کی یہاں کوئی ڈیفنس نہیں ہے۔"

پھر خود ہی بے نیازی سے سر جھٹک کر جاپانیوں کو ایک گالی دی اور کہا۔

"آئیں آ جائیں جاپانی بھی۔ میں تو کہہ دوں گا کہ سبھاس چندر بوس میرا دوست تھا میرے پاس ہومیوپیتھی کا علاج کرانے آیا کرتا تھا۔۔۔"

تھوڑی دیر میں رات کا اندھیرا ہو گیا۔ اس ساحلی گاؤں میں بجلی کہیں کہیں تھی۔ ویسے بھی جاپانیوں کے حملے کے خوف سے رات کو وہاں بلیک آؤٹ کر دیا جاتا تھا۔

دار جی کا مکان دکان کے پیچھے کچی سڑک کی دوسری طرف تھا۔ بانس کی دیواروں والا کمروں کا مکان تھا۔ انہوں نے برآمدے میں مجھے چارپائی ڈال دی۔ مچھر دانی بھی لگا ی۔ ساری رات بارش ہوتی رہی۔ صبح اٹھا تو بارش ہو رہی تھی۔ مگر کہیں بھی پانی ں کھڑا تھا۔ زمین اونچی نیچی نیم پہاڑی تھی۔ سردار جی کی نوکرانی آئی ہوئی تھی۔ ش کی وجہ سے وہ واپس نہ جا سکی اور رات وہیں رہی۔ صبح اس نے ہمیں ناشتہ وغیرہ کر دیا۔

کوئی دس بجے کے قریب بارش رک گئی۔ میں نے سردار جی سے کہا۔

"مجھے ناگ مندر کا پتہ بتا دیں۔ میں کم از کم وہاں جا کر بنگالی فیملی کے بارے میں ھ معلومات تو حاصل کروں۔"

سردار جی بولے۔ "کاکا تمہیں وہاں سوائے پتھر کے ناگ دیوتا کے اور کچھ نہیں لے گا۔ مہنت اور پجاری جاپانیوں کے خوف سے اپنے سارے سانپ دیوتا پٹاریوں میں ل کر وہاں سے رفو چکر ہو گئے ہیں تم گھبراؤ نہیں۔ میں کسی کو بھیج کر اپنے یار یرے کو دکان پر بلاتا ہوں۔ اس سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔"

دکان پر آ کر سردار جی نے ایک آدمی کو سپیرے کی طرف بھیجا۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ نٹے بعد سپیرا بھی آ گیا۔ پہلی نظر میں یہ کالا کلوٹا سپیرا مجھے بن مانس لگا۔ اس کے جسم کافی بال تھے۔ ناک چوڑا اور آنکھیں سرخ تھیں۔ سر منڈا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں س کی لمبی چھڑی تھی۔ آتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر سردار جی کو پرنام کیا اور بولا۔

"ماراج نے بلایا ہے۔ کیا بات ہے؟"

وہ اردو ایسے بولتا تھا جیسے اس نے نئی نئی سیکھی ہو۔ سردار جی نے اس کو ہندو بنگالی کی کاجل اور اس کے انکل اور ماتا جی کے بارے میں ساری تفصیل بتائی اور کہا۔

"یہ لوگ ایک مہینہ ہوا ناگ مندر میں آئے تھے کلکتہ سے۔ تب سے واپس یں گئے۔ یہ نوجوان ان کی تلاش میں کلکتے سے یہاں آیا ہے۔ کیا تم ان کے بارے کھوج لگا سکتے ہو؟"

اس سپیرے کا نام سردار جی نے مجھے شانچی بتایا تھا اور کہا تھا کہ یہ سپیرا نسل در نسل یہاں کا رہنے والا ہے اور سانپوں کو جنگل سے پکڑتا اور انہیں ہندوستان کے مختلف ناگ مندروں میں سپلائی کرنا اس کا دھندا ہے۔ شانچی کی عمر کا اس کی شکل اور سوکھا ساکھا جسم دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ کبھی وہ مجھے لگتا کہ اس کی عمر ساٹھ سال کی ہو گی۔ کسی وقت لگتا کہ وہ بیس بائیس سال کا نوجوان ہے۔ اس کے جسم پر جو بال نظر آ رہے تھے وہ سارے کالے تھے۔ شانچی بانس کی چھڑی فرش پر رکھ کر سٹول پر بیٹھ گیا۔ کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ میں اس کی باتوں کو سلیس اردو میں بیان کرتا ہوں۔

"سردار جی! کستھار کے ناگ مندر میں بنگال آسام سے عورتیں مرد ناگ پوجا کو آتے ہی رہتے ہیں۔ جنگ کی وجہ سے اب اس مندر میں کوئی نہیں آتا۔"

پھر شانچی سپیرے نے میری طرف اپنی سرخ انگارہ ایسی آنکھوں سے دیکھا اور مجھ سے کاجل اس کی ماتا اور چچا کا حلیہ دریافت کیا۔ میں نے اسے بتا دیا۔ وہ فرش کی طرف بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے فرش پر کوئی شے نظر آ رہی ہے۔ پھر سردار جی کی طرف دیکھ کر سٹول سے اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"سردار جی! میں کھوج لگا لوں۔ پھر آ کر کچھ بتا سکوں گا۔"

سردار جی نے پوچھا۔

"شانچی! کتنے دن تک کھوج لگاؤ گے؟"

وہ بولا۔ "کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

اور پرنام کر کے چلا گیا۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ دل میں سوچا کہ یہ کام مجھے خود ہی کرنا پڑے گا۔ یہ سوکھا ساکھا سپیرا کیا کرے گا۔ اس کو کاجل اور اس کی ماتا کا حلیہ بھی یاد نہیں رہے گا۔ میں نے سردار جی سے جب اپنی مایوسی کا اظہار کیا تو وہ بولے۔

"کاکا تو اس سانپ کی اولاد کو نہیں جانتا۔ یہ ہر جگہ گھس جاتا ہے۔ زمین کے اندر کا حال معلوم کر لیتا ہے۔ دو ایک دن ٹھہر جاؤ۔ یہ کچھ نہ کچھ سراغ رسانی ضرور کر کے آئے گا۔ اور ویسے بھی تم اکیلے یہاں کچھ نہیں کر سکتے۔ تم تو ان لوگوں کی زبان بھی

نہیں جانتے۔ یہاں سے ذرا آگے جاؤ گے تو اراکان کی برمی زبان شروع ہو جائے گی۔"

میرا خیال تھا کہ شانچی سپیرا سراغ رسانی کرنے میں چھ سات دن تو ضرور لگائے گا مگر وہ دوسرے ہی دن شام کے وقت سردار جی کی دکان پر آ گیا۔ آتے ہی پہلے اس نے بڑی تیز پتی والی چائے پی۔ بیڑی پی اور دونوں نتھنوں سے دھواں نکالتے ہوئے بولا۔

"ان لوگوں کا پتہ چل گیا ہے۔"

میں بڑا خوش ہوا۔ سردار جی میری طرف دیکھ کر بولے۔

"میں نہ کہتا تھا یہ بڑا جبردست قسم کا آدمی ہے۔ یہ تو زمین کے اندر کی بھی خبر لے آتا ہے۔ ہاں تو شانچی کیا خبر ملی ہے ان بنگالیوں کی؟"

شانچی سپیرے نے بتایا کہ کچھ روز پہلے ناگ مندر میں کلکتے سے ایک عورت اور مرد آئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بنگالی لڑکی بھی تھی۔ چونکہ ناگ مندر میں نہ کوئی مہنت تھا نہ پجاری تھا۔ یاتری بھی نہیں تھے۔ یہ لوگ ایک دن اور ایک رات مندر میں رہے اور ناگ دیوتا کی پوجا پاٹھ کرتے رہے۔ پھر ایک آدمی انہیں یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گیا کہ چتواراکھی کی پہاڑیوں میں شیش ناگ کا مندر ہے وہاں ناگ دیوتا رات کو درشن دیتے ہیں۔ یہ لوگ ان کے ساتھ چتواراکھی کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے۔

میں نے شانچی سپیرے سے پوچھا۔

"اب وہ لوگ کہاں ہیں؟ اگر چتواراکھی پہاڑی مندر میں ہی ہیں تو مجھے اس مندر کا راستہ بتاؤ۔ میں وہاں جاؤں گا۔"

شانچی کہنے لگا۔

"بابو پہلے میری پوری بات سن لو۔"

شانچی نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ چتواراکھی کے شیش مندر میں ناگ دیوتا نے کبھی درشن نہیں دیئے۔ لگتا ہے ان لوگوں کو دھوکے سے وہاں لے جا کر غائب کر دیا گیا ہے۔

"اب یہی ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کسی جاسوس کو شیش مندر میں ان لوگوں کا

کھوج لگانے کے لئے بھیجوں اس پر کچھ پیسے خرچ ہوں گے۔"

سردار جی نے کہا۔

"شانچی! تم پیسوں کی فکر نہ کرو۔ جتنا خرچہ ہو گا میں دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "سردار جی! میرے پاس بھی پیسے ہیں۔ مگر میں خود اس آدمی کے ساتھ شیش مندر جانا چاہتا ہوں۔"

سردار جی ہنس پڑے۔ "کاکا! یہ تم نہیں بول رہے تمہارے سر پر جو عشق کا بھوت سوار ہے وہ بول رہا ہے۔"

شانچی سپیرا کہنے لگا۔

"بابو! چتوارا کھی کی پہاڑیاں بڑی خطرناک ہیں وہاں جنگلی جانور اور سانپ بہت ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تم صرف یہ بتا دو کہ ان پہاڑیوں کو کونسا راستہ جاتا ہے اور میں وہاں کیسے پہنچ سکتا ہوں۔ آگے میں جانوں میرا کام۔۔۔"

شانچی سپیرا سردار جی کو تکنے لگا۔ بولا۔

"مارا ج! لگتا ہے یہ بابو مارا جائے گا۔ اس کو سمجھاؤ۔ یہ اس طرف نہ جائے۔"

سردار جی مجھے سمجھانے لگے۔ جب میں اپنی ضد پر قائم رہا تو انہوں نے شانچی سپیرے سے کہا کہ تم اس کے ساتھ کیوں نہیں چلے جاتے۔ میں تمہیں سارا خرچہ دے دوں گا۔ شانچی کہنے لگا۔

"چتوارا کھی کی پہاڑیوں میں ایک جگہ سنتھالی سپیروں کا قبیلہ آباد ہے۔ انہوں نے ایک بہت بڑے درخت کے نیچے شیش ناگ کا مندر بنایا ہوا ہے۔ یہ قبیلہ ہمارے قبیلے کا دشمن ہے۔ میں اگر وہاں گیا تو زندہ واپس نہیں آ سکتا۔"

میں نے سردار جی سے کہا۔

"سردار جی آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے اس سپیرے کے سنتھالی سپیروں کے قبیلے کا پتہ لے دیں۔ میں خود وہاں پہنچ جاؤں گا۔ مجھے جنگلوں پہاڑوں کا بڑا تجربہ ہے۔"

سردار جی بولے۔ "کاکا اگر تو باز نہیں آتا تو جا جو تیرا جی چاہے کر۔۔۔"

انہوں نے شانچی سپیرے سے کہا کہ وہ مجھے سنتھالی سپیروں کے قبیلے کا پتہ سمجھا دے۔ کیونکہ شانچی کو یقین تھا کہ کاجل اور اس کی ماتا اور انکل چندر بابو کو سنتھالی سپیروں نے اغوا کیا ہے شانچی نے مجھے سارا راستہ اچھی طرح سے سمجھا دیا۔

سردار جی نے اس سے پوچھا کہ آخر ان سپیروں نے بنگالی خاندان کو کیوں اغوا کیا ہے۔ شانچی کہنے لگا۔

"یہ بڑا قاتل سپیروں کا قبیلہ ہے ان کے آدمی یہاں ناگ مندر کے میلے پر اکثر آتے جاتے رہتے ہیں اور یہاں سے کسی نہ کسی لڑکی کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ کوئی مرد ہو تو اسے وہ راستے میں ہی ختم کر دیتے ہیں کیونکہ لڑکی کو اپنے قبیلے میں لے جا کر وہ خوب کھلاتے پلاتے ہیں - ان کی سپیرن عورتیں لڑکی کو دن میں دو بار ناریل کے دودھ سے نہلاتی ہیں۔ اس کا بناؤ سنگھار کرتی ہیں۔ ایک خاص مدت کے بعد لڑکی کو چھوٹے سانپ سے ڈسوایا جاتا ہے۔ جب سانپ کا زہر لڑکی کے جسم میں پھیلنے لگتا ہے تو ایک خاص دوائی لگا کر زہر کا اثر زائل کر دیا جاتا ہے۔ یہ عمل سات دن تک جاری رہتا ہے۔ اسکے بعد لڑکی کو بڑے سانپ سے ڈسوانا شروع کر دیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ زہر کا اثر بھی زائل کرتے جاتے ہیں۔ ایک مہینے کے بعد لڑکی کا جسم سانپ کے زہر کا عادی ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں یہ خاصیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس انسان کو دانت سے کاٹے وہ مر جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ سنتھالی سپیرے بنگالی لڑکی اور اس کے ساتھ جو دو مرد عورت تھے انہیں اپنے قبیلے میں لے گئے ہیں۔ انہوں نے مرد عورت کو راستے میں ہی ختم کر دیا ہو گا اور لڑکی پر سانپ ڈسوانے کا کام شروع کر دیا ہو گا۔"

شانچی کی زبان سے یہ باتیں سن کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ کاجل زہریلی لڑکی بن جائے گی اور وہ جس کو کاٹے گی وہ اس کے زہر کے اثر سے مر جائے گا۔ میں نے یہ سوچ کر شانچی سپیرے کی باتوں کو سنی ان

سنی کر دیا کہ یہ شخص جھوٹ بھی تو بول سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سردار جی سے زیادہ پیسے بٹورنے یا ان پر اپنا اثر ڈالنے کے لئے حالات کو زیادہ سنگین بنا کر پیش کر رہا ہو۔ میرے دماغ میں بار بار خیال آ رہا تھا کہ آخر وہ کس مقصد کے لئے اغوا کر کے لائی گئی لڑکی کو زہریلا بناتے ہیں۔ سردار جی بھی یہی سوچ رہے تھے۔ انہوں نے یہی سوال شانچی سپیرے سے پوچھ لیا۔

"او کالو تم یہ بتاؤ کہ آخر سنتھالی سپیرے لڑکی کو سانپ ڈسوا کر زہریلی کس لئے بناتے ہیں؟"

شانچی کہنے لگا۔

"ایسی لڑکی کو وہ سپیرن بنا لیتے ہیں۔ اسے ساتھ لے کر گاؤں گاؤں شہر شہر پھرتے ہیں۔ لوگوں کے گھروں میں جا کر سانپوں کا تماشہ دکھاتے ہیں۔ اپنے خاص مقصد کے لئے کسی لڑکی کو پسند کر لیتے ہیں پھر خیرات میں اس لڑکی کی اتری ہوئی پرانی ساڑھی یا دھوتی لے کر اسے اپنے خاص سانپ کو سنگھاتے ہیں اور رات کو مکان کے آس پاس چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور سانپ کو چھوڑ دیتے ہیں سانپ لڑکی کی اتری ہوئی ساڑھی یا دھوتی میں لڑکی کے جسم کی جو بو ہوتی ہے اس بو کے پیچھے پیچھے لڑکی کے گھر جہاں وہ سو رہی ہوتی ہے پہنچ جاتا ہے اور اس کی پنڈلی پر ڈس کر آ جاتا ہے۔ یہ سانپ اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس کے ڈسنے سے آدمی کی موت واقع نہیں ہوتی۔ بس ایک غنودگی اور کمزوری سی آدمی پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ لڑکی کے گھر پہنچ جاتے ہیں اور گھر والوں کو بتاتے ہیں کہ لڑکی پر ناگ دیوتا عاشق ہو گیا ہے اس کو لے کر کتھار کے ناگ مندر پہنچو۔ جب گھر والے لڑکی کو لے کر کتھار کے ناگ مندر میں پہنچتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ سپیرے راستے میں ہی لڑکی کو اغوا کر لیتے ہیں اور اس کے آدمیوں کو سانپ ڈسوا کر مار ڈالتے ہیں۔ اگر راستے میں موقع نہ ملے تو ناگ مندر کے پجاری سے مل کر لڑکی کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔"

سردار جی بڑی دلچسپی سے شانچی سپیرے کی باتیں سن رہے تھے۔ میں بھی یہ سوچ کر اب پریشان ہونے لگا تھا کہ کہیں سچ مچ سنتھالی سپیروں نے کاجل کی ماں اور انکل کو سانپوں سے ڈسوا کر ہلاک نہ کر دیا ہو۔ سردار جی نے کہا۔

"اوئے کالو! تم نے نہیں بتایا کہ پھر اس لڑکی کا انجام کیا ہوتا ہے جس کو سپیرے سانپ ڈسوا کر زہریلی بنا دیتے ہیں۔"

شانچی سپیرے نے بتایا کہ تین ایک مہینے تک مختلف سانپوں سے ڈسوانے کے بعد لڑکی کا رنگ کالا سیاہ پڑ جاتا ہے۔ اس کے جسم میں اتنا زہر پھیل جاتا ہے کہ وہ دشمن قبیلے کی جس عورت جس مرد کا منہ یا جسم کا کوئی حصہ چوم لیتی ہے وہ مر جاتا ہے۔ اس طرح یہ سپیرے لوگ اس زہریلی لڑکی کے ذریعے اپنے دشمنوں سے اپنی دشمنیوں کا بدلہ لیتے ہیں۔ شانچی سپیرے نے بتایا کہ دوسری طرف دشمن قبیلے کے سپیروں نے بھی اس قسم کی کوئی لڑکی یا آدمی اغوا کر کے اسے زہریلا بنا کر تیار رکھا ہوتا ہے اور ان کے دشمن پر حملے بھی جاری ہو جاتے ہیں۔ شانچی بولا۔

"سپیروں کے قبیلوں کی یہ لڑائی اور دشنیاں پرانے زمانوں سے چل رہی ہیں کوئی سال بھر کے اندر سانپوں سے اپنے جسم کو ڈسوانے والی لڑکی کو سانپوں کے زہر کا نشہ ہو جاتا ہے۔ قبیلے کے سپیرے تو اسے ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد ایک خاص اور بے ضرر زہر والے سانپ سے ڈسواتے ہیں مگر زہریلی لڑکی کو سانپ کے زہر کے نشے کی ایسی لت پڑ جاتی ہے کہ وہ جنگل اور پہاڑیوں میں نکل جاتی ہے اور ڈھونڈھ کر سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسواتی ہے۔ اس کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ سانپوں کو بھی اس لڑکی کے زہریلے خون کا نشہ چڑھ جاتا ہے۔ جنگلی سانپ دور دور سے اس لڑکی کے جسم کی بو پا کر اس کی طرف آتے ہیں اور اس کے جسم سے جونکوں کی طرح چمٹ کر اس کا خون چوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ یوں ایک روز زہریلی لڑکی مر جاتی ہے اور سانپ اس کے جسم کا گوشت بھی کھا جاتے ہیں۔"

شانچی سپیرے نے کاجل کی اتنی ڈراؤنی تصویر پیش کی کہ میں نے دل میں طے کر لیا کہ خواہ مجھے سنتھالی قبیلے کے سارے سپیروں کو ہی کیوں نہ قتل کرنا پڑے کاجل کو

ان کے چنگل سے ضرور چھڑا کر لاؤں گا۔ میرے دل میں ہندو بنگالی لڑکی کاجل سے محبت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ آگے چل کر مجھے کس قسم کے خوفناک واقعات سے واسطہ پڑنے والا تھا۔ اس سے میں بالکل بے خبر تھا۔ شانچی سپیرے سے میں نے سنتالی سپیروں کے قبیلے کا سارا محل وقوع دریافت کر لیا۔ ان کے رسم و رواج اور پوجا پاٹھ کے طریقوں کے بارے میں بھی ابتدائی معلومات حاصل کر لیں۔ اگلے روز صبح صبح میں اپنی خطرناک مہم پر روانہ ہونے لگا تو سردار جی نے بھی مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نہ رکا اور اللہ کا نام لے کر میں چتوارا کھی کی دشوار گزار پہاڑیوں کی طرف چل پڑا۔

جس علاقے سے میں گزر رہا تھا یہ برما اور بنگال کا سرحدی جنگلوں کا پہاڑی اور نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ شانچی سپیرے نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ مجھے کہاں سے کہاں پیدل سفر کرنا ہو گا۔ کہاں سے میں کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کروں گا۔ راستے میں کہاں کہاں پہاڑی گاؤں میرے راستے میں آئیں گے۔ اس نے بتایا تھا کہ اگر میں نقشے کے مطابق چلتا رہا تو دوسرے دن شام سے پہلے مجھے سبز رنگ کی تین چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی نظر آئیں گی۔ یہاں سے مجھے بائیں جانب مڑ جانا ہو گا۔ آگے ایک برساتی ندی ملے گی۔ اس ندی کے پار چتوارا کھی کی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں اور ان ہی پہاڑیوں کی ایک چھوٹی سی وادی میں سنتالی سپیروں کی بستی ہے اور وہیں ایک گنجان درخت کے تنے میں شیش ناگ کا چھوٹا سا مندر بنا ہوا ہے۔

جنگل تو اس سے پہلے میں نے بہت دیکھے تھے مگر جس علاقے سے میں گزر رہا تھا وہ ایک مختلف جنگلی علاقہ تھا۔ سمندر قریب ہونے کی وجہ سے یہاں زمین تھوڑی تھوڑی ریتلی تھی۔ اونچی گھاس کہیں بھی نہیں تھی۔ کہیں کہیں جھاڑیوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ اگے ہوئے تھے۔ ناریل اور تاڑ کے درخت دور قطاروں میں کھڑے تھے۔ کھلا میدانی علاقہ کافی دور تک چلا گیا تھا۔ ایک پگ ڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ میں اس پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میری نگاہ پہاڑی چوٹیوں پر تھی۔ یہ چتوارا کھی کی پہاڑیاں تھیں۔ مجھے وہیں پہنچنا تھا۔ ان پہاڑیوں کو سامنے رکھ کر میں سمت درست کر لیتا تھا۔

میں نے پرانی پتلون کے اوپر ٹھنڈی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ جیب میں چاقو تھا۔ دوسری جیب میں ڈبل روٹی کے سلائیس تھے جن میں سردار جی نے تلی ہوئی مچھلی کے کچھ ٹکڑے رکھوا دیئے تھے۔ میرے سفر اسی طرح شروع ہوتے تھے۔ میں اللہ توکل نکل پڑتا تھا۔ میرے جنگلوں کے تنہا سفر نے مجھ پر ایک بات ضرور ثابت کر دی تھی کہ شہروں میں آدمی بھوکا مر سکتا ہے مگر جنگل کسی آدمی کو بھوکا پیاسا نہیں مرنے دیتا۔ بمبئی اور مدراس ایسے شہروں میں اپنی بے یار و مددگار آوارہ گردیوں کے زمانے میں میں نے دیکھا تھا کہ اگر مجھے پیاس لگتی تھی تو مجھے پانی ملنا دشوار ہو جاتا تھا۔ دکاندار سوڈا واٹر کی بوتل خریدنے کو کہتا مگر سادہ پانی دینے سے صاف انکار کر دیتا تھا۔ یہ بمبئی کا شہر ہی تھا کہ جہاں مجھے دو دن کا فاقہ آ گیا تھا۔ بڑے بڑے شہر سنگدل اور بے فیض ہوتے ہیں مگر جنگل انسانوں کے ساتھ مہربان ماں ایسا شفقت کا سلوک کرتے ہیں۔ پانی کی تلاش میں بعض جنگلوں میں ضرور کچھ دور تک بھٹکنا پڑتا ہے مگر کہیں نہ کہیں کوئی ندی یا جھرنا ضرور مل جاتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو چاہے گدلا ہی سہی مگر بانس کے درختوں میں گھرا ہوا تالاب ہی سامنے آ جاتا ہے۔

یقین کریں جنگلوں میں سفر کرتے ہوئے میں شہروں سے زیادہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا تھا۔ جنگلی درندوں اور سانپوں کا خطرہ ضرور ہوتا تھا۔ مگر تجربے نے یہ بات بھی ثابت کر دی تھی کہ سانپ پر اگر پاؤں پڑ جائے تو وہ اپنی جان بچانے کے لئے حملہ کرتا ہے ویسے آپ قریب سے گزر جائیں تو وہ کچھ نہیں کہتا۔ بس ذرا سی پھنکار مار کر خبردار ضرور کرتا ہے کہ میری طرف مت آنا۔ یہی حال جنگل کے بادشاہ شیر کا ہے۔ اگر شیر کسی شکاری کی حماقت سے آدم خور نہ بن جائے تو وہ آدمی پر کبھی حملہ نہیں کرتا بلکہ بعض شکاریوں نے بتایا کہ اگر شیر راستے میں آ جائے تو وہ خاموشی سے راستہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ شیر جنگل میں بھوک سے مارا مارا پھر رہا ہو۔ جنگل میں قدرت نے اس کے لئے خوراک کا بڑا اعلیٰ انتظام کر رکھا ہے۔ اسے بڑی آسانی سے کسی ہرن یا نیل گائے یا جنگلی بھینس کا شکار مل جاتا ہے

خود میرے ساتھ ایک بار ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔ میں جنگل میں چلا جا رہا تھا کہ ایک جگہ سامنے جھاڑیاں آ گئیں۔ میں نے راستہ تلاش کرنے کی غرض سے جھاڑیوں کو ہٹایا تو سامنے ٹھنڈے ٹھنڈے نرکلوں میں ایک بہت بڑا شیر لیٹا ہانپ رہا تھا۔ اس نے ایک دم سے اپنا بھاری شاہانہ سر اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں تو دہشت کے مارے وہیں ساکت ہو کر رہ گیا۔ شیر اسی طرح لیٹا رہا۔ صرف گردن جھٹک کر ہلکا سا غرایا۔ یہ اس بات کا انتباہ تھا کہ جدھر سے آئے ہو ادھر ہی واپس چلے جاؤ اور آئندہ اس طرف کا رخ نہ کرنا۔ میں الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ شیرنی اگر پورے دنوں سے ہو یا اس کے بچے پیدا ہو چکے ہوں تو اس کی طبیعت میں غصیلا پن ضرور آ جاتا ہے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا اناڑی آدمی ان جھاڑیوں میں چلا جائے جہاں شیرنی نے اپنے بچوں کے لئے مارا ہوا شکار چھپایا ہوتا ہے تو البتہ وہ اس پر حملہ کرے گی۔ وہ بھی اسے کھانے کے لئے نہیں بلکہ سبق سکھانے کے لئے کہ وہ اس طرف کیوں آ گیا تھا۔ صرف ایک آدھ ہاتھ ہی مارے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ شیرنی کے پنجے میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ آدمی شدید زخمی ہو جاتا ہے یا کبھی کبھی آدمی کی گردن ہی ٹوٹ جاتی ہے۔

لیکن جس جنگلی علاقے میں میں چلا جا رہا تھا وہاں شیر کی موجودگی کا زیادہ امکان نہیں تھا۔ البتہ ہاتھی یہاں بہت تھے۔ کئی بار ہاتھیوں کا غول میرے آگے سے گزر گیا۔ میں دوڑ کر درخت پر چڑھ گیا۔ اسی طرح میرا سفر جاری رہا۔ راستے میں جنگلی لوگوں کا ایک گاؤں بھی آیا۔ انہوں نے مجھے ابلے ہوئے چاولوں اور کچے کیلوں کا سالن کھلایا۔ یہ لوگ بنگالی کم اور اراکانی زیادہ لگتے تھے۔ نہ وہ میری زبان سمجھتے تھے نہ میں ان کی زبان سمجھتا تھا مگر انسان ہونے کے ناطے ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ راستے میں ایک دریا بھی آیا۔ یہ دریا میں نے ایک ملاح کی کشتی میں بیٹھ کر پار کیا۔ رات ہونے لگی تو میں رات بسر کرنے کے لئے کوئی ٹھکانہ تلاش کرنے لگا۔ سانپوں کی وجہ سے میں کسی درخت پر رات بسر کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ درخت بھی زیادہ تر ناریل، تاڑ اور بانس اور جنگلی کیلے کے تھے جن پر چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں

ہو تا تھا۔ کوئی گاؤں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس ایک پہاڑی کی کھوہ میں کچھ سو
اور زیادہ جاگ کر میں نے کسی نہ کسی طرح رات بسر کی - صبح کی روشنی ہوتے ہی میں
اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

قصہ مختصر میں آخر ان تین چٹانوں کے پاس پہنچ گیا جن پر سبز رنگ کی کائی لگ
ہوئی تھی۔ یہ زنگار کی سبز گہری تہہ تھی۔ یہی وہ تین سبز چٹانیں تھیں جن کے بار
میں شانچی سپیرے نے بتایا تھا کہ وہاں سے مجھے بائیں طرف مڑنا ہو گا۔ آگے ایک ند
آئے گی۔ ندی کے پار چتوارا کھی کی پہاڑیاں شروع ہو جائیں گی۔

میں سبز چٹانوں کی بائیں جانب مڑا تو آگے واقعی ایک ندی بہہ رہی تھی۔ یہ ند
ہمارے پنجاب کی نہروں ایسی ندی نہیں تھی۔ یہ پہاڑی ندی تھی جو چھوٹے بڑ
پتھروں کے درمیان سے اور اوپر سے گزر رہی تھی۔ اس کا پانی تھوڑا گدلا تھا۔ جنو
مشرقی ایشیا کے جنگلوں اور پہاڑیوں میں عام طور پر اسی قسم کی گدلے پانیوں والی ندیا
بہتی ہیں۔ ہاں اگر کہیں اوپر سے آبشار گر رہی ہو تو اس کا پانی ضرور شفاف ہو تا ہے
ندی کے پتھروں پر پاؤں رکھتا میں ندی کے دوسرے کنارے پر چلا گیا۔ یہاں سے
سامنے کی جانب دیکھا تو ڈوبتے سورج کی ملگجی روشنی میں پہاڑیوں کی چوٹیاں روش
روشن نظر آ رہی تھیں۔ یہی چتوارا کھی کی پہاڑیاں تھیں اور یہی میری منزل تھی۔

شام ہو رہی تھی تھوڑی دیر میں رات کا اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ میں نے رات وہ
کسی جگہ بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ندی میں نہایا۔ اپنے کپڑے دھوئے۔ فلیٹ کے کینو
کے جوتے اچھی طرح سے دھو کر صاف کئے۔ موسم حبس آلود تھا۔ بارش بالکل نہ
ہوئی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ج
تک میں ان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں داخل نہیں ہوا تھا مجھے سمت کا پورا پورا اند
تھا۔ جیسے ہی میں ان پہاڑیوں کے اندر آیا مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں ک
طرف جا رہا ہوں۔ یہاں کافی درخت تھے۔ جھاڑیاں اور گھاس بھی تھی۔ ایک
ہاتھیوں سے آمنا سامنا ہوا تو میں ان سے بچنے کی خاطر دوسری طرف کو نکل گیا۔

شام ہو رہی تھی۔ پہاڑی جنگل میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ ایک چھوٹی پہاڑی ختم ہوتی
سری شروع ہو جاتی۔ مجھے شانچی سپیرے نے اس بات کی خاص طور پر تاکید کی تھی
کسی پہاڑی کے اوپر مت چڑھنا۔ کیونکہ سنتھالی سپیروں کی بستی پہاڑیوں کے
ان کسی جگہ کھلی وادی میں ہے۔ جب مجھے احساس ہونے لگا کہ میں ان ٹیلوں کی
بھلبھلیوں میں الجھتا جا رہا ہوں تو میں وہیں ایک جگہ رک کر ایک درخت کے پاس
ہو گیا۔

یہاں اتنی گہری خاموشی تھی کہ ایسی خاموشی میں نے شام کے وقت کسی جنگل میں
دیکھی تھی۔ حیرانی کی بات تھی کہ کسی درخت پر کوئی پرندہ تک نہیں بول رہا تھا۔
لہ شام کے وقت جنگل میں پرندے بسیرا کرنے آتے ہیں اور بڑا شور مچاتے ہیں۔
جس مقام پر کھڑا تھا وہاں سے پہاڑی ایک طرف گھوم جاتی تھی۔ اس کا نشیب
عمودی تھا۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ قدم قدم چلتا پہاڑی کی دوسری طرف آ
۔ یہاں شام کے گہرے ہوتے اندھیرے میں مجھے ایک جھونپڑا سا دکھائی دیا۔ میں یہ
کر اس کی طرف بڑھا کہ شاید یہاں کوئی جنگلی دیہاتی رہتا ہو۔ اس سے یہ پوچھنے کی
شش کروں گا کہ سپیروں کی بستی یہاں سے کس طرف ہے۔ میں جھونپڑے سے
دور تھا کہ مجھے ایک باریک سیٹی کی آواز سنائی دی۔ سیٹی کی اس آواز سے میرے
آشنا تھے۔ یہ سانپ کی سیٹی کی آواز تھی۔ مجھے ایک سپیرے نے ست پڑا کے
وں میں بتایا تھا کہ برسات کے دنوں میں سانپ اپنی ناگن کو بلانے کے لئے یہ آواز
ا ہے۔ میں ایک لمحے کے لئے وہیں چپ چاپ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ دوسری
ری بار جب سانپ کی سیٹی کی آواز آئی تو میں نے محسوس کیا کہ آواز میری دائیں
ب سے آ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں چلتا بائیں جانب نکل گیا۔ میں نر اور مادہ سانپوں
ملاپ کے مقام سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

اتنے میں خدا جانے کہاں سے بادل آئے اور آسمان پر چھا گئے۔ بادلوں میں بجلی
۔ گرج بلند ہوئی اور ایک دم سے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارانی جنگلوں

میں میں نے اس طرح یکدم موسلا دھار بارش ہوتے پہلے بھی کئی بار دیکھی تھی۔ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے کسی نے بٹن دبایا ہو اور موسلا دھار بارش برسنے لگی ہو۔ میرے سامنے اس وقت بارش سے بچنے کے لئے وہ جھونپڑا ہی تھا جس کو دیکھ کر اس طرف آگیا تھا۔ جھونپڑا زمین سے کوئی دو تین فٹ اونچا تھا جیسا کہ عام طور پر ان علاقوں میں جھونپڑے زمین سے دو تین فٹ اونچی مچان پر بنائے جاتے ہیں تاکہ بارشوں میں سیلاب کا پانی جھونپڑے میں نہ آسکے۔ کیونکہ ان علاقوں میں دو ایک مہینوں کو چھوڑ کر تقریباً سارا سال ہی بارشیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ جھونپڑا ایک چھوٹے سے کیبن کی شکل کا تھا۔ اس کی دیواریں بانس جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ چھت ناریل کی شاخوں ٹہنیوں کی ڈھلواں تھی اور آگے چھوٹا سا برآمدہ بھی تھا۔ یہ کسی دیہاتی کا جھونپڑا نہیں لگتا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی وقت یہاں لکڑی کی کٹائی کا کام ہوتا ہو اور ٹھیکیدار کے آدمیوں نے اپنے رہنے کے لئے یہ کیبن بنالیا ہو۔

کیبن کے برآمدے میں ایک سٹول پڑا تھا۔ اس کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر اندھیرا تھا مگر یہ گہری ہوتی شام کا اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں مجھے تھوڑا تھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ کیبن کے فرش پر درختوں کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں باہر برآمدے میں آکر سٹول پر بیٹھ گیا۔ بارش بڑے زور سے ہو رہی تھی۔ اس کی پھواریں برآمدے میں میرے اوپر بھی پڑ رہی تھیں۔ میں نے سٹول کو ذرا پیچھے کر لیا۔ بارش کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی بہت بڑی آبشار پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گر رہی ہو۔ دیکھتے دیکھتے رات کا اندھیرا چھا گیا۔ پہلے مجھے سامنے اور دائیں بائیں اونچے اونچے درخت نظر آ رہے تھے۔ اب صرف بجلی چمکتی تو وہ دم بھر کے لئے نظر آ کر غائب ہو جاتے۔ میرے پاس کھانے پینے کو اب کچھ بھی نہیں تھا۔ ان پہاڑیوں میں داخل ہونے سے پہلے میں نے کچھ جنگلی کیلے توڑ کر کھا لئے تھے اور ندی کے پانی سے پیاس بھی بجھالی تھی۔ مجھے اس وقت بھوک پیاس بھی نہیں تھی۔

بارانی گھنے جنگلوں کی ایک خاص دہشت ہوتی ہے۔ شہر کا آدمی نیا نیا ایسے جنگلوں

میں سفر کر رہا ہو اور رات آجائے تو خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ شروع شروع میں مجھ پر بھی یہ دہشت طاری ہو جایا کرتی تھی لیکن وقت اور تجربے کے ساتھ ساتھ یہ دہشت دور ہو گئی اور مجھے ان جنگلوں کا تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ میں جنگل کی مختلف آوازیں پہچاننے لگا تھا۔ درندوں پرندوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کی آوازوں کے علاوہ جنگل کی ایک اپنی آواز بھی ہوتی ہے - یہ آواز عام طور پر اس وقت سنائی دیتی ہے جب رات کا وقت ہو۔ ہوا بالکل بند ہو۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی ہو۔ ایسے میں اس قسم کی آواز اچانک سنائی دیتی ہے جیسے کوئی شخص آپ کے قریب سے سرگوشیوں میں بات کرتا گزر گیا ہو۔ ایک جنگلی نے مجھے بتایا تھا کہ جنگل میں رات کے وقت بعض پودے بڑی تیزی سے ایک دم بڑھتے ہیں اور یہ آواز ان پودوں کی کسی شاخ کے بڑھنے کی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے شخص نے مجھے اس سے زیادہ رومانٹک بات بیان کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ آدھی رات کے بعد اگر ہوا اچانک بند ہو جائے تو جنگل کے بعض درخت ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ یہ سرگوشیوں ایسی آواز ان درختوں کے بات کرنے کی ہوتی ہے۔ بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو میرے دل سے جنگل کی راتوں کی دہشت اور ان کا ڈر بالکل اتر چکا تھا۔ اگر کوئی ڈر ہوتا تھا تو صرف جنگلی درندوں اور سانپوں کا ڈر ہوتا تھا کہ کسی طرف سے اچانک نکل کر حملہ نہ کر دیں۔ اس وقت بھی جبکہ میں بانس کی جھونپڑا نما کیبن کے برآمدے میں بیٹھا تھا تو مجھے اس سانپ کا ڈر لگا ہوا تھا جس کی سیٹی کی آواز سن کر میں یہاں آگیا تھا۔ ڈر یہی تھا کہ کہیں وہ سانپ اپنی مادہ کو لے کر بارش سے بچنے کے لئے اس کیبن میں نہ آجائے۔ کیونکہ بارش اتنے زور شور سے ہو رہی تھی کہ لگتا تھا درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ کر بہا لے جائے گی۔

میں سٹول پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر برآمدے میں بانس کی جو ریلنگ لگی تھی اس کے پاس آگیا۔ یہاں بارش کی پھوار میری منہ پر پڑی تو مجھے جنگل کی گرمی اور حبس والی شام کے بعد یہ ٹھنڈی پھوار بڑی خوشگوار لگی۔ بارش کا پانی بڑے شور

کے ساتھ کیبن کی مچان کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ اندھیرے میں مجھے یہ سیلابی پانی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس کی آواز بارش کی آواز سے الگ سنائی دے رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ کیبن بھی بارش کے سیلاب میں نہ بہہ جائے۔ مگر پانی مچان کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ ابھی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ برآمدے کے لکڑی کے فرش پر لیٹ کر تھکان دور کرنی چاہئے۔ لیکن سانپوں کے جوڑے کے خوف سے میں نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ میں واپس سٹول پر آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد موسلا دھار بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ بارش کی آواز بھی ہلکی ہو گئی۔ کوئی ایک منٹ بعد بارش بالکل رک گئی - یہ تماشا میں جنگلوں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ بارش ایک دم شروع ہوتی اور پھر جب رکتی تو ایسے رکتی کہ بادلوں میں سے ایک بوند بھی نیچے نہ گرتی تھی۔ درخت ضرور بارش کے بعد ٹپکتے رہتے تھے۔

بارش کی آواز کے علاوہ مجھے بارش رکنے کے بعد درختوں کے ٹپکنے کی آواز بھی بڑی اچھی لگتی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی جب کہ بارش یکدم رک گئی تھی درختوں پر بارش کا رکا ہوا پانی ٹپکنے لگا تھا اور میں اس آواز کو بڑے شوق سے سن رہا تھا۔ بارش کا سیلابی پانی کا ریلا جو مچان کے نیچے سے بہہ رہا تھا اب اس کی آواز بھی بہت ہلکی ہو گئی تھی۔

اتنے میں مجھے ایک اور آواز سنائی دی جو ان آوازوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس الگ آواز کو کوئی ماہر شکاری کوئی جنگل کا باسی یا میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ میں جلدی سے سٹول سے اٹھا اور کیبن کی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں برآمدے میں کونے میں تھا جہاں سے کیبن کی دیوار کے ساتھ نیچے اترنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ میں دیوار کے کونے کے پاس بیٹھ گیا اور اندھیرے میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ مجھے درختوں کے ٹپکنے اور مچان کے نیچے سے برساتی پانی کے ریلے کے گزرنے کی آوازوں کے علاوہ جو آواز سنائی دی تھی اور جس نے مجھے چوکنا کر دیا تھا وہ آواز بارش کے پانی میں انسانی قدموں کی آواز تھی۔ کوئی شخص درختوں کے نیچے سے گزر کر کیبن کی طرف آ رہا تھا۔

خاص آواز مجھے کیبن کی طرف آتی سنائی دی تھی۔ مجھے جنگل کی تاریک راتوں کا ھیرا گہرا سیاہ نہیں بلکہ کاسنی رنگ کا لگتا تھا۔ ایسے اندھیرے میں میری آنکھیں ت کچھ دیکھ لیتی تھیں۔ مجھے اندھیرے میں ایک انسانی سایہ کیبن کی طرف بڑھتا نظر ۔ میں ناک کی بجائے منہ سے سانس لینے لگا تاکہ میرے سانس کی آواز پیدا نہ ہو۔

پراسرار سایہ کیبن کی سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے سے گزرتا ہوا کیبن کے اندر خل ہو گیا۔ میں جہاں بیٹھا تھا وہیں دبک کر بیٹھا رہا۔ بانس کی دیوار میرے ساتھ ہی ی تھی۔ بانسوں کے درمیان جو درزیں ہوتی ہیں میں نے ان کے ساتھ آنکھیں لگا ں مگر کیبن کے اندر گھپ اندھیرا تھا مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب یہ انسانی سایہ بن کے اندر داخل ہوا تھا تو مجھے کچھ ایسا نظر آیا تھا۔ جیسے اس شخص کے ہاتھ میں ی رسی ہے جسے وہ بار بار جھٹک رہا تھا۔ میری آنکھیں بانسوں کی دیوار کی ایک درز پر لی تھیں کہ اچانک کیبن میں روشنی ہو گئی۔ پراسرار انسان نے ایک دیا روشن کر کے رش پر رکھ دیا تھا۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ انسانی سایہ ایک عورت تھی جب وہ جلتا ہوا دیا رش پر رکھ رہی تھی تو اس کے سر کے کھلے بال نیچے لٹک رہے تھے۔ پھر اس نے لوں کو جھٹک کر پیچھے کیا اور جلتے ہوئے دیئے کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ چانک اس نے بائیں ہاتھ کو اوپر کیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کالا سانپ تھا جس چیز کو یں رسی سمجھ رہا تھا وہ سانپ تھا۔ اس عورت نے جو دبلی پتلی تھی اور جس کے جسم پر جھے صرف ایک ساڑھی نما دھوتی ہی دکھائی دے رہی تھی سانپ کو گردن سے پکڑ رکھا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت نے اپنا دایاں بازو آگے کیا۔ سانپ کے منہ کو پنے بازو کے قریب لے گئی۔ سانپ نے اس کے بازو پر ڈس دیا۔ عورت سانپ کا منہ پنے سینے کے پاس لے گئی۔ سانپ نے وہاں بھی ڈس دیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سانپ نے عورت کے جسم کے مختلف حصوں پر چار پانچ مرتبہ ڈسا۔ ہر بار عورت کے حلق سے ہلکی سی آہ نکل جاتی تھی۔ اس کے بعد اس عورت نے اپنی زبان باہر نکالی۔ سانپ

کے منہ کو اپنی زبان کے پاس لے گئی۔ سانپ نے اس کی زبان پر بھی ڈس دیا۔ عورت نے زبان اندر کرلی۔ مستی کے عالم میں ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا جو مجھے بالکل کسی بچے کے معصوم قہقہے جیسا لگا۔ پھر ایک دم سے اس نے سانپ کی گردن پر زور سے کاٹا۔ سانپ کو دم سے پکڑ کر جھٹکے دیتی ہوئی اٹھی۔ دروازے سے باہر برآمدے میں آئی۔ میں نے چہرہ دیوار کی اوٹ میں کرلیا۔ اس عورت نے برآمدے میں کھڑے ہو کر زور سے سانپ کو جھاڑیوں میں اچھال دیا۔ کھلے دروازے میں سے آتی دیئے کی مدھم روشنی میں مجھے وہ عورت کسی دوسری دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس نے دونوں بازو اوپر اٹھائے۔ سر کے کھلے بالوں کو حال کھیلنے کے انداز میں تین چار مرتبہ آگے پیچھے جھٹکے دیئے اور پھر جیسے نشے میں جھومتی ہوئی واپس کیبن کے اندر چلی گئی۔ میں ایک بار پھر بانسوں کی درمیانی درز میں سے اندر دیکھنے لگا۔

وہ فرش پر جلتے دیئے کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی وہ آہستہ آہستہ دائیں بائیں جھوم رہی تھی۔ دیئے کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے جسم کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ اچانک مجھے سنتھالی سپیروں کے قبیلے کی زہریلی عورتوں کا خیال آگیا جن کے بارے میں شانچی سپیرے نے رونگٹے کھڑے کر دینے والی باتیں بیان کی تھیں۔ میں نے غور سے آنکھیں درز کے قریب کر کے اسے دیکھا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ کہ لڑکی کلکتے کی بنگالی لڑکی کاجل نہیں تھی جس کی تلاش میں میں جان پر کھیل کر وہاں آیا تھا۔ ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لہرا گیا۔

یہ عورت اگر واقعی سنتھالی سپیروں کی زہریلی لڑکی تھی جسے اپنا مطلب نکل جانے اور لڑکی کے بیکار ہو جانے کے بعد سنتھالی سپیروں نے مرنے کے لئے جنگل میں چھوڑ دیا تھا یا وہ خود ہی سانپوں کو ڈسوانے کی خاطر جنگل میں نکل آئی تھی تو ہو سکتا ہے اسے بنگالی لڑکی کاجل کے بارے میں کچھ پتہ ہو اور اس سے مجھے کاجل کا سراغ مل جائے۔ مجھے اتنا اطمینان تھا کہ اس عورت کے پاس اب کوئی سانپ وغیرہ نہیں ہے۔ اگر خطرہ تھا تو صرف اس بات کا تھا کہ کہیں یہ مجھ پر حملہ نہ کر دے۔ کیونکہ شانچی سپیرے نے

بتایا تھا کہ سانپوں سے بار بار ڈسوانے کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے کہ لڑکی کے سارے جسم میں سانپ کا زہر سرایت کر جاتا ہے۔ اس کا رنگ گہرا سیاہ پڑ جاتا ہے اور پھر کاٹنا تو دور کی بات ہے اگر وہ صرف کسی کا منہ چوم لے تو وہ شخص اس کے زہر کے اثر سے مرجاتا ہے۔ یہ سارے امکانات اور خدشے اور خطرے میرے ذہن میں تھے جب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اس زہریلی لڑکی کے سامنے جانا چاہئے یا نہیں۔ وہ جلتے ہوئے دیئے کے سامنے فرش پر بیٹھی آہستہ آہستہ جھوم رہی تھی۔ موسلا دھار بارش کے بعد جنگل پر ڈراؤنا سناٹا چھا گیا تھا۔ اس سناٹے میں صرف درختوں کے ٹپکنے کی آواز آ رہی تھی۔ بارش کا پانی جو مچان کے نیچے نشیب میں بہہ رہا تھا اس کی آواز بھی مدھم پڑ گئی تھی۔

اس لڑکی کی شکل شباہت سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہندوستان کی ہی رہنے والی ہے۔ برما کی رہنے والی نہیں چنانچہ وہ اردو میں نہ سہی مگر ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں مجھ سے ضرور بات کر لے گی اور میری بات سمجھ لے گی۔ اب میں اس زہریلی لڑکی کے سامنے جانے کے لئے بالکل تیار تھا۔ میں آہستہ آہستہ سے اٹھا اور کیبن کی دیوار کے ساتھ ساتھ دبے پاؤں چلتا دروازے کی طرف بڑھا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ میرے پاؤں میں کینوس کے اس زمانے کے فلیٹ شوز تھے جن کی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ اندر سے دیئے کی دھندلی سی روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں نے سر آگے کر کے اندر دیکھا۔ زہریلی لڑکی نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی چیخ مار کر اٹھی اور مجھے کاٹنے کے لئے اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اس کی کلائیوں کو پکڑ کر اوپر کر دیا تاکہ وہ مجھے اپنے ناخن بھی نہ مار سکے۔ زہریلی لڑکی کے حلق سے چیخ کی ایسی ہیبت ناک آواز نکلی کہ سارا جنگل لرز گیا۔

میں نے زہریلی لڑکی کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا اور جیب سے چاقو نکال کر کھول لیا۔ زہریلی لڑکی ہاتھ جوڑ کر کانپنے لگی۔ اس نے بنگلہ اردو کی ملی جلی زبان میں کہا کہ مجھے نہ مارنا میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ کھلا چاقو میرے ہاتھ میں تھا اور میں اس کے سر پر کھڑا تھا۔ دیئے کی روشنی میں میرا سایہ بھوت کی طرح دیوار پر پڑ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟ میں نے تمہیں اپنے آپ کو سانپ سے ڈسواتے دیکھ لیا ہے۔ کیا تم سنتھالی سپیروں کی عورت ہو؟"

حالانکہ میں جان گیا تھا کہ یہ لڑکی سنتھالی سپیروں کے ظلم و ستم کی ستائی ہوئی لڑکی ہے مگر میں اس کی زبان سے اس کی کہانی سننا چاہتا تھا۔ زہریلی لڑکی بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سخت ڈری ہوئی تھی۔ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں ایک بدقسمت عورت ہوں۔ چاقو ہٹا لو پھر تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔"

میں نے چاقو بند کرکے جیب میں ڈال لیا۔ لڑکی ساڑھی سے اپنے سیاہ بدن کو ڈھانپتے ہوئے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس سے تین چار فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

"اب بتاؤ تم کون ہو اور اس جنگل میں کیسے آ گئی ہو۔ تمہاری زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ تم بنگال کے کسی شہر کی رہنے والی ہو۔"

زہریلی لڑکی اپنے بالوں کو پیچھے باندھتے ہوئے بولی۔

"میرا نام پاروتی ہے۔ میں کلکتے کے پاس ایک قصبے درگاپور میں اپنے ماتا پتا کے گھر میں رہتی تھی اور اسکول میں ٹیچر تھی۔ ایک روز ہمارے محلے میں ایک سنتھالی سپیرا آیا۔ وہ سانپوں کا تماشہ دکھاتا تھا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا او کہا کہ تم پر ناگ دیوتا مہربان ہو گئے ہیں۔ تم بڑی بھاگیہ وتی ہو۔ یہ سپیرا ہمارے گھر آ کر میرے ماتا پتا جی سے بھی ملا اور انہیں بھی بتایا کہ ناگ دیوتا نے مجھے پسند کر لیا ہے۔ میرے ماتا پتا پڑھے لکھے ہونے کے باوجود سخت توہم پرست تھے۔ انہوں نے سنتھالی سپیرے کی بڑی آؤ بھگت کی اور کہا کہ ناگ دیوتا سے کہہ کر ہماری بیٹی کی کسی اچھی جگہ شادی کرا دو۔ سنتھالی سپیرے نے کہا کہ لڑکی کو درگاپور کے ناگ مندر میں لے جا کر پرارتھنا کرانی ہو گی۔ وہ مجھے ناگ مندر میں لے گیا۔ میرے ماتا پتا بھی ساتھ تھے۔ سپیرے نے انہیں مندر کی ڈیوڑھی میں بٹھا دیا اور مجھے ایک کوٹھڑی میں لے جا کر کوئی چیز سنگھائی جس سے میں بے ہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو میں ایک بیل گاڑی میں بیٹھی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ ایک سنتھالی سپیرا اور دو عورتیں میرے پاس بیٹھی میری نگرانی کر رہی تھیں۔ بیل گاڑی ایک جنگل سے گزر رہی تھی۔ میں بہت روئی۔ بہت چیخی چلائی۔ ان لوگوں نے مجھے زبردستی کوئی چیز سنگھا کر دوبارہ بے ہوش کر دیا۔ یہ سنتھالی سپیرے تھے۔ یہ مجھے اپنے ڈیرے پر لے آئے جو اس جنگل میں چتوراکھی کی پہاڑیوں میں ہے۔ یہاں لا کر انہوں نے مجھے نشے پر لگا دیا۔ پہلے وہ مجھے کچھ پلاتے تھے۔ پھر ہر ہفتے ایک سانپ مجھے ڈسواتے۔ ہوتے ہوتے میں بھی نشے کی عادی بن گئی۔ دن میں دو بار مجھے سانپ سے ڈسوانے لگے۔ پھر میری ایسی حالت ہو گئی کہ میں رو رو کر ہاتھ جوڑ کر انہیں کہتی کہ مجھے سانپ سے ڈسواؤ۔ مجھے سانپ سے ڈسوا کر وہ مجھ سے ہر قسم کی مشقت لیتے تھے۔ مگر مجھے کوئی ہوش نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح تین برس بیت گئے۔ میرا سارا جسم سانپوں کے زہر سے سیاہ پڑ گیا۔ میرے جسم پر سانپوں کے کاٹنے کے بے شمار نشان پڑ گئے۔ میرا خون زہر بن گیا۔ تب ان سپیروں نے مجھے ڈیرے سے نکال کر جنگل

میں پھینک دیا۔ اب میں دن رات اس جنگل میں بھٹکتی پھرتی ہوں اور سانپوں کو تلا
کرتی رہتی ہوں۔ جہاں کہیں کوئی سانپ نظر آتا ہے وہیں اس کو پکڑ لیتی ہوں۔ پہلی
وہ مجھے خود ڈستا ہے دوسری بار میں خود اسے ڈسواتی ہوں۔ دن میں دس دس بارہ
سانپ مجھے ڈستے ہیں مجھے بھوک زیادہ لگے تو میں سانپ کو ہی کھا جاتی ہوں....."

وہ اپنی دردناک کہانی سناتے سناتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھے اس پر
حد ترس آیا۔ مگر معاملہ حد سے گزر چکا تھا۔ اب میں اس کے لئے کچھ نہیں کر
تھا۔ پھر بھی میں نے ازراہ ہمدردی اس سے کہا۔

"اگر تم چاہو تو میں تمہیں تمہارے ماں باپ کے پاس پہنچا دوں؟"

لڑکی روتے روتے چپ ہو گئی۔ ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"اب میں گھر جانے کے لائق نہیں رہی میں ایک ایسی ناگن بن گئی ہوں
دوسری ناگنوں اور سانپوں کو کھا کر زندہ رہ رہی ہے۔ میں واپس انسانوں کی دنیا
نہیں جا سکتی۔"

اور وہ لڑکی سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ میں بھی خاموش بیٹھا رہا۔ میں اسے
تسلی دیتا؟ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ انسانوں کی دنیا میں جانے کے قابل نہیں رہی تھ
وہ سر سے پاؤں تک زہریلی ناگن بن گئی تھی اور اسے کچھ روز بعد انہی جنگلوں
اپنے ہی زہر سے مرجانا تھا۔ شانچی سپیرے نے مجھے بتایا تھا کہ ایسی زہریلی عورتوں کی
یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ان پر سانپ کے زہر کا بھی نشہ نہیں ہوتا۔ پھر وہ بچھوؤں
ڈسوانے لگتی ہیں۔ تب ان کے خون میں اتنا زہر بھر جاتا ہے کہ ان کا جسم اچانک پھ
جاتا ہے اور وہ مرجاتی ہیں۔

رونے سے اس لڑکی کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟ تم بھی اپنی بھاشا سے ادھر کے آدمی نہیں لگتے۔ ان جنگلوں
کیسے آئے ہو؟ کیا تم کوئی شکاری ہو؟"

اب میں نے اسے ساری کہانی بیان کر دی اور اسے کہا کہ میں کلکتے کی بنگالی لڑ

کاجل کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ زہریلی لڑکی نے میری بات سن کر کہا۔

"کچھ دن ہوئے سنتھالی سپیرے ایک بنگالی لڑکی کو پکڑ کر لائے تھے۔ دو راتیں
اسے برگد کے درخت والے ناگ دیوتا کے مندر کی کوٹھڑی میں بند رکھا۔ پھر اسے
اراکان کے بڑے ڈاک بنگلے کی طرف لے گئے تھے۔ وہ لڑکی کاجل ہی ہو گی۔"

جب میں نے اسے کاجل کا حلیہ بتایا تو وہ کہنے لگی۔

"ہاں۔ اس لڑکی کا یہی حلیہ تھا۔ مگر اس کے ماتا پتا اس کے ساتھ نہیں تھے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ اراکان کا بڑا ڈاک بنگلہ کہاں ہے اور وہاں کون رہتا ہے۔ سنتھالی سپیرے
کاجل کو وہاں کس لئے لے گئے ہیں؟"

زہریلی لڑکی نے حلق سے سانپ کی پھنکار ایسی آواز نکالی۔ کہنے لگی۔

"سنتھالی سپیروں نے مجھ پر بھی بڑے ظلم کئے ہیں۔ اراکان کے ڈاک بنگلے میں
بھی اس لڑکی پر ظلم و تشدد کیا جائے گا۔"

میں نے پوچھا یہ ڈاک بنگلہ یہاں سے کتنی دور ہے۔ وہ بولی۔

"تم اتنی دور کلکتہ شہر سے اس لڑکی کی تلاش میں آئے ہو۔ کیا تم اس سے پریم
کرتے ہو؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"یہی سمجھ لو کہ میں اس سے پریم کرتا ہوں۔"

زہریلی لڑکی سر جھکا کر فرش پر جلتے چراغ کی لو کو تکنے لگی۔ پھر چہرہ اٹھا کر میری
طرف دیکھا اور کہا۔

"میں تمہیں خود لے کر ڈاک بنگلے جاؤں گی۔ وہ پہاڑیوں میں ایسی جگہ پر ہے
جہاں تم اسے تلاش نہیں کر سکو گے۔ میں وہاں تین بار جا چکی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تم اتنا خطرناک پہاڑی راستہ میرے ساتھ کیسے چلو گی؟ تمہارے تو
پاؤں میں جوتا بھی نہیں ہے؟"

زہریلی لڑکی مسکرائی - کہنے لگی۔

"میرے پاؤں انہی جنگلوں میں پھرتے پھرتے پتھر کے مانند سخت ہو گئے ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو۔ میرا تمہارے ساتھ جانا ضروری ہے۔ تم اکیلے گئے تو پہاڑیوں میں بھٹک جاؤ گے۔"

میں نے سوچا کہ اگر یہ میرے ساتھ چلنے پر ضد کر رہی ہے تو اس میں میرا ہی فائدہ ہے۔ کم از کم یہ مجھے صحیح جگہ پر تو پہنچا دے گی۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے پاروتی! تم میرے ساتھ چلو گی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی - کیبن کے دروازے کی طرف بڑھی اور کہا۔

"تم یہیں رہنا۔ میں صبح کو آؤں گی۔"

وہ چلی گئی۔ کیبن کے فرش پر دیا جل رہا تھا۔ رات کافی باقی تھی۔ میں وہیں لکڑی کے فرش پر لیٹ گیا۔ بارش میں بھیگے ہوئے جنگل میں گہری خاموشی طاری تھی۔ کسی پتے کے ہلنے کی بھی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں کاجل کے بارے میں سوچنے لگا کہ خدا کرے وہ مجھے اراکان کے ڈاک بنگلے میں مل جائے۔ یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو کوئی میرے اوپر جھکا ہوا مجھے بازو سے ہلا کر جگا رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ زہریلی لڑکی پاروتی تھی وہ میرے لئے دو چار جنگلی کیلے اور انناس لائی تھی - کہنے لگی۔

"یہ کھا لو۔ پھر ہم چلیں گے۔"

میں نے چاقو سے انناس چھیل کر کھایا۔ اور تین کیلے کھائے۔ پاروتی سے پوچھا کہ اس نے بھی کچھ کھایا ہے کہ نہیں۔ وہ بڑے پراسرار انداز لہجے میں بولی۔

"میں جو کھاتی ہوں وہ میں نے کھا لیا ہے تم اب میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر پہاڑی سفر پر چل پڑی۔ وہ سارے پہاڑی راستوں کو جانتی تھی۔ رات بھر کی بارش کی وجہ سے گھاس گیلی ہو رہی تھی۔ بانس کے درختوں پر

سے بارش کا رکا ہوا پانی ابھی تک ٹپک رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد دن کا اجالا پھیلنے لگا۔ آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ مرطوب فضا میں طرح طرح کے جنگلی سبزے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ یہ سارا نیم پہاڑی علاقہ تھا اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں یہ انڈیا کے شمالی باڈر کے ساتھ ملا ہوا برما کا پہاڑی علاقہ تھا۔ یہ اراکان کی پہاڑیاں تھیں اور یہاں کئی مسلمان قبیلے آباد تھے۔ یہ قبیلے جنگلوں میں رہتے تھے۔ ابھی تک ہمیں اس قبیلے کا کوئی آدمی نہیں ملا تھا۔

زہریلی لڑکی شارٹ کٹ رستوں پر جا رہی تھی۔ وہ میرے آگے آگے تھی۔ اس کے بال پیچھے گردن پر بندھے ہوئے تھے۔ جسم پر کاسنی رنگ کی ساڑھی تھی۔ دن کے اجالے میں دیکھا تو اس لڑکی کا رنگ گہرا بادامی تھا۔ بازوؤں پر جگہ جگہ سانپوں کے ڈسوانے کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ ایک بات کا مجھے خطرہ شروع ہی سے لگا ہوا تھا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے آخری ایام تھے۔ برما پر جاپان کا قبضہ تھا اور شمال میں جاپانی فوجیں آسام کی سرحدوں پر انگریزوں کی انڈین فوجی یونٹوں سے گھمسان کی جنگ کر رہی تھیں۔ ہم برما کی سرحد کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں غلطی سے ہم جاپانی فوج کے مورچوں کی طرف نہ نکل جائیں۔

جب میں نے پاروتی سے اس خطرے کا ذکر کیا تو اس نے لاپرواہی سے کہا۔

"ادھر جنگ وغیرہ کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم مت گھبراؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ زہریلی لڑکی دنیا کے جنگی اور سیاسی حالات سے بالکل بے خبر ہے۔ بہرحال میں بہت چوکنا ہو کر چل رہا تھا۔ چھریرے بدن کی یہ دبلی پتلی زہریلی لڑکی پاروتی بغیر تھکے چلی جا رہی تھی۔ پہاڑی راستوں پر چلتے ہوئے آدمی بہت جلدی تھک جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں اترائیاں چڑھائیاں بہت ہوتی ہیں - ایک پہاڑی وادی سے نکل کر ہم دوسری وادی میں داخل ہوئے تو میں نے پاروتی سے پوچھا کہ ابھی ڈاک بنگلہ کتنی دور ہے۔ وہ چلتے چلتے رک گئی - بولی۔

"کیا تم تھک گئے ہو؟"

پھر اس نے سامنے والی پہاڑی کی نشیب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ڈاک بنگلہ وہاں ہے۔ ہم شام ہونے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ ک تمہیں بھوک پیاس لگی ہے؟؟"

میں بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

"بھوک تو نہیں لگی مگر ہاں پیاس ضرور لگ رہی ہے۔"

زہریلی لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بولی۔

"میرے ساتھ آؤ۔ وہاں پانی کا تالاب ضرور ہو گا۔ مجھے اسی طرف سے پانی ٹھنڈی ہوا آتی محسوس ہوتی ہے۔"

اس لڑکی کو جنگل نے شاید اپنی بیٹی بنا لیا ہوا تھا۔ جنگل اسے اپنی تمام نعمتوں ا تمام خطروں سے آگاہ کر دیتا تھا۔ ہم ایک طرف درختوں کی جھنڈ میں گئے تو وہاں وا ایک چھوٹی سی پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ بڑا شفاف پانی تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا سیر ہو کر پانی پیا۔ زہریلی لڑکی بھی منہ ہاتھ دھونے لگی۔ پھر اس نے ہرنی کی طرح ند کی سطح سے منہ لگا کر پانی پیا۔ میں نے کہا۔

"پاروتی! تم اس طرح کیوں پانی پیتی ہو؟"

وہ بولی۔

"جنگل کی دھرتی میری ماتا ہے۔ جس طرح بچہ ماتا کے سینے سے منہ لگا کر دود ہے اسی طرح میں دھرتی ماں کے سینے پر منہ رکھ کر پانی پیتی ہوں۔"

پانی پی کر وہ میرے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔ جس طرح جنگل میں میں محتاط کر چل رہا تھا پاروتی اس کے مقابلے میں ایک جنگلی ہرنی کی طرح پوری آزادی اور فکری سے چل رہی تھی۔ وہ مجھ سے کاجل کے بارے میں پوچھنے لگی کہ اس کی کتنی ہے؟ کیا اس کے بال بھی میری طرح لمبے ہیں؟ تم اس سے کتنا پریم کرتے مجھے اس کے اس قسم کے سوالوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس ہوں ہاں کہہ جواب دیئے جا رہا تھا۔ اتنے میں وہ بات کرتے کرتے اچانک چپ ہو گئی۔ میں نے ا

ی طرف دیکھا کہ یہ اچانک چپ کیوں ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں درختوں کے نیچے جو جھاڑیاں تھیں ن میں سے کالے رنگ کا ایک لمبا سانپ نکل کر میری طرف بڑھا۔ زہریلی لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

"اپنی جگہ سے ہلنا مت۔ نہیں تو یہ بھاگ جائے گا۔"

سانپ نے اپنی گردن گھاس میں تھوڑی سی اوپر اٹھا رکھی تھی اور لہراتا ہوا آہستہ آہستہ رینگتا میری طرف آ رہا تھا۔ خدا جانے وہ میری ہی طرف کیوں آ رہا تھا۔ جب وہ مجھ سے کوئی پانچ فٹ کے فاصلے پر آ گیا تو اس نے گردن اوپر اٹھا کر اپنا پھن پھیلا دیا۔ اب سانپ نے اپنا منہ زہریلی لڑکی کی طرف پھیر لیا تھا۔ زہریلی لڑکی کے چہرے پر ایسی مسرت اور خوشی کے اثرات تھے جیسے اسے کوئی انمول شے مل گئی ہو۔ سانپ اپنی جگہ پر پھن اٹھائے کنڈلی مارے بیٹھا زہریلی لڑکی کو مسلسل تک رہا تھا۔

میرے دیکھتے دیکھتے زہریلی لڑکی نے اپنا ہاتھ سانپ کی طرف اس طرح بڑھایا جیسے اسے پیار کرنا چاہتی ہو۔ سانپ نے بھی ایسی تیزی کے ساتھ زہریلی لڑکی کے ہاتھ پر ڈس دیا۔ لڑکی نے اپنا ہاتھ پیچھے نہ کیا بلکہ دوسرا ہاتھ بھی اس کی طرف کر دیا۔ سانپ نے اس کے دوسرے ہاتھ پر بھی ڈس دیا۔ اب اس نے سانپ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زمین پر سے اٹھا لیا اور اسے اپنی گردن کے قریب لے آئی۔ سانپ نے اس کی گردن پر بھی ڈس دیا۔ مجھے نہیں معلوم سانپ ایک بار ڈس کر زہر خارج کرتا ہے کہ دوسری بار ڈس کر زہر خارج کرتا ہے یا نہیں۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ سانپ زہریلی لڑکی کے جسم پر بار بار ڈس رہا تھا اور لڑکی خوش ہو کر مسکرائے جا رہی تھی اور سانپ سے پیار محبت کی باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

یہ بڑا دہشت ناک منظر تھا۔ میں پیچھے ہٹ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس منظر کو خوفزدہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ جب سانپ ڈستے ڈستے نڈھال ہو گیا تو زہریلی لڑکی پاروتی نے سانپ کو اپنی گردن میں ڈالا۔ اس کا سر ہاتھ میں پکڑا اور میری طرف دیکھ کر کہنے

گی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

اور وہ سانپ کو لے کر درختوں کے پیچھے چلی گئی - تھوڑی دیر بعد واپس اس کا منہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں مزید خوفزدہ ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے سانپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا۔ میرے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ کہنے

"میں تمہارے سامنے سانپ کو کھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اسے - درختوں کے پیچھے چلی گئی تھی۔"

میں بت بنا اس لڑکی کا منہ تک رہا تھا جس کو سپیروں نے ظلم و ستم کا نشانہ کے بعد انسان سے حیوان بلکہ حیوان سے بھی بدتر بنا دیا تھا۔ کہنے لگی۔

"اگر میں تمہارے پاس نہ بیٹھی ہوتی تو اس سانپ نے تمہیں ڈس لینا تھا۔ زہریلا سانپ تھا۔ ٹھہرو میں پانی پی کر ابھی آتی ہوں۔ میرے جسم میں اس ز سانپ نے آگ سی لگا دی ہے۔"

وہ دوڑ کر ندی کی طرف چلی گئی۔ پانی پی کر واپس آئی تو اپنے بالوں کا جوڑا با ہوئے کہنے لگی۔

"اب مجھے رات تک بھوک نہیں لگے گی۔ یہ سانپ اس جنگل میں کبھی کبھ ہاتھ آتا ہے - چلو آگے چلتے ہیں۔"

وہ آگے آگے اور میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

ہم گھاٹیوں اور کھڈوں میں سے گزرتے ہوئے دوپہر کے وقت اس پہاڑ نشیب میں آ گئے جہاں اراکان والا ڈاک بنگلہ تھا۔ بنگلے کی ڈھلانی سرخ چھت دو نظر آ رہی تھی۔ زہریلی لڑکی نے اس طرف اشارہ کیا۔

"وہ ہے ڈاک بنگلہ۔ اگر تمہارے بھاگ میں ہو گا تو کاجل تمہیں وہاں مل گی۔ مگر میں جانتی ہوں وہ جس حالت میں تمہیں ملے گی شاید تم اسے قبول نہ گے۔"

میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"سوال میرے قبول یا نہ قبول کرنے کا نہیں ہے میں تو اس لڑکی کو کلکتے اس کے ر واپس لے جانا چاہتا ہوں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پہلے جنگل میں بڑا حبس تھا۔ بادل جھکے ہوئے تھے۔ پھر نڈی ہوا چلنے لگی۔ زہریلی لڑکی نے درختوں میں سے نظر آنے والے بادلوں کی طرف یکھا اور کہا۔

"شاید بادل برسیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں جلدی ڈاک بنگلے تک پہنچ جانا چاہئے۔"

وہ ہنس کر بولی۔

"کیوں؟ کیا تمہیں جنگل کی برکھا اچھی نہیں لگتی؟ مجھے تو برکھا بڑی اچھی لگتی ہے نگل میں جب بارش ہوتی ہے تو میں بارش میں نکل آتی ہوں....."

ہم اس پہاڑی پر چڑھ رہے تھے جس کے نشیب میں تھوڑا اوپر جا کر ڈاک بنگلہ بنا ا تھا۔ چڑھائی زیادہ دشوار گزار نہیں تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں میں سے گزرنا پڑ رہا ا۔ جب ہم ایک جگہ درختوں کے جھنڈ میں آئے تو سامنے کھلی جگہ میں ڈاک بنگلے کا آمدہ اور لکڑی کے کیبن نما کمروں کی کھڑکیاں اور دروازہ نظر آیا۔ میں آگے بڑھنے لگا زہریلی لڑکی نے مجھے کلائی سے پکڑ کر پیچھے کر لیا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے پاروتی؟ کیا پھر کوئی سانپ نظر آیا ہے؟"

پاروتی خود بھی درختوں کے پیچھے ہو گئی اور مجھے بھی اپنے قریب کر لیا۔ وہ درخت کے تنے کی اوٹ میں سے ڈاک بنگلے کے برآمدے اور سامنے جو چھوٹا سا صحن تھا اس طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"مجھے ڈاک بنگلے سے کسی انسان کی بو نہیں آ رہی۔"

زہریلی لڑکی پاروتی میں سانپوں سے ڈسواتے ڈسواتے سانپوں ایسی خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں۔ جس طرح سانپ کو دور سے انسان کی موجودگی کا احساس ہو جاتا ہے اسی

طرح پاروتی بھی دور سے اجنبی یا غیر اجنبی انسان کی بو سونگھ لیتی تھی۔ میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کاجل کو سپیرے کسی دوسری جگہ لے گئے ہوں اور کچھ دیر بعد و ڈاک بنگلے میں آ جائیں۔ ہمیں چل کر دیکھنا چاہئے۔"

زہریلی لڑکی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"سپیرے کاجل کو ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے کسی سرکاری عہدے دار کے ہی لائے تھے وہ اسے یہاں سے کہیں اور کہاں لے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی ہمیں ڈاک بنگلے میں جا کر دیکھنا چاہئے۔"

اس نے کہا۔ "پہلے میں جاتی ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔ مجھے اندر کوئی خطرہ ہے۔"

بہرحال میں وہیں رک گیا۔ پاروتی درختوں کے عقب سے ہو کر ڈاک بنگلے طرف نکل گئی۔ میں ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ صحن میں گزر کر برآمدے میں آئی۔ سامنے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دائیں بائیں دی پھر دروازے کو کھول کر اندر چلی گئی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے و برآمدے میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ زہریلی لڑکی پاروتی کمرے سے باہر آئی۔ اس دور سے مجھے چلے آنے کا اشارہ کیا۔ میں جلدی جلدی چلتا اس کے پاس آ گیا۔ اس کہا۔

"ڈاک بنگلہ خالی پڑا ہے۔ چلو کچن میں چل کر دیکھتے ہیں۔ وہاں اندازہ ہو گ یہاں کوئی آدمی رہتا ہے یا نہیں۔"

کچن ڈاک بنگلے کے پیچھے عمارت کے احاطے میں الگ کیبن کی شکل میں بنا تھا۔ کچن بھی خالی تھا۔ ایسے کوئی آثار نہیں تھے کہ وہاں کسی نے کھانا وغیرہ پکایا چولہا بھی ٹھنڈا تھا۔ ہم واپس ڈاک بنگلے میں آ گئے۔ ڈاک بنگلے کے چار چھوٹے چھو کمرے تھے۔ پرانا فرنیچر ہر کمرے میں موجود تھا۔ بیڈ روم میں بڑا سا پلنگ بغیر بستر خالی تھا۔ ہم خالی ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

میں نے زہریلی لڑکی سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ کاجل یہاں لائی بھی گئی ہے یا نہیں؟"

وہ کہنے لگی۔ "اسے دو سنتھالی سپیرے یہاں ضرور لائے تھے۔ اس کا مجھے یقین ہے۔"

"تو پھر وہ کہاں غائب ہو گئی؟"

میں نے حیرانی سے سوال کیا۔ زہریلی لڑکی اس طرح بار بار اوپر کو سانس کھینچنے لگی جیسے فضا میں کسی خاص شے کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کیا بات ہے پاروتی؟"

پاروتی نے آہستہ سے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

اور وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی۔

میں زہریلی لڑکی پاروتی کے پیچھے پیچھے تھا۔

وہ اسی طرح فضا میں کسی چیز کی بو سونگھتی برآمدے کے کونے والی کوٹھڑی کے پاس آ کر رک گئی۔ کہنے لگی۔ "اس کوٹھڑی کے اندر سنتھالی سپیروں کا کوئی سانپ موجود ہے۔ میں اپنے سانپوں کی بو پہچانتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کوٹھڑی کے دروازے پر تو تالا پڑا ہے۔"

وہ بولی۔ "اسے توڑ دو۔"

میں ایک پتھر ڈھونڈھ کر لے آیا۔ پتھر کو تالے پر دو تین بار زور سے مارا۔ تالا ٹوٹ گیا۔ زہریلی لڑکی نے مجھے ہاتھ سے پیچھے ہٹا دیا۔

"تم آگے مت آنا۔"

اس نے دروازہ کھول دیا - دروازہ کھلتے ہی اندر سے کسی سانپ کے پھنکار مارنے کی آواز بلند ہوئی۔ میں مزید ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ زہریلی لڑکی کوٹھڑی میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک سانپ پکڑا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"یہ ہمارے سنتھالی سپیروں کا سانپ ہے - میں اس کی بو پہچانتی ہوں۔ ہمارے سپیرے جب کسی اغوا کی ہوئی لڑکی کو یہاں لے کر آتے ہیں تو جاتے وقت اپنا ایک سانپ ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ سانپ اس لڑکی کی رکھوالی کرتا ہے اور اگر لڑکی فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے ڈس لیتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے مگر سوال یہ ہے کہ بنگالی لڑکی کاجل کہاں ہے؟"

زہریلی لڑکی نے سانپ کو اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ سانپ اسے بالکل نہیں ڈس رہا تھا۔ وہ مجھے واپس دوسرے کمرے میں لے آئی۔ ہم بانس کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگی۔

"مجھے ایسے لگتا ہے کہ کاجل کو کسی دوسرے جنگلی قبیلے کے سپیرے اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"یہ تم نے کیا ایک نئی کہانی شروع کر دی ہے۔"

زہریلی لڑکی نے کہا۔

"مجھے تو ایسے ہی لگتا ہے۔ جاتے جاتے وہ لوگ باہر والی کوٹھڑی کو تالا لگا گئے۔ یہ سانپ اسی کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ وہ وہیں بند ہو گیا۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ وہ بولی۔

"ہمیں اس قبیلے کی تلاش میں جانا پڑے گا۔ جس کے لوگ تمہاری کاجل کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"

"اتنے لمبے چوڑے پہاڑی علاقے میں ہم ان لوگوں کو کیسے تلاش کریں گے؟"

میں نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ وہ کہنے لگی۔

"تم کاجل سے پریم کرتے ہو۔ تمہیں تو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ اب میں اپنی سانپ کی سونگھنے کی طاقت سے کام لوں گی اور وہ لوگ جہاں کہیں ہوں گے انہیں ڈھونڈھ لوں گی۔"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ بادلوں میں ہلکی گرج پیدا ہوئی۔ وہ کہنے لگی۔

"بڑے زور کی بارش آ رہی ہے۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں تمہارے لئے جنگل سے کچھ کھانے کو لے کر آتی ہوں۔ میرے لئے تو یہ سانپ کافی ہو گا۔"

وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ میں دروازے میں آ کر اسے دیکھنے لگا۔ سانپ

اس کی گردن میں لپٹا ہوا تھا اور وہ جنگل کی ہرنی کی طرح لمبی لمبی چھلانگیں لگاتی درختو
جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ اتنے میں بادل زور سے گرجا اور درختوں کے پتوں اور ڈاک بنگلے کی کھپریل کی چھت پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے کی آواز آنے لگی۔ میں برآمدے میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن کی روشنی آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگی تھی۔ بارش شروع ہو گئی۔ جنگلوں پہاڑوں کی بارش نے مجھے ہمیشہ مسحور کیا ہے۔ برآمدے کی چھت پر جو پتھر کی سلیٹیں لگی ہوئی تھیں ان پر بارش کی آواز زیادہ شور مچا رہی تھی۔ زہریلی لڑکی کو گئے دس پندرہ منٹ گزر گئے تھے۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ جنگلی حیوانوں کی طرح کی ہو گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی خطرہ ہو سکتا تھ کہ کوئی سانپ بچھو نہ اسے کاٹ لے۔ وہ اس خطرے سے بے نیاز تھی اور سانپ بچھ خود اس کی خوراک بن چکے تھے۔

بارش خوب برس رہی تھی کہ میں نے زہریلی لڑکی کو درختوں کے جھنڈ میں سے نکل کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں جنگلی کیلوں کا پورا گچھا پکڑ رکھ تھا۔ جامنی رنگ کی لڑکی' کاسنی رنگ کی ساڑھی اور زرد رنگ کے کیلوں کا گچھا۔۔۔۔ یہ پال گوگین کی کلر سکیم تھی۔ وہ مجھے تہیٹی کے جزیرے میں پال گوگین کی بنائی ہوئی کوئی تصویر لگ رہی تھی۔

وہ بارش میں بھیگتی ہوئی بڑے آرام سے چلتی تھوڑا تھوڑا مسکراتی برآمدے میں گئی۔ کیلے کا گچھا اس نے برآمدے کے لکڑی کے فرش پر رکھ دیا اور اپنے بال نچوڑتے ہوئے بولی۔

"یہاں سوائے جنگلی کیلوں کے مجھے اور کچھ نہیں ملا۔ ویسے کچن میں میں نے ایک مرتبان میں کچے چاول دیکھے تھے۔ میں تمہیں رات کو چاول بھی بنا دوں گی۔ میر اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا کہ بدقسمتی اسے کہاں سے کہاں لے آئی ہے۔ اگر اس کے ماتا پتا توہم پرست نہ ہوتے اور سنتھالی سپیروں کی جاہلانہ باتوں میں نہ آتے ا یہ لڑکی آج درگاپور کے کسی کالج سے بی اے کر چکی ہوتی ہو سکتا ہے اس کی شادی ہ

گئی ہوتی اور یہ اپنے خاوند اور بچے کے ساتھ خوشی خوشی اپنے گھر میں زندگی بسر کر رہی ہوتی۔ یہ ایک بچے کی ماں ہوتی۔ ایک خدمت شعار بیوی ہوتی لیکن اس کی ماں باپ کی جہالت نے اس کو اس حال میں پہنچا دیا ہے کہ یہ حیوانوں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہی ہے اور کوئی پتہ نہیں اس کے جسم میں رچا ہوا زہر کب اسے ہلاک کر ڈالے۔ زہریلی لڑکی برآمدے کے فرش پر بیٹھی اپنے گیلے بالوں کو جھٹک کر سکھا رہی تھی۔ اس نے بالوں کو گردن کے پیچھے باندھ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جو سانپ وہ لے کر گئی تھی وہ اب اس کے پاس نہیں ہے۔

میں نے سانپ کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنس کر بولی۔

"مجھے بھوک لگی تھی۔"

میں ڈر گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں ایک ناگن خور عورت کے پاس نہیں بیٹھا ہوں بلکہ آدم خور ناگن کے پاس بیٹھا ہوا ہوں اور یہ آج رات جب میں سو جاؤں گا تو مجھے بھی کھا جائے گی۔

دیکھتے دیکھتے دن کی روشنی ڈوب گئی اور شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"آج کی رات تو ہمیں اسی ڈاک بنگلے میں بسر کرنی پڑے گی۔ کل موسم ٹھیک ہوا تو کاجل کی تلاش میں آگے چلیں گے۔"

وہ گردن جھکائے میری طرف بڑی پراسرار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ہاں --- آج کی رات یہیں رہنا ہو گا۔"

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کچھ کیلے کھا کر جو تھوڑی بہت بھوک لگی تھی اسے ختم کیا اور اٹھ کر کمرے میں آگیا۔ یہاں بجلی نہیں تھی۔ ہر کمرے میں مٹی کے تیل کا بڑی چمنی والا لیمپ پڑا تھا۔ میں لیمپ جلانے لگا تو زہریلی لڑکی نے مجھے منع کرتے ہوئے کہا۔

"لیمپ نہ جلاؤ۔ اس کی روشنی دور سے نظر آ جاتی ہے۔ مجھے اب بھی یہاں خطرہ

لگتا ہے۔"

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اسے اس خالی ڈاک بنگلے میں ابھی تک کونسا خطرہ نظر آ رہا ہے۔ بہرحال مجھے اس کی چھٹی حس کا اعتبار تھا۔ میں نے کہا۔

"اگر لیمپ نہ جلایا تو اندھیرا ہو جائے گا۔"

وہ کہنے لگی۔ "کچن میں چل کر دیکھتے ہیں - وہاں کوئی نہ کوئی موم بتی ضرور مل جائے گی۔"

ہم کچن میں آ گئے۔ یہ پرانے ٹائپ کا کچن تھا۔ دیوار میں ایک جانب پتھر کے شیلف بنے ہوئے تھے۔ یہاں ایک ڈبے میں ہمیں تین چار موم بتیاں مل گئیں۔ ہم انہیں لے کر بیڈ روم میں آ گئے۔ میں نے ایک موم بتی جلا کر کارنس پر لگا دی اور زہریلی لڑکی سے کہا۔

"تم پلنگ پر سو جانا۔ میں دوسرے کمرے میں صوفے پر جا کر سو جاتا ہوں۔"

وہ کہنے لگی۔ "تم نئے نئے شہر سے آئے ہو۔ اس قسم کی تکلیفوں کے عادی نہیں ہو۔ تم پلنگ پر سونا۔ میں تو جنگل میں بھی جا کر رات کاٹ لوں گی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کے باوجود مجھے یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ برآمدے میں یا دوسرے کمرے میں صوفے پر رات کو سوئے - وہ پہلے تو ضد کرتی رہی۔ پھر میرے اصرار پر مان گئی اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ میں نے کہا۔

"اندر سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا لینا۔"

یہ کہہ کر میں دوسرے کمرے میں آ کر صوفے پر لیٹ گیا۔ یہاں میں نے کھڑکی کے نیچے دیوار کے ساتھ اس طرح موم بتی روشن کر دی تھی کہ باہر سے اس کی روشنی نظر نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے صوفہ کھلے دروازے کے آگے کر لیا۔ یہاں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھی آ رہے تھے اور بارش کی آواز بھی زیادہ قریب سے سنائی دیتی تھی۔ میرا ذہن کاجل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ سپیرے اگر اسے اس ڈاک بنگلے میں لائے تھے تو پھر یہاں سے آگے اسے کہاں لے گئے ہیں۔ اگر بقول زہریلی لڑکی کے

اسے سنتھالی سپیرے نہیں بلکہ کسی دوسرے قبیلے کے لوگ اغوا کر کے لے گئے ہیں تو وہ کس حال میں ہو گی۔ یہی سوچتے سوچتے اور بارش کی آواز سنتے سنتے مجھ پر نیند طاری ہونے لگی۔ میری آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگیں۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ نہ جانے میں کتنی دیر سویا رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرا بازو ہلا کر مجھے جگا دیا۔ میں نے کونے والی موم بتی کی روشنی میں دیکھا کہ زہریلی لڑکی پاروتی مجھے جگا رہی تھی۔

"جلدی سے اٹھو۔ میرے ساتھ آؤ۔"

اس کے بعد اس نے دوڑ کر کونے والی موم بتی بجھا دی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں صوفے پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سوچنے لگا۔ خدا جانے کیا مصیبت آ گئی ہے۔ بارش کی آواز ہلکی ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس کے کمرے کی موم بتی بجھی ہوئی تھی۔ وہاں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"بات کیا ہوئی ہے؟ تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

وہ آہستہ سے بولی۔

"میں نے کچن کی پچھلی طرف دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنی ہے۔ وہ کسی اور ہی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔"

میرے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لئے ایک دم تیز ہو گئی۔ جس بات کا مجھے شروع ہی سے دھڑکا لگا ہوا تھا وہ بات پوری ہو رہی تھی۔ یہ لوگ سوائے جلپائی سپاہیوں کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے زہریلی لڑکی کو یہ بات بالکل نہ بتائی۔ میں نے اسے کہا۔

"تم جلدی سے سانپ والی کوٹھڑی میں چلی جاؤ۔ میں وہیں آتا ہوں۔"

وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ مگر میں نے اسے زبردستی اس کوٹھڑی کی طرف بھیج دیا جہاں سے سانپ نکلا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں بیڈ روم کے عقبی دروازے سے نکل کر ڈاک بنگلے کے پچھلے برآمدے میں آ کر ایک طرف دیوار سے لگ

کر کھڑا ہو گیا۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ مجھے کسی انسانی قہقہے کی آواز آئی۔ اس ۔ ساتھ کسی دوسرے نے جواب میں کچھ کہا۔ یہ اجنبی زبان تھی۔ میں اندھیرے : آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچن کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ یہ آوازیں کچن کی طرف سے رہی تھیں۔ پھر اچانک کچن میں روشنی ہو گئی۔ میں جلدی سے دروازے کے اندر گیا۔ کسی نے کچن میں پیٹرومائٹ کا لیمپ جلا دیا تھا۔ کچن کی کھلی کھڑکی کا رخ برآمد کی طرف تھا۔ کھڑکی میں سے مجھے دو جاپانی سپاہی نظر آئے جو ادھر ادھر چیزوں کی تلا لے رہے تھے اور ساتھ ساتھ ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہے تھے۔ میں وہیں سے وا مڑا اور بیڈ روم کے اندھیرے میں دبے پاؤں مگر تیز تیز چلتا سامنے والے برآمدے سے گزر کر سانپ والی کوٹھڑی میں آ گیا۔ یہاں بھی اندھیرا تھا۔ زہریلی لڑکی اندر مو تھی۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"جاپانی فوج اس علاقے میں داخل ہو گئی ہے کچن میں دو جاپانی سپاہی موجود ہیں ہمیں یہاں سے ابھی بھاگ جانا چاہئے۔"

زہریلی لڑکی بولی۔

"اس کوٹھڑی کے پیچھے برساتی نالہ ہے - وہاں چٹانوں کے اندر ایک سرنگ ـ میں نے وہ سرنگ دیکھی ہوئی ہے۔ ہم وہاں جا کر چھپ جاتے ہیں۔ جب یہ جاپانی ، سے چلے جائیں گے تو باہر نکل آئیں گے۔"

اس وقت میری عقل پر بھی پردہ پڑ گیا۔ میں نے بھی یہی سمجھا کہ یہ دو ج سپاہی شاید رات کی رات یہاں رکیں گے۔ صبح ہوتے ہی کسی دوسری طرف ا جائیں گے۔ ان سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ نیچے برساتی نالے کی سرنگ میں جا چھپ جائیں۔ میں نے زہریلی لڑکی سے کہا۔

"نیچے کس طرف سے جائیں؟"

لڑکی نے میری کلائی پکڑ لی اور مجھے کھینچتی ہوئی کوٹھڑی سے نکل کر برآمدے کی لکڑی کی سیڑھیاں اتر کر نیچے لے گئی۔ نیچے ڈاک بنگلے کے برآمدے کے چبوترے کے قریب ہی پتھر کی کچھ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہلکی بارش اور اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کو پکڑ کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر گئے۔ نیچے برساتی نالہ زور شور سے بہہ رہا تھا۔ اس کا پانی اندھیرے میں دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔

زہریلی لڑکی مجھے نالے کے کنارے کنارے چلاتی جھاڑیوں کو پکڑتی ایک پہاڑی کے نشیب میں لے آئی۔ یہاں پہاڑی کے اندر ایک قدرتی سرنگ بنی ہوئی تھی۔ یہ سرنگ کوئی پندرہ بیس فٹ لمبی تھی اور آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ زہریلی لڑکی پاروتی کو اس سرنگ کا پتہ تھا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کوئی سانپ نہ نکل آئے۔ جب میں نے پاروتی سے اپنے اس ڈر کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔

"تم کیوں فکر کرتے ہو۔ سانپ آیا تو میں اسے پکڑ کر کھا جاؤں گی۔ مجھے اس کی بو پہلے سے آ جاتی ہے۔"

میں نے پاروتی سے کہا۔

"ہمیں دن نکلنے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ جاپانی فوج اس طرف چلی آ رہی ہے یہ جاپانی سپاہی یونہی ادھر نہیں آ گئے۔"

زہریلی لڑکی کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے جاپانیوں کی اتنی فکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ پکڑی بھی گئی تو جو جاپانی سپاہی اس پر تشدد کرنے کی کوشش کرے گا اس کے زہر سے زندہ نہ بچ سکے گا۔ لیکن میں جاپانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر ان کا جنگی قیدی نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں نے کلکتے میں جاپانیوں کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ جنگی قیدیوں کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک کرتے ہیں۔ چنانچہ میں وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ جاپانی اس سارے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ میں اگر اکیلا بھاگتا ہوں تو کسی بھی جگہ پکڑا جا سکتا تھا۔ میرے لئے زہریلی لڑکی کی راہ نمائی بڑی ضروری تھی۔ کیونکہ وہ کم از کم ان پہاڑیوں

کے تمام نشیب و فراز سے واقف تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں کسی حالت میں بھی جاپانیوں کا قیدی نہیں بننا چاہتا تو وہ کہنے لگی۔

"میں بھی قیدی نہیں بنوں گی۔ ہم سویرا ہونے سے پہلے یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔ یہ برساتی نالہ آگے کالی چٹانوں والی پہاڑیوں کی طرف جاتا ہے۔ ان پہاڑیوں کے پیچھے ایک دریا ہے۔ ہم دریا پار کر کے آسام کی طرف نکل جائیں گے۔"

سرنگ میں اندھیرا تھا۔ مچھر بہت تھے۔ میں مچھر مارتے مارتے تنگ آ گیا تھا۔ میں نے زہریلی لڑکی سے پوچھا۔

"تمہیں مچھر نہیں کاٹتے؟"

اندھیرے میں اس لڑکی کی آنکھیں ہی مجھے چمکتی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے اس کی ہنسی کی آواز آئی۔ کہنے لگی۔

"جو مچھر مجھے کاٹتا ہے وہ مر جاتا ہے۔"

سرنگ کے باہر بارش کی آواز بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ برساتی نالے کا شور بھی تقریباً ختم گیا تھا۔ میں وہاں سے نکل جانے کو بے تاب تھا۔ میں نے زہریلی لڑکی سے کہا ہو سکتا ہے کچھ دیر بعد یہاں اور بھی جاپانی سپاہی آ جائیں۔ اس لئے ہمیں فرار ہو جانا چاہئے۔ وہ بولی۔

"اگر تم یہی چاہتے ہو تو چلو۔ نکل چلتے ہیں۔"

ہم سرنگ سے نکل کر برساتی نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ زہریلی لڑکی میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ میری آنکھیں بھی اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ راستہ جنگلی جھاڑیوں اور چھوٹے بڑے پتھروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارے ایک طرف پہاڑی تھی۔ دوسری طرف نیچے برساتی نالہ بہہ رہا تھا۔ چھوٹی سی پگ ڈنڈی تھی جس پر ہم چل رہے تھے۔ نالہ ایک طرف مڑ گیا۔ یہاں نالے کا پانی پگ ڈنڈی کے پتھروں تک آ گیا ہوا تھا۔ زہریلی لڑکی پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں سے گزار تھوڑی دور چل کر پہاڑی پیچھے رہ گئی۔ ہم ایک کھلی جگہ پر آ گئے۔ یہاں نالے کا پاٹ

پھیل گیا تھا اور اس میں بڑی بڑی چٹانیں اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ سارا رستہ اس قدر دشوار گزار تھا کہ میں تھک گیا۔ زہریلی لڑکی پر تھکاوٹ کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ سانپوں کے زہر کا اثر تھا جن کا زہر اس کے جسم میں دوڑ رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ پاروتی کو میں نے دیکھا کہ وہ اندھیرے میں ایک طرف منہ کئے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا معلوم کرنا چاہتی ہے۔ اس نے کہا۔

"میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آگے جدھر ہم جا رہے ہیں ادھر آدمی تو نہیں ہیں مگر ہوا ہمارے پیچھے سے آگے کی طرف چل رہی ہے۔ میں آدمیوں کی موجودگی کو محسوس نہیں کر سکتی۔"

میں نے پوچھا۔ "کالی چٹانوں والی پہاڑی ابھی کتنی دور ہے؟"

وہ اندھیرے میں میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ مجھے اس کا سایہ سا نظر آ رہا تھا۔ اس کا رخ ابھی تک شمال مغرب کی طرف تھا۔ کہنے لگی۔

"یہ پہاڑی زیادہ دور نہیں ہے مگر ہمیں ہوشیار ہو کر چلنا ہو گا۔ مجھے لگتا ہے کہ آگے کچھ گڑبڑ ہے۔"

میں اس زہریلی لڑکی کی چھٹی حس کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہوا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آگے ضرور کوئی خطرہ ہے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ ہم برساتی نالہ پار کر کے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ وہ کہنے لگی۔

"اس نالے کی دوسری طرف گئے تو ہم برما کی سرحد میں داخل ہو جائیں گے۔ وہاں تم کہتے ہو کہ جاپانیوں کا قبضہ ہے۔ وہ تو ہمیں پکڑ لیں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ یقین کریں اب میں پچھتانے لگا تھا کہ میں کلکتے سے کیوں نکل پڑا۔ بنگالی لڑکی کاجل کا عشق جو بھوت بن کر میرے سر پر سوار ہو گیا تھا اب بھاگ چکا تھا۔ مجھے بڑی شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ میں کاجل کی تلاش میں جو ان خطرناک جنگلوں میں نکل آیا ہوں یہ میری زندگی کی شاید سب سے بڑی غلطی ور

حماقت تھی۔ اس میں کوئی شک شبہ نہیں تھا کہ اس سارے علاقے پر جاپانیوں کا ق تھا اور ہمارا کسی بھی مقام پر جاپانی سپاہیوں سے آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد جاپانیوں کی قید میں آ جاتے اور ہمارا جو حشر ہوتا اس سے میں بخوبی واقف تھا۔ میں لمبا سانس بھر کر کہا۔

"تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ہم کس طرف جائیں؟ تھوڑی دیر میں دن کی رو ہو جائے گی۔ پھر تو ہم ضرور پکڑے جائیں گے۔"

پاروتی یعنی زہریلی لڑکی میرے پاس ہی پتھروں پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے میرا اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"میں جانتی ہوں تم کاجل سے پریم کرتے ہو۔ مجھ سے پریم نہیں کرتے۔ مجھ تو کوئی پریم نہیں کرے گا۔ میں اس لائق ہی نہیں رہی۔ پھر بھی میں تمہیں اچھا لگی ہوں۔ میں زندہ رہوں چاہے زندہ نہ رہوں۔ مگر تمہیں اس خطرے والے علا سے ضرور نکال دوں گی۔"

زہریلی لڑکی کے ہاتھ مزدوروں کے ہاتھوں کی طرح کھردرے تھے۔ میں سوچنے کہ اس لڑکی کا دل کس قدر نرم و نازک ہے اور انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ بدقسمت لڑکی کے ساتھ یہ کتنی بڑی ٹریجیڈی ہوئی تھی کہ وہ دنیا کے کسی مرد محبت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے زہریلے ہونٹوں کا ذرا سا لمس اس کے محبوب موت کی نیند سلانے کے لئے کافی تھا۔ میں اس کی شکستہ دلی کی باتوں سے بڑا متاثر میں نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

"پاروتی! اس جنگل میں ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ اگر میں یہاں سے زندہ بچ نکل گیا تو تمہیں اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک نہ بھلا سکوں گا۔"

مجھے ایسے لگا جیسے پاروتی نے ہلکی سی سسکی بھری ہو۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب یہاں سے نکل چلو۔"

ہم برساتی نالے سے ہٹ کر بائیں جانب چلنے لگے۔ اس طرف ناریل کے اونچی اونچی چھتریوں والے درختوں کے بڑے جھنڈ تھے۔ ہم ان درختوں کے درمیان سے ہو کر گزر رہے تھے۔ اس وقت آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں دھندلی دھندلی سی روشنی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یہ پو پھٹنے کی روشنی تھی۔ اندھیرے میں سے درختوں جھاڑیوں اور پہاڑیوں کے خاکے ابھرنے لگے تھے۔ ہم ناریل کے جھنڈوں سے باہر آئے تو ناگ پھنی کی جھاڑیوں کے درمیان ایک راستہ آگے کو جاتا دکھائی دیا۔ زہریلی لڑکی کہنے لگی۔

"ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ یہاں سے آگے کالی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دریا آئے گا جس کے پار آسام کا صوبہ ہے۔۔۔"

مجھے اطمینان ہوا کہ ہم جاپانیوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم چھوٹے سے جنگلی راستے پر چل پڑے۔ لگتا تھا کہ اس راستے پر بیل گاڑیاں چلتی رہی ہیں۔ دونوں جانب پہیوں کے گہرے نشان تھے اور درمیان میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے دن کی سفیدی نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ یہ جنگلی راستہ بائیں طرف مڑ گیا تھا۔ جیسے ہی ہم بائیں طرف مڑے اچانک کسی موٹر انجن کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پاروتی مجھے کھینچ کر ناگ پھنی کی جھاڑیوں کے پیچھے لے گئی۔ موٹر گاڑی کی آواز قریب آ رہی تھی۔ پھر ایک فوجی ٹرک ہمارے سامنے سے گزر گیا جس میں جاپانی فوجی بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹرک کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ جب جاپانی فوجی ٹرک کافی آگے نکل گیا تو میں نے پاروتی سے کہا۔

"ہم کسی جاپانی فوجی کیمپ میں تو نہیں آ گئے؟"

پاروتی بڑے غور سے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے میری طرف دیکھا ہی تھا کہ اچانک چار پانچ جاپانی فوجی جھاڑیوں سے نکل کر رائفلیں تانے ہمارے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

یہ جاپانی فوجی خدا جانے کہاں سے نکل آئے تھے۔

انہوں نے ہمیں پکڑ لیا اور آگے لگا کر فوجی کیمپ میں لے آئے۔ یہ عارضی فوجی کیمپ قریب ہی جنگل میں درختوں جھاڑیوں کو صاف کر کے بنایا گیا تھا۔ چاروں طرف خار دار تار لگی تھی۔ درمیان میں آمنے سامنے دو بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف پتھروں کو جوڑ کر چبوترہ بنایا گیا تھا جس پر جاپانی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ دو تین فوجی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ جاپانی سپاہی ایک جگہ پی ٹی کر رہے تھے۔ دن کی روشنی کافی نکل آئی تھی۔ ان سپاہیوں نے ایک بارک میں لے جا کر ہمیں کیمپ کمانڈر کے آگے پیش کر دیا۔

یہ جاپانی فوجی افسر تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کا رینک کیپٹن کا تھا۔ وہ بانس کی چھت اور بانس کی دیواروں والے چھوٹے سے کیبن میں میز کرسی لگائے فل وردی میں بیٹھا تھا۔ کیبن کی بائیں جانب خار دار تاروں والا دروازہ تھا جس کے باہر مشین گن کا مورچہ بنا ہوا تھا۔ جاپانی افسر نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور زہریلی لڑکی پاروتی کو گھور کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی۔ مجھے اپنا اور پاروتی کا دردناک انجام سامنے نظر آ رہا تھا۔ جاپانی افسر نے کرخت لہجے میں مگر صاف ہندوستانی زبان میں پوچھا کہ برٹش آرمی کے مورچے آگے کہاں کہاں ہیں۔ ہمارا برٹش آرمی سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہمیں کیا معلوم کہ اس کے مورچے جنگل

میں کہاں کہاں ہیں۔ اگرچہ خوف کے مارے میرا حلق خشک ہو رہا تھا لیکن میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے ہندوستانی زبان میں جواب دیا کہ ہم ہندوستانی شہری ہیں ہمیں برٹش آرمی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ جاپانی افسر نے اپنا بید زور سے میز پر مارا اور ہندوستانی میں ہی ہمیں گالی دے کر کہا۔

"تم جھوٹ بولتا ہے۔ ہم کو مالوم ہے تم لوگ برٹش ملٹری انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔ تم ہماری پوسٹوں کی جاسوسی کرنے ادھر آیا ہے۔ اگر تم نے سیدھی طرح ہمیں بتایا تو ہم کو تمہارے پیٹ سے راز باہر نکالنا آتا ہے۔"

میرے ساتھ زہریلی لڑکی بھی لکڑی کے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری طرح خوف زدہ نہیں تھی۔ بالکل سیدھی ہو کر بیٹھی تھی اور بانس کی دیوار پر لگے ہندوستان کے نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ جاپانی افسر نقشے کی طرف اس کو متوجہ دیکھ کر کرسی سے اٹھ کر ہمارے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بید کی چھڑی سے زہریلی لڑکی کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"تم نقشے کو دیکھ رہی ہو۔ تم کو ضرور معلوم ہو گا کہ برٹش آرمی کی پوزیشنیں کہاں کہاں ہیں۔ بتاؤ۔ بولو۔"

زہریلی لڑکی چیخنے لگی۔ جاپانی افسر نے زور سے اس کی پیٹھ پر بید کی ضرب لگائی۔ زہریلی لڑکی کے حلق سے غصیلی ناگن کی پھنکار ایسی آواز نکلی۔ ایک بار تو جاپانی افسر بھی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے فوراً ہولسٹر میں سے ریوالور نکال لیا اور باہر کھڑے جاپانی گارڈ کو آواز دی۔ جاپانی سپاہی نے دوڑ کر اندر آتے ہی سیلوٹ کیا۔ جاپانی افسر نے اپنی زبان میں اسے کچھ کہا۔ جاپانی سپاہی نے زہریلی لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر باہر کی طرف گھسیٹا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی بنگلہ زبان میں زہریلی لڑکی سے کہا کہ بھگوان کے لئے سپاہی کو نہ کاٹنا یہ مرگیا تو ہم بھی مارے جائیں گے۔ زہریلی لڑکی پاروتی اگر جاپانی سپاہی کو صرف اپنا ناخن چبھو دیتی تو وہ وہیں مرجاتا اور یقین کریں کہ وہ ایسا کرنے ہی والی تھی کہ میری بات سن کر وہیں اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ وہ اور جاپانی سپاہی اندر آ گئے۔

وہ مجھے اور زہریلی لڑکی پاروتی کو گھسیٹتے دھکیلتے گھونسے اور لاتیں مارتے سامنے والی بارک میں لے گئے اور وہاں الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کر دیا۔ بانس کی کوٹھڑی کی کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ دروازہ بند تھا جس کے باہر سنتری فوجی انداز میں چل پھر کر پہرہ دے رہا تھا۔ کوٹھڑی بالکل خالی تھی۔ میں فرش پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ میرا انجام کیا ہونے والا ہے۔ انجام ظاہر تھا۔ اگر میں جاپانیوں کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوتا تو میرا انجام ایک المناک موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے پاروتی کی بھی فکر تھی۔ جاپانی سپاہیوں کے بارے میں میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ وہ جس علاقے میں قبضہ کرتے ہیں وہاں کی تمام خوبصورت عورتیں اپنے ساتھ فوجی بارکوں میں لے جاتے ہیں ۔ اور ان کے ساتھ حیوانی سلوک کرتے ہیں۔ پاروتی کی طرف سے مجھے صرف ایک تسلی تھی کہ اس پر اگر تشدد ہوا تو صرف ایک بار ہی ہو گا۔ اس کے بعد اگر زہریلی لڑکی پاروتی خود زندہ نہ رہ سکی تو اس پر تشدد کرنے والا بھی زندہ نہیں رہے گا۔

تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ وہی جاپانی افسر دو سپاہیوں کے ساتھ میری بارک میں آ گیا۔ اس کے لئے باہر سے سٹول لا کر رکھ دیا گیا۔ وہ سٹول پر بیٹھ گیا اور اس نے مجھ سے اس علاقے یعنی آسام میں برٹش آرمی کی پوزیشن کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ بڑی صاف ہندوستانی بول لیتا تھا۔ پہلے تو اس کا میرے ساتھ بڑا نرم رویہ رہا۔ میں نے بار بار یہی کہا کہ میں برٹش فوجوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور میں کاجل نام کی لڑکی کی تلاش میں ادھر آ گیا تھا جسے سنتھالی سپیرے اٹھا کر لے گئے تھے۔ جاپانی افسر نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ ایک سپاہی کے ہاتھ میں رسی تھی۔ اس نے رسی اچھال کر چھت کے ساتھ باندھی اور مجھے رسی کے ساتھ الٹا لٹکا دیا۔ میرے دونوں پاؤں رسی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے الٹا لٹکا کر چلے گئے۔ میری حالت خراب ہونا شروع ہو گئی۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں تو سر چکرانے لگا۔ بمشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے ایسا لگا جیسے میری ٹانگوں میں سے جان نکل گئی ہے۔ آنکھوں کے آگے لال لال اندھیرا چھا گیا۔ میرے

حلق سے بلبلاہٹ کی ڈراؤنی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس قسم کے تشدد کا مجھے اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میں بے اختیار ہو کر چیخنے لگا۔

دروازہ کھلا۔ وہی جاپانی افسر سپاہیوں کے ساتھ اندر آیا۔ مجھے یہ تینوں الٹے نظر آ رہے تھے۔ میں نے چلا کر کہا۔ "مجھے نیچے اتارو۔ مجھے نیچے اتارو۔ تم جو پوچھو گے بتا دوں گا۔"

اسی وقت مجھے نیچے اتار دیا گیا۔ میں فرش پر بے سدھ ہو کر گر پڑا تھا۔ جاپانی افسر نے میری پسلیوں میں فوجی بوٹ کی نوک مارتے ہوئے کہا۔

"بولو۔ یہاں برٹش فوجیں کہاں کہاں ہیں؟"

میرے خون کی گردش نارمل ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے آگے جو لال لال تارے ناچ رہے تھے وہ غائب ہو گئے تھے۔ ہاتھوں میں جو سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں وہ ختم ہو گئی تھیں۔ میں نے پانی مانگا۔ ایک سپاہی میرے لئے پانی لے آیا۔ میں نے پانی ایک ایک گھونٹ کر کے پیا۔ اس دوران میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ میں نے کہا۔

"مجھے برٹش آرمی کے ایک یونٹ کمانڈر نے ادھر ایڈوانس کرتی جاپانی فوجوں کی جاسوسی کے لئے یہاں بھیجا تھا۔ یہ لڑکی سپیرن ہے۔ یہ مجھے جنگل میں ملی تھی۔ یہ جاسوس نہیں ہے۔"

جاپانی افسر نے بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے میرا منہ اوپر کیا اور چیخ کر کہا۔

"برٹش فوجیں کہاں کہاں ڈیپلائے ہیں؟"

مجھے اب جھوٹ بولنا تھا۔ ایک جھوٹ میں نے بول دیا تھا۔ آگے اب جھوٹ بولتے چلے جانا تھا۔ جاپانی افسر کو یقین آئے چاہے نہ آئے۔ اس کے سوا میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں کاکسز بازار کے جس ساحلی گاؤں سے چلا تھا میں نے اس کا نام لے کر کہا کہ برٹش انڈیا کی فوج کا پورا ڈویژن وہاں پہنچ چکا ہے۔ ایک جنگی جہاز سمندر میں بھی کھڑا ہے۔

"یہاں سے پیچھے جنگل میں برٹش آرمی نے کالی چٹانوں والی پہاڑیوں میں گریژن قائم کر لیا ہے۔ ان ہی پہاڑیوں میں ایمونیشن اور پٹرول کا بھاری ذخیرہ موجود ہے۔"

جاپانی افسر کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں اندازہ نہ لگا سکا کہ کو میری باتوں پر یقین آ رہا ہے کہ نہیں آ رہا۔ اس نے جاپانی سپاہی کو مخاطب کر تیز لہجے میں جاپانی زبان میں کچھ کہا۔ جاپانی سپاہی نے ایڑیاں موڑ کر زور سے سلیوٹ اور باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جاپانی افسر بولا۔

"تم نے جو کچھ بتایا ہے ہمارے جاسوس اس کی پوری پوری چھان بین کریں اگر تمہارا بیان جھوٹ نکلا تو تمہیں اسی وقت شوٹ کر دیا جائے گا۔"

جاپانی افسر دوسرے سپاہی کو ساتھ لے کر بارک سے نکل گیا۔ میں سوچنے لگ میرے جھوٹ کا پول ضرور کھل جائے گا اور یہ جاپانی مجھے فوراً گولی مار دیں گے۔ خیال آیا کہ کاکسنز بازار وہاں سے کافی دور ہے۔ ان کے سراغ رسانوں کو وہاں جانے میں کافی وقت لگ جائے گا۔ اس دوران میں یہاں سے فرار ہونے کی کو کروں گا۔ یہ اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دینے والی بات تھی۔ جاپانیوں کی قید سے ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔ جس کوٹھڑی میں میں قید تھا اس کے باہر ایک مسلح فوج وقت پہرے پر موجود رہتا تھا۔ کیمپ کے چاروں طرف خاردار تار لگی تھی۔ گیہ مشین گن پوسٹ تھی۔ اور سب سے بڑی یہ بات تھی کہ مجھے یہ بھی گوارا نہیں میں زہریلی لڑکی پاروتی کو جاپانیوں کی قید میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔

میری چھوٹی بارک یا کوٹھڑی کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور وہ جاپانی سپاہی جو مار کر باہر چلا گیا تھا میرے لئے ایک ڈونگے میں کالے رنگ کی چائے اور آدھی روٹی لے آیا۔ اس نے تیز آواز میں کچھ کہا اور ڈونگا اور ڈبل روٹی میرے پاس فر رکھ کر چلا گیا۔ ڈبل روٹی پتھر کی طرح سخت تھی۔ مگر مجھے اس وقت بھوک لگ تھی۔ میں اسے بہت بڑی نعمت سمجھ کر کھا گیا۔ کالی کڑوی گرم چائے نے بھی

اعصاب کو کافی سکون پہنچایا۔ اب میں سوچنے لگا کہ جب تک جاپانیوں پر میرے جھوٹ کا پول نہیں کھلتا اس دوران مجھے فرار ہونے کی کیا کوشش کرنی چاہئے اور میں کیا کر سکتا ہوں۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے تھے۔ میں اٹھ کر بانس کی دیواروں میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ موٹے موٹے بانسوں کو اس طرح جوڑا گیا تھا کہ ان کے درمیان کہیں ذرا سی بھی درز نہیں تھی۔ میں دبے پاؤں چل کر دروازے کے پاس آ گیا۔ دروازہ بند تھا۔ باہر برآمدے کے لکڑی کے فرش پر جاپانی سنتری کے فوجی بوٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ چابی والے کھلونے کی طرح نپے تلے قدم اٹھاتا دروازے کے آگے سے گزر کر چھ سات قدم بائیں طرف جاتا۔ وہاں سے واپس مڑتا اور دروازے کے آگے سے گزرتا ہوا چھ سات قدم دائیں طرف چلا جاتا۔ پھر وہاں سے واپس مڑ آتا۔ باہر ہلکی ہلکی رم جھم ہو رہی تھی۔ سامنے والی بارک کے برآمدے یں بھی دو جاپانی سنتری گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے تھے۔ بارک کے کونے میں ایک ٹرک میں سے کوئی سامان اتارا جا رہا تھا۔ جاپانی سپاہی سامان اتارتے ہوئے اونچی آوز میں آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔

میں پاروتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب ہمیں جاپانی فوجی افسر کے کمرے سے باہر نکالا گیا تھا تو دو جاپانی سپاہی مجھے اس بارک میں لے آئے تھے اور دو سپاہی پاروتی یعنی زہریلی لڑکی کو لے کر اسی بارک میں آگے چلے گئے تھے ۔ اس کا مطلب تھا کہ پاروتی اسی بارک کے کسی اگلے کیبن یا کوٹھڑی میں بند تھی۔ میں فرار کی تدبیریں سوچنے لگا۔ یہ کوئی باقاعدہ جنگی قیدیوں کا کیمپ نہیں تھا۔ آسام کی طرف ایڈوانس کرتی جاپانی فوجوں نے یہاں عارضی کیمپ بنایا ہوا تھا۔ یہاں سے فرار ہونے کے مواقع زیادہ تھے۔ بشرطیکہ میں کسی طرح بارک سے نکل سکوں ۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں پاروتی کو ساتھ کیسے لے جا سکتا تھا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ پاروتی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ لڑکی ایسی تھی کہ دشمن کے لئے ہلاکت کا باعث بن سکتی تھی۔ یہاں سے

فرار ہونے کے لئے رات کا وقت ہی بہترین تھا۔ یہاں جنگی قیدیوں کے کیمپ کی ط مچان پر کوئی سرچ لائٹ بھی نہیں لگی تھی جو اندھیرے میں مجھے تلاش کر لیتی۔ یہ فرار ہونے کے لئے حالات بڑے سازگار تھے۔ صرف باہر ایک گارڈ تھا۔ دروازہ اگر بانس کا تھا مگر میں نے محسوس کیا تھا کہ جب جاپانی سپاہی مجھے چائے کا مگ دے کر وا گیا تھا تو اس نے دروازہ بند کر کے باہر کوئی زنجیر سی چڑھائی تھی۔ ظاہر ہے اس ز نے دروازے کو بند کر دیا ہو گا۔ اگر رات کے وقت میں کسی طرح بارک سے باہر جاؤں تو آگے کیمپ کا خاردار تاروں والا دروازہ پار کرنا تھا۔ اور اس کے بعد میں جن میں گم ہو سکتا تھا۔ لیکن خار دار تار والا دروازہ رات کو ضرور بند کر دیا جاتا ہو گا اس کے آگے مشین گن کی پوسٹ بھی تھی جہاں دو سپاہی ہر وقت موجود رہتے تھے۔

ابھی مجھے یہاں آ کر یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ رات کے وقت یہاں کی کیا کیفی ہوتی ہے۔ باہر بارکوں کے اوپر ضرور لائٹیں روشن ہوتی ہوں گی۔ کیونکہ یہاں جاپانیوں کو برطانوی بمبار جہازوں کی بمباری کا خطرہ بالکل نہیں تھا۔ سارے علاقے جاپانی پھیلے ہوئے تھے اور جب سے میں ان جنگلوں میں داخل ہوا تھا میں نے برٹش ا فورس کا ایک بھی بمبار طیارہ آسمان پر اڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

دوپہر کو مجھے کھانے کو کچھ نہ دیا گیا۔ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو بارک کے ا ایک کمزور روشنی والا بلب اپنے آپ جل اٹھا۔ مجھے بڑی بھوک اور پیاس محسوس رہی تھی۔ اتنے میں دروازے کی زنجیر کھلی۔ وہی جاپانی سپاہی ٹین کی تھالی میں تھوڑ سے چاول لے کر آ گیا۔ ٹین کے ڈونگے میں پانی بھی تھا۔ میں نے صبر شکر کر کے پ کی آگ بجھائی۔ اس کے بعد میں ایک بار پھر بند دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو اور درز میں سے باہر کا جائزہ لینے لگا۔

برآمدے میں جاپانی سنتری باقاعدہ ٹہل رہا تھا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ آ سامنے والی بارکوں اور کیمپ کے احاطے کے بڑے گیٹ کے اوپر کافی روشنی والے بل روشن تھے۔ ان کی تیز روشنی میں کیمپ کے اندر کی ہر شے صاف نظر آ رہی تھی

خاردار تار والا گیٹ بند تھا۔ اس کے باہر بھی ایک سپاہی ڈیوٹی پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ اس دوران مجھ سے کسی نے پوچھ گچھ نہ کی۔ میں نے برطانوی فوجوں کے بارے میں جھوٹی اطلاعات دی تھیں میرے خیال کے مطابق جاپانی کیمپ کمانڈر کو اس کی تصدیق یا تردید کی کوئی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ یہ اطلاع صبح تک پہنچ سکتی تھی اور اس کے بعد مجھ پر اذیت ناک تشدد کا سلسلہ بھی شروع ہونے والا تھا۔

میں نے کافی غور کیا۔ کئی تدبیریں سوچیں۔ مگر وہاں سے فرار ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن میں ماحول کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ رات میں باہر گارڈ ڈیوٹی بدل گئی تھی۔ پہلے والا جاپانی سنتری چلا گیا تھا اور اس کی جگہ دوسرا جاپانی آ گیا تھا۔ میں نے گارڈ ڈیوٹی بدلتے دروازے کی درز میں سے دیکھی تھی۔ مگر اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ جیسا پہلے والا سنتری تھا ویسے ہی دوسرا سنتری آ گیا تھا۔ بانس کی بنی ہوئی کوٹھڑی میں حبس تھا۔ مچھر بھی تھے۔ میں کچھ دیر تک کوٹھڑی میں ادھر سے ادھر ٹہلتا اور سوچتا رہا۔ پھر فرش پر لیٹ گیا۔ مچھر سونے نہیں دیتے تھے۔ میری جیبوں میں جو تھوڑے بہت پیسے اور ایک چاقو تھا وہ جاپانیوں نے تلاشی لیتے وقت نکال لیا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے فرش پر پڑا تھا۔ ایک ہاتھ سے مچھر بھی مار رہا تھا۔ فضا میں گھٹن تھی۔ نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی۔ باہر خاموشی تھی۔ صرف برآمدے کے فرش پر جاپانی سنتری کے بھاری بوٹوں کی آواز آ رہی تھی۔

اچانک باہر شور بلند ہوا۔ بہت سے سپاہی ایک دوسرے کو آوازیں دیتے برآمدے کے سامنے سے گزر گئے۔ باہر جو سنتری پہرے پر تھا اس کے دوڑنے کی بھی آواز آئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر دروازے کی درز کے ساتھ لگ گیا۔ باہر روشنی میں میں صرف سامنے ہی دیکھ سکتا تھا۔ میرے سامنے والی بارک کے باہر ایک ٹرک اور دو تین فوجی جیپیں کھڑی تھیں۔ ایک جیپ تیزی سے بارک کے دوسری کونے کی طرف نکل گئی۔ اس طرف سپاہیوں کا کافی شور تھا۔ کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مجھے فوجی بوٹوں کی آوازیں اپنی کوٹھڑی کی طرف آتی سنائی دیں۔ میں جلدی سے دروازے

سے ہٹ کر کونے میں بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا۔ تین جاپانی سپاہی تیزی سے اندر د
ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے زد و کوب کرنا شروع کر دیا۔ میری کچھ سمجھ میں
آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ وہ مجھے گھونسے اور لاتیں مارتے ہوئے کھینچ کر کو
سے باہر لے آئے اور اسی طرح زدو کوب کرتے سامنے والی بارک میں لے گئے۔
انہوں نے مجھے ایک لوہے کی چارپائی کے ساتھ باندھ دیا۔ ایک ناٹے قد کا جاپانی ا
اندر آیا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے دو تین تھپڑ مار
اور ہندوستانی میں پوچھا۔

"تمہارے ساتھ جو لڑکی تھی وہ تمہیں کہاں ملی تھی؟"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ یعنی مجھے کچھ شک پڑا کہ ضرور زہریلی لڑکی نے اپنا کام کر د
ہے۔ میرا سارا جسم درد کر رہا تھا۔ میں نے اپنا پہلے والا بیان دہرایا کہ وہ سنتھالی سپ
تھی اور میری منگیتر کاجل کی تلاش میں میری راہ نمائی کے لئے میرے ساتھ ہو
تھی۔ یہ پہلے والا جاپانی افسر نہیں تھا۔ اس نے مجھے زور سے تھپڑ مارا اور کہا۔

"تم بکتے ہو۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم دونوں برٹش آرمی کے جاسوس ہو۔"

اس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ اس نے میرے سارے کپڑے اتروا کر میر
کپڑوں کے علاوہ میرے جسم کی بھی تلاشی لی۔ میرا منہ کھلوا کر دانتوں کے آگے
انگلیاں ڈال کر دیکھا۔ خدا جانے وہ کونسی چیز تلاش کر رہے تھے۔ جب انہیں ا
مطلوبہ شے نہ ملی تو مجھے کپڑے پہننے کا حکم ہوا۔ میں نے جلدی سے کپڑے پہن لے
جاپانی افسر نے اب باقاعدہ مجھ سے زہریلی لڑکی پاروتی کے بارے میں پوچھ گچھ شروع
دی۔ جب میں اپنے بیان پر قائم رہا تو جاپانی افسر نے مجھ سے پوچھا۔

"اس لڑکی کو زہر والا انجکشن کس نے دیا تھا؟"

ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہی جاپانی افسر جس
سامنے ہم دونوں کو پیش کیا گیا تھا زہریلی لڑکی پاروتی کے رات کے وقت بارک
کونے میں کمرے میں تھا۔ کہ آدھی رات کے بعد اچانک اس کی چیخوں کی آواز آ

سپاہی دوڑ کر اندر گئے۔ دیکھا کہ جاپانی افسر کا بدن کسی زہر کے اثر سے کالا پڑتا جا رہا تھا اور زہریلی لڑکی غائب تھی۔ پاروتی کے ساتھ اس جاپانی افسر نے دست درازی کی کوشش کی ہو گی اور زہریلی لڑکی نے اس کے جسم میں ذرا سا ناخن چبھو کر اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ پاروتی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اگر وہ فرار نہ ہوتی تو یہ جاپانی اس کو جس طرح اذیت دے دے کر ہلاک کرتے اس کی شاید کہیں مثال نہ ملتی۔

پہلے والا جاپانی افسر مر گیا تھا۔ اس کے بدن میں پاروتی نے ناخن چبھو کر ان تمام سانپوں کا تھوڑا تھوڑا زہر داخل کر دیا تھا جو اس نے آج تک ڈسوائے تھے۔ اب میری شامت آ گئی۔ باقی ساری رات اور دوسرے دن بھی مجھ پر تشدد ہوتا رہا۔ جاپانی یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ لڑکی بھاگ کر کہاں گئی ہو گی۔ میں نے انہیں سنتھالی سپیروں کا ٹھکانہ بتا بھی دیا تھا مگر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے کپڑوں اور جسم کی تلاشی انہوں نے اس لئے لی تھی کہ کہیں میں نے بھی کسی جگہ زہر والا انجکشن تو نہیں چھپایا ہوا۔ میں سارا دن بارک میں لوہے کی چارپائی کے ساتھ بندھا درد سے کراہتا رہا۔ دوپہر کے وقت ایک جاپانی سپاہی آ کر مجھے تھوڑے سے ابلے ہوئے باسی چاول اور پانی دے کر چلا گیا۔ میرا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں رسی سے چارپائی کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور میں چارپائی کے پاس ہی فرش پر بیٹھا تھا۔ اسی طرح شام کا اندھیرا ہو گیا۔ تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ دو مسلح جاپانی سپاہی اندر آئے۔ انہوں نے مجھے کھولا۔ باہر ایک ٹرک کھڑا تھا۔ مجھے اس ٹرک میں دھکا دے کر ڈالا اور ٹرک کسی نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا۔ یہ ٹرک چاروں طرف سے ترپال سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک جاپانی سپاہی رائفل لئے میری نگرانی کے لئے ٹرک میں بیٹھ گیا تھا۔ ٹرک پتھروں پر اچھلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کہیں اترائی آ جاتی - کہیں چڑھائی شروع ہو جاتی۔ مجھے شاید کسی جنگی قیدیوں کے کیمپ میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ کم از کم اب مجھ پر مزید تشدد نہیں کیا جائے گا اور میں دوسرے جنگی قیدیوں کے ساتھ رہوں گا۔

ساری رات ٹرک پہاڑی جنگلاتی علاقے میں چلتا رہا۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی کہ ٹرک ایک موڑ مڑ کر کچھ دور جا کر رک گیا۔ جو سپاہی میری نگرانی کر رہا تھا اس نے اٹھ کر ترپال کا پردہ ہٹادیا اور تیز لہجے میں مجھے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کھلے تھے۔ میں ٹرک سے نیچے کود گیا۔ وہاں پہلے سے تین چار جاپانی فوجی کھڑے تھے۔ کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ کوئی بڑا فوجی کیمپ تھا۔ کئی فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لمبی لمبی بارکیں تھیں۔ مجھے کواٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا۔ صبح ہوئی تو مجھے ایک جاپانی فوجی افسر کے آگے پیش کیا گیا۔ یہاں میرے بارے میں پوری رپورٹ پہلے سے پہنچ چکی تھی۔ یہ جاپانی فوجی افسر شاید میجر کے رینک کا تھا۔ اس کی عمر بھی زیادہ تھی۔ سر گنجا تھا۔ وہ میز پر اپنے آگے لمبی سی تلوار رکھے بیٹھا تھا۔ میری طرف گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ پھر تلوار لے کر اٹھا۔ میرے پاس آیا۔ میں فرش پر بیٹھا تھا۔ تلوار میری گردن پر رکھی۔ میرا سانس خشک ہو گیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جاپانی جنگی قیدیوں کی گردنیں تلوار سے اڑا کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ اس نے دو تین بار تلوار میری گردن کے ساتھ لگائی - پھر بڑے سکون کے ساتھ ٹہلتا ہوا واپس کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ میز پر چھوٹی سی گھنٹی پڑی تھی۔ اس نے گھنٹی پر زور سے ہاتھ مار کر گھنٹی بجائی۔ ایک جاپانی جلدی سے اندر آگیا۔ جاپانی افسر نے اسے جاپانی زبان میں کچھ کہا۔ سپاہی سیلوٹ مار کر باہر نکل گیا۔ چند لمحوں کے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی۔ تھالی میں سفید ابلے ہوئے چاول تھے۔ چاولوں کے اوپر سالن بھی تھا۔ جاپانی میجر نے میری طرف دیکھ کر ہندوستانی میں کہا۔

"کھاؤ۔"

میں خاموشی سے چاول کھانے لگا۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ سارے چاول کھا گیا۔ سپاہی ٹین کے ڈونگے میں میرے لئے پانی لے آیا۔ میں نے پانی پیا اور دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد جاپانی میجر کرسی کھینچ کر میرے پاس آگیا اور اس نے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ بڑے شریفانہ انداز میں مجھ سے سوالات پوچھ رہا تھا۔ سوال

ی تھے کہ زہریلی لڑکی کون تھی؟ اس کے پاس زہر والا انجکشن کہاں سے آیا تھا۔ اور برٹش انڈیا کی فوجیں آسام کے باڈر پر کہاں کہاں پر موجود ہیں؟ زہریلی لڑکی کے بارے ں میں میں نے اس کے آگے بھی یہی بیان دیا کہ وہ مجھے سنتھالی سپیروں کے ڈیرے پر ملی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اس کے پاس زہریلا انجکشن کہاں سے آیا تھا۔ اور برٹش انڈیا کی فوجوں کے متعلق بھی میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ پہلے تو جاپانی میجر بڑے سکون سے میری باتیں سنتا رہا۔ اچانک کرسی چھوڑ کر اٹھا اور مجھ پر ٹھڈوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

جب وہ مجھے مارتے مارتے تھک گیا تو اس نے سپاہی کو بلا کر کچھ کہا۔ سپاہی مجھے گھسیٹتے ہوئے بارک کے پیچھے جہاں جھاڑیاں اور درخت تھے لے گیا۔ یہاں زمین میں چار فٹ اونچے بانس گاڑ کر ایک پنجرہ بنایا ہوا تھا۔ یہ تین فٹ چوڑا تھا۔ اس پنجرے میں مجھے بند کر دیا گیا۔ باہر زنجیر چڑھا دی گئی۔ موٹے موٹے بانس بالکل ساتھ ساتھ جوڑے گئے تھے۔ میں نہ بازو پوری طرح کھول سکتا تھا نہ ٹانگیں پھیلا سکتا تھا۔ باہر پھر بھی بارکوں کی دھندلی سی روشنی وہاں تک آ رہی تھی مگر پنجرے کے اندر گھپ اندھیرا تھا اور میں گھٹنے سینے سے لگائے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اذیت میں زیادہ دیر تک برداشت کر سکوں گا۔

میں جانور کی طرح پنجرے میں بند تھا۔ جانور پھر بھی پنجرے میں ٹہلتا رہتا ہے۔ مگر میں تو ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ کچھ دیر تو بیٹھا رہا۔ پھر گھٹنوں میں اینٹھن شروع ہو گئی۔ میں پوری ٹانگیں نہیں پھیلا سکتا تھا۔ عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ اذیت مجھ سے زیادہ دیر برداشت نہیں ہو گی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ جاپانی کب تک مجھے اس پنجرے میں بند رکھیں۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ شروع رات میں بارکوں کی طرف سے جاپانی سپاہیوں کی آوازیں آجاتی تھیں۔ جیسے جیسے رات گزرتی گئی یہ آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں۔ پنجرے کے باہر جنگل کا سناٹا چھا گیا۔ میں بے بسی کے عالم میں ٹھوڑی گھٹنوں کے اوپر رکھے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ آنکھیں اس لئے بند کی تھیں کہ شاید نیند آجائے اور کم ازکم رات تو کٹے۔ صبح یہ لوگ شاید مجھے یہاں سے نکال کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ کسی بارک میں بند کردیں۔

نیند کوسوں دور تھی۔ خدا کو یاد کرنے لگا۔ خدا سے دعا مانگی کہ یااللہ پاک مجھے اس مصیبت سے نجات دلا۔ بظاہر نجات کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خدا جانے اسی طرح بیٹھے بیٹھے کتنی رات گزر گئی ہو گی کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی کہ جیسے جھاڑیوں میں کوئی چل رہا ہے۔ میں سمجھا کہ ریچھ چیتا یا کوئی دوسرا جنگلی جانور ہوگا۔ میں اکٹھا ہو کر پنجرے میں بیٹھا رہا۔ نہ پنجرے کے اندر کچھ نظر آرہا تھا نہ پنجرے کے باہر کچھ نظر آرہا تھا۔ جھاڑیوں میں کسی کے چلنے کی آواز پنجرے کے قریب آکر رک گئی۔ میں نے

موٹے بانسوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں کوئی ایسی درز نہیں تھی جس میں سے میں باہر دیکھ سکتا۔ پھر ایسا لگا جیسے کوئی زنجیر کھول رہا ہے۔ ضرور یہ جاپانی سپاہی ہے جو مجھے یہاں سے نکالنے آیا ہے۔ اتنے میں باہر سے کسی نے سرگوشی میں میرا نام لے کر کہا۔

"آواز نہ نکالنا میں پاروتی ہوں"

پاروتی کی آواز اور اس کا نام سن کر میرے جسم میں توانائی کی لہر دوڑ گئی۔ زہریلی لڑکی میری مدد کو پہنچ گئی تھی۔ خدا جانے وہ کہاں کہاں سے میرا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ پنجرے کا چھوٹا سا دروازہ پیچھے ہٹ گیا۔ پاروتی نے سر اندر ڈال کر آہستہ سے کہا۔

"باہر آجاؤ۔ جلدی کرو۔"

میں گھٹنوں کے بل چلتا پنجرے سے باہر آگیا۔

زہریلی لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتی ہوئی جھاڑیوں اور درختوں کے اندھیرے کی طرف دوڑ پڑی۔ میں بھی اس کے ساتھ لنگڑاتا ہوا دوڑنے لگا۔ صرف ایک ہی ڈر تھا کہ پیچھے سے مشین گن کا فائر ہمیں بھون کر نہ رکھ دے۔ مگر جاپانی کیمپ پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پاروتی خود بھی جھاڑیوں میں دوڑ رہی تھی اور مجھے بھی دوڑا رہی تھی۔ بارش کی وجہ سے جھاڑیاں گیلی تھیں۔ اس کے دوڑنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے پتہ ہے کہ کہاں جانا ہے۔

یہ بھی نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ اندھیرے میں درختوں کے ہیولے دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ میں نے دوڑتے دوڑتے زہریلی لڑکی پاروتی سے پوچھا کہ ہم کہاں جارہے ہیں؟ آگے کہیں جاپانیوں کی کوئی پوسٹ نہ ہو۔ پاروتی اب تیز تیز چل رہی تھی مجھے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

"ابھی مت بولو' چپ رہو۔"

میں چپ ہوگیا۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ جنگل میں اندھیرا اور سناٹا تھا۔ جنگلی

جھاڑیوں والی ڈھلان اترنے کے بعد کھلی جگہ آگئی۔ اندھیرے میں کیلے کے درختوں کے جھنڈ ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ پیچھے سنبل کے گھنے اور بہت بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ آسمان تک پھیلے ہوئے لگتے تھے۔ سنبل کے درختوں کو میں رات کے اندھیرے میں بھی پہچان لیتا تھا۔ ان درختوں کو آج بھی میں دور سے پہچان لیتا ہوں۔ اب تو یہ درخت سمن آباد میں بھی لوگوں نے اپنے گھروں کے آگے لگا دیئے ہیں جو بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ درخت اوپر سے جتنا بڑا ہو کر پھیل جاتا ہے زمین کے نیچے اس کی جڑیں اس سے بھی زیادہ پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور مکانوں کے فرشوں اور دیواروں کو اکھاڑ دیتی ہیں۔ سنبل بن کے جزیروں میں بھی سنبل کے درختوں کے بے شمار ذخیرے ہیں۔ یہ دو قسم کے درخت ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے درخت پر موٹے موٹے سرخ رنگ کے پھول لگتے ہیں۔ دوسری قسم کے درخت پر لوکاٹ کے رنگ کے پھول لگتے ہیں۔ دوسری قسم کے سنبل کے درخت جنگلوں میں بھی کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ بحرحال میں اس جنگلی لڑکی پاروتی کے پیچھے ان درختوں کے درمیان سے گزرتا آگے چلا جارہا تھا۔ سنبل کے درختوں کا ذخیرہ ختم ہوا تو آگے ایک دریا آگیا۔

پاروتی نے مجھے دریا کنارے ایک جگہ بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود قریبی جھاڑیوں میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک چھوٹی سی سمپان یعنی کشتی کو کھینچتی ہوئی کنارے پر لے آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"آجاؤ۔"

کشتی دریا کے کنارے پانی میں کھڑی ہچکولے کھا رہی تھی۔ میں نے پاروتی کو پہلے بٹھانے کی کوشش کی تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"یہ باتیں رہنے دو کشتی میں بیٹھو۔"

میں کشتی میں بیٹھ گیا۔ پاروتی نے کشتی کو پانی کے اندر تھوڑا سا دھکیلا اور پھر خود بھی چھلانگ لگا کر کشتی کے اندر آگئی۔ کشتی میں دو چپو پڑے تھے۔ وہ چپو چلاتے ہوئے کشتی کو کنارے سے دور لے گئی اور پھر کشتی پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہنے لگی۔

ں نے پاروتی سے پوچھا۔

"یہ کونسا دریا ہے؟"

اس نے کہا: "یہ دریا کی ایک شاخ ہے۔ اصل دریا تو یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا اب میں بات کر سکتا ہوں؟"

پاروتی بولی۔ "ابھی خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔ جاپانی رات کو یہاں کسی نہ کسی ڑف سے نکل آتے ہیں۔"

کوئی آدھے گھنٹے تک کشتی دریا کے رخ پر بہتی رہی۔ اس کے بعد ایک جگہ پہنچ کر پاروتی نے کشتی کو دوسرے کنارے کی طرف چلانا شروع کر دیا۔ میں نے پاروتی کا تھ بٹانے کی کوشش کی تو زہریلی لڑکی کہنے لگی۔

"دریا کا بڑا زور ہے تم کشتی نہیں چلا سکو گے۔"

وہ بڑی مہارت سے چپو کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف چلاتی کشتی کو دوسرے کنارے کی طرف لے جانے لگی۔ دوسرے کنارے پر اندھیرے میں گھنے درختوں کے جھنڈ سیاہ ٹیلوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اس نے کشتی کو کنارے پر لا کر ایک جھاڑی کے قریب کیا۔ ہم کشتی سے اتر پڑے۔ اس نے کشتی کو اوپر ریت پر کھینچ لیا۔ کشتی کو وپر کھینچنے میں میں نے ضرور اس کی مدد کی۔

وہ مجھے ساتھ لے کر ایک بار پھر گھنے جنگل میں گھس گئی۔ یہاں درخت ایک وسرے کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ ہم رک رک کر راستہ دیکھ کر اور کہیں استہ بنا کر چل رہے تھے۔ درختوں کے جھنڈ ختم ہوئے تو مجھے اندھیرے میں ایک بارہ ری سی نظر آئی۔ یہ کسی بارہ دری کا کھنڈر تھا۔ اس کے باہر ایک قطار میں کچھ بت میں سے آدھے باہر نکلے ہوئے تھے۔ بارہ دری کے کھنڈر میں آکر ہم بیٹھ گئے۔ میں س بات پر بڑا حیران تھا کہ زہریلی لڑکی پاروتی اتنی جلدی سے جاپانی کیمپ سے نکل کر ہاں دوسرے بڑے کیمپ میں کیسے پہنچ گئی۔ جبکہ دونوں کیمپوں کے درمیان کافی فاصلہ

تھا۔ اور جس ٹرک میں مجھے بٹھا کر یہاں لایا گیا تھا وہ تقریباً ساری رات جنگل میں رہا تھا۔ جب میں نے پاروتی سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے گردن موڑ کر مہ طرف دیکھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں میں مجھے سانپ کی آنکھوں والی سرخی چمک نظر آئی۔ کہنے لگی۔

"یہ ایک ایسا راز ہے جو میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔ تمہیں بتایا بھی تو تم یق نہیں کرو گے۔ اس لئے یہ سوال پھر نہ کرنا۔"

میں نے یہ سوال اس سے دوبارہ نہ پوچھا۔ وہ مجھے بتانے لگی کہ وہ جاپانیوں کی سے کیسے فرار ہوئی۔ ہوا یہ کہ جب ہمیں الگ الگ کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا تو را کے وقت جاپانی کیپٹن پاروتی کی کوٹھری میں آگیا۔ اس نے پاروتی کے ساتھ دسہ درازی کی - پاروتی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس نے صرف اتنا ہی کیا کہ اپنی ایک اُ کا ناخن جاپانی کیپٹن کی گردن میں چبھو دیا۔ جاپانی فوجی نے کوئی خیال نہ کیا۔ وہ یہی کہ پاروتی پر ایک خاص کیفیت طاری ہو چکی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا سان اکھڑنا شروع ہوگیا۔ یہ ایک سانپ کا نہیں بلکہ سینکڑوں سانپوں کا زہر تھا جو پاروتی جاپانی کیپٹن کے خون میں شامل کر دیا تھا۔ سب سے پہلے اس کا گلا بند ہوا۔ وہ گلے پکڑ کر باہر کی طرف دوڑا مگر سانپوں کے زہر نے اسے اتنی مہلت نہ دی کہ دروازے تک پہنچ سکے۔ وہ دروازے کے ساتھ جاکر زور سے گرا۔ اس وقت باہر ا سنتری پہرا دے رہا تھا۔ اس نے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی تو دروازہ کھول کر اند آگیا۔ اس دوران پاروتی نے روشنی گل کر دی تھی۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ جیسے جاپانی سنتری اندر آیا۔ پاروتی اندھیرے میں سانپ کی طرح رینگتی باہر نکل گئی۔ اس ایک بار کوٹھڑی سے باہر نکلنا ہی بہت تھا۔ وہ بارک کے پیچھے سے ہو کر خار دار تارو سے نکل کر جنگل میں گھس گئی۔ اور اندھیرے جنگل نے اسے اپنے اندر چھپالیا۔ جہ طرح سانپ کو زمین جگہ دے دیتی ہے۔ اسی طرح زہریلی لڑکی پاروتی کو بھی جنگل ا اندر چھپا لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ وہیں جنگل میں کیمپ کے آس پاس منڈلاتی رہی

کیونکہ وہ مجھے بھی وہاں سے نکالنا چاہتی تھی۔ بقول اس کے صبح تک وہ کیمپ کے قریب ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھی رہی۔ جب مجھے بارک سے نکال کر فوجی ٹرک میں سوار کرایا گیا تو وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد وہ میرے ٹرک کے تعاقب میں چل پڑی۔ یہاں سے آگے پاروتی نے مجھے بالکل نہ بتایا کہ وہ میرا تعاقب کرتے ہوئے کس طرح موجودہ فوجی کیمپ تک پہنچی۔ کہنے لگی۔

"جب اس فوجی کیمپ میں جاپانیوں نے تمہیں ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا تو میں تمہیں درختوں کے پیچھے چھپی دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد میں جنگل میں سانپوں کی تلاش میں نکل گئی۔ یہاں مجھے تین سبز رنگ کے سانپ مل گئے۔ میں نے ان سے اپنے آپ کو ڈسوایا اور انہیں کھا کر اپنی بھوک مٹائی۔ سانپوں سے ڈسوانے کے بعد مجھ پر ایک خاص قسم کی خماری چڑھ جاتی ہے۔ میں وہیں جنگل میں گھاس پر سو گئی۔ جس وقت آنکھ کھلی تو رات ہو گئی تھی۔ میں دوڑ کر کیمپ کے قریب جو درخت تھے وہاں آگئی۔ یہاں سے مجھے وہ بارک بجلی کے بلب کی روشنی میں صاف نظر آرہی تھی جس کی ایک کوٹھڑی میں جاپانیوں نے ہمیں قید کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تمہیں کوٹھڑی سے باہر لایا جارہا ہے۔ جاپانی سپاہی تمہیں بارک کے پیچھے لے گیا جہاں اس نے تمہیں بانس کے پنجرے میں بند کر دیا۔ میں نے رات گہری ہو جانے کا انتظار کیا۔ پھر کیمپ کے گرد لگی ہوئی خار دار باڑ ہی کے نیچے ایک جگہ زمین کھود کر ایک گڑھا بنایا اور اسی گڑھے میں سے گزر کر تم تک پہنچی - اور تمہیں وہاں سے نکال لیا۔"

میں نے پاروتی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم مجھے وہاں سے نہ نکالتی تو پنجرے میں پڑے پڑے صبح تک میرا برا حال ہوجاتا۔ میں تو چلنے پھرنے کے قابل بھی نہ رہتا۔"

پاروتی چوکنی ہو کر اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی سانپوں والی چھٹی حس اسے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی ہے۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے پاروتی؟"

اس نے میرا بازو پکڑا اور مجھے اپنے ساتھ بارہ دری سے نکل کر ان بتوں کے پیچھے لے آئی جو آدھے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ہم ان مجسموں کی آڑ لے کر بیٹھ گئے۔ یہ گول گول سروں والے کافی بڑے انسانی مجسمے تھے۔ ان کے ارد گرد کافی گھنی جنگلی گھاس اگی ہوئی تھی۔

پاروتی بڑے غور سے بارہ دری کے کھنڈر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندھیرے میں کوئی خاص شے نظر نہیں آرہی تھی۔ اس خیال سے پاروتی سے بھی نہیں پوچھ رہا تھا کہ یہ پھر مجھے ڈانٹ دے گی کہ خاموش رہو۔ اتنے میں مجھے ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ یہ سایہ درختوں سے نکل کر بارہ دری کے کھنڈر کے پاس آکر رک گیا۔ یہ ایک آدمی تھا اندھیرے میں اس کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جھک کر بارہ دری کے باہر کچھ تلاش کرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ پاروتی لمبے لمبے سانس لے رہی ہے۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا وہ میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ناک سے سانس لینے کی بجائے منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ انسانی ہیولا کھنڈر کے ارد گرد چکر لگانے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی شے کی تلاش میں ہے۔ پاروتی مسلسل منہ سے سانس لے رہی تھی۔ ایک دو منٹ کے بعد انسانی ہیولا یا سایہ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف درختوں میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کچھ دیر تک اسی طرح پاروتی منہ کھول کر سانس لیتی رہی۔ پھر اس نے منہ بند کر لیا اور بولی۔

"یہ میرا دشمن تھا۔ میری بو پاکر ادھر آیا تھا۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر وہ یہاں کیوں نہیں آیا؟"

پاروتی نے کہا "میں نے اپنی بو روک لی تھی۔ میری بو میرے جسم سے بہت کم اور اندر سے بہت زیادہ نکلتی ہے۔ جب میں ناک کے ذریعے سانس لیتی ہوں تو میرے

خون کی زہریلی بو بہت زیادہ مقدار میں باہر آتی ہے۔ لیکن جب میں سانس بند کر کے منہ سے سانس لیتی ہوں تو میرے خون کی بو اتنی دھیمی ہوجاتی ہے کہ کوئی آدمی پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر سے بھی میری بو نہیں سونگھ سکتا۔"

میں پاروتی کی اس قسم کی باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔ میں نے صرف اتنا پوچھا کہ یہ تمہارا دشمن کون تھا۔ اور ہماری بو کے پیچھے کیوں لگا ہوا تھا؟ وہ سانس لے کر بولی۔

"انسان جس حال میں بھی ہو اس کے دشمن اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میں دنیا والوں سے دور اس جنگل میں دربدر پھر رہی ہوں۔ یہاں بھی میرا کوئی نہ کوئی دشمن میری تلاش میں نکل آتا ہے۔ یہ جو شخص رات کے اندھیرے میں میری بو پاکر یہاں تک آیا تھا۔ یہ مہا ناگی سپیرا تھا۔ مہا ناگی سپیرے تمام سپیروں کے سردار ہوتے ہیں۔ انہیں مجھ ایسی عورت کی تلاش رہتی ہے جو خود کو سانپوں سے ڈسوا ڈسوا کر زہریلی ناگن بن گئی ہو۔"

وہ کچھ دیر تک جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی جنگل کے درختوں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے رک رک کر سانس لیتے ہوئے فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور کہنے لگی۔

وہ اب جنگل میں کافی دور نکل گیا ہے۔ وہ میرا دشمن تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم اس کو ناخن چبھو کر ہلاک نہیں کر سکتی تھیں؟"

پاروتی نے کہا۔ "مہا ناگی سپیرے پر دنیا کا زہریلے سے زہریلے سانپ کا زہر بھی اثر نہیں کر سکتا۔ اس علاقے میں شاید دو یا تین ہی مہاناگی سپیرے ہونگے۔ یہ لوگ بڑے چلے کاٹ کر اور بڑے بڑے زہریلے سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسوا کر مہا ناگی کا مقام حاصل کرتے ہیں۔ اگر وہ میرے بدن میں اپنا ناخن چبھو دیتا تو میں ہلاک ہو سکتی تھی۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔" میں نے پوچھا۔

"مگر ہم کس طرف جائیں گے؟ یہاں تو چاروں طرف لگتا ہے جاپانیوں کا قبضہ ہے۔ جس طرف بھی جائیں گے خطرہ ہے کہ جاپانی ہمیں پکڑ لیں گے۔"

پاروتی بولی۔ "میں ان جنگلوں سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ لگتا ہے کہ ہم جنـ
آسام میں کافی دور نکل آئے ہیں۔ پھر بھی میرے اندازے کے مطابق اگر ہم اوپر
طرف پہاڑیوں میں چلتے جائیں تو دو تین دنوں میں بنگال پہنچ جائیں گے۔"

میں خود بنگال یعنی کلکتے پہنچنے کے لئے بے چین تھا۔ میں ان سپیرے سپیر
ناگ ناگوں اور جنگی قیدیوں کے کیمپوں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر تقدیر مجھ پر ہنس ر
تھی۔ کیونکہ میرے نامہ اعمال میں بھی ایسے ایسے سنسنی خیز اور خطرناک واقعات آ
ہوئے تھے۔ کہ آج ان کو یاد کرتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ میں زندہ کیسے بچ گیا۔ م
میں نے اور پاروتی نے طے یہی کیا کہ کسی نہ کسی طرح رات اسی جنگل میں گ
دی جائے اور صبح کا اجالا ہوتے ہی ان پہاڑیوں کی طرف چلنا شروع کر دیا جائے جو
کے اندازے کے مطابق بنگال کے جنگلوں کی طرف نکل جاتی ہیں۔ مہاناگی سپیرا اگر
جا چکا تھا اور بظاہر اس کے واپس بارہ دری کے کھنڈر کے جانب آنے کا امکان نہیں
لیکن اس کے باوجود میں نے دیکھا کہ زہریلی لڑکی پاروتی پر اس کی دہشت ابھی
چھائی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہاں باقی رات گزارنی ٹھیک نہیں۔ ہم یہاں سے آگے جاکر باقی رات گزار
کا کوئی ٹھکانہ تلاش کرتے ہیں۔"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہم وہاں سے اٹھے اور دوسری طرف
ڈھلان اتر کر ایک چھوٹی سی ندی کے پاس آگئے۔ ندی رات کے اندھیرے میں خا
سے بہ رہی تھی۔ بڑے غور سے دیکھنے پر اس کا پانی نظر آتا تھا۔ ہم ندی کے
ساتھ آگے ہوئے درختوں میں چلتے رہے۔ ایک جگہ ندی پر بانس کا چھوٹا سا پل بنـ
تھا۔ ہم یہاں سے پل پار کر کے دوسرے کنارے پر آگئے۔ کیونکہ پاروتی کے خیال
بنگال آسام کو وہی رستہ جاتا تھا۔ ایک جگہ بہت سے درخت ستونوں کی طرح کھ
تھے۔ ان ستونوں کے اوپر درختوں نے چھت سی ڈال رکھی تھی۔ یہاں ایک در
کے نیچے ایک جھونپڑی دیکھی جس کا دروازہ غائب تھا۔ ایک طرف سے ناریل کی شـ

الی چھت اڑ چکی تھی۔ یہ خالی اور ویران جھونپڑی تھی۔ پاروتی نے کہا۔

"بس یہاں رات بسر کرتے ہیں۔"

"میں نے کہا تم جھونپڑی میں سو جاؤ - میں باہر سو جاتا ہوں۔"

پاروتی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "نہیں تم جھونپڑی کے اندر
و گے - میں باہر سوں گی۔"

میں سمجھ گیا کہ اسے ابھی تک مہاناگی کا خطرہ لگا ہوا ہے۔ کہ کہیں وہ اس کو تلاش
رتا ہوا ادھر نہ آجائے۔ اس کے دل میں مہاناگی سپیرے کا جو ڈر و خوف بیٹھا تھا اس
ے لگتا تھا کہ وہ پاروتی کو اپنے قبضے میں کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ میں نے اپنا بازو
ھڑاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم باہر ہی سوجاؤ۔"

اور میں جھونپڑی کے اندر چلا گیا - یہاں سوائے اندھیرے' زمین پر سوکھے پتوں
ور مچھروں کے اور کچھ نہیں تھا۔ مگر اب جنگل کے مچھر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑتے
تھے۔ میرا جسم ان کا عادی ہو گیا تھا۔ برسات کی وجہ سے جنگل کی رات مرطوب اور
نک تھی۔ جبکہ جھونپڑی کے اندر ہلکی ہلکی گرماہٹ تھی۔ میں خشک پتوں پر لیٹ گیا۔
یک طرح سے میں بھی جنگلوں میں پھرتے پھرتے آدھا جنگلی ہو گیا تھا۔ پاروتی کے
ساتھ دوڑ دوڑ کر چل چل کر تھک گیا تھا۔ مچھروں نے حملہ کر دیا مگر میں بڑی جلدی
و گیا۔ مجھے کوئی خبر نہیں تھی کہ پاروتی باہر کہاں جاکر سوئی ہے۔ سوئی بھی تھی یا مہاناگی
سپیرے کے ڈر سے کسی جگہ چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔

میرا خیال ہے میں بڑی مشکل سے آدھا گھنٹہ سویا ہوؤنگا کہ کسی نے مجھے بازو سے
جھنجھوڑ کر جگادیا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جھونپڑی کے اندر
ندھیرے میں میرے اوپر کوئی آدمی جھکا ہوا ہے۔ میں نے اپنے حواس درست کرتے
وئے کہا۔ "کون ہو تم؟"

"چپ رہو۔"

یہ اس آدمی کی آواز تھی جو میری گردن پر ہاتھ رکھے میرے پاس ہی بیٹھا ہ
اس نے میری گردن کو چھوڑ کر میرے گریبان کو پکڑتے ہوئے سخت لہجے میں پوچ
"ناگن لڑکی کہاں ہے؟"

وہ مجھے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ یہاں اندھیرے میں کچھ نظر آرہا تھا۔ میں اس آدمی سے زیادہ طاقتور تھا۔ میں نے لپک کر دونوں ہاتھو اس کی گردن دبوچ لی۔ اس نے بجلی ایسی تیزی کے ساتھ اپنا ہاتھ جیب میں ڈ جب باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک سانپ تھا۔ جس نے اپنا پھن کھول رکھا تھ نے سانپ میرے چہرے کے قریب کیا تو میں نے ڈر کر اس کی گردن چھوڑ دی نے ایک ہاتھ سے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور دوسرا سانپ والا ہاتھ آنکھوں سے کوئی ایک فٹ کے فاصلے پر لا کر بولا۔

"جلدی بتاؤ ناگن لڑکی کہاں ہے؟ نہیں تو یہ سانپ تمہاری زندگی ختم کردے

میں واقعی ڈر گیا۔ میں نے کہا۔ "وہ میرے ساتھ تھی کہنے لگی تم جھونپڑی جاؤمیں باہر سوجاتی ہوں۔ یہیں کہیں ہوگی۔"

مہاناگی نے ویسے ہی لمبے لمبے سانس لے کر فضا کو سونگھااور بولا۔ "اسکی ب آرہی وہ کدھر گئی ہے - جلدی بتاؤ۔" اور اس نے سانپ کا پھن مزید میرے قر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ پاروتی کی بو اس لئے نہیں آرہی کہ ناک بند کرکے سانس ہوگی۔ وہ ضرور آس پاس ہی موجود تھی۔ میں نے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتا وہ کہاں ہے تم جاکر دیکھو وہ سامنے والے درختوں سورہی ہوگی۔"

ابھی یہ فقرہ میں نے ادا ہی کیا تھا کہ ایک چیخ کی آواز کے ساتھ زہریلی لڑکی درختوں میں سے نکل کر سامنے آگئی۔ اس کے منہ سے پھنکار ایسی آوازیں تھیں - اس نے کہا۔

"اس کو چھوڑہ مہاناگی میں ناگن پاروتی تمہارے سامنے آگئی ہوں۔"

مہاناگی سپیرے کی آنکھیں اندھیرے میں چمک اٹھیں۔ اس نے میری گردن فوراً چھوڑ دی اور پاروتی کو بالوں سے پکڑ لیا۔ پاروتی کے جسم میں جیسے جان ہی نہ رہی۔ وہ نیم مردہ سی ہو گئی۔ مہاناگی سپیرا اسے کھینچتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ میں ان دونوں کو دیکھتا ہی رہ گیا اور جنگل کے اندھیرے نے ان دونوں کو اپنے اندر گم کرلیا۔

جب سپیرا مہاناگی پاروتی کو لے کر جنگل کے اندھیرے میں میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ اس لڑکی پاروتی نے محض میری جان بچانے کے لئے اپنے آپ کو مہاناگی کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔ میں احمقوں کی طرح یہاں منہ اٹھائے کس لئے کھڑا ہوں۔ خدا جانے یہ سپیرا اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟کیونکہ زہریلی لڑکی پاروتی نے مجھے بتایا تھا کہ مہاناگی بڑے چلے کاٹ کر اور بے شمار زہریلے سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسوا کر مہاناگی سپیرے کا مقام حاصل کرتے ہیں اور اگر وہ اپنا ناخن بھی میرے جسم میں چبھو دے تو میں مر سکتی ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی میرے بدن میں بجلی کا کرنٹ سا دوڑ گیا۔ میں فوراً جدھر مہاناگی گیا تھا ادھر چل پڑا۔

اس طرف جنگل بڑا گھنا تھا۔ جھاڑیاں اور درختوں کی لٹکتی ہوئی شاخیں میرا راستہ روک رہی تھیں۔ مگر میں دیوانہ وار آگے بڑھتا چلا گیا۔ مشکل یہ تھی کہ زہریلی لڑکی کو تو میری بو آجاتی تھی مگر مجھے اس کی بو نہیں آتی تھی۔ بہت قریب سے میں اس کی بو محسوس کر لیتا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ بے شمار سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسوانے اور بے شمار سانپ کھانے کے بعد اس کے جسم نے ایک عجیب و غریب قسم کی بو چھوڑنی شروع کر دی تھی۔ میں کافی دیر تک جنگل میں چلتا رہا۔ مگر مہاناگی سپیرے کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ میں تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ مجھے ایک یہ بھی خطرہ تھا کہ کسی طرف سے

جاپانی سپاہی سامنے نہ آجائیں۔ یہ علاقہ جاپانیوں کے قبضے میں تھا۔ وہ کم بخت مہاناگی پتہ نہیں پاروتی کو لے کر کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے پاروتی کی مدد کرنے اور اسے مہاناگی سے چھڑانے کی قسم کھالی تھی۔ میں نے کچھ دیر آرام کیا اور اس کے بعد پھر چلنا شروع کر دیا۔

جنگل میں یہی ایک راستہ چلنے کا تھا۔ دوسرا کوئی راستہ بظاہر اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چلتے چلتے سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ آگیا۔ میں دبے دبے قدم اٹھاتا ٹیلے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف گھوم گیا۔ اس خیال سے کہ اگر مہاناگی یہاں کہیں چھپا ہو تو اسے میرے قدموں کی آہٹ ہوشیار نہ کر دے۔ ٹیلے کے دوسری جانب اندھیرے میں مجھے جھاڑیوں کے درمیان ایک راستہ نیچے کھڈ میں اترتا نظر آیا۔ میں نے اندھیرے میں بڑے غور سے اسے دیکھا۔ یہ ایک قدرتی پگڈنڈی تھی۔ میں بڑی احتیاط سے نیچے اترنے لگا۔ کوئی پچاس ساٹھ فٹ نیچے اترنے کے بعد مجھے پانی کے پتھروں سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ جنگل میں جہاں پہاڑی چشمہ بہتا ہو تو اس کی ایک خاص قسم کی آواز آتی ہے۔ جسے میں جنگلوں کا خانہ بدوش ہونے کی حیثیت سے بخوبی پہچانتا تھا۔ میں مزید نیچے اتر گیا۔

اب میں نے دیکھا کہ ٹیلے کے دامن میں ایک جگہ چشمہ بہہ رہا تھا۔ یہ چشمہ پہاڑی نالے کی طرح تھا۔ اندھیرے میں پانی پتھروں سے ٹکرا کر بہتا۔ کسی کسی وقت ایک جھلک سی دکھا دیتا تھا۔ چشمے کے دوسرے کنارے پر ایک اونچی جگہ پر ایک چھپر سا جھکا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ چھپر ایک کوٹھڑی کا تھا۔ میں نے سوچا کہ چل کر دیکھنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے مہاناگی نے پاروتی کو اسی جگہ قید کر رکھا ہو۔ پتھروں پر اندھیرے میں پاؤں رکھ رکھ کر میں نے چشمے کو پار کیا۔ اور دوسری جگہ پر آکر اونچی جگہ پر چڑھ آیا۔ کوٹھڑی کا مجھے کوئی دروازہ نظر نہ آیا۔ ایک طرف دیوار کو جنگلی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں ان کی طرف بڑھا تو مجھے جنگلی لڑکی پاروتی کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ **وہ کہہ رہی تھی۔**

"بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو۔"

آواز دیوار پر چڑھی ہوئی جنگلی بیل کے پیچھے سے آتی ہوئی معلوم ہوئی تھی۔ میں جلدی سے دیوار کی طرف آیا۔ جنگلی بیلوں کو ہاتھ سے پرے ہٹایا۔ تو وہاں دیوار میں ایک کھڑکی تھی۔ جس کے کواڑ بند تھے۔ میں نے بہت تلاش کیا مگر کھڑکی کے بند تختوں میں ذرا سی بھی درز نہیں تھی۔ جہاں سے میں کوٹھری میں جھانکنے کی کوشش کرتا۔

پاروتی کی آواز پھر آئی۔

"تم جو کہو گے - میں کروں گی۔ تم بے شک مجھے ناگن بنا کر پٹاری میں قید کر لو۔ مگر میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرنا۔"

اب مہاناگی سپیرے کی آواز آئی۔ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"میں نے تمہیں اس لئے نہیں پکڑا کہ تم پر رحم کروں یا تمہیں پٹاری میں بند کر کے رکھ لوں۔ یہ تو مجھ پر ناگ دیوتا کی بڑی مہربانی ہوئی ہے کہ پورے ایک جنم کی تلاش کے بعد تمہارے ایسی زہریلی ناگن لڑکی میرے ہاتھ لگی ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ وہی کچھ کروں گا جس کے لئے میں نے تمہیں پکڑا ہے۔"

پاروتی کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھ اگر تو نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو تم کرنے والے ہو تو تمہارا اگلا جنم بچھو کا ہوگا۔ اور میں سورگ میں مہاناگی کے چرنوں میں ہوں گی اور تمہارے واسطے بد دعائیں کروں گی۔ پھر تمہارا ہر جنم مرنے کے بعد برے سے برا ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ تم دھرتی کے ساتھ میں پاتال کی دلدل میں جنم جنم تک رینگتے رہو گے۔"

مہاناگی نے پھنکار ایسی آواز نکال کر کہا۔

"میں جانتا ہوں میرا انجام کیا ہوگا۔ مگر میں تیرا انجام اسی طرح کروں گا جس طرح میں چاہتا ہوں۔ اب میں ناگ دیوتا کی آشیرباد لینے جاتا ہوں۔ چھری میں اسی جگہ تمہارے سامنے رکھ کر جارہا ہوں تاکہ تمہیں تمہاری موت اسی جگہ نظر آتی رہے۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی ۔ تم خوب جانتی ہو کہ میں کس طرح یہاں سے جاؤں گا۔

اور کتنی جلدی واپس آجاؤں گا۔"

اس کے ساتھ ہی کوٹھڑی کے اندر سے ایسی آواز آئی۔ جیسے کہ سانپ نے زور سے پھنکار ماری ہو۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ ایک منٹ دو منٹ تین منٹ جب تین چار منٹ گزر گئے - اور اندر سے نہ پاروتی کی آواز آئی۔ اور نہ مہاناگی سپیرے کی تو بس حیران ہوا کہ یہ بات کیا ہے؟ کیا دونوں مر گئے ہیں۔ اتنے میں پاروتی کے سسکنے کی ور آہستہ آہستہ بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"اے بھگوان میرے پاپ معاف کر دے۔ تو جانتا ہے میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ لر سنتھال کے سپیرے مجھے کلکتے سے اغوا کر کے نہ لاتے تو میں کبھی اس حال تک نہ ہنچتی۔"

اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ مجھے ایسے لگا جیسے کوٹھڑی کے اندر پاروتی اکیلی ہے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا میں نے مہاناگی کو کسی طرف سے بھی کوٹھڑی سے باہر نکلتے نہیں یکھا تھا۔ اول تو کوٹھڑی کا کوئی دروازہ ہی نہیں تھا۔ چاروں طرف پتھر کی دیوار تھی۔ رف یہ ایک کھڑکی تھی جو چاروں طرف پتھروں سے بند کر دی گئی تھی۔ یہ کیا معمہ ہے - کیا مہاناگی سپیرا سو گیا ہے؟

پاروتی کی آواز پھر سنائی دی وہ اپنے بھگوان کے آگے پرارتھنا کر رہی تھی۔

"بھگوان مجھے اس دنیا سے اٹھا لے۔ جب تک مہاناگی واپس نہیں آتا مجھے موت ے دے۔"

میں چونک پڑا۔ اس کا مطلب تھا کہ سپیرا اندر نہیں تھا۔ میں نے کھڑکی کے بند توں کو ہاتھ سے بجاتے ہوئے کہا۔

"پاروتی! پاروتی"

پاروتی بولتے ہوئے ایک دم رک گئی۔ پھر اس کی خوشی سے کانپتی ہوئی آواز ئی۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

"بھگوان کے لئے میری مدد کرو۔"

میں نے کہا میں اندر کس طرف سے آؤں؟ دروازہ کس طرف ہے؟

پاروتی نے جواب دیا "اس کھڑکی کو توڑ کر اندر آجاؤ۔ کوٹھڑی کا دروازہ کوئی ہے۔"

میں نے کھڑکی کے تختوں کو مکے مار مار کر توڑ دیا۔ اور کود کر اندر چلا گیا۔ کوٹھڑی کا منظر یہ تھا کہ فرش پر موم بتی روشن تھی۔ پاروتی فرش پر رسیوں سے جَ ہوئی اس طرح سیدھی پڑی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں زمین میں ہوئی میخوں کے ساتھ بندھے تھے۔ اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ بکھرے ہوئے تھے اور جسم پر ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ میں نے کھولتے ہوئے کہا۔

"پاروتی مجھے معاف کر دینا میں تمہاری مدد کو دیر سے پہنچا۔"

پاروتی بڑی گھبرائی ہوئی تھی اور بار بار کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جس تختے ٹوٹ چکے تھے۔ میں اس کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کھولنے میں مصروف تھا گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بھگوان کے لئے جلدی کھولو' مہاناگی آگیا تو ہم دونوں کو زندہ نہیں چھو گا۔"

جب میں نے ساری رسیاں کھول ڈالیں تو پاروتی جلدی سے کھڑکی کی طرف د اور بولی۔

"جلدی سے باہر آجاؤ۔"

وہ کھڑکی میں سے دوسری طرف کود گئی۔ میں نے بھی اس کے پیچھے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ وہ چشمے کے ساتھ ساتھ اس طرف دوڑنے لگی جس طرف بہاؤ تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ یہاں کھلی جگہ تھی اور رات اندھیرے کا رنگ سلیٹی سلیٹی تھا۔ درخت دور دور تھے۔ جھاڑیاں زیادہ گھنی تھیں۔ ان سب چیزوں کے خاکے اندھیرے میں نظر آرہے تھے۔ چشمہ آگے جاکر

ندی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اور اس کے کنارے اونچے ہوگئے تھے۔ ایک جگہ پاروتی رک گئی۔ میں بھی اس کے پاس آکر رک گیا۔ میں تو ہانپنے لگا تھا۔ مگر پاروتی کا سانس اتنا پھولا ہوا نہیں تھا۔ ایک بار اس نے مجھے بتایا تھا کہ سانپوں کے کھانے اور ڈسوانے کی وجہ سے اس کا سانس زیادہ نہیں پھولتا۔ وہ فضا میں منہ اٹھا کر کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ مہاناگی سپیرے کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جس طرف سے ہم بھاگ کر آئے تھے اس طرف منہ کر کے بولی۔

"مہاناگی کی بو اس طرف سے آرہی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا وہ ہمارا پیچھا کر رہا ہے؟"

"نہیں" پاروتی بولی "اس کی بو بہت دور سے آرہی ہے۔ ابھی وہ اس کوٹھڑی میں واپس نہیں آیا جہاں اس نے مجھے باندھ رکھا تھا۔"

میں نے پوچھا "لیکن وہ تمہیں چھری سے کیوں کاٹنا چاہتا تھا؟ اور مہاناگی سپیرا کوٹھڑی سے باہر کیسے نکلا تھا؟ کوٹھڑی کا دروازہ بھی نہیں تھا۔ ایک کھڑکی تھی جو تختے جوڑ کر بند کی ہوئی تھی؟"

پاروتی نے میرا بازو پکڑ کر آگے کی طرف کھینچا اور بولی۔ "یہ باتیں پھر بتاؤں گی۔ ابھی یہاں سے بھاگ چلو۔"

ہم نے دوبارہ چشمے کی ندی کے اونچے کنارے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ ندی جنگل میں ایک طرف گھوم گئی۔ ہم بھی اس کے ساتھ ہی اس طرف آگئے۔ یہاں ایک بار پھر ندی کے کنارے نیچے ہوتے ہوتے زمین کی سطح کے ساتھ لگ گئے۔ آگے پانی کے گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ پاروتی دوڑنے کی بجائے قدم قدم چلنے لگی۔ یہاں اس نے ایک دو بار پیچھے مڑ کر فضا کو سونگھا اور بولی۔

"اس کی بو نہیں آرہی - ہم خطرے سے نکل آئے ہیں۔"

رات کے سلیٹی رنگ کے اندھیرے میں میں نے آنکھیں پھاڑ کر آگے دیکھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ندی کا چوڑا پاٹ کچھ دور جاکر غائب ہو گیا ہے۔ پاروتی نے بھی پانی کے

شور کی آواز سن لی تھی۔ کہنے لگی۔

"آگے کوئی آبشار ہے میرے پیچھے پیچھے آنا۔"

ہم تھوڑی دور آگے گئے تو تھوڑی دور ندی کے چوڑے پاٹ کا پانی ایک کافی بڑی آبشار کی صورت میں نیچے گر رہا تھا۔ نیچے کافی گہرائی تھی اور پانی کے گرنے کا کافی شور بلند ہو رہا تھا۔ یہاں آگے جانے کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ پاروتی وہاں کھڑی ہو کر غور سے نیچے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔

"یہاں سے آگے ہم کیسے جائیں گے؟ میرا خیال ہے بائیں جانب چلے چلتے ہیں۔"

وہ کہنے لگی "بائیں جانب گئے تو واپس مہا ناگی کی منحوس کوٹھڑی میں پہنچ جائیں گے۔ ہمیں اسی جگہ سے نیچے اترنا ہوگا۔"

اور وہ ادھر ادھر نیچے اترنے کا کوئی راستہ تلاش کرنے لگی۔ وہ اندھیرے میں مجھ سے زیادہ دیکھ لیتی تھی۔ سانپوں کی طرح اسے اندھیرے میں بھی نظر آجاتا تھا۔ آخر اس نے ایک راستہ تلاش کر ہی لیا۔ یہ ایک بہت بڑا درخت تھا جس کی جڑیں زمین سے نکل کر نیچے کافی دور تک چلی گئیں تھیں۔ یہ لمبی لمبی مضبوط جڑیں رسیوں کی طرح آبشار کے قریب ہی لٹک رہی تھیں۔ پاروتی نے کہا۔

"ہمیں ان جڑوں کو پکڑ کر نیچے اترنا ہوگا۔ کیا تم نیچے اتر سکو گے؟"

میں نے کہا۔ "اگر تم اتر سکتی ہو تو میں بھی اتر جاؤں گا۔"

وہ ہنس پڑی اندھیرے میں اس کی چمکتی آنکھیں اور ہنستا ہوا چہرہ مجھے صرف نظر آیا۔

"تو پھر میرے پیچھے آجاؤ۔"

اس نے ساڑھی کے پلو کو کس کر باندھ لیا اور درخت کی ایک لمبی جڑ کو پکڑ کر نیچے اترنے لگی۔ میں نے درخت کی ایک دوسری جڑ کو پکڑا اور اس کے ساتھ ہی دیوار کو پاؤں لگا کر نیچے اترنے لگا۔ ہم پر آبشار کے گرتے پانی کی پھوار پڑ رہی تھی۔ زمین کی دیوار گیلی تھی۔ میرے پاؤں جمانے سے کیچڑ نیچے گرتا تھا۔ کہیں کہیں دیوار میں سے

پتھر باہر نکلے ہوئے تھے۔ میں ان پتھروں پر پاؤں جما کر اتر رہا تھا۔ پاروتی میرے دائیں جانب نیچے اتر رہی تھی۔ میں نے دائیں جانب سر گھما کر دیکھا وہ کافی نیچے تک چلی گئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر درخت کی جڑ ختم ہو گئی تو کیا کروں گا۔ مگر درخت کی جڑ بہت ہی تھی اور بالکل مضبوط رسے کی طرح تھی۔ ہماری ایک جانب ندی کا پانی بڑی زور ے نیچے کی جانب گر رہا تھا۔ نیچے گہرائی میں جہاں پانی بڑے شور کے ساتھ نیچے رتا تھا۔ وہاں سفید دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ میں جو جڑ ہے ختم ہو رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر پاروتی کی طرف نیچے دیکھا۔ پاروتی مین پر کھڑی تھی اور اوپر منہ کر کے کہہ رہی تھی۔

"چھلانگ لگا دو' زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔"

میں نے اندازہ لگایا۔ میرے پاؤں سے زمین کچھ پندرہ فٹ کی گہرائی میں تھی۔ ں نے درخت کی جڑ چھوڑ دی اور گیلی زمین پر پاؤں کے بل گرا۔ پاروتی ہاتھ کے ارے سے مجھے اس طرف بلا رہی تھی۔ جہاں آبشار کی گرتی ہوئی چادر کا کنارا تھا۔ اں اس قدر شور تھا کہ ہمیں ایک دوسرے کی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ میں وار سے نکلی ہوئی جڑوں اور جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ میرے کھتے دیکھتے نیچے اتر گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ نیچے پتھر کی سیڑھیاں تھیں۔ روتی وہاں کھڑی مجھے نیچے آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں پتھر کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ ڑھیوں پر پھسلن تھی۔ بڑی مشکل سے بیٹھ بیٹھ کر میں سیڑھیاں اتر گیا۔ پاروتی خدا نے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے آبشار کا پانی قیامت خیز شور کے ساتھ چے گہرائی میں گر رہا تھا۔ پاروتی نے رک کر میری طرف دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے تو کا سایہ ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ شاید مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ ہم دیوار کی طرف پشت کئے ئے دیوار کے ساتھ لگے آہستہ آہستہ آگے کھسک رہے تھے۔ جب ہم آبشار کی گرتی ئی چادر کے عقب میں آدھے راستے تک پہنچے تو پاروتی دیوار کے اندر چلی گئی۔ ں ایک شگاف تھا۔ پاروتی شگاف کے اندر چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے شگاف میں

چلا گیا۔ یہاں زمین اونچی نیچی اور سخت پتھر کی طرح تھی۔ جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ شگاف کے اندر چلنے لگے۔ یہ ایک سرنگ تھی - جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھ آبشار کا شور کم ہوتا جارہا تھا۔ سرنگ کی چھت ہمارے سروں سے کوئی دو فٹ او ہوگی۔ چھت پر سے پانی ٹپک رہا تھا - میں نے تنگ آکر پاروتی سے پوچھا۔

"ہم کہاں جارہے ہیں - یہ سرنگ ہمیں کہاں تک لے جائے گی؟"

پاروتی نے اندھیرے میں اپنی ساڑھی بدن پر درست کرتے ہوئے کہا۔

"گھبراتے کیوں ہو میں تمہیں موت کے منہ سے نکال کر لے جارہی ہوں - ب سے چلتے آؤ۔"

سرنگ کہیں خشک ہو جاتی۔ کہیں چھت سے لٹکتے ہوئے جالے ہمارے چہروں آگے آجاتے۔ کہیں چھت سے پانی ٹپکنے کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا۔ خدا خدا کر سرنگ ایک ایسی جگہ پہنچی جہاں ایک کشادہ دالان بنا ہوا تھا۔ دیواریں پیچھے ہٹ تھیں۔ چھت بھی اونچی ہو گئی تھی۔ یہاں بے حد حبس تھا۔ میں تھک کر بیٹھ گ پاروتی بھی میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ مجھے ہلکی ہلکی گونج سی سنائی دے رہی تھی۔ گونج اس آواز کو پاروتی بھی غور سے سن رہی تھی۔ اس نے منہ چھت کی طرف اٹھا کر سونگھنے کی کوشش کی اور بولی۔

"میرا خیال ہے ہمارے اوپر سے کوئی دریا گزر رہا ہے۔ میں پریشان ہو کر چھت تکنے لگا۔ چھت میں سے کسی وقت پانی کے بوندوں کے ٹپکنے کی آواز آجاتی تھی۔ نے پاروتی سے کہا۔

"یہ گونج کی آواز کیسی ہے؟"

وہ بولی "یہ ہمارے اوپر سے گزرنے والے دریا کی آواز ہے۔ اسی آواز سے تو نے اندازہ لگایا ہے کہ ہمارے اوپر کوئی دریا بہہ رہا ہے۔"

میں نے ہمیشہ دریا کو اوپر سے دیکھا تھا۔ اور اس کے اوپر ہی سیر کی تھی۔ دریا نیچے آنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔ میں نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

"کہیں آگے جاکر دریا کا پانی اندر تو نہیں آجائے گا؟"

پاروتی ہنسنے لگی - عجیب ناگن قسم کی عورت تھی۔ جب وہ ہنستی تھی تو اس کے حلق سے مجھے پھنکارنے کی آوازیں نکلتی محسوس ہوتی تھیں۔ ہو سکتا ہے یہ میرا مغالطہ ہو - لیکن مجھے اس وقت یہی محسوس ہوتا تھا۔ کہنے لگی۔

"اگر دریا کا پانی کسی طرف سے سرنگ میں آگیا ہوتا تو یہ سرنگ پانی سے بھری ہوئی ہوتی۔ خشک سرنگ کا مطلب ہے کہ یہ سرنگ دور کسی خشک جگہ پر نکلتی ہے۔"

"میں نے کہا لیکن ہم جا کس طرف رہے ہیں؟"

وہ بولی "اسکا مجھے بھی کچھ پتہ نہیں' چلو کافی آرام کر لیا ہے۔"

ہم سرنگ میں کافی آگے چل پڑے۔ کچھ پتہ نہیں ہم کتنی دیر سرنگ کے اندر چلتے رہے۔ کتنے موڑ گھومے۔ کتنی اترائیاں چڑھائیاں عبور کیں۔ آخر ایک جگہ سرنگ ختم ہو گئی۔ جہاں ہم سرنگ سے باہر نکلے وہاں دونوں جانب اونچی پہاڑیاں تھیں۔ رمیان میں تنگ راستہ تھا۔ اوپر آسمان پر پچھلے پہر کے نور کی روشنی جھلکنے لگی تھی۔ ہ تنگ راستہ پہاڑیوں میں کافی دور تک چلا گیا تھا۔ پہاڑیاں ختم ہوئیں تو چھوٹے بڑے ہوکور اور مخروطی چٹانوں کا منظر نظر آیا۔ پچھلے پہر کی نورانی روشنیوں میں ان چٹانوں کی وٹیاں دھندلی دھندلی نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے پاروتی سے پوچھا کہ ہم کہاں آگئے ں؟ یہ کونسی جگہ ہے؟ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک جگہ پتھروں میں پانی بہہ رہا تھا۔ پانی ایک چٹان کے اندر سے آکر نیچے گر رہا تھا۔ ہم نے منہ ہاتھ دھویا' پانی پیا اور زہ دم ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔

پاروتی کہنے لگی "مجھے خود نہیں معلوم کہ ہم کہاں سے نکل آئے ہیں۔ دن کی شنی ہو گی تو کچھ پتہ چل سکے گا۔"

میں نے پاروتی سے پوچھا کہ مہاناگی سپیرا اس سے کس قسم کا سلوک کرنے والا کہ وہ دہائی دے رہی تھی۔ پاروتی نے میرے اس سوال کے جواب میں کہا۔

تمہیں میں ساری باتیں اس لئے بتا دیتی ہوں کہ تم میرے بارے میں بہت کچھ

جانتے ہو۔ سنو مہاناگی سپیرا زندہ حالت میں میرا گوشت کھانا چاہتا تھا۔ اگر تم عین وقت پر نہ آتے تو اس نے میرے جسم کے کسی حصے کا گوشت کاٹ کر کھانا تھا۔ پھر میری گردن کاٹ کر میرا سر ساتھ لے جانا تھا۔ جانتے ہو اس نے ایسا کیوں کرنا تھا؟ ایسا کرنے سے اس میں اتنی شکتی پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ آدمی سے سانپ کا روپ دھار سکتا تھا۔ صرف اسی واسطے وہ میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ تمہاری مہربانی سے میری جان بچ گئی۔

میں اس قسم کی باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور ایک بار پھر پوچھا کہ یہ جنگل کا کونسا علاقہ ہے؟ کیا یہاں سے ہم بنگال کلکتے کی طرف نکل سکتے ہیں؟

پاروتی فضا میں کچھ سونگھ رہی تھی میں نے پوچھا۔

"کیا مہاناگی کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "نہیں' اس کی بو تو غائب ہو چکی ہے۔ یہ تو میں کسی سانپ کی بو لینے کی کوشش کر رہی ہوں - مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ تمہیں بھوک نہیں لگ رہی؟"

میں نے کہا۔ "بھوک ضرور لگ رہی ہے۔ مگر یہاں تو کھانے کو سوائے سانپ اور بچھو کے کچھ نہیں ملے گا۔"

پاروتی ہنس کر بولی "میری مانو تم بھی سانپ اور بچھو کھانے شروع کر دو۔ زندگی بڑی آسان ہو جائے گی۔" پھر وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس طرف سے سانپ کی بو آ رہی ہے - میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ چلی گئی واپس آئی تو بڑی خوش تھی کہنے لگی۔ اکٹھے تین سانپ مل گئے تھے۔ اس کو تھوڑا تھوڑا سا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ یہ بقول اس کے سانپ کے زہر کا نشہ تھا۔ اتنی دیر میں آسمان پر صبح کا اجالا پھیل گیا۔ ہمارے ارد گرد کالی کالی چٹانیں ہی چٹانیں تھیں۔ پاروتی کی ساڑھی کافی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہاں کوئی گاؤں آیا تو میں کسی عورت کی نئی ساڑھی چرا کر پہنوں گی۔"

میں نے کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ ہمیں جانا کدھر کو ہے؟"

اس نے مجھے آنکھیں نکال کر دیکھا اور ڈانٹتے ہوئے بولی۔

"کیوں پریشان ہوتے ہو؟ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ چلو اٹھو میرے ساتھ آؤ۔"

ہم چٹانوں سے باہر نکلے تو وہ فضا کو سونگھتے ہوئے بولی۔

"مجھے ادھر سے سمندر کی بو آ رہی ہے کہیں سرنگ نے ہمیں سمندر کی طرف تو نہیں نکال دیا؟"

میں شکستہ دلی سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پاروتی کا اندازہ درست نکلا۔ ہم اونچی اونچی گھاس میں چل رہے تھے۔ یہاں سے آگے آئے تو سامنے سمندر کا براؤن رنگ کا ریتلا ساحل دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم وہیں کھڑے سمندر کی لہروں کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک طرف سے سات آٹھ آدمی جنہوں نے سروں پر رومال باندھے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں پستول تھے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔

انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔

اپنی وضع قطع اور چال ڈھال سے یہ لوگ جرائم پیشہ اور ڈاکو لگ رہے تھے۔ ان کے قد درمیانے مگر جسم بہت گھٹے ہوئے تھے اور وہ کوئی عجیب سے زبان بول رہے تھے۔ پاروتی کو انہوں نے سب سے پہلے قابو کیا۔ پاروتی نے اپنی بنگلہ اور سنتھالی سپیروں کی زبان میں بہت شور مچایا مگر دو آدمیوں نے اسے قابو کر کے اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے اور گھسیٹتے ہوئے لے کر چل پڑے۔ میرے ہاتھ بھی پیچھے باندھ دیئے اور دھکے دے کر مجھے آگے چلانے لگے۔

پاروتی نے ایک آدمی کو دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کی تو اس نے اسے زور سے تھپڑ مارا۔ پاروتی کے منہ سے پھنکاریں سی نکلنے لگیں۔ وہ سب لوگ اپنی زبان میں اسے مذاق کر کے ہنسنے لگے۔ میں نے انہیں ہندوستانی زبان میں کہا کہ ہم لوگ جنگل میں راستہ بھول کر اوپر آگئے ہیں۔ ہم واپس چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے ٹوٹی ہوئی ہندوستانی زبان میں گالی دی اور کہا۔ ”ابھی تم کو معلوم پڑ جائے گا۔ سب معلوم پڑ جائے گا۔“

وہ آپس میں کسی ایسی زبان میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ ان میں سے دو آدمیوں کے کاندھوں سے چمڑے کے بڑے تھیلے لٹک رہے تھے۔ اور تین آدمیوں نے کمر کے ساتھ خنجر بھی لگائے ہوئے تھے۔ پاروتی نے ایک بار

پھر ایک آدمی کو کاٹنے کی کوشش کی۔ جس کے جواب میں پاروتی کو مار کھانا پڑی۔ میں نے بنگلہ زبان میں چلا کر کہا۔ ”پاروتی کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا۔“

مجھے معلوم تھا کہ اگر اس نے کسی آدمی کو دانتوں سے کاٹ کھایا تو وہ آدمی وہیں اس کے زہر سے مر جائے گا۔ اس کے بعد پاروتی کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ ہم سمندر کے کنارے ریت پر ناریل کے درختوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہاں کنارہ تکون کی صورت میں سمندر میں آگے تک چلا گیا تھا۔ ہم اس تکون کو پار کر کے اگلی طرف آئے تو مجھے سمندر میں دور کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا بحری جہاز نظر آیا۔ جس کی چمنی میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ساحل کی ریت پر تین چار چھوٹی ڈونگا نما کشتیاں کھڑی تھیں۔ ان لوگوں نے ہمیں کشتیوں میں بٹھایا۔ کشتیاں بحری جہاز کی طرف چل پڑیں۔ پاروتی دوسری کشتی میں تھی۔ میں سب سے آگے والی کشتی میں تھا۔

سمندری جہاز کا لنگر گرا ہوا تھا۔ اس کے ڈیک پر اسی قسم کے پندرہ بیس جرائم پیشہ آدمی ریلنگ پر جھکے ہوئی کشتیوں کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ رہے تھے۔ ڈیک پر سے رسی کی تین سیڑھیاں نیچے لٹک رہی تھیں۔ ہمیں سب سے پہلے جہاز پر چڑھایا گیا۔ پھر باقی کے لوگ بھی رسی کی سیڑھیوں کی مدد سے ڈیک پر آگئے یہ ایک خستہ حال پرانا سمندری جہاز تھا جس کے سڑا بورڈ کا رنگ اڑ چکا تھا اور جگہ جگہ زنگ لگ چکا تھا۔ ڈیک کا لکڑی کا فرش صاف ستھرا تھا۔ ہمیں ایک ایسے آدمی کے سامنے پیش کیا گیا جس کی ایک آنکھ کانی تھی اور اس میں سے پانی بہہ رہا تھا جسے وہ رومال سے تھوڑی دیر بعد صاف کر لیتا تھا۔ سر پر نیلا رومال بندھا تھا۔ کمر میں بیلٹ لگی تھی جس کے ساتھ ایک خنجر اور پستول لٹک رہا تھا۔ اس کے دونوں کانوں میں تانبے یا سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں۔ اس نے مجھے اپنی ایک آنکھ سے گھور کر دیکھا پھر پیچھے کو دھکا دیا میں گرتے گرتے بچا۔ پاروتی کے پاس جا کر اس کے خوفناک چہرے پر ایک عجیب خونخوار قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

مجھے معلوم تھا کہ اگر پاروتی نے اس شخص کو اپنا ناخن ذرا سا بھی چبھو دیا تو اس کی

موت واقع ہو جائے گی۔ مجھے یہی خطرہ تھا کہ پاروتی کہیں یہ حماقت نہ کر بیٹھے۔ کیونکہ اس کے بعد ہم دونوں کی موت یقینی تھی۔ مگر پاروتی نے بڑی سمجھداری سے کام لیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کھول دیئے گئے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر خاموش کھڑی خالی خالی نظروں سے اس آدمی کو تکتی رہی۔ اس وقت کسی نے ہندوستانی میں کہا۔

کیپٹن ہم نے انہیں جنگل میں پکڑا ہے۔ یہ دونوں ہندوستانی ہیں۔

کیپٹن کے حلق سے غراہٹ کی سی آواز نکلی - اس نے چٹکی بجا کر ایک طرف اشارہ کیا - اس کا اشارہ ملتے ہی چار آدمی ہمیں دھکیلتے ہوئے جہاز کے لوئر ڈیک میں لے آئے۔ یہاں انہوں نے ہمیں لوہے کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا اور ایک دوسرے سے ہنستے مذاق کرتے اوپر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میں نے پاروتی سے کہا۔

"پاروتی قسمت نے ہمیں ان ڈاکوؤں یا سمگلروں کا قیدی بنا دیا ہے۔ مگر بھگوان کے لئے تم کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا۔"

پاروتی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آدھ گھنٹہ پہلے اس نے جنگل میں تلاش کر کے تین سانپوں کا ناشتہ کیا تھا۔ کہنے لگی۔ "میں ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "خبردار ایسی بیوقوفی نہ کرنا نہیں تو ہماری خیر نہیں۔ یہ لوگ تو قاتل اور ڈاکو ہیں۔ تم ان میں سے کسی کو مارو گی تو یہ ہمیں بھی مار ڈالیں گے۔"

پاروتی نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"تو کیا میں اس کالے بندے کے ساتھ رہوں گی۔"

میں نے کہا خدا کے لئے عقل سے کام لو۔ ہمیں ان لوگوں کی قید سے فرار ہونا ہے۔ اس کے لئے ہمیں بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ کوئے سکیم تیار کرنی پڑے گی۔

پاروتی نے سر جھکا لیا۔ کہنے لگی۔

"اگر اس کالے کیپٹن نے میرا منہ چوما تو وہ تو میرے منہ کے زہر سے مرجائے گا۔

تب میں کیا کروں گی۔"

میں نے کہا "جس طرح بھی ہو تم ایسا مت کرنا۔"

وہ بولی۔ "میں اسے کیسے روک سکتی ہوں وہ تو جانور ہے۔"

میں نے بے بسی کے انداز میں کہا۔

"تمہیں تمہارے بھگوان کا واسطہ ہے کوئی علاج سوچو ورنہ ہماری لاشیں سمندر کی مچھلیاں کھا رہی ہوں گی۔"

پاروتی کچھ سوچنے لگی۔ لوئر ڈیک میں پیاز اور گرم مصالحوں کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ فضا مرطوب اور بوجھل تھی۔ چھت میں جو ہوادان لگا تھا صرف اس میں سے سمندر کی تازہ ہوا کسی وقت آجاتی تھی۔ ہمارا ایک ایک ہاتھ ہتھکڑی سے لوہے کے ستون کے ساتھ جکڑ دیا گیا تھا۔ پاروتی کہنے لگی۔

"اگر میں دو تین سگریٹ یا ایک سگار چبا کر کھا جاؤں تو تمباکو کے اثر سے کم از کم چوبیس گھنٹوں کے لئے میرے منہ کے زہر کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"بس ٹھیک ہے اگر یہ کالا کیپٹن تمہیں رات کو اپنے کیبن میں لے گیا تو تم کہنا کہ مجھے رات کو تمباکو چبانے کی عادت ہے۔ وہ کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔"

اتنے میں جہاز کا فرش کانپنے لگا۔ ساتھ ہے گڑگڑاہٹ کی آواز شروع ہو گئی۔ جہاز کے پرانے انجن چل پڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جہاز دائیں بائیں ہچکولے کھانے لگا۔ پاروتی پریشان ہو رہی تھی کہنے لگی۔

"یہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ آخر انہوں نے ہمیں اپنا قیدی کیوں بنایا ہے؟"

میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"پاروتی یہ لوگ مجھے بحری ڈاکو یا سمگلر لگتے ہیں۔ ان کا کام کھلے سمندروں میں سفر کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے تجارتی جہازوں کو لوٹنا ہے۔ یا یہ ساحلی علاقوں میں منشیات وغیرہ کی سمگلنگ کرتے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں انہوں نے ہمیں

اس لئے پکڑا ہے کہ ہم نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ یہ لوگ روپوش رہ کر گھناؤنے جرائم کرتے ہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ ہم شہر جاکر پولیس کو ان کے ملنے اور وہ جگہ بتا دیں گے جہاں یہ اترے تھے۔"

پاروتی نے ناامیدی کے ساتھ کہا "پھر تو یہ ڈاکو ہمیں کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے کہ ہم انہیں ماریں یہ ہمیں مار ڈالیں۔"

میں نے کہا۔ "اگر ایسا وقت آگیا تو ہم ان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ کم از کم تمہارے پاس تمہارے زہریلے ناخنوں کا ہتھیار تو ہر وقت موجود رہتا ہے۔"

جہاز دائیں بائیں آگے پیچھے ڈولتا سمندر میں رواں دواں تھا۔ لوئر ڈیک سمندری جہاز کا سب سے نچلا ڈیک ہوتا ہے۔ مسافر بردار جہاز میں بارش یا طوفان کے وقت اپر ڈیک کی کلاس کے مسافر یہاں آجاتے ہیں۔ مال بردار جہاز میں لوئر ڈیک کو گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے نیچے بھی ایک منزل ہوتی ہے جہاں جہاز کے انجن نصب ہوتے ہیں۔ لوئر ڈیک میں ہوا صرف اوپر والے ہوا دانوں سے آتی ہے۔ یہاں سمندر دکھائی نہیں دیتا۔ اپر ڈیک اور لوئر ڈیک کو تھرڈ کلاس میں ہی شمار کیا جاتا ہے۔

ہمیں وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دو آدمی آئے اور ہمیں کھول کر جہاز کی درمیانی منزل میں لے گئے۔ یہاں ایک اتنی تنگ راہ داری تھی کہ اس میں سے صرف ایک آدمی ہی گزر سکتا تھا۔ یہاں آمنے سامنے دو کیبن تھے۔ انہوں نے مجھے ایک کیبن میں دھکا دے کر داخل کیا اور باہر سے تالا لگا کر پاروتی کو ساتھ لے کر وہاں سے چلے گئے۔ مجھے راہ داری میں دیر تک ان کے بوٹوں کی آواز آتی رہی۔ اسکا مطلب تھا کہ پاروتی کو وہ اوپر والی منزل کے کسی کیبن میں لے جارہے تھے۔ اور جہاز کے اوپر والا کیبن جہاز کے کپتان کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ میرے کیبن میں سوائے پلاسٹک کے بڑے بڑے تھیلوں کے اور کچھ نہیں تھا جو فرش سے چھت تک چلے گئے تھے۔ وہاں صرف میرے لیٹنے کی جگہ ہی تھی۔ میں فرش پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ میری زندگی کی کتاب نے ایک عجیب وغریب باب کھول دیا ہے۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا

ہے۔ میں تو ایڈونچر پسند طبیعت رکھتا تھا۔ اس مہم جوئی میں موت کئی بار میرے قریب سے ہو کر گزر گئی تھی۔ موت سے آنکھ مچولی کھیلنے میں مجھے بڑا مزہ آتا تھا۔ بس میری طبیعت ہی ایسی تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ کسی کا قیدی بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ دل یہ چاہتا تھا کہ آزادی کے ساتھ دشوار گزار بارانی جنگلوں' کھلے سمندروں اور ناقابل عبور صحراؤں کی سیاحت کرتا رہوں۔ ان سمندری لٹیروں یا سمگلروں نے پاروتی کے ساتھ مجھے بھی پکڑ کر قید میں ڈال دیا تھا۔ جو میرے مزاج کے خلاف تھا۔ اور میں فرار کی ترکیبیں سوچنے لگا تھا۔

کیبن کے دروازے کا تالا کھول کر ایک بوڑھا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چاولوں سے بھری ہوئی تھالی اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا ڈونگا تھا۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا آدمی تھا۔ عمر ساٹھ کے قریب ہوگی۔ سمندری ہواؤں نے اس کے چہرے کو کرخت بنا دیا ہوا تھا۔ اس کے سر پر بھی نیلا رومال بندھا ہوا تھا۔ اس نے تنگی قمیض کے اوپر باندھ رکھی تھی۔ چاول کی تھالی اور ڈونگا میرے آگے رکھ کر بولا۔

"اسے کھاؤ۔ خبردار یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔"

میں نے چاولوں کی تھالی اپنے آگے کی اور میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"یااللہ تیرا شکر ہے۔"

اس جملے نے جیسے اس بوڑھے پر جادو کا اثر کیا۔ اس نے جلدی سے کیبن کا دروازہ بند کیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ وہ ہندوستانی بول لیتا تھا۔ مگر اس کا لہجہ جنوب مشرقی ایشیا کے خطے کا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم مسلمان ہو؟"

میں نے کہا۔ "الحمد للہ مسلمان ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ اس کے دو تین دانت غائب تھے۔ کہنے لگا۔ "میں بھی مسلمان ہوں۔ میں تھائی ہوں۔ تھائی لینڈ کا رہنے والا ہوں۔ جوانی میں کپتان ابرٹو کے ساتھ ہو گیا تھا۔

اب بوڑھا ہو رہا ہوں۔" پھر وہ میری طرف جھک کر راز داری سے بولا۔

"تمہارے ساتھ جو عورت تھی وہ تمہاری بیوی ہے کیا؟"

میں نے کہا۔ "نہیں وہ میری بیوی نہیں - جنگل میں مل گئی تھی۔ سپیرے کی بیٹی ہے - ماں باپ مر چکے ہیں - وہ کلکتہ شہر جانا چاہتی تھی۔ میں بھی کلکتے جانا چاہتا تھا۔ ہم دونوں جنگل میں راستہ بھول گئے۔ اور تم لوگوں نے ہمیں پکڑ لیا۔"

بوڑھا بڑے غور سے میری باتیں سنتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا - کہنے لگا۔ "میرا نام عمر ہے۔ یہاں مجھے سب عامو کہتے ہیں۔ میں پھر آؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ میں دل میں بڑا خوش ہوا کہ لٹیرے ڈاکوؤں کے جہاز میں ایک مسلمان مل گیا ہے۔ جو قید سے فرار ہونے میں میری مدد کر سکتا ہے۔ میں سارا دن کیبن میں پلاسٹک کے تھیلوں کے سٹاک کے پاس پڑا رہا۔ بیچ میں ایک آدمی آکر میرا منہ ہاتھ دھلانے مجھے باتھ روم میں لے گیا جو کاریڈار کے کونے پر تھا۔ جہاز ایک نپی تلی رفتار کے ساتھ دائیں بائیں تھوڑی تھوڑی رولنگ کرتا خدا جانے کس طرف چلا جا رہا تھا۔

مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ دن ہے یا رات۔ کیبن میں ایک بتی جل رہی تھی۔ دوسری بار بوڑھا عمر میرے لئے چاول لے کر آیا تو اس نے بتایا کہ رات ہو گئی ہے۔ وہ میرے لئے ابلے ہوئے چاولوں میں جھینگا مچھلی چھپا کر لے آیا تھا۔ میرے پاس بیٹھ گیا کہنے لگا۔

"ہم پرسوں ایک جزیرے میں پہنچیں گے۔ وہاں کپتان کو مال ایجنٹوں کے حوالے کرنا ہے۔ دو دن جزیرے میں ٹھہریں گے۔ وہاں جہاز میں پینے کا پانی اور خوراک وغیرہ سٹاک کی جائے گی۔"

میں نے پوچھا۔ "کپتان کس قسم کا کاروبار کرتا ہے اور اس نے ہمیں کیوں پکڑا ہے؟"

عمر آہستہ سے بولا۔ "ایسا سوال پھر نہ پوچھنا۔ اس جہاز پر ہر قسم کا ناجائز کاروبار ہوتا ہے۔ زیادہ تر ہم مختلف جگہوں سے ہیروئن اور حشیش لے کر ہانگ کانگ، کولون

اور میکاؤ کے ایجنٹوں کو سپلائی کرتے ہیں۔ آزاد پانیوں میں کوئی چھوٹا موٹا مال بردار جہاز مل جائے تو ہم اسے لوٹ بھی لیتے ہیں۔"

میں نے اس سے کہا۔ "یہ تو گناہ ہے - آپ تو مسلمان ہیں۔"

عمر بولا۔ "پہلے تو مجھے گناہ لگتا تھا۔ اب نہیں لگتا۔ میں نے سوچا پھر نہ جانے موقع ملے نہ ملے۔ اس وقت موقع ہے اس شخص سے دل کی بات کہہ ہی ڈالنی چاہئے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کو تو معلوم ہے کہ ہم دونوں بے قصور ہیں۔ ہمیں یونہی پکڑ کر قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ کیا اس قید سے رہائی نہیں مل سکتی؟"

بوڑھے عمر نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"ایسی بات کبھی بھول کر بھی دل میں نہ لانا۔ کپتان ابرٹو کے جہاز سے آج تک کوئی قیدی فرار نہیں ہوا۔ جانتے ہو جو قید سے فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے اس کے ساتھ کیپٹن کیا سلوک کرتا ہے؟ ایسے قیدی کو بوری میں بند کر کے سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ میں کئی قیدیوں کا یہ عبرت ناک انجام دیکھ چکا ہوں۔"

میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"آخر تمہارے کپتان نے ہمیں کیوں پکڑا ہے وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟"

بوڑھا عمر بولا۔

"دو ایک دنوں میں تمہیں جہاز کی صفائی، میلے کپڑوں کی دھلائی اور جوٹھے برتنوں کے صاف کرنے کے کام پر لگا دیا جائے گا۔ اور اگر کیپٹن کو تمہارے اچھے دام مل گئے تو وہ تمہیں کسی فلپینو یا تھائی سمگلر کے ہاتھوں فروخت بھی کر دے گا۔"

میں نے دل میں کہا کہ تمہارے کپتان کی ایسی تیسی۔ میں تو ہر حالت میں فرار ہو جاؤں گا۔ اگر پاروتی ساتھ نہ جا سکی تو میں اکیلا موقع پاتے ہی بھاگ جاؤں گا۔ میں نے بوڑھے عمر سے اس سمندر کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ یہ خیال دل سے نکال دو کہ اگر تم نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تو تیر کر کسی شہر پہنچ جاؤ گے۔ یہ سمندر ہزاروں میل تک

پھیلا ہوا ہے۔ اور خونخوار شارک مچھلیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر شارک مچھلیوں سے بچ بھی گئے تو ہزاروں میل کی وسعت میں پھیلا ہوا ہیبت ناک سمندر تمہیں بھوکا پیاسا مار دے گا۔"

مجھے جاپانی بحری بیڑے کا خیال آیا جو ان سمندروں میں گشت کر رہا تھا۔ جب میں نے اس سے ذکر کیا کہ اگر ہمیں کوئی جاپانی جنگی جہاز مل گیا تو وہ تو ہمارے جہاز کو تباہ کر دے گا۔ تو وہ حیران سا ہو کر بولا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس علاقے سے سارے جاپانی بھاگ گئے ہیں۔ جاوا' سماٹرا' تھائی لینڈ' برما' فلپائن یہ سارے علاقے جاپانیوں سے خالی ہو گئے ہیں۔ انگریزوں کے ساتھ امریکہ بھی مل گیا ہے۔ ان کے جنگی جہاز اب جاپان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور جنگ جاپان کے ساحلوں کے قریب ہو رہی ہے۔ یہ سمندر تو ہمارے لئے بالکل خالی ہو گئے ہیں۔"

وہ خوش ہو کر ہنسنے لگا۔ یہ بوڑھا مسلمان کبھی مجھے بڑا رحمدل لگتا اور کبھی سفاک قاتل لگنے لگتا۔ ایک بات ثابت ہو گئی تھی کہ میرے فرار میں یہ شخص کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اب مجھے اکیلے ہی فرار کی کوئی ترکیب نکالنا تھی۔ رات گزر گئی۔ دوسرے روز مجھے کیبن سے نکال کر عرشے کی صفائی پر لگا دیا گیا۔ صابن والے پانی سے بھری ہوئی بالٹی اور برش مجھے تھما دیا گیا۔ اور میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر فرش کی صفائی شروع کر دی۔ دوپہر تک میں یہ مشقت کرتا رہا۔ دوپہر کو مجھے تھوڑا بہت کھانے کو دیا گیا۔ اس کے بعد باورچی خانے میں برتنوں کی صفائی کا کام دے دیا گیا۔ اس دوران مجھے نہ تو کانا کپتان دکھائی دیا تھا اور نہ ہی پاروتی نظر آئی تھی۔ تیسرے پہر ڈیک کے دوسرے سرے پر میں نے جہاز کے کپتان کو دیکھا۔ وہ دوربین لگائے اپنی ایک آنکھ سے دور کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پاروتی نے رات کو تمباکو چبائی ہے۔ ورنہ اس وقت یہ کانا کپتان زندہ حالت میں نظر نہ آتا۔ جہاز کچھ زیادہ ہی ڈولنے لگا تھا۔ سمندر کی بپھری ہوئی موجیں دور دور سے آکر جہاز سے ٹکرا رہی تھیں۔ رات کو مجھے دوبارہ

کیبن میں بند کر دیا گیا۔

اس طرح سمندر میں سفر کرتے ہوئے دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن سمندر میں مشرق کی جانب دور سیاہ دھبے سے نظر آنے لگے۔ میں عرشے کی صفائی اور فرش دھونے میں لگا ہوا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس دوران ایک بار بھی پاروتی مجھے جہاز پر نظر نہ آئی تھی۔ لگتا تھا کہ کانے کپتان نے اسے کسی خاص کیبن میں بند کر کے رکھا ہوا ہے۔ جیسے جیسے جہاز آگے بڑھتا گیا سیاہ دھبے اونچے اونچے پہاڑوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ یہ کوئی جزیرہ تھا۔ جہاز ساحل سے کچھ فاصلے پر سمندر میں کھڑا ہو گیا۔ لنگر ڈال دیا گیا۔ چھوٹی کشتیاں سمندر میں اتار دی گئیں۔ ان میں پلاسٹک کے تھیلے لادے جانے لگے۔

کشتیوں کے دو پھیروں میں یہ تھیلے ساحل پر پہنچائے گئے۔ اس دوران کپتان ابرٹو عرشے پر کھڑا کام کی نگرانی کرتا رہا۔ جب سارا مال جزیرے پر پہنچ گیا تو کپتان نے چند آدمیوں کو ساتھ لیا اور کشتی میں بیٹھ کر جزیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت میں عرشے کے دوسرے سرے پر جہاں لنگر نیچے ڈالا گیا تھا اکیلا بیٹھا تھا۔ مجھے جہاز کے دوسرے سرے پر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اگرچہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے مگر مجھے جہاز کی دوسری منزل اور لوئر ڈیک پر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں کپتان کے قریب بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس وقت میں پاروتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پھر خیال آیا کہ اگر میں کسی طرح سمندر میں چھلانگ لگا کر جزیرے کی طرف نکل جاؤں تو ان بحری ڈاکوؤں کی قید سے نجات مل سکتی ہے۔ پاروتی کے بارے میں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کپتان اس پر لٹو ہو گیا ہے۔ اور اسے اس نے اپنے کیبن میں ہی بند کر کے رکھا ہوا ہے۔

اتنے میں بوڑھا جہاز ران عمر ہاتھ میں تام چینی کا مگ پکڑے میری طرف آتا نظر آیا۔ وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر بیٹھ گیا اور ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ان لوگوں کے سامنے میں تم سے زیادہ بات چیت نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی آدمی

ہمارے قریب سے گزرے تو خاموش ہو جانا۔"

ہم ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ بلکہ دوسری طرف منہ کر کے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے بوڑھے عمر سے پاروتی کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو وہ بڑے مزے میں ہے۔ کپتان کو وہ پسند آگئی ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری بڑی مہربانی ہو گی مجھے صرف ایک بار اس سے ملا دو۔"

بوڑھے عمر نے پوچھا "تم اس سے کس لئے ملنا چاہتے ہو؟ وہ تمہاری بیوی تو ہے نہیں۔ پھر اپنی جان خطرے میں کیوں ڈال رہے ہو۔ جانتے ہو اگر کپتان کو پتہ چل گیا تو وہ تمہیں بوری میں ڈال کر سمندر میں پھینک دے گا۔"

میں نے کہا۔ "بابا مجھے اس سے ایک دو بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ صرف تھوڑی دیر کے لئے مجھے اس کے پاس لے چلو۔ اس وقت کپتان بھی جہاز پر نہیں ہے اور آدھے سے زیادہ آدمی جزیرے پہ جا چکے ہیں۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

بوڑھا عمر مسکرانے لگا۔ "معلوم ہوتا ہے تمہیں اس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ اچھا میں کوشش کرتا ہوں تم اسی جگہ بیٹھے رہو۔"

وہ دوسری طرف منہ کئے ہوئے پلٹا اور ان سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ جو جہاز کی دوسری منزل کو جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بالٹی تھی۔ وہ میرے قریب سے ہوتا ہوا عرشے کی ریلنگ کے پاس گیا۔ بالٹی کا پانی سمندر میں پھینکا اور میرے قریب سے واپس جاتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"اپنے کیبن میں جاؤ پاروتی وہاں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

جہاز کا عرشہ تقریباً خالی تھا۔ میں خاموشی سے اترا اور دوسری طرف والی سیڑھیاں اتر کر جہاز کی تیسری منزل کی راہ داری سے گزرتا ہوا اپنے کیبن میں آگیا۔ پاروتی وہاں بیٹھی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے نئی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

میں نے کیبن کا دروازہ بند کرتے ہوئے پاروتی سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں جہاز کا کانا کپتان پسند آگیا ہے۔"

پاروتی کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"تم نے مجھے ہنستے دیکھ کر یہ اندازہ لگایا ہو گا۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میرے چہرے مسکراہٹ تمہیں دیکھ کر آئی تھی۔ آج پہلی بار مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"یہ باتیں چھوڑو۔ مجھے بتاؤ کہ باہر کیوں نہیں نکلتیں؟ کیا تم نے کپتان کے رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

اس پر پاروتی کو غصہ آگیا۔ مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور بولی۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ کیا میں اس کے ساتھ رہ سکتی ہوں جس نے اپنا قیدی بنا رکھا ہے؟ یہ تو اس کی خوش قسمتی ہے کہ میں نے اس کے جسم میں اپنا داخل کر کے اسے مار نہیں ڈالا۔ وہ بھی اس لئے کہ تم نے مجھے منع کیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "پاروتی! ہمارے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ یہ بتاؤ کہ کیا ایسا ہو سکتا کہ تم کسی طرح کپتان کو راضی کر لو کہ ہم دونوں جزیرے کی سیر کرنا چاہتے ہیں اجازت دے دے۔"

وہ کہنے لگی۔ "یہ کالا ڈاکو کپتان بڑا وحشی درندہ ہے۔ میرے ساتھ وہ درندوں ایسا سلوک کر رہا ہے۔ اسے میں صرف تمہاری وجہ سے برداشت کر رہی ہوں۔ نہیں تو میں اسے کبھی زندہ نہ چھوڑتی اس نے مجھے اپنے ساتھ والے کیبن میں بند کیا ہوا ہے۔ یہ تو بوڑھے ملاح کی مہربانی سے میں تم سے ملنے آ گئی ہوں۔ اس نے مجھے دس منٹ سے زیادہ کی مہلت نہیں دی۔ میں خود تم سے ملنے کو بے چین تھی۔ یہ بتاؤ کہ ہم یہاں سے فرار کس طرح ہو سکتے ہیں؟ میں تو کہتی ہوں کہ اسی وقت باہر نکل کر سمندر میں کود جاتے ہیں جہاز کے سارے لوگ جزیرے پر گئے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مگر کچھ ڈاکو پہرے پر موجود ہیں۔ ان کے پاس سٹین گنیں اور رائفلیں ہیں۔ وہ ہمیں وہیں بھون ڈالیں گے۔"

"تو پھر یہاں سے کیسے فرار ہوں؟ میں اس درندے کپتان کے ساتھ زیادہ دیر نہیں رہ سکتی۔ آخر میں بھی ناگن عورت ہوں۔ مجھے ذرا غصہ آ گیا تو صبح کیبن میں کپتان کی لاش ہی ملے گی؟"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں نہیں پاروتی! بھگوان کے لئے ایسا بالکل نہ سوچنا۔ ایسی حرکت نہ کرنا۔ میں یہاں سے فرار کی کوئی ترکیب سوچتا ہوں۔ بوڑھا ملاح تو ہمارا ایک ہمدرد یہاں موجود ہے جیسے ہی میں نے کوئی ترکیب سوچی میں تمہیں بوڑھے عمر کے ہاتھ کہلوا بھیجوں گا۔"

پاروتی نے کہا۔

"یہ بوڑھا ملاح تو کپتان کا بڑا خاص آدمی ہے۔ وہ اسے بتا دے گا۔"

میں نے کہا۔ "میں اسے راضی کر لوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ اور کچھ دن کپتان کا ظلم برداشت کر لو اور بھگوان کے لئے اسے ہلاک نہ کرنا۔ ورنہ ہم دونوں کی خیر نہیں۔"

پاروتی نے زیر لب بنگلہ زبان میں کپتان کو گالی دے کر کہا۔

"تمہاری خاطر مان لیتی ہوں۔"

کیبن کے بند دروازے سے بوڑھے عمر کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"لڑکی کو جلدی بھیجو، کپتان آ رہا ہے۔"

پاروتی جلدی سے اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے ایک نٹ بعد میں بھی کیبن سے نکلا اور صفائی وغیرہ کا کام کرنے اوپر والے ڈیک پر آ گیا۔ ں نے جزیرے کے ساحل کی طرف دیکھا۔ جہاز کے ڈاکو سمگلروں سے بھری ہوئی کشتیاں جزیرے سے چل پڑی تھیں۔ میں عرشے کے فرش کی صفائی میں لگ گیا۔ بحری ڈاکوؤں کی پہلی کھیپ جہاز پر آ گئی۔ ان میں کپتان البرٹو بھی تھا۔ اس کے بعد کشتیاں اپس جزیرے کی طرف چلی گئیں۔ اب ان پر کھانے پینے کا سامان پھل، پانی سے بھرے ہوئے کنستر اور تیل کے ڈرم لاد کر جہاز میں لائے جانے لگے۔ دوپہر تک مال جہاز پر آتا رہا۔ اس کے بعد جہاز کے عملے میں کھانا تقسیم کیا گیا۔ میں بھی اپنی تھالی لے کر یک کی ریلنگ کے پاس بیٹھ گیا۔ شام سے ذرا پہلے جہاز کا لنگر اٹھایا جانے لگا۔ مجھے ایک سلح پہرے دار نیچے میرے کیبن میں لے آیا۔ اب باہر سے کیبن کا دروازہ بند نہیں لیا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جہاز کے پرانے انجن گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ سٹارٹ و گئے اور جہاز آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتا سمندر میں رواں ہو گیا۔

تھائی لینڈ کے بوڑھے مسلمان ملاح عمر سے جہاز کے ڈیک پر ملاقات ہو جاتی تھی۔ بھی کبھی وہ خود میرے کیبن میں آ جاتا تھا۔ اب میں کھانا دوسرے ملاحوں کے ساتھ چن میں بیٹھ کر ہی کھاتا تھا۔ ملاحوں میں زیادہ تر لوگ فلپائن اور تھائی لینڈ کے تھے۔ یک دو ملاحوں کی بیویاں بھی ساتھ تھیں۔ جنہیں وہ کچھ وقت کے لئے اپنے ساتھ کھتے۔ پھر انہیں واپس بھجوا دیتے کیونکہ کپتان البرٹو کا حکم تھا کہ کوئی سیلر اپنی بیوی یا وئی دوسری عورت اپنے پاس زیادہ دن نہیں رکھ سکتا۔

ایک دن آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں - تیز ہوا چلنے لگی۔ بارش بھی شروع ہو ئی۔ دیکھتے دیکھتے سمندر میں طوفان آ گیا۔ جہاز سمندری موجوں پر کھلونے کی طرح

ادھر سے ادھر اچھلنے لگا۔ سمندر کی موجیں عرشے پر شور مچاتی ہوئی آتیں اور جو چیز وہاں پر ہوتی اسے ساتھ بہا کر لے جاتیں۔ میں نے پہلی بار سمندر کا طوفان دیکھا تھا۔ ہم لوگ نیچے ڈیک میں چلے گئے تھے۔ خدا خدا کر کے طوفان تھما۔ اوپر والے ڈیک پر طوفان نے کافی توڑ پھوڑ کی ہوئی تھی۔ دوسرے ملاحوں کے ساتھ مجھے بھی کام پر لگا دیا گیا۔ رات کو بادل چھٹ گئے اور آسمان پر چاند نکل آیا۔ سمندر میں چاندنی رات کا منظر بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ چاروں طرف چاندنی ہی چاندنی تھی۔ میں دن بھر کی مشقت سے فارغ ہو چکا تھا۔ نیچے کیبن میں جانے کی بجائے میں وہیں عرشے پر ایک طرف لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب سورج نکل آیا تھا۔ کیپٹن کے حکم سے مجھے لوئر ڈیک کی صفائی پر لگا دیا گیا۔ یہاں بوڑھا عمر بھی موجود تھا۔ میں فرش پر پھاوڑا چلا رہا تھا کہ وہ میرے پاس آ کر بولا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہارا دل لگ گیا ہے بس اسی طرح دل لگا کر کام کرتے رہے تو پھر کپتان تمہیں اپنے عملے میں شامل کر لے گا اور تمہیں لوٹ مار کے مال سے حصہ بھی ملا کرے گا۔"

میں نے بوڑھے عمر سے کہا۔

"میں تو دن رات فرار کی ترکیبیں سوچتا رہتا ہوں بابا۔"

بوڑھا عمر ٹوٹے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہنسنے لگا۔

"یہ خیال دل سے نکال دو۔"

اتنا کہہ کر وہ سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔

اسی طرح ایک ہفتہ سمندر میں گزر گیا۔ آٹھویں دن جہاز ایک اور جزیرے کے ساحل سے جا لگا۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ تھا اور اس میں بھورے اور سیاہ رنگ کی پہاڑیاں ہی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ جہاز کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ مجھے بھی اس جزیرے پر اترنے کی اجازت مل گئی۔ یہاں بھی کپتان نے منشیات کے کچھ تھیلے سمگلروں کے حوالے کرنے تھے۔ یہ جزیرہ بظاہر بالکل ویران نظر آ رہا تھا۔ ساحل کے

ساتھ درختوں کے نیچے دس بارہ ڈھلانی چھتوں والے مکان بنے ہوئے تھے۔ دنیا جہان کے قیمتی سگریٹ اور مشروبات دستیاب تھے۔ ریستوران میں ہمارے جہاز کے لٹیرے ملاح بھی جا کر بیٹھ گئے اور شراب پینے لگے۔ میں بوڑھے عمر کے پاس کونے والی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

اس نے مجھے بتایا کہ پاروتی اس وقت جہاز پر چل پھر رہی ہو گی۔

"اس وقت اسے کیبن سے باہر نکلنے کی کھلی چھٹی ہے۔ مگر ایک ڈاکو اس کی نگرانی کر رہا ہو گا اگر اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ یہ کیپٹن کا حکم ہوتا ہے۔"

بوڑھے عمر نے خود ہی فرار کا موضوع چھیڑ دیا تھا۔ میں خود اس سے اس موضوع پر تفصیلی اور آخری بات کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں پاروتی کو ساتھ لے کر ہر حال میں فرار ہونا چاہتا ہوں تو پہلے تو وہ مجھے اس کے انجام سے ڈراتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ یہ ناممکن ہے۔ لیکن جب میں نے اسے کہا۔

"بابا! میں نے اور پاروتی نے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چاہے ہمیں اس کے لئے اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔ جان بچ گئی تو آزاد ہو جائیں گے۔ اگر مر گئے تو بھی اس قید سے تو نجات مل ہی جائے گی۔"

اس پر بوڑھا عمر خاموش نظروں سے میری طرف تکنے لگا۔

"کیا واقعی تم نے جہاز سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور تم اس کے لئے جان کی بازی لگانے پر بھی تیار ہو؟"

میں نے اس کا بوڑھا مگر مضبوط ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بڑی عاجزی سے کہا۔

"بابا! تم بھی مسلمان ہو۔ میں بھی مسلمان ہوں خدا کے لئے ہماری مدد کرو۔ ہمیں کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ اس قید سے جان چھوٹے اور پاروتی تو مجھے اس روز کہہ رہی تھی کہ اگر میں یہاں سے بھاگ نہ سکی تو خودکشی کر لوں گی۔"

بوڑھا عمر سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"تم اس کا ذکر اس لڑکی سے مت کرنا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو اس کی شکل تک نظر نہیں آتی میں اس سے کیسے بات کر سکتا ہوں۔"

بوڑھا بولا۔

"تھوڑے دنوں بعد اسے دن کے وقت اوپر والے ڈیک پر چلنے پھرنے کی اجازت مل جائے گی۔"

میں نے اسے بتایا کہ پاروتی کے ساتھ کپتان بڑا وحشیانہ سلوک کر رہا ہے اور وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گی۔

"میں سوچ کر بتاؤں گا۔ ابھی یہ بات اپنے تک ہی رکھنا۔"

زات ہونے سے پہلے پہلے ہمارا جہاز اس جزیرے سے بھی روانہ ہو گیا۔ اب ایک بار پھر سمندر تھا اور ہم تھے۔ مزید ایک ہفتہ سمندر میں سفر کرتے گزر گیا۔ ایک دن جبکہ آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور میں کچن میں برتن مانجھ رہا تھا بوڑھا عمر کچن میں آیا۔ ایک پیالہ صاف کرنے کے بہانے میرے پاس آکر آہستہ سے کہنے لگا۔

"آج دوپہر کے وقت جہاز ایک جزیرے میں داخل ہو گا۔ تم بیماری کا بہانہ بنا کر جہاز پر ہی رہنا۔ پاروتی تو جہاز پر ہی ہو گی۔ پھر بات کروں گا۔"

میرے دل میں امید کی کرن چمکی۔ بوڑھے عمر نے ہمارے فرار کی کوئی ترکیب سوچ لی تھی۔

دوپہر کے وقت جہاز ایک آبنائے میں داخل ہو گیا۔ دونوں جانب اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں۔ درمیان میں گہرا سمندر تھا جس میں ہمارا جہاز آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ آخر ایک جگہ ساحل کے قریب لنگر انداز ہو گیا۔ کپتان اپنے ساتھ کافی آدمیوں کو کشتیوں میں بٹھا کر جزیرے کی طرف چلا گیا۔ میں صبح سے بیماری کا بہانہ بنا کر اپنے کیبن میں ہی پڑا تھا۔ جہاز کو رکے آدھ گھنٹہ گزر گیا تھا کہ بوڑھا عمر میرے کیبن میں

ے لئے چاول اور کافی کا ڈونگا لے کر آ گیا۔ ہنس کر بولا۔

"تم بیمار تو نہیں ہو پھر بھی تمہارا حال پوچھنے آ گیا ہوں۔"

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے تھالی اور کافی کا مگ مجھے پکڑاتے ہوئے مار کر کہا۔

"تمہاری محبوبہ کو بھی ساتھ لایا ہوں مگر تمہیں صرف پانچ منٹ دے سکتا ہوں۔ سے زیادہ وہ تمہارے پاس نہیں ٹھہر سکے گی۔"

یہ کہہ کر بوڑھا عمر کیبن سے باہر نکل گیا۔ دوسرے لمحے پاروتی اندر داخل ہوئی۔ نے نیلے رنگ کی نئی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں بندے تھے اور گلے میں نے کا ہار بھی تھا۔ میں نے کہا۔

"پاروتی! کپتان تو تمہاری بڑی خدمت کر رہا ہے۔"

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ پہلے سے اترا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"تم مجھے مذاق نہ کیا کرو۔ میرا تو تمباکو کھا کھا کر برا حال ہو گیا۔ ایک عرصہ سے نے اپنے آپ کو سانپ سے نہیں ڈسوایا۔ کھانے کو بھی سانپ نہیں ملا۔ اگر اور دیر یہ حالت رہی تو میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔"

میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ بوڑھا عمر آج ہمیں یہاں سے فرار ہونے کی ترکیب بتانے والا ہے۔ اسی لئے تو میں بیماری کا بہانہ بنا کر کیبن میں ہی رہ گیا اور ملاحوں کے ساتھ جزیرے پر نہیں اترا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟"

پاروتی نے خوش ہو کر کہا۔ میں نے اسے مزید تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بوڑھے عمر کے کہنے پر ہی میں جہاز پر رہ گیا ہوں۔"

اس کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔

"بھگوان کے لئے جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب سوچو۔ نہیں ایک ایک کر کے جہاز کے سارے آدمیوں کو مار ڈالوں گی۔"

میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟ تمہیں کہا نہیں کہ اگر تم نے اس قسم کی کوئی حرکت کی تو ہم زندہ نہ رہیں گے۔"

تھوڑی دیر میں پانچ منٹ گزر گئے اور بوڑھا عمر کیبن میں آ گیا۔

"بس' اب باتیں ختم۔ چلو لڑکی میرے ساتھ واپس چلو۔"

پاروتی اٹھ کر اس کے ساتھ جانے لگی تو بوڑھے عمر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میں آ رہا ہوں۔"

پاروتی کو لے کر بوڑھا چلا گیا۔ کوئی دس منٹ بعد واپس آیا اور میرے پاس بیٹھتے ہی بولا۔

"تمہارے فرار کا یہی ایک موقع ہے۔ اگر تم نکل گئے تو نکل گئے۔ اگر جہاز والوں نے تمہیں پکڑ لیا تو پھر اپنا خاتمہ سمجھو۔"

میں نے پوچھا۔ "ہمیں کیا کرنا ہو گا۔ جلدی بتائیں۔"

بوڑھا عمر کہنے لگا۔

"اس جزیرے پر جہاز تین دن رکے گا۔ کیپٹن البرٹو اگلے جزیرے میں ہیروئین کا نیا شاک لینے گیا ہے۔ اسے آنے جانے میں دو دن لگ جائیں گے۔"

میں نے بے چین ہو کر کہا۔

"کیا ہم اسی جزیرے سے فرار ہو جائیں؟"

"پہلے میری بات تو سن لو۔" بوڑھے نے درشت لہجے میں کہا۔

"سنو! اس وقت ہمارا جہاز انڈونیشیا کے جنوب مشرق میں بحر جاوا کے آخری جزیروں میں کھڑا ہے۔ اگر تم رات کے وقت یہاں سے اتر کر شمال کی طرف چلنا شروع کر دو تو راستے میں سمندر کا چھوٹا سا ٹاپو آئے گا۔ اس کی دوسری جانب ایک اور جزیرہ ہے۔ اس جزیرے سے چھوٹے سٹیمر بانس' ربڑ اور گرم مصالحے وغیرہ لے کر انڈونیشیا کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں سے تم کسی سٹیمر میں سوار ہو جانا۔ اگر تم اس میں کامیاب

ہو گئے تو پھر تم سمجھ لینا کہ آزاد ہو گئے۔"

میری آنکھوں کے سامنے در زنداں کھل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا ہم آج رات ہی یہاں سے نکل جائیں؟"

"تم پوری طرح تیار رہو۔ باقی فرار ہونے کا سگنل میں شام کو آ کر دوں گا۔"

"پاروتی کو میں یہ سب کیسے بتاؤں گا؟"

میرے اس سوال پر بوڑھا عمر کہنے لگا۔

"اس کو میں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو تم اپنے کیبن میں ہی رہنا۔ میں شام کو آؤں گا۔"

میں شام تک اپنے کیبن میں ہی رہا۔ شام کے وقت بوڑھا عمر آ گیا۔ کہنے لگا۔

"تیاری پکڑ لو۔ تمہیں آج آدھی رات کے وقت جہاز سے فرار ہونا ہے۔"

اس خبر نے میرے جسم میں ایک نئی جان ڈال دی۔ میں نے کہا۔

"میں بالکل تیار ہوں بابا جان!"

عمر میرے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہ سب کچھ کیا ہے' اس لئے کہ تم مسلمان کے بچے ہو اور تم ان ستمگروں کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتے۔ میں تمہیں اس حالت میں یہاں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں رات کے وقت آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔"

پھر اس نے اپنی پرانی جیکٹ کی جیب میں سے پندرہ بیس نوٹ نکال کر مجھے دیئے اور کہا۔

"یہ ڈیڑھ سو امریکی ڈالر ہیں۔ ان علاقوں میں قدم قدم پر کرنسی بدل جاتی ہے مگر امریکی ڈالر ہر کوئی خوشی سے لے لیتا ہے۔ یہ تم اپنے پاس رکھو راستے میں تمہارے کام آئیں گے۔"

وہ چلا گیا۔ میرے جسم میں ایک نئی طاقت آ گئی تھی۔ مایوسی اور ناامیدی کے سارے خیالات رفوچکر ہو گئے تھے۔ وقت کا مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے

وقت گزر رہا تھا۔ آخر آدھی رات کا وقت ہو گیا اور وعدے کے مطابق بوڑھا عمر بھی پہنچ گیا۔ اس نے مجھے نیلے رنگ کی جیکٹ اور اسی رنگ کی پرانی سی پتلون پہننے کو دی اور کہا۔

"اسے جلدی سے پہن لو۔ سب کچھ تیار ہے۔"

میں نے جلدی جلدی پتلون اور جیکٹ پہنی اور بوڑھے عمر کے ساتھ کیبن سے نکل آیا۔ راہ داری سنسان پڑی تھی۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر جہاز کے اوپر والے عرشے کے پچھلے حصے کی طرف نکل آئے۔ یہاں بھی کوئی پہرے دار نظر نہ آیا۔ میں اندھیرے میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جہاز کے عقبی حصے میں آ کر مجھے نیچے جھانکنے کو کہا۔ میں نے نیچے دیکھا۔ مجھے سمندر کے پانی میں ایک چھوٹی کشتی جہاز کے پیندے کے ساتھ اوپر نیچے ہوتی نظر آئی۔ میں نے بوڑھے سے کہا۔

"پاروتی کہاں ہے؟"

اس نے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کشتی میں بیٹھی ہے۔ اب تم بھی نیچے اتر جاؤ۔"

اس نے رسی کی ایک سیڑھی نیچے پہلے ہی سے لٹکا رکھی تھی۔ اس نیک دل بوڑھے مسلمان نے مجھے گلے سے لگایا اور کہنے لگا۔

"کشتی کو جہاز کے پیچھے سے نکال کر ساحل کے مشرقی کنارے کی طرف لے جانا۔ اس طرف کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور یاد رکھنا۔ کنارے پر پہنچتے ہی بالکل سیدھ میں مشرق کی جانب ناریلوں کے درمیان چلتے جانا۔ آگے سمندر کا ٹاپو آئے گا۔ کنارے کنارے چلتے جانا۔ آگے جا کر دونوں کنارے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب سمندر آیا تو وہاں سے تمہیں سٹیمر مل جائے گا۔ یہ سٹیمر مال لے کر رات کو بھی چلتے رہتے ہیں۔ جاؤ۔ اب خدا کے حوالے۔۔۔۔"

یقین کریں اس وقت میری آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے۔ مگر وہ وقت آنسو بہانے کا نہیں عمل کرنے کا تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر رسی کی سیڑھی پر پاؤں جما کر نیچے

اترنے لگا۔ جب کشتی کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ پاروتی کشتی میں کھڑی مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں کشتی میں اتر گیا۔

اوپر دیکھا۔ اوپر مجھے بوڑھے عمر کا چہرہ نظر نہ آیا۔ کشتی میں دو چپو بھی تھے۔ میں نے پاروتی کو خاموشی سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود کشتی کو آہستہ آہستہ جہاز کے پیندے کے ساتھ ساتھ چلانے لگا۔ میں اس طرح چپو چلا رہا تھا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ میں بوڑھے عمر کی ہدایت کے مطابق کشتی کو جہاز کے مشرق کی جانب لے گیا۔ رات اندھیری تھی۔ دور ساحل پر کہیں کہیں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ساحل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے جہاز سے دور ہوتے ہی کشتی کی رفتار تیز کر دی۔ ساحل کے پاس سمندر میں پہاڑیاں ابھری ہوئی تھیں۔ میں ان پہاڑیوں میں کشتی کو نکال کر ساحل پر لے آیا۔ ساحل پر آتے ہی ہم نے کشتی کو وہیں سمندر میں چھوڑ دیا اور اپنا رخ مشرق کی جانب جو ناریل کے جھنڈ نظر آ رہے تھے اس طرف کر کے دوڑنا شروع کر دیا۔ زمین ریتلی اور سخت تھی۔ کہیں ریتلی ہو جاتی تھی تو کہیں پتھر کی طرح سخت ہو جاتی تھی۔ آخر ہم ناریل کے جھنڈوں میں داخل ہو گئے۔ اب ہم قدم قدم چل رہے تھے کیونکہ جھاڑیاں ہمارا راستہ روک رہی تھیں۔ کافی دیر تک ہم ان جھاڑیوں اور درختوں میں چلتے رہے۔ پھر ہمیں درختوں کے درمیان کچھ فاصلے پر ستاروں کی روشنی میں پانی کی چمک سی نظر آئی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"سمندر کا ٹاپو آ گیا ہے۔ ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے ہمیں جہاز کی مصیبت سے نجات ملی۔"

میں نے رک کر پیچھے اندھیرے میں دیکھا اور کہا۔

"کوئی بحری ڈاکو ہمارا پیچھا نہ کر رہا ہو۔"

پاروتی نے غصے سے کہا۔

"اب تو اگر کانا کپتان بھی آ گیا تو میں اسے زندہ نہ چھوڑوں گی۔ تم بے فکر ہو کر چلو۔"

اور ہم اندھیرے میں سمندری ٹاپو کی طرف بڑھنے لگے۔

بہت جلد ہم اس جگہ پر پہنچ گئے جہاں سمندر جنگل کے اندر آگیا ہوا تھا۔ ہم نے بوڑھے عمر کی ہدایت کے مطابق کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ یہ کنارا کچھ دور چلنے کے بعد دوسرے کنارے کے ساتھ جا کر مل گیا تھا۔ اس طرح سمندر نے یہاں ایک جھیل سی بنائی ہوئی تھی۔ اب ہمیں دوسری جانب اصل سمندر تک پہنچنا تھا۔ یہاں جنگل زیادہ گنجان نہیں تھا۔ درختوں کے درمیان خالی جگہ تھی جہاں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہم گھاس میں چل رہے تھے۔ ایک جگہ اچانک پاروتی رک گئی - میں نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

وہ ایک طرف منہ کر کے فضا میں کچھ سونگھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا۔ کہنے لگی۔

"کتنے دن ہو گئے ہیں کھانے کو اور ڈسوانے کو کوئی سانپ نہیں ملا۔ مجھے اس طرف سے سانپ کی بو آ رہی ہے۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔۔۔"

مجھے مجبوراً وہاں رکنا پڑا۔ پاروتی ایک طرف اگی ہوئی اونچی اونچی گھاس میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں سانپوں کا جوڑا لٹک رہا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں سانپوں سے بار بار اپنے جسم پر ڈسوایا۔ پھر دونوں کو کھانا شروع کر دیا۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

پاروتی ہنس کر کہنے لگی۔

"تم بھی کہتے ہو گے کس ناگن سے پالا پڑ گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اب جلدی سے چلو۔ ہمیں آگے بھی جانا ہے۔"

سانپوں سے ڈسوانے اور انہیں کھانے کے بعد پاروتی کے بدن میں نئی طاقت آگئی تھی۔ وہ تیز تیز چلنے لگی۔ ہم کافی دیر تک جنگل میں چلتے رہے۔ آخر سمندر کا ساحل آ گیا۔ یہاں ہمیں رات کے اندھیرے میں کہیں کوئی گھاٹ یا سٹیمر نظر نہیں آ رہا تھا۔ پاروتی کہنے لگی۔

"بوڑھے عمر نے یہی جگہ بتائی تھی نا؟"

میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے سمندری ساحل کے مغرب کی جانب روشنی جھلملاتی دکھائی دی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"میرا خیال ہے گھاٹ ادھر ہے۔ آؤ چل کر دیکھتے ہیں۔"

جب ہم گھاٹ پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک بڑی کشتی ساحل سے لگی کھڑی تھی۔ اس پر ایک لالٹین روشن تھی۔ کشتی پر پہلے ہی سے بہت سامان لدا ہوا تھا۔ دو آدمی اس پر بانسوں کے گٹھے لاد رہے تھے۔ اندھیرے میں ہمیں ان کی شکلیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ایک آدمی کشتی میں لالٹین کے قریب کھڑا انہیں اپنی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ہم ذرا آگے گئے تو اس آدمی نے ہماری طرف دیکھا اور اپنی زبان میں کچھ پوچھا جو ہماری سمجھ میں نہ آیا۔

میں نے ہندوستانی میں کہا۔

"ہمیں جکارتہ جانا ہے۔ ہمارے پاس امریکی ڈالر ہیں۔"

امریکی ڈالروں کا سن کر وہ آدمی کشتی سے اتر کر ہمارے پاس آگیا۔ ناٹے قد کا سانولا گول مٹول آدمی تھا۔ آنکھیں چھوٹی نتھنے چوڑے تھے۔ وہ فلپینو لگ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کتنے ڈالر ہیں تمہارے پاس؟"

میں نے کہا۔ "جتنا کرایہ لگے گا ہم دیں گے۔"

اب دوسرے دو آدمی بھی ہمارے قریب آ کر ہمیں گھور گھور کر دیکھنے لگے۔

فلپینو نے ہنس کر کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ تم جو چاہو دے دینا۔ بیٹھ جاؤ کشتی میں۔ ہم جکارتہ ہی جا رہے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ رات کے اندھیرے اور لالٹین کی دھیمی روشنی میں اس کی آنکھیں پاروتی کے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہم کشتی میں اتر گئے۔ وہ ہمارے ساتھ آیا۔ اس نے ہمیں کشتی میں بانس کے گٹھوں' بوریوں اور لکڑی کے شہتیروں کے درمیان ایک جگہ بٹھا دیا اور بولا۔

"آرام سے بیٹھو۔ کوئی پرابلم نہیں۔ ہم تمہیں کھانے کو بھی دے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "ہم جکارتہ کب پہنچیں گے؟"

اس آدمی یعنی فلپینو نے جیکٹ کی جیب سے سگار نکال کر سلگایا اور بولا۔

"تین دن میں پہنچ جائیں گے۔ کوئی پرابلم نہیں۔ ہم ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ طوفان آیا تو کشتی کنارے پر لے جائیں گے۔ ابھی تم ایسا کرو کہ دو آدمیوں کا کرایہ پچاس ڈالر دے دو اس میں تمہارے کھانے پینے کا خرچہ نہیں ہے۔ وہ جکارتہ پہنچ کر دے دینا۔"

میں نے جیب سے ڈالر نکال کر گنے اور پچاس ڈالر اس کے حوالے کر دیئے۔ فلپینو نے جو کشتی کا مالک لگتا تھا ڈالروں کی طرف اور پھر اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور پچاس ڈالر اپنی جیکٹ میں رکھ لئے۔ پھر اپنے آدمیوں کو کچھ کہا۔ خود کشتی کے دوسرے سرے پر چلا گیا اور کشتی کی موٹر سٹارٹ کرنے لگا۔ یہ ایک بہت بڑی مال بردار کشتی تھی جس میں ایک موٹر لگی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے بوڑھے عمر نے اسے سٹیمر کہا تھا۔ دو تین بار رسی کھینچنے سے انجن چل پڑا۔ اس کے ساتھ ہی کشتی بھی ساحل سے کھسکنے لگی۔ پاروتی میری قریب ہی بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔

"مجھے ان آدمیوں کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔"

میں نے کہا۔ "اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

کشتی ساحل سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ جب ساحل سے کوئی ساٹھ ستر گز دور ہٹ گئی تو اس نے اپنا رخ کھلے سمندر کی طرف کر لیا اور ایک خاص رفتار سے چلنے لگی۔

مجھے بھی ان لوگوں کی نیت پر شبہ تھا۔ ایک تو ان لوگوں نے میرے پاس کافی تعداد میں امریکی ڈالر دیکھ لئے تھے۔ دوسرے پاروتی کے کانوں میں سونے کے بندے اور گلے میں سونے کا ہار بھی ضرور دیکھ لیا ہو گا۔ یہ دونوں تحفے جہاز کے کانے کپتان نے پاروتی کو عنایت کئے تھے اور وہ انہیں بھی ساتھ ہی لے آئی تھی۔ مگر میں اس لئے مطمئن تھا کہ ان چاروں آدمیوں سے نمٹنے کے لئے اکیلی پاروتی ہی کافی تھی۔ کیونکہ جس عورت کو محض ایک کمزور سی عورت سمجھ رہے تھے انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک زہریلی ناگن ہے۔

رات کے اندھیرے میں جزیرے کا ساحل دور ہوتے ہی سیاہ لکیر کی طرح نظر آنے لگا۔ پھر یہ سیاہ لکیر بھی غائب ہو گئی اور کشتی کھلے سمندر میں آ گئی۔ کشتی کی شکل ایسی تھی کہ یہ تقریباً پچاس گز لمبا اور پندرہ بیس گز چوڑا ایک پلیٹ فارم سا تھا جس کے ایک سرے پر چھوٹا سا انجن لگا تھا اور دوسرے سرے پر جھونپڑی نما چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ اس کیبن کے باہر بانس کے ساتھ جلتی ہوئی لالٹین لٹک رہی تھی۔ کیبن کے اندر کشتی کا مالک فلپینو دو آدمیوں کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ برانڈی بھی پی رہے تھے۔ کسی وقت ان میں سے کسی کے قہقہے کی آواز آ جاتی تھی۔ ایک آدمی کشتی کے دونوں پہلوؤں پر چل پھر کر سامان اور بندھے ہوئے گٹھوں کی چیکنگ وغیرہ میں لگا ہوا تھا۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ سمندر کی لہریں پرسکون تھیں اور مرطوب سمندری ہوا چل رہی تھی۔ میں اور پاروتی سامان کے درمیان جس رخ پر بیٹھے تھے وہاں سے ہمیں کشتی کا کیبن اور کھلا سمندر نظر آتا تھا۔ انجن بالکل

اس طرح چل رہا تھا جس طرح موٹر سائیکل کی موٹر چلتی ہے۔ سامان کی دیکھ بھال کرنے والا ملاح کبھی کبھی موٹر کو بھی آ کر دیکھ جاتا تھا۔ یہ موٹر ڈیزل سے چلتی تھی۔ کشتی کے کنارے اونچے تھے اور سمندر کا پانی نیچے نظر آتا تھا۔

پاروتی کہنے لگی۔

"جکارتہ پہنچ کر تم کہاں جاؤ گے؟"

میں بھی تمہارے ساتھ کلکتے ہی جاؤں گا۔ وہاں سے ہم کسی سمندری جہاز میں سوار ہو کر کلکتے پہنچ جائیں گے۔"

پاروتی آخر کلکتے کی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اس نے ایک ایسی بات کی طرف اشارہ کیا جس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا اور جو بہت اہم تھی۔ کہنے لگی۔

"ہمارے پاس کوئی پاسپورٹ ویزا نہیں ہے جکارتہ کی پولیس تو ہمیں پکڑ لے گی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی اس نے ٹھیک کہا تھا۔ جکارتہ ایک آزاد ملک تھا۔ ایک دوسرا ملک تھا۔ انڈیا میں تو ہمیں پاسپورٹ وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ ابھی پاکستان بھی نہیں بنا تھا۔ ہم کشمیر سے لے کر راس کماری تک جہاں چاہے بغیر پاسپورٹ ویزے کے آ جا سکتے تھے۔ لیکن جکارتہ پہنچ کر تو ہمیں ان چیزوں کی اشد ضرورت تھی۔ اس کے بغیر تو ہم جکارتہ کے ساحل پر پہنچتے ہی گرفتار ہو سکتے ہیں۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ پولیس ہمیں پکڑ سکتی ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ کوئی جکارتہ کی بندرگاہ پر تھوڑی جائیں گے۔ یہ تو بندرگاہ سے کسی جنگل کے کنارے گھاٹ پر کھڑے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی غیر قانونی طور پر مال ادھر سے ادھر لے جاتے ہوں۔ اس طرح ہمیں جکارتہ کے ساحل پر اترنے کا موقع مل جائے گا۔ جب میں نے یہ بات پاروتی کو بتائی تو وہ بولی۔

"ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ ایک بار جکارتہ پہنچ گئے تو پھر وہاں سے انڈیا بھی کسی نہ کسی طرح پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے پاروتی کہ ہمیں ان بحری لٹیروں سے چھٹکارا ملا۔ اگر بوڑھا عمر ہماری مدد نہ کرتا تو یقین کرو ان بحری ڈاکوؤں کی قید سے نکلنا بہت مشکل تھا۔"

پاروتی بولی - "وہ تمہارا مسلمان بھائی تھا۔ وہ تمہارے کام آ گیا۔"

میں نے کہا۔ "وہ بڑا اچھا انسان تھا۔ میں تو اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے پاروتی سے یونہی مذاق میں پوچھا۔

"تم نے کانے کپتان کو کیسے کہا تھا کہ تم تمباکو کھانا چاہتی ہو؟"

پاروتی مجھے اندھیرے میں ہنستی ہوئی نظر آئی۔ بولی۔

"وہ تو بالکل اجڈ آدمی تھا۔ وہ خود بھی کبھی تمباکو چبایا کرتا تھا۔ کہنے لگا۔ تم تمباکو کھاؤ گی یا چباؤ گی۔ میں نے کہا۔ میں دونوں کام کرتی ہوں۔ وہ منہ پھاڑ کر ہنسنے لگا۔ پھر اس نے مجھے ایک بکس میں سے ایک سگار نکال کر دیا جسے میں نے توڑ کر سارا تمباکو منہ میں ڈال لیا اور اسے چبانے لگی۔ اس گدھے کو کیا معلوم تھا کہ میں یہ سب کچھ اس کی جان بچانے کے لئے کر رہی ہوں۔ میں نے ایک سگار کا تمباکو تو اسی وقت کھا لیا۔ دوسرے سگار کا تمباکو منہ میں ڈال کر چباتی رہی۔ بس اسی طرح ہر رات ایک سگار کھا لیتی اور ایک سگار چباتی رہتی اور کانے بحری ڈاکو کی جان بچ گئی۔"

میں اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا کہ اس کی زندگی بھی کیا زندگی بن گئی ہے۔ کہاں وہ کلکتے کے اسکول میں پڑھا کرتی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ مستقبل میں سکول ٹیچر بنے گی۔ اس کے ماں باپ اس سے کتنا پیار کرتے ہوں گے۔ اور کہاں اب اس کی یہ حالت ہے کہ اب تک ہزاروں سانپ کھا چکی ہے۔ ہزاروں سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسوا چکی ہے۔ اس کے بدن کے ذرے ذرے میں اتنا زہر پیدا ہو چکا ہے کہ اگر کسی کو ذرا سا ناخن چبھو دے کسی بچے کا منہ چوم لے تو وہ اس کے زہر سے مر جائے گا۔

پاروتی بھی شاید اس وقت یہی کچھ سوچ رہی تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد

ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگی۔

"میں بھی کتنی ابھاگن ہوں۔ اگر کلکتے پہنچ بھی گئی تو کیا منہ لے کر اپنے ماتا پتا کے پاس جاؤں گی۔ وہ تو مجھے پہچان بھی نہیں سکیں گے۔ جب میں اپنے ماتا پتا سے جدا ہوئی تھی اور سنتھالی سپیرے مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے تو میرا رنگ اتنا کالا نہیں تھا جتنا اب ہے میں سانولی ہوتی تھی۔ میرے بال بڑے لمبے ہوتے تھے۔ اب تو میرے بال بھی سانپوں کے زہر کی گرمی سے جھڑ جھڑ کر چھوٹے ہو گئے ہیں۔ میرے ماتا پتا جی تو مجھے دیکھ کر بہت روئیں گے....."

اور پھر رات کے اندھیرے میں مجھے پاروتی کی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ میں بھی اداس ہو گیا۔ واقعی اس لڑکی کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی تھی۔ انسان دوسرے انسان پر جتنا ظلم کرتا ہے۔ شاید اتنا ظلم ایک جانور بھی دوسرے جانور پر نہیں کرتا۔ میں یونہی پاروتی کو جھوٹی تسلیاں دینے لگا۔

"جی ہلکا نہ کرو پاروتی! ایک بار تم اپنے گھر پہنچ گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ لوگ تمہارا علاج کرائیں گے۔ تمہاری کھوئی ہوئی صحت اور رنگ روپ واپس آ جائے گا۔ تم دوبارہ اسکول میں داخل ہو کر پڑھائی شروع کر دینا۔ ابھی تمہاری عمر ہی کتنی ہے۔"

پاروتی ٹھنڈا سانس بھر کر چپ ہو گئی۔

کشتی سمندر میں معمول کی رفتار کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ سمندری موجوں کی ہلکی ہلکی آواز پیدا ہو رہی تھی جس کو کشتی کے دوسرے سرے پر لگی ہوئی موٹر کے شور نے کافی حد تک دبا دیا تھا۔ میری نظریں جھونپڑی نما کیبن کی طرف اٹھ گئیں۔ کیبن میں خاموشی چھائی تھی۔ پہلے فلپنو اور اس کے ساتھیوں میں سے کسی کے قہقہے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اب وہ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے فضا میں خطرے کی بو محسوس کی۔ لیکن پھر سوچا کہ ایسی خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔ ان لوگوں کو ہم پر حملہ کر کے کیا مل جائے گا۔ یہی چند ڈالر اور سونے

ایک معمولی سا ہار اور بندے ---- مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ محض چند پیسوں ، لئے اجنبی مسافروں کا خون کر دیا کرتے ہیں۔ آخر وہی ہو کر رہا جس کا مجھے ڈر لگا ا تھا۔ کشتی سمندر میں بھی چلی جا رہی تھی۔ آسمان پر صبح کے نور کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ند لمحوں کے بعد صبح کاذب کی پہلی روشنی میں ہمیں کشتی میں لدا ہوا سامان اور سمندر ا نیلی موجیں صاف دکھائی دینے لگیں۔ میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔ وہ لکڑی کے تیروں کے ساتھ ٹیک لگائے ایک طرف کو جھکی سو رہی تھی۔

کیبن میں سے دو آدمی نکل کر ہماری طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک فلپنو تھا ر دوسرا اس کا ساتھی تھا۔ ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستولوں نے ساری بات ضح کر دی۔ جب یہ لوگ ہمارے قریب آئے تو اس وقت باقی دو ملاح بھی کیبن میں ے نکل کر ہماری طرف بڑھنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ یہ لوگ ہمارے یب آ کر رک گئے۔ فلپنو گردن ٹیڑھی کئے مکار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا ۔ میں نے ہندوستانی زبان میں اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بھائی؟ کیا کچھ پیسے چاہئیں؟"

فلپنو نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ چاروں قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔ اتنی دیر ں پاروتی بھی جاگ پڑی۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

میں نے اسے خاموش رہنے کو کہا اور فلپنو سے دوبارہ پوچھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ پینو کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ کرخت آواز میں بولا۔

"ابھی بتاتا ہوں میں کیا چاہتا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے آگے بڑھ کر پاروتی کو بازو سے پکڑا اور کھینچ کر اپنے اتھ لگا کر پستول اس کی کنپٹی پر رکھ کر بولا۔

"تمہارے پاس جو کچھ ہے نکال کر رکھ دو۔"

میں نے اپنی جیکٹ کی جیب میں سے سارے ڈالر نکال کر رکھ دیئے۔ فلپنو نے

اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ڈالر اٹھائے اور میری جیبوں کی تلاشی لی۔ پھر مجھے نائیلون کی رسی سے شہتیروں کے ساتھ باندھ دیا۔ اس دوران میں پاروتی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ فلپینو کے جسم کے کسی بھی حصے میں ناخن چبھو کر اسے ہلاک کرے۔ کیونکہ اس طرح باقی تینوں آدمی اس کو کسی صورت میں بھی زندہ نہ چھوڑتے اور اسے فوراً گولی مار دیتے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے بھی گولی سے اڑا دیتے۔ اس کے لئے ہمیں کسی حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ شاید یہ بات پاروتی بھی سمجھ گئی تھی۔ اس نے کوئی مدافعت یا اپنی طرف سے حملہ نہ کیا۔

مجھے باندھنے کے بعد وہ لوگ پاروتی کو کھینچتے ہوئے کشتی کے کیبن میں لے گئے۔ کیبن کی لکڑی کی دیواریں تھیں اور میری طرف کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ آدمیوں کے قہقہوں اور اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز ضرور آ رہی تھی۔ مجھے ایک ہی فکر لگا تھا کہ دشمن چار ہیں۔ پاروتی انہیں کس طرح ہلاک کرے گی۔ مگر پاروتی اس قسم کے مردوں کی جنسی کیفیات سے پوری طرح باخبر ہو چکی تھی۔ اس نے وہی کام کیا جو اسے ایسے نازک حالات میں کرنا چاہئے تھا۔ کیبن میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ صرف کشتی کے انجن اور سمندری لہروں کی آواز آ رہی تھی۔ کیبن پر کوئی دو تین منٹ تک ایک سکوت سا طاری رہا۔ پھر کسی کے قہقہے کی آواز آئی۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ کوئی دس منٹ کے بعد دن کی روشنی میں پاروتی ساڑھی سنبھالتی ہوئی کیبن میں سے نکلی۔

میری جان میں جان آئی۔

میرے پاس آ کر اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے بولی۔

"سب کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ جا کر دیکھ لو۔"

میں نے کہا۔ "پہلے میری رسی تو کھولو۔"

پاروتی نے مسکراتے ہوئے میری رسی کھول دی اور میں جلدی سے کیبن کے اندر چلا گیا۔ کیبن کے اندر کا نقشہ یہ تھا کہ چاروں غنڈے مر چکے تھے اور فرش پر

ادھر ادھر الٹے سیدھے پڑے تھے۔ ان سب کے منہ سے سبز رنگ کی جھاگ نکل رہی تھی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ جس آدمی نے میرے ڈالر اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالے تھے اس کی جیب میں سے ڈالر نکال کر اپنے قبضے میں کئے۔ پھر پاروتی کے پاس آ گیا۔

"پاروتی! تم نے بڑی عقل مندی سے کام لیا۔ مجھے تو یہی فکر تھی کہ تم ان چاروں کو کس طرح مارو گی۔"

پاروتی لکڑی کے بڑے شہتیر پر بیٹھی اپنے کانوں میں سونے کے بندے ڈال رہی تھی۔ اس کے گلے میں سونے کا ہار بھی موجود تھا۔ وہ یہ ساری چیزیں بھی واپس لے آئی تھی۔ کہنے لگی۔

"بس کچھ نہ پوچھو۔ دو آدمیوں کی گردن کو چوما دو آدمیوں کے جسم میں چپکے سے ناخن چبھو دیئے۔ اس کے بعد بھلا وہ کیسے زندہ رہ سکتے تھے۔"

پھر وہ جلدی سے شہتیروں پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور جس طرف سمندر میں کشتی جا رہی تھی اس طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"اب ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ کہیں ہم سمندر میں بھٹک نہ جائیں۔"

یہ پریشانی مجھے بھی تھی لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ کشتی میں ہماری جانیں محفوظ ہیں۔ میں نے کہا۔

"جس رخ پر ان لوگوں نے کشتی کو ڈال رکھا ہے ہم اسی رخ پر کشتی کو چلاتے جائیں گے پہلے ان بدمعاشوں کی لاشیں تو ٹھکانے لگائیں۔"

ہم کیبن میں آ گئے۔ چاروں بدمعاشوں کی لاشوں کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور سمندر میں پھینک دیا۔ کیبن کے اندر ایک وہیل لگا تھا جس سے کشتی کے رخ کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ کچھ گھسے پٹے پرانے گیئر بھی لگے ہوئے تھے جو میری سمجھ سے باہر تھے۔ وہیل کو لوہے کی تار سے باندھا ہوا تھا۔ جس سے وہیل حرکت نہیں کر رہا تھا اور کشتی ایک ہی رخ پر بہے چلی جا رہی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"یہ بالکل موٹر کار کی طرح ہے۔ ابھی تو اس کا ڈرائیونگ وہیل ان لوگوں نے باندھا ہوا ہے جب دیکھیں گے کہ کشتی کا رخ ادھر ادھر ہو رہا ہے تو وہیل کی سمت درست کر لیں گے۔ ہمیں سورج سے کشتی کے رخ کو قائم رکھنا ہو گا اس وقت سورج ہمارے پیچھے ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم شمال مغرب کی طرف جا رہے ہیں اور ہمیں کشتی کو اسی طرف لے جانا چاہئے۔"

پاروتی کیبن کی پہلو والی کھڑکی میں سے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"سمندر کی لہریں کچھ زیادہ اوپر نیچے ہونے لگی ہیں۔"

یہ میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ کشتی نے سمندر کی موجوں پر زیادہ ہچکولے کھانے شروع کر دیئے ہیں۔ اب جو میں نے کیبن سے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھا تو دور سے کالی سیاہ گھٹائیں امڈی چلی آ رہی تھیں۔ ان گھٹاؤں میں کسی وقت بجلی بھی لہرا جاتی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"لگتا ہے سمندر میں طوفان آنے والا ہے۔"

"ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کہیں یہ کشتی الٹ نہ جائے۔"

میں نے دور بادلوں پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اتنا خطرناک طوفان نہیں لگتا۔ بہرحال ہمیں کیبن میں جا کر بیٹھ جانا چاہئے۔"

اتنی دیر میں ہوا تیز ہو گئی تھی۔ سمندر کی موجیں کشتی کو زیادہ اوپر نیچے کرنے لگی تھیں۔ کیبن میں آ کر ہم نے ٹوٹا ہوا دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائیونگ وہیل کھولنے لگا تو پاروتی نے مجھے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ سیاہ گھٹائیں اب ہمارے اوپر پہنچ گئی تھیں۔ بادل گرجنے لگے۔ بجلی کڑکنے لگی اور پھر بارش شروع ہو گئی۔ یہ سمندر کی بارش تھی۔ طوفانی بارش تھی۔ کشتی ہچکولے کھانے لگی۔ ہواؤں کا شور بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ سمندر کا پانی کیبن کے دروازے سے ٹکرانے لگا۔ پاروتی سہم کر کونے میں بیٹھ گئی۔

سمندر میں طوفان آیا ہوا تھا۔

طوفانی ہوائیں چیخ رہی تھیں۔ زبردست بارش ہو رہی تھی۔ کشتی کو سمندر کی بپھری ہوئی موجیں ادھر سے ادھر اچھالتی ہوئی لئے جا رہی تھیں۔ ایک بڑی موج کشتی کے اوپر آ گئی اور ایک طرف کے سارے بانس اور شہتیر سمندر میں گر گئے۔ موٹر کا انجن بند ہو چکا تھا۔ میں نے وہیل کی رسی کھول لی تھی اور اسے اناڑیوں کی طرح یونہی ادھر سے ادھر گھمائے جا رہا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید اسی طرح کشتی الٹنے سے بچ جائے۔ کشتی ابھی تک اس لئے نہیں الٹی تھی کہ یہ ایک پلیٹ فارم کی طرح تھی جو تختوں کو جوڑ کر بنا دیا گیا تھا۔ پاروتی ڈر کر کیبن میں ایک طرف کو بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ کہا مگر مجھے طوفان کے شور میں کچھ سمجھ نہ آیا۔ پانی اور بارش کی بوچھاڑیں کیبن کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ یاخدا ہمیں اس طوفان سے بچا لے۔ طوفان تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں خود بھی دل میں خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اگر کشتی الٹ گئی تو ہمارا زندہ بچنا محال ہے۔ اس قدر بپھری ہوئی سمندری موجوں میں بڑے سے بڑا تیراک بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

سمندر پر بارش نے دھند کی چادر سی پھیلا دی تھی۔ کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہم شمال کو جا رہے ہیں یا جنوب کو جا رہے ہیں۔ ایک طرف سے سمندر کی بڑی موج نے کشتی کو اچھالا تو پاروتی چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہیل میرے ہاتھ سے چھوٹ

گیا۔ میں گر پڑا۔ بڑی مشکل سے کیبن میں ٹھکی ہوئی ایک ہک کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے آپ کو سنبھالا - پاروتی نے چیخ کر کہا۔

"میں مرنا نہیں چاہتی۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔"

اور پھر وہ زور زور سے رونے لگی۔ زندگی کتنی پیاری چیز ہے۔ موت کو سامنے دیکھ کر زندگی زیادہ پیاری لگنے لگتی ہے۔ میں نے چلا کر پاروتی سے کہا۔

"روؤ نہیں۔ اپنے بھگوان سے تم بھی دعا کرو"

کیبن کبھی ایک طرف سے اونچا ہو جاتا اور کبھی ایسے نیچے چلا جاتا جیسے اب اوپر نہیں اٹھے گا۔ کیبن کی وجہ سے ہم سمندر کی طوفانی موجوں سے بچے ہوئے تھے۔ ورنہ موجیں کب کی بہا کر لے گئی ہوتیں۔ نہ جانے اس حالت میں کتنا وقت گزر گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ طوفان کی شدت میں کمی آنے لگی ہے۔

میں نے اٹھ کر وہیل کو پکڑ لیا اور کیبن کے شیشے میں سے سمندر کو دیکھا۔ سمندر کے ہیجان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ چٹان ایسی موجیں ہیبت ناک انداز میں اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ کشتی بھی ان کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ مگر بارش رک گئی تھی اور ہوا کی تیزی بھی کم ہو گئی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"خدا نے ہماری دعا قبول کر لی ہے پاروتی طوفان تھم رہا ہے۔"

پاروتی گھٹنوں میں سر دیئے کونے میں بیٹھی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بارش کے رکتے ہی دھند چھٹ گئی تھی اور سمندر نظر آنے لگا تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی وہاں تک سمندر ہی سمندر تھا جس میں بڑی بڑی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ کشتی کا انجن خاموش ہو چکا تھا۔ کشتی کے پیچھے لگا ہوا وہ تختہ بھی شاید ٹوٹ چکا تھا جس کو وہیل کنٹرول کرتا تھا اور اس کی وجہ سے کشتی کا رخ بدلا جاتا تھا۔ کیونکہ وہیل میں وہ سختی نہیں رہی تھی اور آسانی سے دائیں بائیں گھوم جاتا تھا۔

ہماری کشتی اللہ کے بھروسے سمندر میں کسی نامعلوم منزل کی طرف چلی جا رہی تھی۔ یہی بہت بڑی غنیمت تھی کہ کشتی طوفان میں غرق نہیں ہوئی تھی اور ہماری

جانیں بچ گئی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا طوفان کم ہوتا گیا۔ آخر طوفان آگے نکل گیا اور سمندر کسی حد تک پرسکون ہونے لگا۔ پاروتی سر پکڑ کر بیٹھی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔

"فکر نہ کرو پاروتی! طوفان نکل گیا ہے۔ ہم بہت جلد کسی نہ کسی جزیرے پر پہنچ جائیں گے۔"

پاروتی نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اسے چکر آگیا اور وہ دوبارہ جلدی سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ سمندر اگر پرسکون بھی ہو تو بڑے سے بڑا جہاز بھی تھوڑا بہت ضرور ڈولتا ہے اور اس کے ڈولنے سے آدمی کی طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔ اس کو سی سیک نیس یعنی سمندری علالت کہتے ہیں۔ مگر بعض لوگوں کی سمندری سفر میں طبیعت بالکل ٹھیک رہتی ہے۔ یہ میں نے سن رکھا تھا۔ میری بھی طبیعت بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ پاروتی کو ضرور چکر آ رہے تھے۔ میری نظریں کیبن کے شیشے میں سے سمندر کو دور تک دیکھ رہی تھیں۔ مگر سامنے کی جانب جس طرف کشتی بہتی چلی جا رہی تھی کسی جزیرے کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کشتی پر فلپینو جو مال لاد کر لے جا رہا تھا وہ سارے کا سارا سمندر میں بہہ چکا تھا۔ کشتی ایک ویران پلیٹ فارم کی طرح بالکل خالی ہو گئی تھی۔ میں نے کیبن کے دروازے کی چٹخنی کھولی اور باہر نکل آیا۔ کشتی اب اتنی زیادہ نہیں ڈول رہی تھی۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ کسی طرف بھی زمین کی سیاہ لکیر نظر نہ آئی۔ میں جلدی سے کیبن میں آ کر پاروتی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کہا۔

"پاروتی! کشتی خدا کے بھروسے چلی جا رہی ہے۔ کہیں زمین نظر نہیں آئی۔"

پاروتی نے کسی حد تک اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"بھگوان نے ہمیں بچا لیا۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا۔ میں کچھ دیر شکستہ کیبن میں پاروتی

کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران سمندر کا ہیجان تقریباً ختم ہو گیا تھا اور کشتی معمول کے مطابق صرف اوپر نیچے ہوتی ہی جا رہی تھی۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ سکیڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ کہیں زمین کے آثار نہیں تھے۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ طوفان نے ہمیں اس وسیع و عریض سمندر میں لا کر ڈال دیا ہے جو براعظم ایشیا اور براعظم امریکہ کے درمیان پھیلا ہوا ہے؟ اس خیال ہی سے میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اگر ایسی بات تھی تو پھر ہمارا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ یہ سمندر ہمیں بہت جلدی بھوکا پیاسا مار دے گا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ سمندر کا پانی اس قدر کڑوا ہوتا ہے کہ آپ ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتے۔ کشتی میں جو تھوڑا بہت راشن پانی رکھا ہوا تھا وہ سارے کا سارا سمندر کی نذر ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی بھوک اور پیاس برداشت ہو سکتی تھی۔

مجھے پاروتی کی آواز آئی - میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کیبن کے دروازے میں کواڑ کے سہارے کھڑی تھی۔ میں جلدی سے اس کے پاس آ گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے پاروتی؟"

اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔"

"ٹھیک ہوں۔"

پھر وہ سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہم کہاں آ گئے ہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کچھ معلوم نہیں۔ اب تو کشتی جہاں لے جائے لے جائے۔"

سمندری طوفان سے ہماری جان تو بچ گئی تھی مگر اب ہمیں ایک ایسی موت کا سامنا تھا جس نے آہستہ آہستہ ہمیں بھوک پیاس سے نڈھال کر کے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر مارنا تھا۔ یہ بڑی خوف کی موت تھی۔ میں نے ایسے کئی واقعات رسالوں میں پڑھے تھے کہ جہاز ڈوب گیا۔ کچھ آدمی کشتی میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر سمندر کا

اذیت ناک سفر شروع ہو گیا۔ بھوک پیاس نے انہیں نڈھال کر دیا۔ سورج کی تپش نے ان کے جسموں کو خشک کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کو بھوکی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ جب کوئی مر جاتا تو باقی اس کی لاش کو نوچ کر کھا جاتے۔ میری روح اس تصور ہی سے کانپ اٹھی۔ خدا نہ کرے کہ وہ وقت ہم پر آئے کہ ہمیں ایک دوسرے کی لاشوں کو کھانا پڑے۔ دن گزر گیا۔ رات آ گئی۔ بھوک تو مجھ سے برداشت ہو رہی تھی مگر پیاس نے میری زبان کو لکڑی کی طرح سخت کر دیا تھا۔ پاروتی بھی ایک طرف نڈھال ہو کر پڑی تھی۔ آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ میں بارش کی دعا مانگنے لگا۔ بارش کا پانی پی کر ہم زندہ رہ سکتے تھے۔

آدھی رات کے وقت بارش ہونے لگی۔ پاروتی اور میں دونوں آسمان کی طرف منہ کھول کر بیٹھ گئے۔ ہم نے بالکل اسی طرح اپنے منہ کھول رکھے تھے جس طرح چڑیا کے بچے اپنی ماں کو دانہ لاتے دیکھ کر گھونسلے میں منہ کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔

بارش کا پانی ہمارے حلق میں اتر رہا تھا اور ہماری جان میں جان پڑ رہی تھی۔

بارش کے پانی میں اگرچہ وہ طاقت نہیں ہوتی جو زمین کے پانی میں ہوتی ہے لیکن اس وقت بارش کا پانی ہمارے لئے آب حیات تھا۔ جی بھر کر پانی پی لینے سے ہمارے اندر طاقت سی آ گئی۔ ہم وہیں کیبن میں آ کر لیٹ گئے۔ خدا جانے کب ہمیں نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو کیبن کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ پاروتی سو رہی تھی۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ دھوپ سمندر پر چمک رہی تھی۔ سمندر کی لہریں پرسکون تھیں۔ میں نے ایک طرف نگاہ ڈالی تو مجھے ایک سیاہ لکیر مشرق سے مغرب کی طرف پھیلی ہوئی نظر آئی۔

یہ یقیناً زمین کے آثار تھے۔ کشتی اس طرف جا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے پاروتی کو جگا کر سیاہ لکیر دکھائی۔ اس کے چہرے پر بھی رونق آ گئی۔ ہم وہیں بیٹھ گئے اور سیاہ لکیر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ آہستہ آہستہ سیاہ لکیر سمٹنے لگی - سمٹتے سمٹتے سیاہ لکیر ایک دھبہ سا بن کر ابھرنے لگی۔ سمندر میں درختوں کی کچھ جھاڑیاں بھی تیرتی

نظر آئیں۔ میں نے خوش ہو کر پاروتی سے کہا۔

"یہ ضرور جاوا سماٹرا کا کوئی جزیرہ ہو گا۔"

اتنے میں دور سے دو تین کچے ناریل سمندر میں لہروں پر تیرتے دیکھے۔ جب وہ کشتی کے قریب آئے تو ہم نے انہیں اٹھا لیا۔ انہیں توڑ کر ان کا میٹھا پانی پیا اور گودا کھا کر اپنی بھوک اور پیاس مٹائی۔ دور سے نظر سیاہ دھبہ اب اونچی اونچی پہاڑیوں کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد سمندر کی لہروں نے ہماری کشتی کو زمین کے ساحل پر چڑھا دیا۔

ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور کشتی سے اتر کر وہیں پانی میں ریت پر بیٹھ گئے۔ پھر اٹھے اور پانی میں چلتے ساحل کی خشک ریت پر آ کر دونوں جانب نگاہ دوڑائی۔ یہ کسی جزیرے کا ساحل معلوم ہوتا تھا۔ ریتلا ساحل دور ناریل کے درختوں تک چلا گیا تھا۔ ہم درختوں کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔

پاروتی کہنے لگی۔

"کیسے پتہ چلے گا کہ یہ کونسا جزیرہ ہے یہاں تو کوئی آبادی نظر نہیں آتی۔"

جزیرے کا وہ ساحل جہاں ہم بیٹھے تھے غیر آباد تھا۔ نہ کہیں کوئی جھونپڑی تھی نہ کسی جگہ کوئی کشتی کھڑی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"ساحل کے ساتھ ساتھ چل کر دیکھتے ہیں شاید جزیرے کی دوسری طرف لوگ رہتے ہوں۔"

ہم ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جزیرہ بڑا پراسرار تھا۔ ساحل پر ناریل اور تاڑ کے درخت قطار در قطار لگے تھے۔ جزیرے کے اندر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور ٹیلے تھے جن پر جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ بہت جلد ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ جزیرہ بڑا چھوٹا ہے اور سمندر میں گھرا ہوا ہے۔ اور سب سے زیادہ پریشان کر دینے والی بات یہ تھی کہ اس جزیرے پر کوئی آبادی نہیں تھی۔ کہیں کسی جنگلی قبیلے والوں کے بھی جھونپڑے نہیں تھے۔ ہم نے سارا جزیرہ گھوم کر دیکھ لیا۔ جزیرے کے اندر بھی کافی

درخت تھے۔ ان میں جنگلی کیلے کے درخت تھے۔ ہم نے کیلے توڑ کر کھائے اور بھوک مٹائی۔ پاروتی کہنے لگی۔

"میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں جنگل میں سانپ تلاش کرتی ہوں۔ یہاں سانپ ضرور ہوں گے۔"

میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ درختوں کی طرف جا چکی تھی اور اونچی اونچی جھاڑیوں نے اسے چھپا لیا تھا۔ میں ناریل کے درخت کے نیچے گرے پڑے ناریل میں سے ایک ناریل کو اٹھا کر توڑنے لگا۔ اسے توڑ کر وہیں بیٹھ گیا اور اس کا پانی پینے لگا۔

ناریل کا پانی اس قدر میٹھا اور عجیب سی پاکیزہ خوشبو والا تھا کہ میں خدا کی قدرت پر حیران رہ گیا۔ اللہ میاں نے انسان کو کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں زمین پر صرف ایک ہی انسان باقی رہ گیا ہوں اور یہ زمین کے درخت کا پہلا ناریل ہے۔ تھوڑی دیر بعد پاروتی جھاڑیوں میں سے نکل کر آتی نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بھورے رنگ کا سانپ تھا جس کو اس نے گردن سے پکڑ رکھا تھا۔ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"بڑی مشکل سے یہ سانپ ملا ہے۔ اس سے میں نے دو مرتبہ ڈسوایا ہے۔ اب اسے کھا جاؤں گی۔"

میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ پاروتی ہنسنے لگی۔

"کبھی تو مجھے سانپ کھاتے دیکھ لیا کرو۔"

میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم یہ مکروہ عادت ترک کر دو۔ یہ شائستہ انسانوں کا کام نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "کلکتے جا کر شاید یہ عادت چھوڑ دوں وہاں میں دوبارہ اسکول میں داخل ہو جاؤں گی بس ایک بار میں کلکتے پہنچ جاؤں۔"

ہم وہاں سے اٹھ کر ساحل سمندر پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہاں سے اگر نکلیں گے تو آگے کس طرف جائیں گے؟"

ہماری بڑی کشتی ابھی تک دور سمندر کے ساحل پر ایک طرف آدھی پانی میں اور آدھی ریت میں کھڑی تھی۔ پاروتی کہنے لگی۔

"اس کشتی کو ہمیں کسی چیز سے باندھ دینا چاہئے۔ اگر سمندری موجیں اسے کھینچ کر لے گئیں تو ہم اس جزیرے میں پھنس جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اس کی کیا ضرورت ہے۔ اتنی بڑی کشتی ہے۔ سمندر بھی پرسکون ہے۔ کشتی کہاں چلی جائے گی۔"

ہمیں اس بات کی بالکل خبر نہیں تھی کہ سمندر کی لہریں جو کشتی تک آ کر بار بار واپس چلی جاتی ہیں انہوں نے کشتی کو آہستہ آہستہ اپنی طرف کھسکانا شروع کر دیا ہے۔ اس وقت آسمان پر ایک طرف سے بادل آنے لگے تھے۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"چلو جزیرے کی دوسری طرف چل کر دیکھتے ہیں شاید وہاں لوگ رہتے ہوں جن کی جھونپڑیوں پر ہماری نظر نہ پڑی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ جزیرے کے دوسرے ساحل کا ایک بار پھر جائزہ لیتے ہیں۔"

جنگلی کیلے اور ناریل کھانے کے بعد ہمارے جسموں کی طاقت واپس آ چکی تھی۔ ہم اٹھ کر جزیرے کے دوسرے ساحل کی طرف چلنے لگے۔ ہم جزیرے کے اندر سے ہو کر جانے کی بجائے ساحل کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اب ہم بڑے غور سے جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان دیکھتے جا رہے تھے۔ یہ جزیرے کا مشرقی رخ تھا۔ بادل اس طرف سے اڑ اڑ کر آ رہے تھے۔ اچانک تیز ہوا چلنے لگی۔ جزیرے کے اندر کی جانب درختوں کے نیچے ایک جھونپڑے کی چھت پر نظر پڑی۔ میں نے پاروتی کو وہ چھت دکھاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے وہاں ضرور کوئی رہتا ہے۔ چلو چل کر معلوم کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں ضرور بتا دیں گے کہ یہ جزیرہ کس سمندر میں واقع ہے اور یہاں سے جاوا سماٹرا کا

ملک کس سمت کو ہے۔"

پاروتی نے کہا۔

"تم آگے آگے چلو۔ میں کچھ فاصلہ ڈال کر تمہارے پیچھے آتی ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ تم پر حملہ کر دیں۔ اس صورت میں میں تمہیں بچا سکوں گی۔"

میں آگے آگے اور پاروتی کوئی سات آٹھ قدموں کا فاصلہ ڈال کر میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ میں جھونپڑے سے کوئی پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر ایک درخت کے پیچھے ہو گیا اور غور سے جھونپڑے کی طرف دیکھنے لگا۔ جھونپڑا ویران لگتا تھا۔ میں نے نیچے سے ایک پتھر اٹھا کر جھونپڑے کے کھلے دروازے کے آگے پھینکا اس خیال سے کہ اگر کوئی جھونپڑے کے اندر ہو گا تو باہر ضرور نکلے گا۔ مگر کوئی باہر نہ نکلا۔ اس دوران پاروتی بھی میرے قریب پہنچ گئی تھی۔ سرگوشی میں بولی۔

"کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "لگتا ہے جھونپڑے میں کوئی رہتا ہے۔ میں نے پتھر پھینکا تھا۔ کوئی باہر نہیں نکلا۔"

پاروتی بولی۔ "تم یہاں ٹھہرو میں جا کر پتہ کرتی ہوں۔"

میں وہیں درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا رہا۔ پاروتی درخت کے پیچھے سے نکلی اور آہستہ آہستہ جھاڑیوں کو پیچھے ہٹاتی جھونپڑے کی طرف چلنے لگی۔ میں سانس روکے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پاروتی جھونپڑے کے پاس آ کر ایک طرف ہو گئی۔ پھر اس نے زمین پر سے درخت کی ٹوٹی ہوئی ٹہنی اٹھا کر جھونپڑے کے دروازے میں پھینکی۔ اندر سے کوئی نہ نکلا۔ پاروتی آڑ چھوڑ کر جھونپڑی کے سامنے آ گئی۔ اس نے جھک کر جھونپڑے میں نظر ڈالی۔ پھر میری طرف رخ کر کے بولی۔

"آ جاؤ۔ جھونپڑے میں کوئی نہیں ہے۔"

میں دوڑ کر اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے بھی جھونپڑے کو اچھی طرح سے دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ زمین پر خشک پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"اس جھونپڑے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہاں کوئی آدمی ضرور رہتا ہے۔ ہمیں ایک طرف چھپ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی آ جائے۔"

پاروتی نے جھونپڑے کے آگے جو خالی جگہ تھی اس پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ یہ جھونپڑا مدتوں سے خالی پڑا ہے۔ اگر یہاں کوئی آدمی رہ رہا ہوتا تو یہاں آگ جلانے کے کوئی نہ کوئی آثار ضرور ملتے۔ مگر یہ جگہ تو بالکل صاف ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے یہ کوئی جنگلی آدمی ہو اور جانوروں پرندوں کے گوشت کو شکار کے بعد کچا ہی کھا جاتا ہو۔"

پاروتی نے کہا۔ "تو پھر تو یہ کوئی آدم خور قسم کا جنگلی آدمی ہو گا۔ میں نے اپنی سکول کی کتاب میں پڑھا تھا کہ جزیروں میں جنگلی لوگ زندہ انسانوں کو پکڑ کر کھا جاتے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"جاوا ساٹرا کے علاقوں میں ایسے آدم خور جنگلی نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ تو افریقہ کے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔"

ہم جھونپڑے کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ اس دوران ہوا نے آندھی کی شکل اختیار کر لی۔ درختوں کے اوپر کے حصے جھولنے لگے۔ ہم پر ان درختوں کے پتے اور خشک ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ پاروتی بولی۔

"طوفان پھر آ رہا ہے۔ چلو واپس کسی جگہ چھپ کر جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔"

ہم وہاں سے واپس چل پڑے۔ درختوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے ہوا کی شدت کا ہمیں زیادہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ جزیرہ کوئی اتنا وسیع بھی نہیں تھا۔ جیسے ہی ہم درختوں سے نکل کر ساحل پر کھلے سمندر کے سامنے آئے تو ہمیں پتہ چلا کہ ہوا آندھی کی طرح چل رہی ہے۔ اتنے میں بارش بھی شروع ہو گئی۔ سمندر کی موجیں دور سے

ابھر ابھر کر ساحل کی طرف آ رہی تھیں۔ مجھے اچانک اپنی کشتی کا خیال آگیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"کہیں ہماری کشتی سمندر میں تو نہیں بہہ گئی؟"

پاروتی بھی فکر مند ہو گئی۔ ہم اٹھ کر درختوں کے ساتھ ساتھ سمندر کی اس جانب دوڑنے لگے جدھر ہماری کشتی ساحل کی ریت پر کھڑی تھی۔ جب ہم اس مقام پر پہنچے تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ہماری بڑی کشتی ساحل سے کھسک کر سمندر میں داخل ہو گئی تھی اور سمندر کی موجیں تیز ہواؤں میں اسے ایک طرف بہائے لئے جا رہی تھیں۔

پاروتی اور میں بے بسی کے عالم میں کشتی کو اپنے سے دور ہوتے دیکھتے رہ گئے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ سمندر کی ایک موج اسے ساحل کی طرف لاتی تھی اور دوسری موجیں واپس جاتے ہوئے کشتی کو ساحل سے مزید دور لے جاتی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے کشتی ہماری آنکھوں سے دور ہو گئی اور پھر دور ہی ہوتی چلی گئی۔ بارش کی بوچھاڑیں ہم پر پڑ رہی تھیں۔ ہوا نے شور مچایا ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر دوڑتے ہوئے جزیرے کے اندر آ کر ایک ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ ہمارے اوپر گھنے درختوں کی چھتریاں تنی ہوئی تھیں۔ یہاں بارش کے پانی سے ہم محفوظ تھے۔ پاروتی کہنے لگی۔

"ہماری کشتی تو سمندر میں بہہ گئی۔ اب کیا کریں گے۔ کہیں ہم جزیرے میں قید تو نہیں ہو گئے؟"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جزیرے میں کھانے کو پھل اور پینے کو ناریل کا پانی بہت ہے۔ تمہارے واسطے سانپ بھی کہیں نہ کہیں سے مل جایا کریں گے۔ کچھ وقت یہاں رہنا ہی پڑے گا پھر یہاں سے جانے کی ترکیب بھی سوچ لیں گے۔"

کوئی ایک گھنٹے بعد طوفان تھم گیا۔

ہم اٹھ کر ساحل پر آ گئے۔ طوفان باد و باراں کی وجہ
ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک ہم سمندر کے کنارے پھرتے رہے۔ ا
دوسری طرف آ گئے۔ یہاں سرمئی اور سبز رنگ کی نوکیلی چٹا
دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے پاروتی سے کہا کہ اس جزیرے
موجود رہنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ یہاں کوئی نہ کوئی آدمی
کسی دوسرے جزیرے سے لوگ یہاں آئے تھے اور پھر واپس
خاموش چل رہی تھی - صاف لگ رہا تھا کہ ایک سانپ سے
نہیں بنا۔ اسے مزید سانپوں سے ڈسوانے کی ضرورت تھی۔ میں
واقف ہو چکا تھا۔ چلتے چلتے اس نے سمندر کی چٹانوں کی طرف
ہوئے کہا۔

"اس طرف سے بہت سے سانپوں کی بو آ رہی ہے۔ تم
ہوں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے چل پڑا۔ پاروتی چلتے
میں بھی رک گیا۔ پھر اس نے جھاڑیوں کو ہٹایا تو وہاں ایک
کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر سفید تاج تھا۔ پاروتی نے
آہستہ سے کہا۔

"اپنی جگہ سے مت ہلنا۔"

اس کے بعد

"گنگا کے پجاری ناگ"

کا دوسرا حصہ پڑھیں

2

گنگا کے پُجاری ناگ

اے۔ حمید



میں پاروتی کے پہلو میں ایک قدم پیچھے ہو کر کھڑا تھا۔

سانپ بھی اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلا تھا۔ پاروتی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ جوڑ کر سانپ کو نمسکار کیا اور اس کے آگے جھک گئی۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ یہ ہندو توہم پرست عورت تو اپنی پوجا پاٹھ میں لگ گئی ہے اگر سانپ نے اچھل کر مجھ پر حملہ کر دیا تو میں اپنا بچاؤ نہیں کر سکوں گا۔ پاروتی کسی منتر کا جاپ کرنے لگی۔ منتر پڑھ کر وہ اپنے اوپر پھونک مارتی اور پھر منتر پڑھنے لگتی۔ سانپ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھا رہا۔ پاروتی ہاتھ جوڑے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی پیچھے ہٹنے لگا۔ ہم جھاڑیوں سے باہر نکلے تو پاروتی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

"ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ شو دیوتا کے اندر ناگ کے درشن ہو گئے۔ یہ اندر ناگ ہے جس کو یہ سانپ درشن دیتا ہے اس کے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تو اپنے اندر ناگ سے کہو کہ ہماری جو کشتی سمندری طوفان میں بہہ گئی ہے وہ واپس لا دے۔"

پاروتی بولی۔ "ہو سکتا ہے کشتی شام تک واپس آ جائے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

بار چہارم 2000ء

ناشر محمد علی قریشی نے نیر اسد پریس لاہور سے چھپوا کر مکتبہ القریش لاہور سے شائع کی۔

قیمت =/200 روپے

مکمل سیٹ =/400 روپے

"اس قسم کے جاہلانہ عقیدوں کی وجہ سے تم اس حال تک پہنچی ہو۔ اگر تمہارے ماتا پتا سنتھالی سپیروں کو اپنے گھر میں گھسنے ہی نہ دیتے تو آج تمہاری یہ حالت نہ ہوتی۔ مگر وہ بھی دوسرے ہندوؤں کی طرح دیوی دیوتاؤں کو اپنا بھگوان مانتے تھے۔ انہوں نے سنتھالی سپیروں کی دیوتاؤں کی طرح آؤ بھگت کی اور وہ بدمعاش سپیرے تمہیں اغوا کر کے لے گئے۔"

پاروتی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ کہنے لگی۔

"کبھی کبھی مجھے یہ دیوی دیوتا سب جھوٹ لگتا ہے لیکن میں ان عقیدوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ یہ میرے خون میں شامل ہو چکے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "خدا تمہیں سیدھا راستہ دکھائے۔ اب یہ بتاؤ کہ شام ہو رہی ہے۔ رات کہاں گزارنی ہے؟ مجھے خطرہ ہے کہ رات کو یہاں کوئی درندہ وغیرہ نہ کہیں سے نکل آئے۔"

پاروتی نے اردگرد کے درختوں کو دیکھا۔

"ہم ان درختوں پر بھی رات کو بسیرا کر سکتے ہیں۔ مگر یہ بڑے اونچے درخت ہیں۔ ان پر چڑھنا آسان نہیں۔"

میں نے کہا۔ "اور پھر ساحل پر جو چٹانیں ہیں وہاں چل کر دیکھتے ہیں۔ شاید وہاں کوئی ایسا ٹھکانہ مل جائے جہاں رات بسر کی جاسکے۔"

پاروتی بولی۔ "لیکن میرے لئے دو تین سانپوں سے ڈسوانا بڑا ضروری ہے۔"

میں نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جو سانپ تھا اس سے ڈسوا لیتی۔ اس سے کیوں نہیں ڈسوایا؟"

پاروتی نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

"یہ اندر ناگ شو دیوتا کا خاص سانپ - اس نے بھی میرے جسم کی بو پالی تھی۔ اسے بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں آدھی سے زیادہ ناگن بن چکی ہوں۔ وہ مجھے کبھی نہ ڈستا۔"

ہم اسی طرح باتیں کرتے ساحل پر سمندر میں دور تک پھیلی ہوئی چٹانوں میں آ گئے۔ سمندر کا پانی ان چٹانوں کے اندر تک چلا گیا تھا۔ ہم پانی میں چلتے ان چٹانوں میں رات بسر کرنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ پاروتی دوڑ کر ایک طرف گئی۔ اس نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا اور جب باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک دھاری دار سانپ پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس کی کلائی اور بازو پر بار بار ڈس رہا تھا۔ پاروتی بڑے آرام سے کھڑی سانپ سے ڈسوا رہی تھی۔ میں چند قدم کے فاصلے پر کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔

جب سانپ میں مزید ڈسنے کی طاقت نہ رہی تو پاروتی نے اس کا سر منہ میں ڈال کر کھانا شروع کر دیا۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ یہ مکروہ منظر میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کام سے فارغ وہ کر وہ میرے پاس آئی تو بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ سمندر کا سانپ تھا۔ سمندر کے سانپ کا زہر ٹھنڈا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "پاروتی! میرا کہا مانو اور تم سانپ کھانے چھوڑ کر مچھلیاں کھانا شروع کر دو۔"

وہ سر جھٹک کر بولی۔

"کہاں مچھلی کہاں سانپ - کہاں راج بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔۔۔۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ عورت اب لاعلاج ہو چکی ہے۔ تھوڑی دیر چٹانوں میں چلنے پھرنے کے بعد ہم نے ایک چٹان میں رات بسر کرنے کی جگہ تلاش کر لی۔ یہ ایک کھوہ تھی جو سمندری موجوں نے بنا دیا ہوا تھا۔ میں تھک گیا تھا۔ کھوہ میں چٹان کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پاروتی کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا - میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔"

اور وہ چلی گئی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے زرد کیلوں کا گچھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں دو کچے ناریل تھے۔ میں کیلے

اور ناریل کھاتے کھاتے تنگ آگیا تھا مگر وہاں اس کے سوا کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ مچھلیاں سمندر میں دور دور تک تھیں اور اگر کوئی مچھلی ہم پکڑ بھی لیتے تو اس کو روسٹ کرنے کے لئے آگ کہاں سے جلاتے۔ میرے پاس ماچس بھی نہیں تھی۔

دن کی روشنی کم ہونے لگی تھی۔ ابر آلود آسمان کی وجہ سے سورج غروب ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم کچھ دیر چٹان کے اندر بیٹھے جزیرے سے فرار کی ترکیبیں سوچتے رہے۔ ہمارے سامنے ایک ہی ترکیب تھی کہ کسی طریقے سے گرے پڑے دو چار درختوں کی شاخوں کو کاٹ کر انہیں آپس میں باندھ دیا جائے اور سمندر میں ڈال کر اس پر بیٹھ جائیں اس میں خطرہ بھی تھا۔ درختوں کی شاخیں سمندری موجوں کے تھپیڑوں سے الگ الگ بھی ہو سکتی تھیں۔ اس کے سوا دوسرا کوئی طریقہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

ابھی شام بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہمیں پوری رات اس چٹان میں گزارنی تھی۔ پاروتی کہنے لگی۔

"چلو چل کر جزیرے میں پھرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے جھونپڑے میں کوئی آدمی آگیا ہو۔ اگر اس کی کشتی سمندر میں نظر آگئی تو ہم اسے لے کر فرار ہو جائیں گے۔"

یہ ناقابل یقین باتیں تھیں۔ پھر بھی میں وقت گزارنے کے لئے پاروتی کے ساتھ چٹانوں سے نکل کر جزیرے میں داخل ہو گیا۔ جزیرے میں دھندلا دھندلا اندھیرا اترنے لگا تھا۔ چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ دس پندرہ منٹ تک ہم جزیرے کے اندر سیدھ میں چلتے رہے۔ اس کے بعد جزیرے کا مشرقی ساحل آگیا۔ ہم سخت بور ہو گئے تھے۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"اس سے تو یہی بہتر تھا کہ چٹان میں ہی بیٹھے رہتے۔ یہاں کوئی نہیں آتا۔ جھونپڑی بھی خالی پڑی تھی۔"

پاروتی سمندر میں مشرق کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے ہاتھ کے اشارے سے دور سمندر میں مجھے کچھ دکھاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کوئی جزیرے کی طرف آ رہا ہے۔"

میں نے سمندر پر نگاہ دوڑائی۔ دور ایک کشتی جزیرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"پاروتی! کچھ لوگ کشتی میں بیٹھے اس طرف آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ جنگلی لوگ ہوں۔ جلدی سے کسی جگہ چھپ جاتے ہیں۔ اگر یہ کشتی یہاں چھوڑ کر دوسری طرف گئے تو ہم ان کی کشتی لے کر بھاگ جائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ اس درخت پر چڑھ جاتے ہیں۔"

ساحل کے ساتھ ساتھ ناریل کے درختوں کی جو قطار دور تک چلی گئی تھی اس میں ایک چھوٹے قد کا گھنا درخت بھی تھا۔ اس کی شاخیں بڑی گھنی تھیں۔ ہم جلدی جلدی درخت پر چڑھ کر شاخوں میں اس طرح چھپ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں سمندر کا ساحل صاف نظر آ رہا تھا۔ کشتی آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ ہم دونوں درخت کی ٹہنیوں میں چھپے بڑے غور سے کشتی کو قریب آتے دیکھ رہے تھے۔ جب کشتی مزید قریب آگئی تو اس میں بیٹھے ہوئے آدمی نظر آنے لگے۔ یہ تین آدمی تھے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ ساحل پر آ کر وہ کشتی سے اتر گئے۔ اب ہم نے دیکھا کہ عورت دبلی پتلی لڑکی تھی۔ آدمیوں کے جسم تقریباً عریاں تھے۔ کمر کے ساتھ کیلے کے پتوں کی جھالریں سی باندھ رکھی تھیں۔ جسم پر مختلف رنگ کی لکیریں پڑی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کے کندھے سے تیر کمان لٹک رہا تھا اور ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں۔ لڑکی نے لمبا سا کرتہ پہنا ہوا تھا جو اس کے گھٹنوں تک چلا گیا تھا۔ انہوں نے لڑکی کے دونوں ہاتھ رسی سے باندھے ہوئے تھے۔ لڑکی ان سے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے ساحل پر لا رہے تھے۔ پاروتی نے آہستہ سے کہا۔

"ہے بھگوان! یہ جنگلی لوگ تو لڑکی پر ظلم کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "اپنے بھگوان کے لئے خاموش رہو۔"

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ کشتی چرانے کا امکان کہاں تک ہے۔ انہوں نے کشتی کو ریت پر کھینچ لیا تھا اور وہ کشتی سے زیادہ دور نہیں تھے۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یہ لوگ لڑکی کو لے کر جزیرے کے اندر چلے جائیں تاکہ ہمیں کشتی میں بیٹھ کر فرار ہونے کا موقع مل جائے۔ مگر وہ لوگ کچھ اور پروگرام بنا کر جزیرے پر لڑکی کو لائے تھے۔ انہوں نے کشتی سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر لڑکی کے بازو کھول دیئے اور اسے زبردستی پکڑ کر ریت پر لٹا دیا۔

ایک آدمی نے تھیلے میں سے لکڑی کی میخیں نکال لیں۔ انہوں نے لڑکی کے چاروں طرف لکڑی کی میخیں ریت میں گاڑ دیں۔ پھر لڑکی کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں ان میخوں کے ساتھ باندھ دیئے۔ اب لڑکی بالکل جکڑی ہوئی زمین پر پڑی تھی۔ وہ ہاتھ پیر بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ صرف گردن ادھر ادھر ہلاتے ہوئے رو رہی تھی اور اپنی زبان میں بار بار کچھ کہہ رہی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"یہ لوگ کیا کرنے لگے ہیں؟"

پاروتی نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔

"میرا خیال ہے یہ لڑکی کو قتل کر کے کھا جائیں گے۔"

دو آدمی لڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔ ایک آدمی کلہاڑی لے کر درختوں کی طرف چل پڑا۔ وہ ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں نے پاروتی کے کان میں کہا۔

"بالکل نہ بولنا۔۔۔"

ہم دونوں سانس روک کر شاخوں میں ساکت ہو گئے۔

جنگلی آدمی ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر درختوں کے نیچے گری پڑی لکڑیاں اٹھانے لگا۔ وہ خشک گھاس بھی کاٹ رہا تھا۔ تین چار پھیرے لگا کر وہ ڈھیر ساری لکڑیاں اور خشک گھاس پھوس لے گیا۔ ان جنگلی آدمیوں نے مل کر لکڑیاں اور گھاس پھوس زمین پر جکڑی ہوئی لڑکی کے چاروں طرف ڈھیریاں سی بنا کر ڈال دیا۔ ایک ڈھیری لڑکی کے سر کے بالکل قریب پیچھے کی جانب لگا دی گئی۔

لڑکی اونچی آواز میں رونے اور اپنی زبان میں بار بار ایک ہی جملہ دہرانے لگی۔

میں نے پاروتی سے کہا۔

"یہ لوگ لڑکی کو زندہ جلا رہے ہیں۔ ھمیں اس کو بچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔"

پاروتی نے کہا۔ "ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ تین آدمی ہیں۔ ان کے پاس زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک جنگلی کو مار لوں گی۔ اس کے بعد ہماری موت یقینی ہے۔"

پاروتی نے درست کہا تھا۔ اس قسم کی حرکت ہم دونوں کو لڑکی سمیت موت کے منہ میں لے جا سکتی تھی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ان جانگلی آدمیوں نے گھاس پھونس اور درختوں کی شاخوں کی ڈھیریوں کو آگ لگا دی اور لڑکی کے گرد اچھل اچھل کر چیخ چیخ کر چکر لگانے لگے۔ وہاں دھواں اٹھنے لگا۔ تینوں جانگلی لڑکی کو اردگرد جلتی ہوئی آگ کے حوالے کر کے کشتی کی طرف دوڑ کر گئے۔ کشتی کو کھینچ کر سمندر میں ڈالا - اس میں بیٹھے اور تیزی سے چپو چلاتے دور ہونے لگے۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ لڑکی کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ اگرچہ آگ براہ راست اس کے اوپر نہیں لگی تھی لیکن آگ اس کے چاروں طرف تھی اور آہستہ آہستہ آگ کے شعلے اس کی طرف بڑھ رہے تھے اور دھوئیں سے بھی اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"جب تک جنگلی سمندر میں نظر آ رہے ہیں تم درخت پر ہی رہنا۔ میں لڑکی کو بچانے جاتا ہوں۔"

میں نے درخت سے نیچے چھلانگ لگا دی اور زمین کے ساتھ لگ کر جھک۔ جھک کر کچھ دوڑ کر کچھ رینگ کر جتنی جلدی پہنچ سکتا تھا لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے ایک طرف سے آگ پر ریت ڈال کر اسے بجھانا شروع کر دیا۔ لڑکی کے سر کی طرف سے بس نے آگ بجھا دی۔ لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ چیخ چیخ کر

مجھے اپنی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ میں نے جلتی ہوئی گھاس اور لکڑیوں کو پرے ہٹا دیا۔ اور جلدی جلدی لڑکی کے ہاتھ پیر کھول دیئے اور اسے لیٹے لیٹے بازوؤں سے پکڑ کر ریت پر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

لڑکی اٹھنے لگی تو میں نے اسے پکڑ کر وہیں لٹا دیا اور اپنی زبان میں کہا۔

"لیٹی رہو۔ اٹھو نہیں۔"

لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ میرے کھینچ کر نیچے بٹھانے سے ہی ریت پر میرے ساتھ پڑی رہی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ ہمارے اور سمندر کے درمیان آگ اور دھوئیں کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی جس نے ہمیں سمندر میں واپس جاتے جنگلی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ میں نے اس دیوار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور اسے کھینچتا اور اپنے ساتھ دوڑاتا ہوا درختوں میں لے آیا۔

اس دوران پاروتی بھی درخت سے نیچے اتر چکی تھی۔ ہم نے لڑکی کو وہیں جھاڑیوں کے پاس بٹھا دیا۔ لڑکی کا رنگ گہرا سانولا ناک انڈونیشیا کے علاقے والے لوگوں کی طرح ذرا چپٹا تھا۔ وہ حیران ہو کر کبھی مجھے اور کبھی پاروتی کو دیکھتی۔ میں نے لڑکی سے ہندوستانی میں پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔ یہ کون تھے؟"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ پاروتی نے بھی اس سے دو تین بار یہی سوال کئے۔ مگر لڑکی یا تو ہماری زبان نہیں سمجھ رہی تھی یا ابھی صدمے کے اثر سے باہر نہیں ہوئی تھی۔

سمندر پر جانگلیوں کی کشتی اب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ہم لڑکی کو لے کر ساحل پر کھلی فضا میں لے آئے۔ جہاں اسے لٹا کر آگ لگائی گئی تھی وہاں آگ ابھی تک لگی ہوئی تھی اور دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔ جب لڑکی کے ہوش و حواس ذرا بحال ہوئے تو اس نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں کہا۔

"میں مچھوا۔ یہ دشمن۔ میں بابا ملنا۔ دور۔۔۔ میرا گھر۔۔۔"

کافی دیر بعد اس کی ٹوٹی پھوٹی باتوں کو جوڑ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ اپنے ماں باپ کے پاس ساتھ والے کسی قریبی جزیرے میں رہتی ہے۔ یہ لوگ دشمن قبیلے کے آدمی تھے۔ اسے ہلاک کرنے کے لئے یہاں لے آئے تھے۔ اس کی باتوں سے یہ معلوم کر کے ہمیں بڑا حوصلہ بھی ہوا کہ کوئی دوسرا جزیرہ جہاں آبادی بھی ہے وہاں سے قریب ہی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ لڑکی کو جو اپنا نام مچھوا بتا رہی تھی اس کے جزیرے تک کس طرح پہنچایا جائے اور خود بھی وہاں کس طرح پہنچا جائے۔

رات ہم نے چٹان کی کھوہ میں گزاری۔ دوسرے دن ہم اس جگہ پر آ گئے جہاں رات کو لڑکی کو جانگلی آدمیوں نے زندہ جلانے کے لئے لٹایا تھا۔ وہاں جلی بجھی راکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لڑکی نے چیخ چیخ کر کچھ کہا۔ وہ سمندر کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اشارہ کرتے ہی وہ درختوں کی طرف بھاگ گئی۔ ہم نے سمندر کی جانب دیکھا۔ دور سمندر میں ایک کشتی ساحل کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"میرا خیال ہے اس لڑکی کے دشمن قبیلے کے لوگ ہوں گے۔ اسی لئے یہ لڑکی ان کو دیکھ کر بھاگ گئی ہے۔"

"تو پھر ہمیں بھی درختوں میں جا کر چھپ جانا چاہئے۔ ہم اس بار انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

یہ کہہ کر پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑا اور درختوں کی طرف بھاگی۔ ہم ناریل کے جھنڈوں میں آئے تو جانگلی لڑکی وہیں جھاڑیوں میں چھپی سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ یہ کون لوگ آ رہے ہیں؟ لڑکی نے ہمیں بڑی مشکل سے سمجھایا کہ یہ دشمن قبیلے کے لوگ ہیں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیاں اور کھوپڑی لینے آئے ہیں۔ ہم لڑکی کو وہاں سے دور لے گئے اور اسے جھاڑیوں کے پیچھے بٹھا کر اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی زبان میں سمجھایا کہ وہ وہیں رہے اور کسی حالت میں بھی ساحل سے سمندر کی طرف نہ آئے۔ میں اور پاروتی ساحل والے درختوں کی اوٹ میں بیٹھ

گئے اور کشتی کو سمندر کی طرف آتے دیکھنے لگے۔ کشتی اب قریب آ گئی تھی۔ اس میں صرف آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے ساحل پر آتے ہی کشتی سے چھلانگیں لگا دیں اور کشتی کو ریت پر کھینچنے کے بعد اس مقام پر آ کر غور سے نیچے ریت کو دیکھنے اور پاؤں سے جلی ہوئی شاخوں اور گھاس پھوس کی راکھ کو ادھر ادھر ہٹانے لگے۔ پھر وہ تعجب سے ادھر ادھر دیکھنے اور ایک دوسرے سے تیز تیز آواز میں باتیں کرنے لگے۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہیں راکھ میں لڑکی کی ہڈیاں اور کھوپڑی نہیں ملی جس پر وہ حیران اور جھنجلائے ہوئے ہیں۔

اچانک ایک آدمی نے زمین پر پاروتی اور لڑکی کے پاؤں کے نشان دیکھ کر چیخ ماری کلہاڑی والے ہاتھ کو بلند کیا اور وہ نشان اپنے ساتھی کو بھی دکھانے لگا۔ دونوں جھک کر نشان کو دیکھنے اور پاؤں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے والے درختوں کی طرف آنے لگے۔ کیوں کہ پاؤں کے نشان انہیں ہماری طرف ہی لا رہے تھے۔ پاروتی نے مجھے کندھے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں ایک کو سنبھال لوں گی۔ تم موقع دیکھ کر دوسرے کو پکڑ لینا۔"

اس سے پہلے کہ میں سمجھ سکوں کہ اس نے یہ کس قسم کا فیصلہ کیا ہے وہ دوڑ کر درختوں سے نکل کر ان جانگلی آدمیوں کے سامنے آ گئی۔ میں حیرت زدہ ہو کر درخت کی اوٹ میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں جانگلی وہیں سیدھے ہو کر پاروتی کو غور سے دیکھنے لگے۔ پاروتی نے لپک کر ایک آدمی کا بازو تھاما اور اسے دوسری طرف لے گئی۔ وہ جانگلی زور سے ہنس پڑا۔ اس نے اپنی زبان میں اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور پاروتی کو وہیں ریت پر گرا لیا۔ شاید پاروتی یہی چاہتی تھی۔ دوسرا آدمی وہیں کھڑا ان دونوں کو تکتا رہا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔

پاروتی جنگلی آدمی کے ساتھ زمین پر گرتے ہی اپنا کام کر چکی تھی۔ کیونکہ جانگلی زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پاروتی نے اٹھ کر دوسرے آدمی کو بھی اشارے سے

اپنی طرف بلایا۔ دوسرا آدمی ڈرتا ڈرتا جھکا جھکا کلہاڑی ہاتھ میں لئے پاروتی کی طرف بڑھا۔ پاروتی نے بلند آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"باہر مت نکلنا۔ میں اسے بھی نرگ میں پہنچا رہی ہوں۔"

جیسے ہی دوسرا جانگلی پاروتی کے قریب آیا پاروتی نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے جیسے اسے اپنے قریب آنے کی دعوت دے رہی ہو۔ جانگلی نے جھک کر اپنے ساتھی کو دیکھا جس پر پاروتی کے ناخنوں کا قاتل زہر اپنا کام کر چکا تھا۔ جیسے ہی وہ جھکا پاروتی اس سے لپٹ گئی اور اس کی گردن میں انگلیوں کے سارے ناخن چبھو دیئے۔ دس انگلیوں کے ناخنوں کا زہر ایک دم سے جانگلی کے خون میں شامل ہوا تو اس پر سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے کلہاڑی گر پڑی۔ پاروتی نے جلدی سے کلہاڑی اٹھائی اور چار پانچ قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں جنگلی ختم ہو چکے تھے۔ پاروتی دوڑ کر میرے پاس آ گئی۔ ہم جنگلی لڑکی کے پاس گئے۔ اسے بتایا کہ اس کے دونوں دشمن ختم کر دیئے گئے ہیں۔ جب اسے دونوں کی لاشیں ریت پر پڑی ہوئی دکھائیں تو جنگلی لڑکی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ یہ خوشی کی چیخ تھی۔ وہ ہمیں سمجھانے لگی کہ کشتی ہمارے پاس موجود ہے۔ میرے ماں باپ کے جزیرے پر چلو۔ میں تمہیں وہاں لئے چلتی ہوں۔ ہم کشتی میں سوار ہو گئے۔ جنگلی لڑکی اور میں نے چپو سنبھال لئے اور کشتی سمندر میں اس جزیرے کی طرف چل پڑی جس جزیرے پر جنگلی لڑکی کے ماں باپ رہتے تھے۔

هم جنگلی لڑکی کے جزیرے پر پہنچ گئے۔

لڑکی ہمیں اس جگہ لے گئی جہاں ایک پہاڑی کے دامن میں جنگلی لوگوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ لڑکی کے ماں باپ نے لڑکی کو دیکھا تو دوڑتے ہوئے آئے اور اسے گلے لگا لیا۔ دوسرے جانگلی بھی ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے۔ لڑکی نے اپنی زبان میں ماں باپ کو ہمارے بارے میں بتایا۔ انہوں نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ ہمیں مچھلی اور پھل کھانے کو دیئے۔ ایک دن اور ایک رات ہم نے ان لوگوں کے پاس گزارے۔ مشکل یہ پیش آئی کہ وہ ہماری زبان بالکل نہیں سمجھتے تھے۔

پاروتی نے بہت کوشش کر کے صرف اتنا معلوم کیا کہ یہ جزیرہ انڈونیشیا کے طویل ترین جزیرے ساٹرا اور ملایا کے درمیانی سمندر یعنی خلیج ملاکا کے درمیان کا کوئی ویران جزیرہ ہے۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان کے جنوب میں کافی نیچے آ گئے ہوئے ہیں اور اب ہمیں سب سے پہلے اس زمانے کے ملایا اور آج کے ملائشیا کی بندرگاہ کوالالم پور جانا ہو گا اور وہاں سے ہندوستان تک کا سمندری سفر طے کرنا ہو گا۔

جب یہ ساری صورت حال پاروتی کو بتائی تو وہ کچھ پریشان ضرور ہوئی لیکن کہنے لگی۔

"کم از کم جاپانیوں اور بحری ڈاکوؤں سے تو نجات ملی۔ اب ہم تعلیم یافتہ شہروں میں سفر کر کے انڈیا پہنچیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہمارے پاس ان شہروں میں داخل ہونے کے لئے پاسپورٹ ویزا نہ

ہوا تو ہمیں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا جائے گا۔"

پاروتی نے بڑی عقل مندوں والی بات کی۔ کہنے لگی۔

"ان سارے ملکوں پر جاپانیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ جنگ ختم ہو گئی ہے۔ جاپانی بھاگ گئے ہیں۔ یہاں پھر سے انگریزوں کی حکومت بن گئی ہے کسی نے پوچھا تو ہم کہہ دیں گے کہ ہم جنگ میں جاپانیوں کی قید میں تھے۔ ہمارے پاس پاسپورٹ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔"

میں بہت حد تک اس معاملے میں مطمئن ہو گیا۔ اب سوال اس جزیرے سے نکلنے اور ملایا کی بندرگاہ کوالالم پور پہنچنے کا تھا۔ جنگلی لوگوں نے ہمارے لئے ایک کشتی تیار کر دی جس میں چھ سات روز کا کھانے پینے کا سامان رکھ دیا۔ وہ اپنی زبان میں اور اشاروں سے ہمیں سمجھاتے رہے کہ ہمیں سمندر میں کس طرف سفر کرنا ہو گا اور کتنے دن کے بعد ہم ملایا کے ساحل پر پہنچیں گے۔ میں سخت بیزار تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"تم ہی ان کی جنگلی زبان سمجھو۔ میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔"

پاروتی میں ایک بات میں نے دیکھی تھی کہ وہ سخت مایوسی کی حالت میں بھی پرامید ضرور رہتی تھی۔ شاید اس لئے کہ اس کا مزاج ہی ایسا ہو یا شاید یہ سانپوں کے زہر کا اثر ہو۔ کہنے لگی۔

"میں سمجھ رہی ہوں۔ تمہیں بھی سمجھا دوں گی۔"

منہ اندھیرے ہماری کشتی جنگلیوں کے جزیرے سے سمندر میں روانہ ہو گئی۔ سب لوگ ہمیں رخصت کرنے ساحل پر جمع تھے۔ ہماری کشتی آہستہ آہستہ سمندر میں بہنے لگی۔ میں اور پاروتی دونوں چپو چلا رہے تھے۔ ساحل پر سمندر کی موجیں واپس جاتے ہوئے ہماری کشتی کو بھی اپنے ساتھ سمندر میں دور تک لے گئیں۔ جنگلی لوگوں نے جس طرف جانے کو کہا تھا ہم کشتی کو اس طرف چلا رہے تھے۔ سب سے بڑی نشانی ہمیں یہ دی گئی تھی کہ سورج ہمیشہ ہمارے عقب میں طلوع ہونا چاہئے۔ بہرحال ہم

ایک مرتبہ پھر کھلے سمندر میں تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار ہمارے پاس کھانے پینے کا کافی سامان بھی موجود تھا اور کشتی ایسی تھی کہ سمندری موجوں کے ساتھ ہی اوپر اٹھ جاتی اور ان موجوں کے ساتھ ہی نیچے آ جاتی تھی۔ یعنی سمندری موجیں ہماری کشتی سے ٹکرا کر اسے الٹ نہیں سکتی تھیں۔ ہاں اگر سمندر میں طوفان آ جائے تو پھر بچنا مشکل تھا۔ میں دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ یاخدا ہمیں سمندری طوفان سے محفوظ رکھنا۔

دن کے وقت ہم چلے تھے۔ سارا دن سمندر میں کشتی بہتی رہی۔ دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے جنگلیوں نے کشتی میں ایک طرف ترپال کی چھت ڈال دی تھی۔ سمندر میں خاص طور پر جنوبی سمندروں میں جب دھوپ چمکتی ہے تو اس کی چمک اور گرمی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ ہم سائبان کے سائے میں آ کر بیٹھ جاتے۔ کشتی ایک ہی رخ پر جا رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم سورج کی سمت دیکھ کر اندازہ لگا لیتے تھے کہ ہم صحیح جانب جا رہے ہیں یا نہیں۔ ابھی تک ہم اپنے خیال میں درست سمت کو جا رہے تھے۔

ایک دن گزر گیا۔ پھر دوسرا اور تیسرا دن بھی گزر گیا۔ چوتھے دن دوپہر کے وقت ہمیں شمال مشرق کی جانب سمندر میں دور سیاہ لکیر دکھائی دی۔ پاروتی نے وہ لکیر مجھے دکھائی اور کہا۔

"یہ دھرتی ماتا کی لکیر ہے۔"

میں نے لکیر کو غور سے دیکھا۔ واقعی یہ زمین کی لکیر تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا لیکن اس لکیر کو جنگل کے درختوں کی شکل اختیار کرتے کرتے پورے دو دن لگ گئے۔ ہم ایک جگہ ساحل پر کشتی سے اتر گئے۔ اترتے ہی ہم زمین پر چت لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ جب آدمی تین چار دن سمندر میں بے یار و مددگار ایک تنہا کشتی میں سفر کرنے کے بعد زمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کی جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اس وقت زمین اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت محسوس

ہوتی ہے۔ ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔ دیر تک ہم ساحل سمندر کی ریت پر لیٹے رہے۔ پھر اٹھے اور درختوں کی چھاؤں میں آ کر بیٹھ گئے۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ ہم واقعی ملایا کے ساحل پر پہنچے ہیں کہ کسی دوسرے ویران جزیرے پر آ گئے ہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم درختوں کے نیچے ایک طرف چل پڑے۔ درخت ناریل کے بھی تھے اور تاڑ اور دیودار کے بھی تھے۔ آگے جا کر ربڑ کے درختوں کی قطاریں دیکھیں تو میں سمجھ گیا کہ یہ ملایا ہی ہے۔ ایک جگہ ندی بہہ رہی تھی۔ اس کا پانی میٹھا تھا۔ سمندر میں ہم ناریل کا پانی ہی پیتے رہے تھے۔ اتنے دنوں کے بعد ندی کا میٹھا پانی پیا تو طبیعت بشاش ہو گئی۔ پھر ہم نے سب سے پہلے اپنے اپنے کپڑے ندی میں دھوئے۔ خوب نہائے۔ جب کپڑے سوکھ گئے تو انہیں پہنا اور ایک طرف روانہ ہو گئے - پاروتی کی بھوک تیز ہو گئی تھی۔ میں نے تو جنگلی کیلے اور ناریل کھا کر پیٹ بھر لیا تھا مگر پاروتی کی بھوک نہیں مٹی تھی۔ میں نے اسے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتے اور ناک اونچی کر کے سونگھتے دیکھا تو کہا۔

"تمہیں یہاں بہت سانپ مل جائیں گے فکر نہ کرو۔"

وہ ابھی تک فضا میں سانپوں کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میری بات سن کر بولی۔

"اس طرف سے مجھے سانپوں کی بو آ رہی ہے تم یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

مجبوراً مجھے وہیں بیٹھنا پڑا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد پاروتی درختوں میں سے میری طرف آئی تو وہ بڑی خوش خوش تھی۔ کہنے لگی۔

"یہاں کے سانپ بڑے زہریلے اور گرم ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اب مجھے یہ نہ بتانا کہ تم نے کتنے سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسوایا ہے اور کتنے سانپ کھائے ہیں۔"

وہ مسکراتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے کہا۔

"پاروتی! ہم اب شہروں میں داخل ہو رہے ہیں وہاں تمہیں اتنی آسانی سے سانپ نہیں ملیں گے۔ وہاں کیا کرو گی - اس لئے میری بات مانو اور یہ بری علاوت ترک کر دو اور دوسرے انسانوں کی طرح زندہ رہنا سیکھو۔"

پاروتی اپنے بازو پر وہ جگہ دیکھ رہی تھی جہاں اس نے سانپ سے ڈسوایا تھا۔ وہاں مجھے تھوڑا تھوڑا خون نکلتا نظر آیا۔ کہنے لگی۔

"تم میری فکر نہ کرو۔ شہروں میں بھی سانپ مل جاتے ہیں۔ سانپ جہاں ہو گا مجھے اس کی بو آ جائے گی۔"

ہم نے کچھ دیر آرام کیا اور اٹھ کر دوبارہ چلنے لگے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہاں لوگوں سے معلوم ہوا کہ ہم واقعی ملایا کے ملک میں ہیں۔ اس گاؤں کے لوگ ملائی مسلمان تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں مسلمان ہوں تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ میں نے پاروتی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ میری بیوی ہے۔ ہم جاپانیوں کے جنگلی قیدی کیمپ سے بھاگے ہیں۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ جاپانی یہاں سے دفع ہو گئے ہیں۔"

گاؤں کے ملائی مسلمانوں نے ہمیں کھانا کھلایا۔ ہمیں نئے کپڑے پہننے کو دیئے - میں نے کرتے کے اوپر دھوتی باندھ لی۔ جس طرح ملایا کے دیہاتی مسلمان باندھا کرتے ہیں۔ پاروتی کو بھی انہوں نے اسی قسم کا لباس دیا جو اس نے پہن لیا۔ ہمیں نئے چپل بھی دیئے۔ ہم دو دن وہاں ملائی مسلمانوں کے مہمان رہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ سامنے والی پہاڑیوں کے پیچھے ہمیں ایک سڑک ملے گی جو ہمیں مغرب کی طرف ایک شہر میں پہنچا دے گی وہاں ریلوے سٹیشن ہے۔ جہاں سے ہم گاڑی میں بیٹھ کر کوالالم پور پہنچ سکتے ہیں۔

رخصت کرتے ہوئے ان نیک دل ملائی مسلمانوں نے ہمیں کچھ رقم بھی دی۔ ہم

ان کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے اور سامنے والی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ سارا دن چلتے رہے سورج غروب ہو رہا تھا کہ ہم پہاڑیوں کی دوسری جانب سڑک پر آ گئے۔ یہ کشادہ اور پختہ سڑک تھی۔ سڑک پر سے ٹرک اور فوجی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ان فوجی گاڑیوں میں جاپانیوں کے بجائے انگریز فوجی بیٹھے نظر آتے تھے۔ ہمیں ایک ٹرک والے نے اپنے ٹرک میں بٹھا لیا۔ شام کو ہم ایک شہر میں پہنچے جس کا نام میں اب بھول گیا ہوں۔ سٹیشن پر جا کر معلوم ہوا کہ کوالالم پور کو رات کے وقت گاڑی چلتی ہے۔ ہم وہیں سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہی ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ پاروتی نے ملائی مسلمان عورتوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میں اس لباس میں کیسی لگتی ہوں؟

میں نے کہا۔ "اتنی بری نہیں لگتی ہو۔"

وہ بڑی لگاوٹ سے میرے قریب ہو کر بولی۔

"تم نے مجھے اپنی بیوی کہا ہے تو کیوں نہیں مجھ سے بیاہ کر لیتے؟ میں تمہاری بڑی سیوا کروں گی۔"

میں نے دل میں کہا تم سے شادی کرنے سے تو بہتر ہے کہ میں سانپوں سے بھرے ہوئے کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں۔ میں نے اسے جواب دیا۔

"کوئی اور بات کرو پاروتی۔"

وہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چیز تلاش کر رہی ہے۔ میں نے کچھ نہ پوچھا اور خاموش رہا۔ وہ کچھ بے چین ہونے لگی میں پھر بھی جان بوجھ کر چپکا ہو کر بیٹھا رہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔ "میں ذرا باتھ روم تک جا رہی ہوں۔"

اگرچہ وہ تقریباً جنگلی لڑکی بن چکی تھی اس کے باوجود وہ ایک بڑے شہر کی رہنے والی تھی۔ وہ شہر کے ادب آداب اور تمدن کو پوری طرح سمجھتی تھی۔ مگر مصیبت یہ

تھی کہ وہ شہر میں جنگل کی خوراک تلاش کرنے جا رہی تھی۔ قریب ہی ریفرشمنٹ روم تھا۔ وہ اس کے اندر چلی گئی۔ کوالالم پور کو جانے والی ٹرین کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ پاروتی ریفرشمنٹ روم سے باہر آئی تو بدستور بے چین تھی۔ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ "تمہیں کہا تھا ناں کہ اپنی بری عادت چھوڑو۔ شہر میں تمہیں اتنی آسانی سے سانپ نہیں ملیں گے۔"

پاروتی نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے پھنکار کی سی آواز نکلی۔ وہ بالکل جنگل والی لڑکی بن گئی تھی۔

"مل جائیں گے سانپ۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ سانپ خود مجھے تلاش کر کے میرے پاس آ جائیں گے۔"

میں اٹھ کر کاؤنٹر پر چلا گیا جہاں سگریٹ فروخت ہوتے تھے۔ ایک پیکٹ سگریٹ خریدا۔ سگریٹ سلگایا اور بنچ پر پاروتی کے پاس بیٹھ کر خاموشی سے سگریٹ پینے لگا۔ دل میں تھوڑی سی تشویش بھی تھی کہ اگر پاروتی کو کوئی سانپ نہ ملا تو کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے۔ سانپ اس کے جسم کا' اس کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ سٹیشن پر کافی رونق تھی۔

پاروتی نے اپنا چہرہ پلیٹ فارم کے جنوبی سرے کی طرف کیا اور کچھ سونگھنے لگی۔ پھر میرا بازو کھینچتے ہوئے بولی۔

"میرے ساتھ آؤ۔ ایک سانپ مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے۔"

میں نے دل میں کہا یاخدا خیر ہو۔ یہ شہر ہے۔ کہیں یہ عورت مجھے کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے۔ مجبوراً اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ پاروتی کی حس اسے دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جس طرف وہ جا رہی ہے ادھر کہیں نہ کہیں کوئی سانپ ضرور ہو گا۔ ٹرین کے چلنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو یہ تماشہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ پلیٹ فارم جہاں ختم ہوتا تھا وہاں ایک طرف ایک کیبن بنا ہوا تھا۔

شاید یہ ریلوے کا کوئی موڑ وغیرہ تھا۔ پاروتی نے اس کیبن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"سانپ اس طرف ہے۔"

کیبن کے آگے تھوڑی سی جگہ تھی جہاں کیلے کے درخت اور گھاس وغیرہ اگی ہوئی تھی۔ وہاں صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ زیادہ روشنی نہیں تھی۔ ہم وہاں پہنچے تو ایک چوکیدار کہیں سے نکل کر آ گیا۔ اس نے ملائی زبان میں ہم سے کچھ پوچھا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں اسے بتایا کہ ہم نے یہاں ایک سانپ دیکھا ہے۔ اس کو مارنا چاہتے ہیں تا کہ کسی مسافر کو نہ ڈس دے۔ چوکیدار ہندوستانی زبان سمجھ لیتا تھا۔ سانپ کا سن کر وہ بھی خوف زدہ سا ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"کہاں دیکھا تھا سانپ؟"

اس کے پاس ایک ڈنڈا تھا۔ پاروتی نے کہا۔

"تم اس طرف جا کر بیٹھو۔ ہم خود سانپ کو ڈھونڈھ کر مار دیں گے۔ کہیں سانپ تمہیں نہ کاٹ لے۔"

چوکیدار پہلے ہی خوف زدہ تھا۔ وہ جلدی سے گھاس اور درختوں میں سے نکل کر دور چلا گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"میں بھی ادھر چلا جاتا ہوں کہیں سانپ نے مجھے ڈس لیا تو میں ناحق میں مارا جاؤں گا۔"

پاروتی نے بڑے محبت بھرے انداز میں کہا۔

"کسی سانپ میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ میرے پیارے دوست کو کاٹے۔ میں تو اسے کچا چبا جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو تم ویسے بھی اسے کچا چبا جاؤ گی۔ میں اس طرف جاتا ہوں۔"

میں بھی وہاں سے دور ہٹ گیا۔ اچانک پاروتی ایک طرف کو جھکی جھکی دوڑ پڑی۔ میں سمجھ گیا۔ اس نے سانپ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ وہیں غائب ہو گئی۔ جب اسے کافی دیر لگ گئی تو چوکیدار میرے پاس آ کر کہنے لگا۔

"کہیں تمہاری عورت کو سانپ نے نہ کاٹ لیا ہو۔"

میں نے کہا۔ "وہ سانپ کو ختم کر کے ہی آئے گی۔"

اور واقعی پاروتی سانپ کو پورے کا پورا ختم کر کے ہی آئی۔ وہ خالی ہاتھ تھی اور بڑی ہشاش بشاش تھی۔ کہنے لگی۔

"میں نے سانپ کو مار دیا ہے۔"

چوکیدار نے اطمینان کا سانس لیا۔

ہم واپس پلیٹ فارم پر آ گئے۔ میں نے پاروتی سے پوچھا۔

"سانپ ایک تھا یا دو؟"

وہ افسوس کے ساتھ بولی۔

"ایک ہی تھا۔ کاش دو تین ہوتے۔ لیکن کافی زہریلا سانپ تھا۔"

میں نے دل میں سوچا کہ شہر میں جانے سے ایک فائدہ تو ضرور ہو گا کہ وہاں کے سارے سانپ ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گے۔ وہاں سے ہم آدھی رات کو ٹرین میں سوار ہوئے اور باقی کی ساری رات اگلا سارا دن اور اس سے اگلی رات کا سفر طے کرنے کے بعد تیسرے دن صبح سویرے ملایا کے سب سے بڑے شہر کوالالم پور پہنچ گئے۔ وہیں سٹیشن پر ہم نے ناشتہ کیا۔ پاروتی کو سانپوں کی تلاش تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"خدا کے لئے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو۔ یہ شہر ہے یہاں اتنی جلدی سانپ نہیں ملیں گے۔"

یہاں سے ہمیں سمندری جہاز میں سوار ہو کر انڈیا جانا تھا۔ یہ چھ ایک دن کا سمندری سفر تھا۔ اس زمانے میں سمندری جہازوں کی رفتار زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ ہمارے پاس کافی رقم تھی جو گاؤں کے ملائی مسلمانوں نے آپس میں چندہ کر کے ہمیں دی تھی۔ ہم نے شہر کے ایک چھوٹے سے غریبانہ ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو میاں بیوی ظاہر کیا۔ میں پاروتی کو ہوٹل میں چھوڑ کر بندرگاہ کی طرف

روانہ ہو گیا تاکہ پتہ کروں کہ ہندوستان کو جہاز کس روز روانہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ پرسوں ایک جہاز دوپہر کے بعد روانہ ہونے والا ہے۔ اس کے ٹکٹ بندرگاہ کے ساتھ ہی ایک آفس میں فروخت ہوتے تھے۔ میں نے وہاں سے جہاز کے تھرڈ کلاس کے کوالالم پور سے کلکتے تک کے دو ٹکٹ خرید لئے۔

دن بھر ہم شہر کی سیر وغیرہ کرتے رہے۔ رات کو ہوٹل میں واپس آئے تو پاروتی کا جسم ایک بار پھر ٹوٹ رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"تم ہوٹل میں بیٹھو میں باہر جا کر اپنی خوراک تلاش کرتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "پاگل ہو گئی ہو۔ یہ شہر ہے جنگل نہیں۔"

وہ بولی۔ "یہاں باغ بہت ہیں۔ ان علاقوں کے باغوں میں سانپ بچھو اکثر مل جاتے ہیں میں ابھی واپس آ جاؤں گی۔"

اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

وہ کوئی دو گھنٹے بعد واپس آئی تو بڑی خوش تھی۔ کہنے لگی۔

"مجھے کافی دور تک جانا پڑا۔ ایک جگہ ربڑ کے درختوں کا ذخیرہ تھا۔ وہاں چار سانپ مل گئے۔ دو میں نے وہیں کھا۔ یہ دو اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔"

میں اچھل کر پلنگ پر چڑھ گیا۔

"ان کو یہاں کیوں لے آئی ہو؟"

وہ تیز لہجے میں بولی۔

"کل کیا کھاؤں گی۔ کل کس سے اپنے کو ڈسواؤں گی تم سے؟"

میں چپ ہو گیا۔ اس نے دونوں سانپ اپنی قمیض کے اندر چھپائے ہوئے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دونوں سانپ نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ دونوں سیاہ رنگ کے ڈیڑھ بالشت لمبے سانپ تھے اور پاروتی کے ہاتھوں میں تڑپ رہے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں ایک چھوٹی میز پر ایک تانبے کا گلاس پڑا تھا۔ پاروتی نے دونوں سانپ میز پر رکھ کر جلدی سے ان کے اوپر گلاس اوندھا رکھ دیا۔

"ہے بھگوان۔ یہاں شہر کے باغوں ذخیروں کے سانپ بڑے زہریلے ہیں۔ دیکھو۔ میرے بازو پر ان کے کاٹنے سے خون نکل آیا ہے۔"

وہ مجھے اپنا بازو دکھانے لگی۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"خدا کے لئے مجھے یہ منظر نہ دکھاؤ۔"

پاروتی بازار سے ایک چھوٹا سا تھیلا خرید لائی جس کے اوپر زپ لگی تھی۔ زپ سے تھیلا بند ہو جاتا تھا۔ اس نے دونوں سانپ تھیلے میں ڈال کر زپ سے اس کا منہ بند کر دیا۔

"اب دو دن کے لئے میرے پاس میری خوراک جمع ہو گئی ہے۔"

دونوں دن پاروتی نے ایک ایک سانپ پر گزارہ کیا۔ جس روز شام کو ہمیں کوالالم پور سے کلکتے کے لئے روانہ ہونا تھا اس روز دوپہر کے بعد پاروتی ربڑ کے ذخیروں اور شہر کے غیر آباد علاقوں کی طرف نکل گئی اور تھیلے میں اکٹھے چھ سات سانپ بھر کر لے لئے۔ کہنے لگی۔

"جہاز میں میرے کام آئیں گے۔"

اس زمانے میں سمندری جہاز پر سوار ہوتے وقت سامان کی چیکنگ وغیرہ نہیں ہوتی تھی۔ کسی نے نہ پوچھا اور پاروتی سانپوں کے تھیلے سمیت جہاز پر سوار ہو گئی۔ شام کے وقت جہاز نے بندرگاہ سے لنگر اٹھا دیا۔ اسے ایک بڑا سٹیمر لوہے کی زنجیر سے کھینچتا ہوا گہرے پانیوں میں لے گیا۔ وہاں جہاز کے انجن سٹارٹ ہو گئے اور جہاز سمندر میں اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جس روز ہم روانہ ہوئے اس روز بھی بارش ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہم نے اپر ڈیک کی بجائے لوئر ڈیک میں اپنے بستر لگا لئے تھے۔ سمندر میں کافی تموج تھا۔ ساری رات سارا دن جہاز میں رولنگ ہوتی رہی۔ پاروتی روزانہ دن کے وقت تھیلے میں سے ایک سانپ نکال کر اسے قمیض کے اندر چھپا کر جہاز کے باتھ روم میں ساتھ لے جاتی اور اس سے اپنے آپ کو خوب ڈسوا کر اور اسے ہڑپ کرنے کے بعد منہ ہاتھ دھو کر ہشاش بشاش واپس آ جاتی۔ کوالالم پور سے چلے ہوئے ہم چار دن

کے بعد رنگون پہنچے۔

جہاز پورا ایک دن رنگون کی بندرگاہ پر کھڑا رہا۔ یہاں کچھ مسافر اتر گئے اور کچھ سوار ہو گئے۔ ان میں بنگالی مسافروں کی تعداد زیادہ تھی۔ میں بنگلہ زبان بول اور سمجھ لیتا تھا۔ پاروتی تو تھی ہی بنگالن۔ ہمارے ڈیک پر بھی کچھ بنگالی کنبے اپنا سامان لے کر آ گئے تھے۔ میں نے پاروتی سے کہا کہ ان لوگوں سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ مگر ایک مدت کے بعد اسے اپنے ہم زبان لوگ ملے تھے۔ ایک بنگالی میاں بیوی ہمارے پاس ہی سامان لگا کر بیٹھے تھے۔ پاروتی اس کی بیوی سے بنگالی زبان میں خوب باتیں کرنے لگی۔ یہ بنگالی جوڑا نوجوان ہی تھا مگر زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ پاروتی ان سے خوب گھل مل گئی۔ میں نے سوچا کہ چلو اس کا دل لگا رہے گا۔ اب اسے کچھ دنوں کے بعد تو اپنے ماتا پتا کے پاس پہنچ ہی جانا ہے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ پاروتی کو کلکتے میں اس کے گھر چھوڑ کر میں بھی اپنے صوبہ پنجاب کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ مجھے بھی اپنے گھر سے نکلے کافی عرصہ گزر گیا تھا۔ رنگون سے کلکتے پہنچنے میں جہاز نے پورے تین دن لگائے۔ چوتھے روز دن کے وقت جہاز کلکتے کے دریائے ہگلی میں داخل ہو گیا۔ پاروتی اپنے شہر کا ساحل اور ساحل کے درختوں اور اڑتے پرندوں کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ ہم اوپر والے ڈیک پر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔ پاروتی کوئی بنگلہ گیت گنگنانے لگی۔ وہ بڑی خوش تھی کہ ایک مدت کے بعد اپنے ماتا پتا کی شکل دیکھے گی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"وہ مجھے دیکھ کر کس قدر خوش ہوں گے۔ کیا وہ مجھے پہچان لیں گے؟ کیوں نہیں۔ مجھے میری ماتا جی میرے باپو جی ضرور پہچان لیں گے۔ میں بڑی بدل گئی ہوں نا۔ پہلے میرا رنگ اتنا کالا کہاں ہوتا تھا۔ اب میں بڑی کالی ہو گئی ہوں۔"

میں نے اس کو کہا۔

"پاروتی! اپنے بھگوان کے لئے میری ایک بات مان لو اور گھر پہنچ کر سانپوں کی دوستی چھوڑ دینا۔ ذرا سوچو۔ تمہارے ماتا پتا کو جب پتہ چلے گا کہ تم سانپ کھاتی اور

سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسواتی ہو تو انہیں کتنا دکھ ہو گا۔"

پاروتی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔

"تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔ میں گھر جانے کے بعد یہ عادت چھوڑ دوں گی۔"

تیسرے پہر جہاز کلکتے کی خضر پور جیٹی کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ ہمارے پاس کوئی سامان تو تھا نہیں۔ بندرگاہ سے نکل کر ایک ٹیکسی لی اور پاروتی نے اسے اپنے محلے کا پتہ بتا کر وہاں چلنے کو کہا۔ جب ہم اس محلے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ پاروتی کے ماتا پتا تو ایک عرصہ ہوا مکان چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ پاروتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اپنے مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

پاروتی کے مکان میں کوئی دوسرے کرایہ دار آ گئے ہوئے تھے۔ ہمسایوں میں سے بھی اکثر لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ پاروتی کے ماں باپ کس شہر میں نقل مکانی کر گئے ہیں۔ پاروتی انتہائی غمزدہ ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"شہر میں تمہارا کوئی رشتے دار ہے تو چلو وہاں چل کر پوچھ لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارے ماتا پتا کا انہیں کچھ علم ہو۔"

پاروتی نے کہا۔ "شہر میں ہمارا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔"

میں بھی بڑی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ پاروتی کو میں اتنے بڑے شہر میں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کے قیام کا اعلان ہو چکا تھا اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں فرقہ وارانہ ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ کلکتہ شہر کی فضا بھی خراب تھی۔ یہ سب کچھ ہمیں وہیں پاروتی کے پرانے محلے کے بنگالی ہندوؤں نے بتایا۔ ایک بنگالی عورت نے پاروتی سے کہا کہ تم درگا ماتا کے مندر میں چلی جاؤ۔ رات وہاں گزارو۔ صبح اپنے ماتا پتا کا شہر میں کھوج لگانا۔ پاروتی نے وہاں مجھے اپنا خاوند ہی ظاہر کیا تھا اور ظاہر ہے کہ وہ لوگ مجھے بھی ہندو ہی سمجھ رہے تھے۔ بعد میں پاروتی نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ بتا رہے تھے کہ ایک روز پہلے ان کے محلے میں دو مسلمان آ گئے تھے۔ محلے کے ہندو بنگالیوں نے ان دونوں کو چھرے مار کر مار ڈالا تھا۔

پاروتی ابھی تک اپنی گلی میں مکان کے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب اس کا کیا ارادہ ہے۔ اس نے اداس آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"تم اپنے وطن جانا چاہتے ہو تو بے شک چلے جاؤ میں کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر لوں گی۔"

میرے دل پر اس کے اس جملے کا بڑا اثر ہوا۔ اصل میں مجھے بھی پاروتی کے ساتھ ایک خاص انس سا پیدا ہو گیا تھا۔ آخر ہم اتنی مدت تک مصیبتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ اب اس حالت میں چھوڑ کر جانا میں مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کہا۔

"پاروتی! میں اس حالت میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"تم میری خاطر اپنے آپ کو مشکل میں کیوں ڈالتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "بات صرف اتنی سی ہے کہ میں تمہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم کسی اپنے رشتے دار کا ہی ٹھکانہ بتا دو۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ آؤں گا۔"

وہ کہنے لگی۔ "دلی میں میری ایک خالہ رہتی تھی۔ شاید ماتا جی وہاں چلی گئی ہوں۔"

"تو چلو دلی چلتے ہیں۔"

ہم گلی میں سے نکل کر بازار میں آ گئے۔ پاروتی کہنے لگی۔

"میں کلکتے میں ناگن ماتا کے مندر میں ایک بار درشن کے لئے ضرور جانا چاہتی ہوں تم میرے ساتھ چلو۔"

"یہ ناگن ماتا کا مندر کہاں ہے؟"

"زیادہ دور نہیں ہے۔ میں ایک دو بار وہاں جا چکی ہوں۔ یہاں سے رکشا لیتے ہیں۔"

ناگن ماتا کا مندر کلکتہ شہر کے شمالی مضافات میں بانس اور ناریل کے جھنڈوں کے

پاس ایک ندی کے کنارے پر تھا۔ ایسا ہی مندر تھا جیسا کہ بنگال میں ہندوؤں کے مندر ہوتے ہیں۔ کافی ہندو مرد عورتیں وہاں نظر آ رہی تھیں۔ مندر کے بڑے دروازے پر ایک سانپ کا مجسمہ لگا تھا جس کا نچلا دھڑ سانپ کا اور اوپر والا دھڑ عورت کا تھا۔ پاروتی نے بتایا کہ یہ ناگن ماتا کی مورتی ہے۔ مجھے اس کی ناگن ماتا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ پاروتی کو اس کے رشتے داروں کے پاس پہنچا کر اپنے شہر امرتسر کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ مجھے یہ اطمینان ضرور ہونا چاہئے تھا کہ پاروتی محفوظ جگہ پر پہنچ گئی ہے۔ میرا اس کا اتنی دیر کا ساتھ تھا۔ ہم نے بڑی مصیبتوں کے دن دیکھے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا جاتا۔

پاروتی نے مجھے ہندو ظاہر کیا ہوا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ مندر میں لے گئی۔ وہاں اسے ایک جوگن عورت ملی۔ اس نے دور سے پاروتی کو دیکھا تو اس کے پاس آ گئی۔ عمر چالیس سے اوپر ہو گی۔ رنگ اس کا بھی کالا تھا۔ بال کھلے تھے۔ ماتھے پر سرخ تلک لگا تھا۔ گیروی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس نے پاروتی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بنگلہ زبان میں کہا۔

"میا! میرے ساتھ چل تجھے ناگن ماتا کا آشیرباد دلاؤں۔"

پاروتی نے مجھے ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس جوگن کے ساتھ مندر کے بڑے کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں ایک طرف درخت کے نیچے چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر کے بعد پاروتی واپس آئی۔ وہ بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید اسے اپنی ماتا پتا کا ٹھکانہ معلوم ہو گیا ہے۔ میرے پاس آئی تو میں نے پوچھا۔

"یہ جوگن کون تھی؟ کیا اس نے تمہیں تمہارے ماتا پتا کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟"

پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک طرف لے گئی۔ کہنے لگی۔

"تمہیں ایک راز کی بات بتانا چاہتی ہوں۔ مگر یہاں نہیں۔ اس طرف آ جاؤ۔ ان

درختوں کے نیچے چل کر بیٹھتے ہیں۔"

کچھ فاصلے پر گھاس کا چھوٹا سا قطعہ تھا جہاں ناریل اور املی کے درختوں نے چھاؤں ڈال رکھی تھی۔ کلکتے کا آسمان اس روز ابر آلود تھا۔ ہم ان درختوں کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔

"اب بتاؤ وہ راز کی بات کیا ہے؟"

راز کی بات جو مجھے پاروتی نے بتائی وہ بڑی ہیبت ناک اور ناقابل یقین تھی۔ جوگن جو پاروتی کو مندر میں لے گئی تھی ناگن ماتا کی بھکشنی تھی۔ اس نے پاروتی کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ لڑکی سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسواتی ہے اور سانپ کھاتی ہے اور ایک عرصہ سے یہ کام کر رہی ہے۔ اس نے پاروتی کے آگے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا۔ اس نے پاروتی سے کہا کہ تم اپنی طاقت سے بے خبر ہو۔ تم ایک مدت سے سانپ ڈسوا رہی ہو اور سانپ کھا رہی ہو۔ تم کو معلوم نہیں کہ برما کے جنگلوں میں تم نے بے خبری میں ایک ایسا سانپ مار کر کھا لیا تھا جو ناگن ماتا کے دشمن قبیلے کا سب سے بڑا سانپ تھا اور جس کا نام پدم گری سانپ تھا۔ اس سانپ نے تمہارے خون میں ایک ایسی طاقت پیدا کر دی ہے کہ اگر تم تین راتیں ایک خاص چلہ کرو تو ناگن ماتا کی کرپا سے تمہارے اندر ایسی شکتی آ جائے گی کہ تم جس وقت چاہو انسان سے ناگن کا روپ بدل سکو گی اور ناگن سے انسان کی شکل میں بھی واپس آ سکو گی۔۔۔۔

جوگن عورت نے پاروتی کو یہ بھی بتایا کہ چونکہ تم نے ناگن ماتا کے دشمن سانپ کو ہلاک کر کے کھایا تھا اس وجہ سے ناگن ماتا تم سے بہت خوش ہے اور تین راتوں کا چلہ کاٹنے کے بعد وہ تمہیں درشن بھی دے گی اور تمہیں انسان سے ناگن اور ناگن سے دوبارہ انسان کا روپ اختیار کرنے کی شکتی بھی دے دیگی۔

جب پاروتی مجھے ساری رام کہانی سنا چکی تو میں نے مذاق میں کہا۔

"پاروتی! اس کا مطلب ہے کہ اب تم خود سانپ بننے والی ہو۔ دیکھنا سانپ بن کر

کہیں مجھے نہ ڈس دینا۔"

پاروتی نے کہا۔

"تم اسے مذاق مت سمجھو۔ جوگن مایا نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ بھی ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچو اگر مجھے یہ شکتی' یہ طاقت مل گئی کہ میں جب چاہے انسان سے ناگن اور ناگن سے دوبارہ انسان بن جاؤں تو میری زندگی میں کتنا بڑا انقلاب نہیں آ جائے گا۔ میں دنیا کی سب سے انوکھی عورت بن جاؤں گی۔ کیونکہ آج تک ایسی عورت کسی نے نہ دیکھی ہو گی۔"

مجھے اس کی باتوں پر ذرا بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن مجھے اس کی خوشنودی منظور تھی۔ میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"بابا یہ بتاؤ کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

پاروتی بولی۔ "میں ناگن ماتا کے مندر میں تین راتوں کا چلہ کاٹوں گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو چلہ کاٹ کر دیکھ لو۔ میں اتنی دیر اپنے دوست کے ہاں چلا جاؤں گا اس کا فلیٹ لوئر چت پور روڈ پر ہے۔"

پاروتی نے میرے بازو کو تھام کر اپنا سر میرے ساتھ لگا دیا۔

"تم میرے سچے دوست ہو۔ بس میں آج رات ہی سے چلہ شروع کر دوں گی۔ جوگن میری مدد کرے گی۔"

میں نے اسے کہا۔

"ذرا ہوشیار رہنا۔ کہیں یہ اس جوگن عورت کی کوئی چال نہ ہو۔ کہیں یہ بھی سنتھالی سپیروں کی کوئی پھوپھی خالہ نہ ہو۔"

پاروتی نے گردن اونچی کر کے کہا۔

"اب میں وہ بیوقوف بھولی بھالی پاروتی نہیں ہوں۔ میں سنتھالی سپیروں کے پورے خاندان کو ختم کر سکتی ہوں۔ مجھے کوئی سپیرا ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔۔۔۔"

میں پاروتی کو مندر میں چھوڑ کر لوئر چت پور روڈ اپنے پرانے دوست جان کے

پاس آ گیا۔ وہ مجھے حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

"تم اتنی دیر کہاں غائب رہے؟"

میں نے کہا۔ "بمبئی میں تھا اور کہاں جاتا۔ بمبئی ایکٹر بننے گیا تھا۔ اتنی مدت مارا مارا پھرتا رہا۔ کام نہ بنا۔ واپس آ گیا۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟ یہاں کلکتے میں تو فضا بڑی خراب ہو رہی ہے۔ پاکستان بن گیا ہے۔ میں تو پاکستان چلا جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی پاکستان چلا جاؤں گا۔"

جان نے کہا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ بمبئی وغیرہ کی طرف مت جانا۔ وہاں بھی فسادات شروع ہو گئے ہیں۔ پنجاب میں تو بڑے، زبردست فسادات ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے ہم یہاں سے رنگون چلے چلیں گے وہاں سے کسی سمندری جہاز میں بیٹھ کر کراچی پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ بالکل صحیح پروگرام ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کب پاکستان چلنے کا ارادہ ہے؟"

میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ تین راتیں چلہ پورا کرنے کے بعد میں پاروتی کو لے کر اس کے رشتے داروں کے پاس دلی پہنچا دوں گا۔ اور جس طرح بھی ہو سکے گا خود دلی سے پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ اپنے دوست کو میں نے یہ سب بالکل نہیں بتایا تھا۔ اس لئے میں اس کی ہاں میں ہاں ملائے جاتا تھا۔

تین راتیں میں نے اپنے دوست کے فلیٹ پر گزاریں۔ تین راتیں پاروتی ناگن ماتا کے مندر میں چلہ کاٹتی رہی۔ اس نے مجھے کہہ دیا کہ میں اس دوران مندر میں نہ آؤں۔ مجھے مندر میں جانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی مندر کی گھٹی گھٹی تنگ فضا میں ہمیشہ مجھے دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے مندر تنگ گھٹے ہوئے اور حبس آلود ہوتے ہیں۔ تنگ کوٹھڑیاں تنگ راہ داریاں اور نیچی نیچی چھتیں اور فضا میں پھیلی ہوئی لوبان کی تیز بو۔۔۔۔۔ جب کہ مسلمانوں کی عبادت گاہیں فراخ

کشادہ اور کھلی ہوتی ہیں۔ اس سے دونوں قوموں کے کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تین راتوں کے بعد صبح کے وقت میں ناگن والے مندر میں گیا۔ پاروتی نے مجھے جس جگہ بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا تھا میں وہاں بیٹھ گیا۔ میں نے پاروتی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ پہلی نظر میں میں نے اسے بالکل نہیں پہچانا۔ اس نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ سر کے بال شانوں پر کھلے تھے۔ ہاتھ میں گیندے کے پھولوں کا ہار تھا۔ قریب آئی تو میں نے اسے پہچانا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"چلہ کاٹ لیا پاروتی؟"

وہ میرے سامنے گھاس پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ویسے تو ہر وقت ایک خاص قسم کی خوفناک سی چمک رہا کرتی تھی مگر اس وقت اس کی آنکھیں ہلکی ہلکی سرخ بھی ہو رہی تھیں۔ اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اس کا ہاتھ گرم تھا۔ کہنے لگی۔

"میرا چلہ کامیاب رہا۔"

"کیا مطلب؟ یعنی اب تم انسان سے ناگن اور ناگن سے انسان بن سکتی ہو؟"

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ پاروتی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"تم مجھے بہت عزیز ہو۔ تم نے ہر مصیبت میں میرا ساتھ دیا ہے۔ میں تمہارے کردار کی عظمت سے بڑی متاثر ہوئی ہوں۔ واقعی مسلمان کے کردار میں ایک خاص شرافت اور عظمت ہوتی ہے جس کا مجھے تمہارے ساتھ رہ کر تجربہ ہوا ہے۔ میں جانتی ہوں جب تم مجھے انسان سے سانپ اور سانپ سے واپس انسان بنتے دیکھو گے تو اسے بھی شعبدہ بازی ہی سمجھو گے۔ یقین کرو یہ شعبدہ بازی ہی ہو گی لیکن عام آدمی کے لئے یہ ایک حقیقت ہو گی۔ یہ علم جس کے منتروں کا جاپ کر کے میں نے انسان سے ناگن بن جانے کی شکتی حاصل کی ہے شیطانی علم ہے۔ شیطان اس علم کی مدد سے انسانوں کو گمراہ کرتا ہے اور خدا سے انہیں دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے یوں سمجھ لو کہ

میں اس علم کی طاقت کرنے کے ساتھ ہی شیطان کے گروہ میں شامل ہو گئی ہوں۔ اتنا ضرور ہے کہ میرے اندر جو انسانیت ہے اس کا احساس زندہ ہے اور ناگن بن کر بھی زندہ رہے گا۔"

میں نے پاروتی کی باتیں سن کر کہا۔

"پاروتی! تم کبھی کبھی سچائی کی باتیں کرتی ہو تم بہت تھوڑی ہندو ہو۔ زیادہ مسلمان ہو۔ پھر تم پوری مسلمان کیوں نہیں ہو جاتی؟"

پاروتی زمین کو تکنے لگی۔ پھر میری طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور بولی۔

"بہت ممکن ہے ایسا وقت بھی آ جائے۔ لیکن ابھی مجھے شیطان کے ساتھ رہ کر اس کی شکتی کی مدد سے اپنے دشمنوں سے بدلہ لینا ہے۔ اپنے ماتا پتا کا سراغ لگانا ہے اس کے بعد مجھے لگتا ہے کہ میرا راستہ وہی ہو گا جس پر تم چل رہے ہو۔"

میرے دل میں پاروتی کے لئے مزید احترام کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اس لڑکی نے فلسفے کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں۔ جتنی زندگی اس نے بسر کی تھی ساری کی ساری دکھوں مصیبتوں اور درد و آلام سے بھری ہوئی تھی۔ ان مصیبتوں اور آفتوں نے پاروتی کو ایسا علم سکھا دیا تھا جس نے اس کے دل کے ایک کونے کو ضرور روشن کر دیا تھا۔ یہی روشنی ایک دن پاروتی کے سارے دل کو روشن کرنے والی تھی۔ یہ وہ عورت تھی جو مرنے کے لئے جنوبی بنگال کے جنگلوں میں اکیلی چھوڑ دی گئی تھی۔ جس کے جسم کو سانپوں نے کاٹ کاٹ کر زہر بنا دیا تھا مگر اس عورت کے اندر زندہ رہنے اور بہتر زندگی بسر کرنے کی جو تڑپ تھی اور اس تڑپ نے اس کے ارادوں کو جو طاقت دی تھی اسے کوئی بھی نہ مار سکا تھا۔ یہی وہ طاقت اور توانائی تھی جو پاروتی کو ایک نئی زندگی کی نئی منزل کی طرف لئے جا رہی تھی۔

میں نے پاروتی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"چلو اب انسان سے سانپ بن کر دکھاؤ۔"

پاروتی ایک لمحہ کے لئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے گھورتی رہی۔ اس

کی آنکھوں میں واقعی ایک نئی مقناطیسی کشش پیدا ہو گئی تھی۔

"یہاں نہیں۔۔۔ میرے ساتھ مندر کے پیچھے آؤ۔"

وہ مجھے لے کر مندر کے پیچھے آ گئی۔ یہاں چھوٹا سا تالاب تھا۔ پتھر کی سیڑھیاں تالاب کی سطح تک جاتی تھیں۔ تالاب کے کونے میں ایک برجی تھی۔ اس برجی کے ساتھ اونچی اونچی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ دن کا وقت تھا۔ مگر اس طرف دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ پاروتی نے ان جھاڑیوں کے درمیان مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"مجھے عورت سے سانپ بنتے دیکھ کر تم ڈر تو نہیں جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "ڈروں گا شاید نہیں مگر حیران ضرور ہوں گا لیکن پہلے تم سانپ تو بنو۔"

پاروتی کہنے لگی۔

"ایک بات یاد رکھنا جس وقت میں ناگن کے روپ میں ظاہر ہو گئی تو میں تمہاری بات تو سن لوں گی لیکن تم میری بات نہ سمجھ سکو گے کیونکہ میں اس وقت سانپوں کی زبان میں ہی بات کر سکوں گی۔"

"کیا سانپوں کی بھی کوئی اپنی زبان ہوتی ہے؟"

پاروتی مسکرائی۔

"سانپ ہلکی ہلکی سسکاروں اور دھیمی پھنکاروں کی زبان میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ اگر ہم کچھ دیر اور ایک دوسرے کے ساتھ رہے تو میں تمہیں یہ زبان بھی سمجھا دوں گی۔۔۔ لو۔۔۔ اب مجھے ناگن کے روپ میں دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

میرے دل میں یہ خیال بھی تھا کہ پاروتی مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ یہ خیال بھی آ جاتا تھا کہ اس کے پاس کوئی شیطانی منتر آ گیا ہے اور شیطان کئی شکلیں بدل کر انسانوں کے سامنے ظاہر ہو جایا کرتا ہے ہو سکتا ہے یہ انسان سے سانپ بن جائے۔ میں

یقینی اور بے یقینی کے عالم میں پاروتی کے سامنے بیٹھا اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جوگیوں کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور منہ ہی منہ میں کسی منتر کا جاپ شروع کر دیا۔

آج بھی جب میں یہ سطریں لکھتے ہوئے اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ جو کچھ دیکھا وہ واقعی وقوع پذیر ہوا ہو۔ میرا خیال ہے کوئی تین چار منٹ تک پاروتی منہ ہی منہ میں منتروں کا جاپ کرتی رہی۔ پھر اس کا جسم آگے پیچھے اور دائیں بائیں آہستہ آہستہ ہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے منہ سے سسکاریوں ایسی آوازیں نکلنے لگیں۔ سچ کہہ رہا ہوں میں خوف زدہ ہو گیا۔ سوچا اٹھ کر بھاگ جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ یہ ہندو لڑکی کیا کہے گی کہ میں مسلمان کا بچہ ہو کر ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ بمشکل مزید ایک منٹ گزرا ہو گا کہ پاروتی کے حلق سے پھنکار کی آواز نکلی اور وہ غائب ہو گئی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ جس جگہ پر وہ بیٹھی ہوئی تھی اب وہاں سیاہ رنگ کا ایک سانپ کنڈلی مارے، پھن کھولے بیٹھا جھوم رہا تھا۔ خوف کے مارے ایک بار تو میرا حلق خشک ہو گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مگر سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ ایک عورت میری آنکھوں کے سامنے غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ سانپ آ گیا تھا۔ سانپ آہستہ آہستہ دائیں بائیں پھن لہرا رہا تھا اور اپنی دوشاخہ زبان بار بار باہر نکال رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سنبھالا کہ ممکن ہے یہ پاروتی کے شیطانی منتروں کا اثر ہو اور ان منتروں نے میری نظر بندی کر دی ہو۔ کیونکہ بہرحال دنیا میں جادو ٹونا تو اپنی جگہ پر موجود ہے اور سفلی عمل سے دوسروں کی نظر بندی بھی لوگ کرتے ہیں۔ میں نے ہمت کر کے سانپ کی طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

"پاروتی! کیا یہ تم ہو؟"

میرے سامنے کنڈلی مار کر بیٹھے ہوئے سانپ نے آگے پیچھے پھن کو یوں ہلایا جیسے کہہ رہا ہو۔ ہاں میں ہی پاروتی ہوں۔ میں نے گھبراہٹ میں کہا۔

"پاروتی انسانی شکل میں واپس آ جاؤ۔ مجھے یقین آ گیا ہے۔"

میں نے ابھی پلک بھی نہیں جھپکی تھی کہ میرے سامنے سانپ کی جگہ پاروتی بیٹھی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"جو کچھ تم نے دیکھا ہے یہ چلتر ہے۔ نرگ ودیا ہے جس کو تم شیطانی عمل کہا کرتے ہو۔"

وہ اٹھ کر میرے دائیں جانب آ کر بیٹھ گئی۔

"جانتے ہو یہ سب نظروں کی شعبدہ بازی ہے میرا یہ وشواش ہے کہ میں انسانی روپ میں ہی تھی لیکن دیکھنے والوں کو ناگن دکھائی دے رہی تھی۔ تمہاری جگہ اگر کوئی خدا کا باعمل بزرگ بندہ ہوتا تو وہ مجھے انسانی روپ میں ہی دیکھتا مگر ہم تم دنیا دار ہیں۔ موہ مایا کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم چیزوں کو ان کی اصلی شکل میں نہیں دیکھ سکتے۔"

میں نے محسوس کیا کہ پاروتی کی روح میں ایک نئی بیداری ایک نیا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم نے انسان سے ناگن بننے کی شکتی بہرحال حاصل کر لی ہے۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

پاروتی نے کہا۔ "میں اپنی اس شکتی سے اپنے ان دشمنوں سے بدلہ لینا چاہتی ہوں جنہوں نے مجھے اغوا کیا۔ میری زندگی کو جہنم بنایا اور میرے گھر کو تباہ کیا اور میرے ماتا پتا کو مجھ سے جدا کر دیا لیکن سب سے پہلے میں اپنے ماتا پتا کی تلاش میں دلی جانا چاہتی ہوں۔ وہاں امار پور نام کی ایک آبادی ہے جہاں کبھی میری خالہ رہا کرتی تھی۔ ہو سکتا ہے میرے ماتا پتا وہیں ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر ہم آج رات ہی دلی کی کوئی ٹرین پکڑ لیتے ہیں۔"

پاروتی کہنے لگی۔ "تمہارے پاس ٹکٹ کے پیسے ہوں گے؟ میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں بچا۔"

میں نے جیب میں سے ساری رقم نکال لی۔ یہ کل پندرہ روپے دس آنے تھے۔ اگرچہ اتنے پیسے اس زمانے میں بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ لیکن پاروتی نے کہا۔

"میرے اندر جو نئی طاقت پیدا ہوئی ہے اس کی وجہ سے مجھے دوسری کئی چھوٹی چھوٹی طاقتیں بھی حاصل ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر میں سانپوں کی زبان بول سکتی ہوں اور سمجھ سکتی ہوں۔ میں سانپوں پر حکم چلا سکتی ہوں۔"

پاروتی مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"تم نے ضرور سن رکھا ہو گا کہ زمین کے اندر جو خزانہ دفن ہوتا ہے اس پر ایک سانپ بیٹھا ہوتا ہے جو خزانے کی حفاظت کرتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ کہانیوں میں پڑھا تھا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

پاروتی کہنے لگی۔ "میں اس خزانے کے سانپ پر بھی حکم چلا سکتی ہوں۔ میں اسے حکم دے سکتی ہوں کہ خزانے میں سے کوئی ہار کوئی قیمتی ہیرا یا سونے کی اشرفیاں مجھے ا کر دے اور وہ اسی وقت مجھے لا دے گا۔"

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"پاروتی! تم الف لیلیٰ کی کہانیوں کی باتیں کرنے لگی ہو۔ یہ سب خیالی باتیں ہیں۔"

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ مندر کے دروازے ک طرف چلاتے ہوئے بولی۔

"میرے ساتھ دریا پر چلو۔ وہاں ایک پرانے محل کا کھنڈر ہے۔ ماتا جی کہا کرا تھیں کہ یہ کسی سورج بنسی خاندان کے راجہ کا محل ہوا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس محا کے کھنڈر میں کوئی خزانہ دفن ہو۔"

میں نے دل میں کہا کہ چلو یہ تماشہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ کلکتے کے شمال کی جانب دریائے جمنا بہتا ہے جس کو وہاں دریائے ہگلی کہتے ہیں۔ ہم ٹرام کار میں بیٹھ کر دریا طرف چل دیئے۔

دریائے ہگلی کے کنارے ایک کھنڈر تھا جس کی شکستہ دیواروں پر گھاس اگ رہی تھی۔ ایک بھی چھت سلامت نہیں تھی۔ جگہ جگہ پتھروں اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ گلہریاں ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔ یہ سورج غروب ہونے کا وقت تھا۔ کلکتہ شہر کے آسمان پر دن کی روشنی مغرب کی طرف سمٹتے ہوئے نارنجی رنگت اختیار کر رہی تھی۔ پاروتی میری ساتھ چلتی کھنڈر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہی کبھی راجہ کا محل تھا۔"

"اب تو یہاں سوائے اینٹ پتھر اور سوکھی کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں کہاں سے خزانہ ملے گا۔"

پاروتی بولی۔

"ایسی جگہوں پر ہی خزانے ہوا کرتے ہیں چلو۔ کھنڈر کے اندر چلتے ہیں۔"

ہم کھنڈر کی چار دیواری میں آ گئے۔ یہاں کافی جھاڑ جھنکاڑ تھا۔

میں نے کہا۔ "یہاں کہیں سے کوئی سانپ بچھو نکل آیا تو میں تو مارا جاؤں گا۔"

پاروتی نے کہا۔

"میرے ہوئے ہوئے کسی سانپ بچھو کی مجال ہے کہ تمہیں کچھ کہے۔"

وہ جھک کر فضا میں کچھ سونگھتے ہوئے قدم قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک جھاڑی کے پاس جا کر اس نے جلدی سے اندر ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ

میں نسواری رنگ کا سانپ بل کھا رہا تھا اور اس کی کلائی پر ڈس رہا تھا۔ پاروتی سانپ کو اسی طرح پکڑے کھڑی رہی۔ جب سانپ نے کلائی پر ڈستے ڈستے تھک کر گردن نیچے ڈال دی اور پاروتی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"منہ دوسری طرف کر لو۔"

میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ جب تھوڑی دیر بعد گردن گھما کر پاروتی کو دیکھا تو اس کے ہاتھ میں سانپ نہیں تھا۔ کہنے لگی۔

"اس کا گوشت کڑوا تھا۔"

میں نے اسے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"خدا کے لئے آئندہ میرے سامنے یہ مکروہ حرکت نہ کرنا۔"

پاروتی نے میری بات کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور جھکے جھکے قدم قدم جھاڑیوں اور پتھر کے ڈھیروں میں آگے بڑھتی رہی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ وہ پتھروں کی ڈھیری کے پاس جا کر رک گئی۔ جھک کر پتھروں کو سونگھا۔ گردن اٹھا کر کہنے لگی۔

"یہاں آؤ۔ یہاں کوئی خزانہ دفن ہے۔ مجھے خزانے کے سانپ کی بو آ رہی ہے۔"

میں نے خیال کیا کہ یہ بھی نظر بندی کا کوئی کھیل ہو گا۔ آج کل کہاں دفن شدہ خزانے ملتے ہیں۔ میں نے کندھے سکیڑتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا۔

"اگر یہاں تمہیں خزانے کا شبہ ہے تو پھر خود ہی زمین کھودو۔ میں یہ مزدوری نہیں کر سکتا۔"

پاروتی مسکرانے لگی۔

"ہمیں زمین کھودنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تو پھر تمہیں جو خزانہ نظر آ رہا ہے وہ باہر کون لائے گا؟ تمہارا تایا ابا؟"

"تمہیں ابھی تماشہ دکھاتی ہوں۔"

یہ سب کچھ مجھے اب تماشہ ہی لگتا تھا۔ ہو سکتا ہے آپ بھی اسے تماشہ ہی خیال

کرنے لگے ہوں۔ لیکن ایک بات ضرور ہے۔ اس دنیا میں جہاں ہم آپ رہ رہے ہیں بعض اوقات ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں کہ انسانی عقل حیران کھڑی رہ جاتی ہے۔ ہم نے اپنی دنیا اور اس دنیا کے معمولات کو چند اصولوں اور ضابطوں میں تقسیم کر رکھا ہے جنہیں ہم حقائق کہتے ہیں۔ ہم ہر واقعے کو حقائق کے اصولوں پر پرکھنے کے عادی ہیں۔ لیکن جب کبھی ہم کوئی ایسا واقعہ دیکھیں یا اس کے بارے میں سنتے ہیں جو ہمارے ان ضابطوں اور حقائق کے خود ساختہ اصولوں کے منافی ہوتا ہے تو ہم حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں ایسے ایسے سربستہ راز ہیں کہ جن کی بابت ہمیں علم تو کیا ان کا وہم و گمان تک نہیں ہے۔ قدرت نے ہمیں بہت کچھ دے کر بہت کچھ ہم سے چھپا لیا ہے۔ ہم اپنی طرف سے قدرت کے اسرار کا ایک پردہ اٹھا کر بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے نیچر کو تسخیر کر لیا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ قدرت کی سٹیج پر ایک پردہ اٹھتا ہے تو پیچھے ایک پردہ گر بھی جاتا ہے۔ آج انسان ہوا میں اڑ رہا ہے لیکن کل تک ہوا میں اڑنے والے کو جادوگر یا بھوت پریت سمجھا جاتا تھا۔ کل کا جادو' کل کا طلسم آج کی سائنس بن کر ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ آج صرف جن بھوت غائب ہوتے ہیں۔ کیا معلوم کل انسان بھی غائب ہونا سیکھ جائیں اور جس طرح فیکس مشین میں ڈالی گئی تحریر ایک سیکنڈ میں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے دوسرے براعظم کے شہر میں لگی فیکس مشین میں ظاہر ہو جاتی ہے اس طرح ہو سکتا ہے کل انسان بھی اسی طرح ایک شہر سے غائب ہو کر دوسرے شہر میں پہنچ جائے۔

پاروتی پتھروں کے پاس بیٹھ گئی۔ میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ آسمان پر شام کی نارنجی روشنی آہستہ آہستہ قرمزی ہونے لگی تھی۔ پاروتی نے منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھا اور پھر اس کے منہ سے سسکاریوں کی آوازیں نکلنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سانپوں کی زبان میں خزانے کے سانپ سے مخاطب ہے۔ یہ بات آپ کو بھی بڑی عجیب لگے گی اور اس وقت مجھے بھی بڑی عجیب لگی تھی کہ ایک انسان سانپ سے باتیں کر رہا

ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میں اب بھی یہی کہوں گا کہ سائنس کی بدولت وہ زمانہ بھی ضرور آ جائے گا جب انسان جانوروں کی بولیوں اور جانور انسانوں کی زبان سمجھنے لگیں گے۔

پاروتی کوئی پندرہ سیکنڈ تک چھوٹی چھوٹی سسکاریوں کی کوڈ زبان میں کچھ بولتی رہی۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔

”میں نے تمہیں غلط نہیں کہا تھا۔ نیچے ایک خزانہ موجود ہے۔ میں نے خزانے کے سانپ سے کہا ہے کہ وہ میرے لئے خزانے میں سے کوئی بھی چیز منہ میں ڈال کر لے آئے۔“

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”بھلا دیکھتا ہوں تمہارا خزانے والا سانپ زمین کے اندر سے کیا لاتا ہے۔“

میں بالکل صاف صاف بیان کروں گا۔ مجھے پاروتی کی باتوں پر آدھا یقین اور آدھی بے یقینی تھی۔ یا یوں سمجھ لیں کہ پورا پورا یقین بھی تھا اور پوری پوری بے یقینی بھی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی خیال آتا کہ ہو سکتا ہے ایسا ہو بھی جائے۔ اب تو مجھے پورا پورا یقین ہو گیا ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز ممکن ہے۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

”پتھر ہٹا کر سانپ کے لئے راستہ بنا دیتے ہیں۔“

پاروتی نے مجھے منع کیا۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ سانپ اپنے لئے راستہ خود بنا لے گا۔“

پھر میری آنکھوں نے ایک سفید سانپ کو دیکھا جس کی جلد شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ پتھروں کے درمیان سے باہر نکل کر پاروتی کے سامنے کنڈل مار کر بیٹھ گیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سانپ کے منہ میں سونے کی چھوٹی سی لڑی جس میں ایک سرخ رنگ کا نگ چمک رہا تھا۔ پاروتی نے سونے کی لڑی سانپ کے سے نکال کر اسے غور سے دیکھا۔ پھر سانپ کی زبان میں سی سی کر کے اس سے دو

باتیں کہیں۔ سانپ جدھر سے آیا تھا ادھر ہی کو واپس چلا گیا۔ اس نے سونے کی لڑی مجھے دکھائی۔

”دیکھو۔ یہ سونے کی ہے۔ اس میں یہ عقیق بھی لگا ہوا ہے۔ یہ ضرور بڑا قیمتی ہو گا۔“

سرخ رنگ کا عقیق انگوٹھے کے سائز کا تھا اور شام کی روشنی میں اس میں سے شعاعیں نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

”یہ تو ہمیں بازار میں لے جا کر بیچنا پڑے گا کہیں ہمیں پولیس چوری کے شبے میں نہ پکڑ لے۔ اچھا تھا کہ تمہارا سانپ خزانے میں سے سونے کی اشرفیاں لے آتا۔“

پاروتی بولی۔

”سونے کی اشرفیاں بیچنے جاتے جب بھی لوگوں کو ہم پر شک پڑ سکتا تھا۔ اس لڑی کے بارے میں تو میں سنار سے کہہ سکتی ہوں کہ ہمارے خاندانی ہار کی ایک لڑی باقی رہ گئی ہے اسے بھی فروخت کرنا پڑ رہا ہے۔“

میں نے اسے کہا۔

”اب رات ہو رہی ہے ہم اس وقت کہاں اسے صرافہ بازار میں لے جا کر فروخت کرتے پھریں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم رات کی گاڑی سے اسے ساتھ ہی لے کر دلی چلے چلتے ہیں۔ دلی جا کر اسے فروخت کر دیں گے۔“

”یہ خیال بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے پاس دلی جانے کا ریل کا کرایہ تو موجود ہی ہے۔“

”بالکل“

پاروتی نے سونے کی لڑی مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”اسے تم اپنے پاس سنبھال کر رکھ لو۔ چلو اب ریلوے سٹیشن پر چل کر دلی جانے والی گاڑی کا پتہ کرتے ہیں۔“

دریا کے علاقے سے نکل کر ہم بڑی سڑک پر آئے۔ وہاں سے ایک ٹیکسی پکڑی

اور کلکتہ کے ہوڑہ ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ دلی جانے والی گاڑی رات کے سوا نو بجے چلے گی۔ اس وقت ابھی شام کے سات ہی بجے ہوں گے۔ ہم نے دلی تک کے دو تھرڈ کلاس کے ٹکٹ خریدے اور پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئے۔ کلکتے میں ابھی فضا اتنی خراب نہیں ہوئی تھی۔ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ پنجاب میں بہت خون خرابہ ہو رہا ہے اور جالندھر امرتسر میں سخت فسادات ہو رہے ہیں۔ مجھے اس لئے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی کہ میرے گھر والے لاہور شہر میں تھے اور لاہور پاکستان میں تھا۔ امرتسر میں ہمارے کچھ رشتہ دار ضرور تھے۔ کسی وقت اُن کا خیال ضرور آ جاتا تھا۔ پھر سوچتا کہ وہ صدیوں سے وہاں آباد ہیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا اور وقت آنے پر وہ آسانی سے نکل جائیں گے۔

میں نے کینٹین کے کاؤنٹر سے دو گلاس چائے کے لئے۔ ایک گلاس پاروتی کو دیا اور ہم دونوں پلیٹ فارم پر کاؤنٹر کے قریب ہی بنچ پر بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ پاروتی کے اندر ایک نئی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے بارے میں مجھے اس نے خود ہی بتایا۔

"جب سے میرے اندر انسان سے ناگن بن جانے کی شکتی پیدا ہوئی ہے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اب مجھے سانپوں سے ڈسوانے اور سانپ کھانے کی حاجت نہیں رہی۔ وہ حالت وہ کیفیت جو سانپ ڈسوانے کے بعد مجھ پر طاری ہوتی تھی اب اس کے بغیر بھی مجھ پر طاری رہتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کم از کم اس مکروہ عادت سے تو تمہارا پیچھا چھوٹا۔"

پاروتی نے کہا۔

"اور سنو! اب مجھے بھوک بھی نہیں لگتی میرا مطلب ہے میں کچھ نہ بھی کھاؤں لگتا ہے میرے اندر کمزوری پیدا نہیں ہو گی۔ ایک طرح سے میرے اندر ایک سانپ کی ساری باتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ جانتے ہو سانپ صرف ایک بار کھاتا ہے اور پھر عرصے تک کچھ بھی نہیں کھاتا۔ میں بھی دن میں ایک بار کھانا کھا لوں تو پھر بھوک

نہیں لگتی۔ اس وقت بھی مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

میں نے اسے کہا۔ "تمہارا تو پیٹ کا مسئلہ حل ہو گیا اب تمہارا کھانا بھی میں خود کھایا کروں گا۔"

پاروتی نے چائے کا گلاس اپنے پاس بنچ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میری ایک بات سنو۔ تمہیں ایک ضروری بات بتانا چاہتی ہوں۔ اس کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ اس میں میری زندگی کا راز چھپا ہوا ہے۔"

پاروتی ایک لمحے کے لئے پلیٹ فارم کے فرش کو گھورنے لگی۔ پھر میری طرف نگاہیں اٹھائیں اور کہا۔

"میری زندگی اب بڑی لمبی ہو گی۔ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکو گے۔ میرے ایسی عورت جو کئی برسوں تک سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسواتی رہی ہو اور سانپوں پر گزارہ کرتی رہی ہو جب وہ ناگن ماتا کا چلہ کاٹ کر انسان سے ناگن بننے کی طاقت حاصل کرتی ہے تو اس دنیا میں اس کی عمر بہت لمبی ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ عام انسانوں کے برخلاف کھانے پینے سونے اور دوسری انسانی ضرورتوں اور کمزوریوں سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اب مجھے بھوک نہیں لگتی۔ میں اگر چاہوں تو کھا پی لوں۔ نہ کھاؤں تو مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ میں سانپ کھانے سے بے نیاز ہو گئی ہوں۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارے ساتھ کوئی حادثہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ تم گاڑی کے نیچے آ سکتی ہو تم پر کسی مکان کی چھت گر سکتی ہے۔ فسادات میں تمہیں کوئی گولی مار سکتا ہے۔"

پاروتی نے جواب دیا۔

"تم نے بالکل ٹھیک سوال کئے ہیں۔ میرے ساتھ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس قسم کے حادثے گزر سکتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب میرے سر پر کسی مکان کی چھت گرے گی۔ جب میں کسی گاڑی کے نیچے آؤں گی اور جب بھی مجھے کوئی گولی

مارے گا تو اس سے ایک سیکنڈ پہلے میں سانپ بن چکی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "لیکن سانپ کی شکل میں بھی تم مر سکتی ہو۔ چھت گرنے سے کچلی جا سکتی ہو۔ گاڑی کے نیچے آنے سے تمہارے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ پستول کا فائر تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے۔ پھر تو تم مر جاؤ گی پھر کیسے زندہ رہ سکو گی؟"

پاروتی نے مسکرا کر کہا۔

"یہی وہ راز کی بات تھی جو میں تمہیں بتانے لگی تھی۔ سنو! اگر میرے ساتھ کبھی ایسا حادثہ پیش آ جائے اور میرے جسم کے ٹکڑے ہو جائیں تو تمہیں میری زندگی کی خاطر ایک کام کرنا ہو گا۔ تم میری سانپ کی لاش کے ٹکڑے اکٹھے کر کے کسی برتن میں بند کر دینا۔ کوہ ہمالیہ کے شمال میں دار جلنگ سے تین کوس اوپر کی جانب کیلاش پربت ہے۔ وہاں ایک شو مندر ہے۔ اس مندر کے پیچھے ایک تالاب ہے۔ میرے جسم کے ٹکڑے کسی ایسے برتن یا ڈبے میں بند کر کے جس کے اندر پانی نہ جا سکے اس تالاب میں ڈال دینا۔ چھ دن کے بعد اس برتن کو نکال کر کھولو گے تو میرے جسم کے ٹکڑے جڑ گئے ہوں گے اور میں زندہ ہو چکی ہوں گی۔ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے اسے تو اپنے پاس لکھ کر رکھ لینا۔ یا اپنے ذہن میں اسے اچھی طرح یاد کر لینا۔ کیونکہ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور سانپ کی شکل میں میری لاش کے ٹکڑے وہیں پڑے رہنے دیئے تو میں واقعی مر جاؤں گی۔"

قدرتی طور پر ایک سوال میرے دل میں پیدا ہوا - میں نے کہا۔

"پاروتی! اس کا مطلب ہوا کہ مجھے تمہارا محافظ بن کر ساری زندگی تمہارے ساتھ رہنا پڑے گا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد تم کیا کرو گی؟"

پاروتی بولی۔ "جب تک تم میرے ساتھ ہو ٹھیک ہے مجھے تسلی ہو گی کہ اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ گزرا تو تم مجھے مرنے سے بچا لو گے۔ جب تم مجھ سے جدا ہو گئے تو پھر جو خدا کرے گا وہی ہو گا۔ ہو سکتا ہے مجھے تمہارے ایسا کوئی اور دوست

جائے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ پھر ٹھیک ہے۔"

پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ابھی تو تم اس وقت تک میرے ساتھ رہو گے ناں جب تک میں ان سنتھالی سپیروں سے انتقام نہیں لے لیتی جنہوں نے میری زندگی برباد کی ہے۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"ہاں۔ اس وقت تک تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔"

پاروتی نے بے اختیار مجھے دعا دی۔ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ پاروتی نے کچھ عرصے سے بھگوان کی جگہ خدا کا نام لینا شروع کر دیا تھا۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کے اندر کوئی خاص تبدیلی پیدا ہو رہی ہو۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ وہ ہندو ازم اور ہندوؤں کے رسوم و رواج سے برگشتہ ہو رہی تھی۔ کچھ میری صحبت کا بھی اثر تھا۔

پلیٹ فارم پر پندرہ بیس ہندو بنگالیوں کا ایک جلوس کانگریس کی جھنڈیاں لہراتا بندے ماترم اور ہندوستان زندہ باد کے نعرے لگاتا گزر گیا۔ پاروتی نے پوچھا۔

"کیا ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ کیا انگریز یہاں سے چلا گیا ہے؟"

کلکتے آ کر مجھے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا پورا علم ہو چکا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ جون جولائی کے دن تھے۔ ابھی 14 اگست کا تاریخی دن نہیں آیا تھا۔ اصولی طور پر ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کا اعلان ہو چکا تھا۔ اس دوران شمالی ہندوستان خاص طور پر مشرقی پنجاب اور دلی میرٹھ مراد آباد وغیرہ میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔ یہ ساری خبریں میں اخبار میں پڑھ لیتا تھا۔ ہندو سکھوں کو مسلمانوں کی علیحدہ مملکت پاکستان بن جانے کا سخت غصہ تھا اور انہوں نے مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کرنا اور ان پر اکا دکا قاتلانہ حملے شروع کر دیئے تھے۔

یہ ساری باتیں میں نے پاروتی کو بتائیں تو وہ بولی۔

"آخر مسلمانوں کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ ... نے ہندو گھرانے میں جنم لیا ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ ہندو بہت تنگ دل ہو ہے۔ اور مسلمان سے تو وہ ہمیشہ سے نفرت کرتا آیا ہے۔"

میں نے پاروتی سے کہا۔ "اسی لئے تو مسلمانوں نے اپنے لئے علیحدہ وطن پاکستا بنایا ہے۔ میں نے بھی بچپن میں دیکھا ہے کہ ہم کبھی کسی ہندو کے گھر میں جاتے تھے ان کی عورتیں ہم سے دور بھاگ جاتی تھیں۔ کہتی تھیں اگر ہم کسی مسلمان سے چ گئیں تو ہم بھرشٹ ہو جائیں گی۔ ہمیں سات بار گنگا میں اشنان کرنا پڑے گا۔"

پاروتی کہنے لگی۔

"خدا نے مسلمانوں کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ بڑا اچھا ہوا کہ مسلمانوں وطن پاکستان بن گیا۔ خدا نے چاہا تو میں ایک بار پاکستان دیکھنے ضرور جاؤں گی۔"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی مسافروں میں ہلچا سی مچ گئی۔ ہر کوئی ٹرین کی طرف دوڑا۔ پتہ چلا کہ ہوڑہ میل ہے اور یہی ٹرین ہمیں دلی لے جائے گی۔ اس زمانے میں عورتیں بھی تھرڈ کلاس میں اپنی مردوں کے ساتھ ب جاتی تھیں۔ چنانچہ پاروتی بھی میرے ساتھ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گئی۔

جس وقت ہم پلیٹ فارم پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اس وقت آسمان پر کا گھٹائیں چھانے لگی تھیں۔ جب ٹرین کلکتہ کے ہوڑہ سٹیشن سے چلی تو بارش شروع گئی۔ ایک بات کا مجھے بڑا اطمینان ہو گیا تھا کہ اب پاروتی نہ تو سانپوں سے ڈسوائے او انہیں اپنی خوراک بنائے گی۔ بلکہ اب تو وہ کھانے پینے سے بالکل ہی آزاد ہو گ تھی۔ کہنے کو تو اس نے مجھے یہی کہا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دلی تک کے سفر میں وہ کچ کھانے پینے کو مانگتی ہے یا نہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کچھ کھائے پیئے بغیر وہ زن رہ سکے گی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں قدرت کا نظام ایک سربستہ راز ہے یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ٹرین رات کے اندھیرے میں کلکتہ شہر کی جھلملاتی روشنیو کو پیچھے چھوڑتی ہوئی بھاگی جا رہی تھی - ڈبے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا آ رہ

تھی۔ کسی وقت بارش کی بوچھاڑ بھی اندر آ جاتی تھی۔ ہمارے ساتھ والے بنگالی مسافر نے بارش سے بچنے کے لئے کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔ سفید سانپ نے کھنڈر کے خزانے میں سے جو عقیق کے نگ والی سونے کی لڑی ہمیں لا کر دی تھی وہ میں نے اپنے پاس بڑی اچھی طرح سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔

کلکتے سے دلی تک کا سفر بڑا لمبا سفر تھا۔

میں نے پاروتی سے کہا کہ میں اس کے سونے کے واسطے اوپر برتھ پر جگہ بنا دیتا ہوں۔ وہ ہلکے سے تبسم کے ساتھ بولی۔

"مجھے سونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بھول گئے ہو کہ میں۔۔۔۔"

اور اس نے اپنے ہونٹ میرے کان کے پاس لا کر فقرہ مکمل کیا۔

"میں ناگن ہوں۔"

ٹرین نے مضافات کا کوئی چھوٹا سا سٹیشن چھوڑا تو ریل کی پٹڑیوں نے بہت ش مچایا۔ میں نے پاروتی سے کہا کہ مجھے تو ضرور نیند آ جائے گی۔ میں اپنے لئے جگہ بناتا ہوں۔ اوپر والے برتھ پر کسی مسافر کی گٹھڑیاں پڑی تھیں۔ میں نے انہیں بڑی احتیاط سے ایک طرف کر کے اتنی جگہ بنا لی کہ میں ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ سکتا تھا۔ میں واپس پاروتی کے پاس آ کر بیٹھ گیا کہ جب نیند آئے گی تو اوپر برتھ پر چڑھ کر سو جاؤں گا۔ پاروتی کھڑکی کے شیشے پر باہر سے گرتی بارش کے قطروں کو دیکھ رہی تھی۔ کسی کسی وقت وہ مجھ سے ان جنگلوں کی بات کر لیتی جہاں سے گزر کر ہم آئے تھے۔ اسے وہ جنگل بہت یاد آ رہے تھے۔ ہم اسی طرح کبھی خاموش اور کبھی باتیں کرتے رہے۔ ڈبے میں دوسرے مسافر بھی اپنی اپنی باتوں میں لگے تھے۔ کچھ مسافر سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ٹرین کلکتے سے بہت آگے نکل آئی تھی اور اندھیرے میں بنگال کے سرسبز کھیتوں میدانوں اور ندی نالوں پر سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔

مجھے نیند آنے لگی تو میں نے پاروتی سے کہا۔

"میں اوپر برتھ پر سونے جاتا ہوں۔ تم کسی سٹیشن پر اترنا بالکل نہیں۔"

وہ ہنس پڑی۔

"اب مجھے اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں برتھ پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ چلتی ٹرین میں مجھے بڑی جلدی نیند آ گئی۔ ایک دھچکے سے میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ ٹرین رک گئی ہے۔ میں نے سر نیچے کر کے دیکھا۔ پاروتی اپنی سیٹ پر اسی طرح بیٹھی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ اترا ہوا تھا باہر پلیٹ فارم پر بڑی روشنیاں تھیں۔ میں نیچے اتر آیا۔ پاروتی نے کہا۔

"آسن سول کا سٹیشن آیا ہے۔"

آسن سول سے صوبہ بہار کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہوڑہ ایکسپریس نے ہمیں شام کے وقت دلی پہنچا دیا۔ وہاں سے ہم تانگہ لے کر پاروتی کی خالہ کے گھر پہنچے تو وہاں تالا لگا تھا۔ معلوم ہوا کہ دلی میں فسادات کے ڈر سے وہ لوگ کسی دوسرے شہر چلے ہیں۔ پاروتی بولی۔

"اب کیا کریں؟"

میں نے کہا۔ "واپس سٹیشن پر چل کر رات گزارتے ہیں صبح سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے؟"

ہم اسی تانگے میں واپس دلی سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ ایک چوک میں اچانک ہندو بلوائیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور چھرے تھے۔ پاروتی نے کہا۔ ہم ہندو ہیں - کلکتے جا رہے ہیں۔ ایک ہندو نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔

"یہ ہمیں مسلمان لگتا ہے۔ ہم اس کا معائنہ کریں گے۔"

میرا رنگ اڑ گیا۔ کیونکہ ان بلوائیوں سے میرا بچنا مشکل تھا۔

پاروتی بڑی جرات کر کے میرے آگے آ گئی۔ کہنے لگی۔

"یہ میرا پتی ہے۔ میں ناگ دیوتا کی بھگتنی ہوں اگر تم نے میرے پتی کو ہاتھ لگایا تو ناگ دیوتا تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ہندو بلوائی ذرا ٹھٹک گئے۔ لیکن ایک ہندو نے للکار کر کہا۔

"یہ بھی مسلمان ہے۔ اس کو بھی مار ڈالو۔"

میں بھول گیا تھا کہ کلکتے سے چلتے وقت پاروتی نے ایک سانپ اپنی قمیض کے اندر چھپا کر رکھ لیا تھا۔ چونکہ اب اسے سانپ کھانے کی ضرورت نہیں تھی اس لئے یہ سانپ اس کی قمیض کے اندر محفوظ پڑا تھا۔ جیسے ہی بلوائی مجھے ہلاک کرنے کے لئے آگے بڑھا پاروتی نے اونچی آواز میں ناگ دیوتا کا کوئی منتر پڑھا اور قمیض کے اندر سے سانپ نکال کر بلوائیوں پر اچھال دیا۔ سانپ اور چور کی بڑی دہشت ہوتی ہے۔ جیسے ہی سانپ بلوائیوں کے اوپر گرا وہ سر پر پاؤں رکھ کر ایک طرف کو بھاگے۔ پاروتی نے کوچوان کو آواز دی۔

"تانگہ یہاں سے نکال کر لے چلو۔"

مگر کوچوان وہاں سے خدا جانے جان بچا کر کہاں غائب ہو چکا تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔ "تانگے میں بیٹھو - جلدی کرو۔"

وہ تانگے میں بیٹھی - میں نے گھوڑے کی باگیں سنبھالیں اسے سانٹا رسید کیا گھوڑا

ذرا بدکا اور پھر سڑک پر سٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی تانگہ نہیں چلایا تھا۔ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ تانگہ چلانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کیونکہ کوچوان کو صرف باگیں ٹھیک طرح سے سنبھالنی ہوتی ہیں۔ تانگے کو گھوڑا چلاتا ہے۔

اس کے باوجود ایک آباد سڑک پر آ کر ہم نے تانگہ چھوڑ دیا۔ کیونکہ سڑک پر ٹریفک جاری تھی اور یہاں حادثے کا ڈر تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"اگر عین وقت پر تم سانپ نکال کر ان پر نہ پھینکتیں تو میرا بچنا ناممکن تھا۔"

پاروتی نے بڑے پیار سے کہا۔

"تمہاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر تو دیکھے۔"

رات کے نو دس بجے کا وقت ہو گا۔ دلی میں فسادات کی اکا دکا وارداتوں کے شروع ہو جانے سے سڑک بے رونق تھی۔ کسی وقت کوئی گاڑی تیزی سے گزر جاتی تھی۔ کوئی رکشا ٹیکسی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم سڑک پر چلنے لگے۔ آگے چوک آ گیا۔ یہاں ہمیں ایک رکشا مل گیا جس نے ہمیں ریلوے سٹیشن پہنچا دیا۔ ہم نے باقی ساری رات ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر گزاری۔ دن کی روشنی ہوئی تو میں نے پاروتی سے پوچھا کہ اب اس کا کیا پروگرام ہے۔ پاروتی کہنے لگی۔

"مجھے ماتا پتا کی بہت یاد آ رہی ہے۔ خدا جانے میرے بغیر ان کا کیا حال ہو رہا ہو گا۔ میں صرف ایک بار ان سے مل کر انہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں زندہ ہوں۔ اس کے بعد میں سنتھالی سپیروں سے انتقام لینے بنگال کے جنوبی جنگلوں کی طرف نکل جاؤں گی۔ تمہاری مرضی ہے تم میرے ساتھ چلنا یا نہ چلنا۔"

میں نے کہا۔ "مگر تمہارے ماتا پتا تو جھانسی میں ہیں اور ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ وہاں کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

پاروتی کچھ سوچ کر بولی۔

"پتا جی کبھی کبھی اپنے جھانسی کے ایک دوست کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ ان کا کلاس فیلو تھا۔ اور اب جھانسی میں کسی سینما ہاؤس کا مالک ہے۔ اس کا نام کچھ نریندر

کمار یا نرمل کمار قسم کا تھا۔ اگر ہم جھانسی جائیں تو اس آدمی کا پتہ چل سکتا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ جھانسی چلو گے؟"

میں نے دل میں عہد کیا ہوا تھا کہ اس بے یار و مددگار اور مصیبت زدہ لڑکی کو جب تک محفوظ ہاتھوں میں نہیں پہنچاؤں گا اس کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ جھانسی جانے پر تیار ہو گیا۔ میں نے جیب سے رقم نکال کر گنی - چند ایک روپے ہی باقی رہ گئے تھے۔ اس رقم سے ہم ٹرین کے ذریعے جھانسی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ پاروتی نے کہا۔

"کیوں نہ یہاں خزانے والا ہار بازار میں لے جا کر بیچ دیں۔ اس سے ہمیں کافی رقم مل جائے گی۔ ہم نئے کپڑے اور نئے جوتے بھی خرید لیں گے۔"

میں بھی اس ہار یا سونے کی لڑی سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "چلو دلی کے صرافہ بازار میں چلتے ہیں۔"

ہم نے وہیں سٹیشن سے صرافہ بازار کا پتہ معلوم کیا اور ٹرام میں بیٹھ کر چل پڑے۔ ہمیں قلی نے بتایا تھا کہ تیسرے چوک میں جا کر ٹرام سے اتر جانا۔ پھر بائیں ہاتھ کو بازار میں مڑو گے تو صرافہ بازار میں پہنچ جاؤ گے۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ تیسرے چوک پر ٹرام رکی تو ہم ٹرام سے اتر کر بائیں طرف بازار میں مڑ گئے۔ یہ ایک تنگ سا بازار تھا۔ سناروں کی کتنی ہی دکانیں تھیں۔ الماریوں میں زیورات سجے ہوئے تھے۔ پولیس بھی وہاں پر موجود تھی۔ ہم ایک دکان میں آ گئے۔ یہ ایک ہندو لالے کی دکان تھی۔ گدی پر ایک موٹا لالہ بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ پیچھے دیوار پر رام اور سیتا کی تصویر لگی تھی۔ ہمارے کپڑے معمولی سے تھے۔ لالہ جی نے پہلے تو ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

میں نے قمیض کے اندر سے سرخ عقیق والی سونے کی لڑی نکال کر اسے دی تو وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ سونے کی لڑی کے منکوں کو اس نے کسوٹی پر رگڑا۔ پھر عقیق

کو عینک لگا کر الٹ پلٹ کر دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے لڑی ایک طا رکھ دی اور پوچھا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملی ہے؟"

پاروتی نے کہا۔

"ہمارے حالات ٹھیک نہیں رہے۔ یہ میرا شادی کا ہار تھا۔ اس کی لڑیاں توڑ کر بیچتے رہے ہیں۔ یہ آخری لڑی رہ گئی تھی۔ اسے بھی بیچنے آئے ہیں۔"

لالہ نے پوچھا۔

"پہلی لڑی جہاں بیچی تھی اس نے کیا دیا تھا؟"

پاروتی نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"لالہ تم بتاؤ اس کا کیا دو گے؟"

لالہ جی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ بڑا قیمتی عقیق ان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ لیکن وہ ظاہ رہا تھا کہ یہ معمولی سے ہار کی لڑی ہے۔ کہنے لگا۔

"پتھر مصنوعی ہے۔ سونا ٹھیک ہے میں تمہیں اس کے پانچ سو روپے دے ہوں۔ اس سے زیادہ ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔"

پانچ سو روپے کی رقم 1947ء میں بہت کافی رقم ہوا کرتی تھی۔ پاروتی نے م طرف دیکھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ ٹھیک ہے۔ پاروتی بولی۔

"ٹھیک ہے لالہ جی! لڑی رکھ لیں اور ہمیں پانچ سو روپے دے دیں۔"

لالہ جی نے تجوری میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر ہمیں دے دیئے۔ انگریزی کرنسی تھی۔ میں نے کہا۔

"اب تو ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ کیا انگریزی نوٹ لوگ لے لیں گے؟"

لالہ جی بولے۔ "ہندوستان آزاد ضرور ہو گیا ہے مگر ابھی یہاں انگریزی نوٹ چلتے ہیں جاؤ اب اپنا راستہ ناپو۔"

میں نے سو سو روپے کے پانچوں نوٹ اپنی قمیض کی جیب میں سنبھال کر

لئے۔ پاروتی نے کہا کہ اب سٹیشن پر چل کر معلوم کرتے ہیں کہ جھانسی کی گاڑی کب جائے گی۔ ہم صرافہ بازار سے نکلے اور چوک میں آ گئے۔ یہاں سے ہمیں ٹرام کار میں بیٹھ کر ریلوے سٹیشن پہنچنا تھا۔ ہم سٹاپ پر ٹرام کا انتظار کر رہے تھے کہ پولیس کے دو سپاہی ہمارے پاس آ گئے۔ ان میں ایک سکھ تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو بھئی تم؟"

میں نے اسے بتایا کہ ہم کلکتہ سے دلی آئے تھے یہاں ہمارے رشتے دار ہمیں نہیں ملے اب ان کی تلاش میں جھانسی جا رہے ہیں۔ سکھ سپاہی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"گوپال راس یہ تو جھانسی جا رہے ہیں۔"

دوسرا سپاہی جو ہندو تھا اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور کہنے لگا۔

"اور جو چوری کا مال تم ابھی ابھی بیچ کر آ رہے ہو اس کا پہلے حساب کتاب تو چکاؤ چلو ہمارے ساتھ تھانے۔۔۔"

میں اور پاروتی انہیں کہتے ہی رہ گئے کہ ہم نے جو سونے کی لڑی فروخت کی ہے وہ ہماری اپنی تھی۔ ہمارے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور ہمیں پکڑ کر تھانے لے آئے جو قریب ہی تھا۔ وہاں ایک موٹا سکھ تھانیدار بیٹھا تھا۔ اس نے بھی ہم پر چوری کا الزام لگایا اور میری جیب سے پانچ سو کے نوٹ نکال کر اپنے قبضے میں کر لئے اور حوالدار سے کہا۔

"ان کو حوالات میں بند کر دو۔ کل عدالت میں ان کا چالان پیش کریں گے۔"

صورت حال ایک دم سے پلٹ گئی تھی۔ کہاں ہم جھانسی جا رہے تھے اور کہاں ہمیں حوالات میں بند کیا جا رہا تھا۔ میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔ وہ سخت غصے میں تھی۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔

"خدا کے لئے ذرا صبر کرنا۔ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا۔ میں تھانیدار سے

خود بات کرتا ہوں۔"

میں سکھ تھانیدار کو سمجھانے لگا کہ ہم چور نہیں ہیں - سونے کی لڑے میری پتنی کی ماتا جی کی تھی۔ اس نے ہم دونوں کو پنجابی میں گالی دی اور حوالدار سے کہا۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ بند کر دو انہیں حوالات میں۔"

حوالات سامنے ہی تھی۔ سلاخوں والے دروازے کے باہر سنتری رائفل لئے کھڑا تھا۔ ہمیں اندر بند کرنے لگے تو پاروتی نے کہا۔

"مجھے باتھ روم جانا ہے۔"

سکھ تھانیدار نے پاروتی کو گالی دی اور فحش مذاق کیا۔ پاروتی کا میں نے چہرہ دیکھا۔ وہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"وہ سامنے باتھ روم ہے۔"

کونے میں غسل خانے کا دروازہ تھا۔ پاروتی غسل خانے میں چلی گئی۔ مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ تھانے میں ایک سکھ تھانیدار تھا۔ ایک سنتری حوالات کے باہر کھڑا تھا اور دونوں سپاہی جو ہمیں پکڑ کے وہاں لائے تھے وہ ہمیں تھانیدار کے حوالے کر کے باہر چلے گئے تھے۔

میں حوالات کے فرش پر سلاخوں کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ پاروتی یونہی غسل خانے میں نہیں گئی تھی۔ سکھ تھانیدار رجسٹر پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔ چھت کا پنکھا چل رہا تھا۔ جب پاروتی کو غسل خانے میں گئے دس پندرہ منٹ ہو گئے تو سکھ تھانیدار نے چپڑاسی سے کہا۔

"اوئے شبراتی! دیکھ اوئے! یہ تیری ماسی اندر کیا کر رہی ہے۔ کھول دے دروازہ۔"

چپڑاسی شبراتی ساتھ والے کمرے میں سے نکل کر آیا اور اس نے جاتے ہی غسل خانے کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے کہا۔

"سردار جی اندر تو کوئی نہیں ہے۔"

سکھ تھانیدار نے چونک کر غسل خانے کی طرف دیکھا۔ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ غسل خانہ خالی تھا۔ سکھ تھانیدار جلدی سے اٹھا اور غسل خانے کی طرف لپکا۔ ابھی اس نے دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ حوالات کا سنتری اس کی طرف دوڑا۔ چپڑاسی نے سکھ تھانیدار کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ بھی ایک طرف گر گیا۔

اب میں نے نسواری رنگ کے اس سانپ کو دیکھ لیا تھا جو اصل میں پاروتی ناگن کے روپ میں تھی۔ اس نے سکھ تھانیدار اور چپڑاسی دونوں کو ڈس لیا تھا۔ حوالات والا سنتری قریب جا کر تھانیدار پر جھکا تو پاروتی نے اسے بھی ڈس دیا۔ وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور باہر دروازے کی طرف دیکھتا رہا کہ کوئی دوسرا سپاہی تو اندر نہیں آتا۔ کیونکہ کسی کے اندر آ جانے سے سانپ کی زندگی کو خطرہ تھا۔ وہ ضرور اسے مار ڈالتا۔ پاروتی نے ناگن بن جانے کے بعد ان تینوں کو کچھ اس طرح ڈسا تھا کہ ان کی آواز تک نہیں نکلی تھی۔ جیسے ان کے گلے بند ہو گئے ہوں۔

پاروتی سانپ کے روپ میں تیزی سے رینگتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ قریب آتے ہی اس نے انسانی شکل اختیار کر لی اور بولی۔

"حوالات کو تالا لگا ہے۔ اس کی چابی سنتری کی پیٹی سے لگی ہو گی۔ میں لاتی ہوں۔"

میں نے اسے کہا۔

"تھانیدار نے ہمارے پانچ سو کے نوٹ اپنی جیب میں رکھ لئے تھے وہ بھی نکال لانا۔"

پاروتی دوڑ کر تینوں بے ہوش یا مرے ہوئے آدمیوں کے پاس گئی۔ سنتری کی پیٹی میں سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ اس کے بعد تھانیدار کی جیب میں سے پانچ سو کے نوٹ نکالے۔ بھاگ کر میرے پاس آئی۔ چوتھی چابی لگانے سے حوالات کا تالا کھل گیا۔ اس نے نوٹ میری قمیض کی جیب میں ڈالے اور بولی۔

"تھانے کے دروازے پر وہی دونوں سپاہی ہوں گے۔ پیچھے سے جاتے ہیں۔ پیچھے

ضرور کوئی دروازہ ہو گا۔"

ہم ایک کمرے سے نکل کر تھانے کے پیچھے احاطے میں آئے۔ یہاں ایک چارپائی پر بیٹھا اپنے بدن پر تیل کی مالش کر رہا تھا۔ ہم بڑے اطمینان سے اس کے ق سے گزر گئے۔ سامنے احاطے کا چھوٹا دروازہ تھا۔ اس دروازے سے نکل کر ایک میں آ گئے۔ گلی میں مکان کے باہر دو عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ بھاگنے انہیں شک پڑ سکتا تھا۔ ہم تیز تیز چلنے لگے۔ گلی آگے جا کر ایک طرف مڑ گئی۔ آ پھر ایک گلی تھی۔ اس گلی نے ہمیں دوسرے بازار میں پہنچا دیا۔ ایک خالی رکشا قر سے گزرا۔ میں نے اسے ہاتھ دیا۔ وہ رکا۔ ہم اس میں گھس گئے۔ میں نے کہا۔

"نئی دلی کی طرف چلو۔"

پاروتی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔

"اب ہم ریلوے سٹیشن نہیں جا سکتے۔"

رکشا تیزی سے نئی دلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

نئی دلی وہاں سے کافی دور تھی۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہ کی۔ دلی اور نئی کی تھوڑی بہت مجھے پہچان تھی۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے کہا۔

"ہمیں بارہ کھمبا پر اتار دینا۔"

بارہ کھمبا پر اتر کر میں نے رکشا کا کرایہ ادا کیا اور ایک طرف فٹ پاتھ پر لگے۔ پاروتی نے کہا۔

"ادھر تم کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "تم نے سکھ سپاہی کو کہا تھا کہ ہم جھانسی جا رہے ہیں۔ چنانچہ جہ تھانے میں ہمارے فرار کا پتہ چلے گا اور سپاہیوں کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ ہم تین پولیہ والوں کو ہلاک کر کے فرار ہوئے ہیں تو پولیس ہماری تلاش میں سیدھی ریلوے سٹیشہ پہنچ جائے گی۔"

پاروتی کہنے لگی۔ "میں نے ان تینوں آدمیوں کے جسم میں صرف اتنا زہر داخل

ہے جس سے وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بے ہوش رہیں گے۔ وہ مریں گے نہیں۔"

میں نے کہا۔ "خواہ کچھ بھی ہو۔ بہرحال ہم چوری کے الزام میں پکڑے گئے تھے۔ پولیس نے ہمیں حوالات میں بند کیا تھا اور ہم حوالات توڑ کر بھاگے ہیں یہ کوئی کم جرم نہیں ہے۔"

"پھر اب کیا کریں؟"

پاروتی کے اس سوال کے جواب میں میں نے کہا۔

"ہم جھانسی ضرور جائیں گے لیکن ٹرین دلی یا نئی دلی کے سٹیشن سے نہیں بلکہ آگرہ سے پکڑیں گے اور آگرہ تک ہم بس میں سفر کریں گے۔"

ناشتہ ہم نے سٹیشن پر ہی کر لیا تھا۔ ہمارا زیادہ دیر دلی میں رکنا ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک دکاندار سے پوچھا کہ یہاں سے آگرہ کو بسیں کہاں سے چلتی ہیں۔ اس نے بتایا کہ بسوں کا اڈہ بستی نظام دینؒ میں ہے وہاں سے تمہیں بس مل جائے گی۔ ہم نے ٹیکسی پکڑی اور بستی نظام الدینؒ کے لاری اڈے پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے آگرہ کو سیدھی کوئی بس نہیں جاتی۔ شہر کوسی اور متھرا کو بسیں چلتی ہیں - وہاں سے ہمیں آگرہ جانے والی بس مل جائے گی۔

میں اب بڑا چوکس تھا۔ پولیس کا سپاہی نظر آتا تو میں پاروتی کو لے کر فوراً ایک طرف ہو جاتا۔ لاری اڈے پر کافی رش تھا۔ دلی میں گڑبڑ شروع ہو جانے کی وجہ سے بعض لوگ شہر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ ہمیں بھی کوسی جانے والی ایک لاری میں جگہ مل گئی۔ دوپہر کو لاری کوسی کے چھوٹے سے شہر میں پہنچی۔ یہاں ہم نے لاری اڈے پر ہی روٹی کھائی اور دوسری لاری میں بیٹھ کر متھرا کے شہر میں آ گئے۔ یہ ہندوؤں کا مشہور شہر ہے۔ یہاں بڑے مندر ہیں۔ یہاں فسادات تو نہیں ہو رہے تھے مگر فضا میں کافی تناؤ تھا۔ مسلمانوں کی بہت تھوڑی آبادی تھی جو سہمی ہوئی تھی۔ ہر طرف کانگریس کے جلوس نکل رہے تھے۔ گھروں پر آزادی کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ کانگریس کے جھنڈے تھے۔ کوسی میں بھی ہم نے یہی سماں دیکھا تھا۔

متھرا سے ہمیں کوئی دو گھنٹے بعد آگرہ جانے والی بس ملی۔ اس بس نے ہمیں
کے قریب آگرہ پہنچایا۔ آگرہ میں بھی ہندوؤں کے جلوس نکلے ہوئے تھے۔ ہندوستا
زندہ باد۔ بھارت ماتا کی جے کے نعرے ہر طرف سنائی دے رہے تھے۔ اگرچہ یہ
مسلمان کافی تعداد میں آباد تھے مگر وہ کچھ خوف زدہ سے لگ رہے تھے۔ دو دن پ
یہاں ایک محلے میں ہندوؤں نے چار مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا۔

پاروتی کہنے لگی۔

"ہندوؤں کو آزادی مل گئی ہے اب تم دیکھ لینا یہ مسلمانوں کا جینا حرام کر دی
گے۔ یہ تو پہلے ہی مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے اب تو آزاد ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"سٹیشن پر چل کر جھانسی والی گاڑی پکڑتے ہیں۔"

پاروتی نے میرے ساتھ لگ کر کہا۔

"تم گھبرانا بالکل مت۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہاری طرف کسی نے آنکھ اٹھا
کر بھی دیکھا تو میں اسے وہیں مار ڈالوں گی۔ اگر میں ناگن بن کر کسی کو پوری طر
سے ڈس دوں تو اس کا جسم اسی وقت پھٹ جائے گا۔"

ہم ابھی تک آگرہ کے لاری اڈے پر ہی بیٹھے تھے۔ وہیں ہم نے ٹی سٹال سے چائے کا ایک ایک گلاس لے کر پیا۔ ابھی سورج پوری طرح سے غروب نہیں ہوا تھا۔ دن کی روشنی ہلکی ہلکی سنہری ضرور ہونے لگی تھی۔ ہم لاری اڈے کے سائبان تلے بنچ پر بیٹھے تھے۔ دوسرے مسافر بھی ادھر ادھر اپنے اپنے سامان کو لئے بیٹھے تھے۔ ان مسافروں میں ایک گہرے سانولے رنگ کا دبلا پتلا ادھیڑ عمر دیہاتی ٹائپ کا آدمی بھی تھا جو اپنی گٹھڑی سامنے رکھے فرش پر بیٹھا تھا۔ چائے کا گلاس اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ اور وہ اسے پھونکیں مار مار کر پی رہا تھا۔ اس مسافر کی طرف میرا دھیان اس لئے گیا کہ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہمیں گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک دو بار نظریں دوسری طرف کرنے کے بعد جب دوبارہ نظریں اس پر ڈالیں تو وہ مجھے اور پاروتی کو

گھورتا ہوا نظر آیا۔ نظریں ملتے ہی اس نے آنکھیں دوسری طرف کر لیں۔ میں نے سوچا کہ یہ کوئی متعصب ہندو ہے۔ اور اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور ایک ہندو عورت کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔ مگر میں نے پاروتی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ آگرہ سے آگے دھول پور اور گوالیار تک کوئی لاری نہیں جاتی تھی۔ ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ آگرہ سے جھانسی تک ریل گاڑی میں سفر کیا جائے۔ ہمیں دلی پولیس کا زیادہ خطرہ بھی نہیں رہا تھا۔ ہم دلی سے کافی دور نکل آئے تھے۔ چائے پینے کے بعد پاروتی کہنے لگی۔

"چلو ریلوے اسٹیشن پر چلتے ہیں۔ وہاں سے معلوم کرتے ہیں کہ جھانسی کو گاڑی کس وقت نکلتی ہے۔"

ہم نے تانگہ لیا اور متھرا کے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ میری نگاہ اس دیہاتی پر تھی جو ہمیں باربار گھورتا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ متھرا کے بازاروں میں بھی ہندوستان کے آزاد ہونے کی خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ دکانوں پر کانگریس کے جھنڈے لہرائے رہے تھے۔ اس شہر میں ویسے بھی ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ تانگہ ایک آبادی سے گزرا جہاں خاموشی چھائی تھی۔ کوچوان ہندو تھا۔ کہنے لگا۔

"یہاں مسلمان رہتے ہیں۔ کل تک یہ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ آج خاموش ہیں۔ اب یہ ہمارے غلام ہیں جی۔ ہم ان کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ یہ یاد رکھیں گے۔"

میں نے آنکھیں بند کر کے دل میں دعا کی کہ یااللہ یہاں کے مسلمانوں کو یہاں کے متعصب ہندوؤں سے بچانا۔ سٹیشن پر بھی کانگریس کے جلوس نکلے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا جھانسی کو جانے والی گاڑی رات کو جاتی ہے۔ ہم وہیں مسافر خانے میں ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہندو آزادی کی خوشی میں مٹھائی بانٹ رہے تھے۔ وہ ہمارے پاس بھی آئے۔ انہوں نے مجھے بھی ہندو سمجھ کر تھوڑی سی مٹھائی دی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک

طرف سے ایک تانگہ آکر سٹیشن کے سامنے رکا۔ اس میں کچھ برقع پوش مسلمان خواتین دو مرد اور بچے سوار تھے۔ ابھی تانگہ رکا ہی تھا کہ چوک کی طرف سے ہندو غنڈوں کا ایک گروہ چھرے اور ڈنڈے لئے نعرے لگاتا نمودار ہوا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ یہ گروہ تانگے کی طرف بڑھا۔ کوچوان نے فوراً گھوڑے کو دوڑا دیا۔ ہندو غنڈے تانگے میں بیٹھی مسلمان عورتوں کو قتل کرنے کے لئے تانگے کے پیچھے دوڑے مگر خوش قسمتی ہوئی کہ تانگہ ان کی گرفت سے نکل گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"یہاں تو بلوہ شروع ہو گیا ہے۔"

وہ کہنے لگی "گھبراؤ نہیں میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دونگی۔"

مگر اندر سے میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ پاروتی ناگن بن کر زیادہ سے زیادہ ایک دو حملہ آور ہندوؤں کو ہلاک کر سکتی تھی۔ وہ مجھے ہندوؤں کے ہجوم سے نہیں بچا سکتی تھی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہی دیہاتی آدمی جو لاری اڈے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا ایک طرف سے نکل کر ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"ریلوے اسٹیشن پر ہندو غنڈوں کا حملہ ہونے والا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں میں آپ کو بچانے کے لئے آیا ہوں۔ میں گوالیار کا رہنے والا ہوں۔ یہاں آکر میں بھی پھنس گیا ہوں۔"

پاروتی اور میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ہم مسلمان ہیں؟"

وہ بولا۔ "ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو پہچان لیتا ہے۔ اپ مجھ سے بحث نہ کریں۔ اگر زندگی پیاری ہے تو میرے ساتھ آجائیں۔ یہاں رہے تو قتل ہو جائیں گے۔ مندر چوک میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگادی ہے۔ وہاں کتنے ہی مسلمان شہید ہو گئے ہیں۔"

پاروتی نے مجھ سے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ آدمی میرا ہمدرد ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ چلے چلنا چاہئے۔"

اس وقت میں بھی گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے ہندو غنڈوں کو مسلمانوں کے تانگے پر حملہ آور ہوتے دیکھ لیا تھا۔ ہم اس دیہاتی کے ساتھ چل پڑے۔ اس آدمی نے گٹھڑی بغل میں دبا رکھی تھی۔ وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ اس نے ہمیں کہہ دیا تھا کہ ہم زیادہ ادھر ادھر نہ دیکھیں۔ وہ ہمیں اسٹیشن کے عقب میں لے آیا۔ یہاں ایک طرف مکانوں کے پچھواڑے تھے اور ایک جانب کھیت تھے۔ ہم کھیتوں میں چلنے لگے۔ راستے میں ایک پیپل کا گھنا درخت آیا۔ جس کے تلے میں رام سیتا لچھمن کی مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ اور ایک سادھو بیٹھا پوجا پاٹھ کر رہا تھا۔ ہم اس کے قریب سے ہو کر گزر گئے۔ کھیت ختم ہوئے تو ریلوے لائن آگئی۔ ریلوے لائن کے پار میدان تھا۔ میدان میں سے گزرنے کے بعد وہ پراسرار دیہاتی ہمیں مٹی کے ٹیلے کے پاس لے آیا۔ جہاں کسی حویلی کا ویران کھنڈر تھا۔ پراسرار دیہاتی کہنے لگا۔

"یہاں ہم بالکل محفوظ ہیں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں تو جھانسی کی رات والی گاڑی پکڑنی ہے۔"

پراسرار دیہاتی بولا۔ "رات کو میں خود تم لوگوں کے ساتھ سٹیشن پر جاؤں گا۔ مجھے بھی گوالیار جانا ہے۔"

پاروتی نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کیا کام کرتے ہو اور متھرا میں کیسے آئے ہو؟

دیہاتی کہنے لگا۔ "بہن جی میں مسلمان ہوں۔ میرا نام عبداللہ ہے۔ میں گوالیار کے ایک گاؤں میں رہتا ہوں۔ چوڑیاں پراندے چل پھر کر بیچتا ہوں۔ مہینے میں ایک بار چوڑیاں پراندے اور رنگدار دوپٹے خریدنے متھرا آتا ہوں۔ اور رات اسی کھنڈر میں بسر کرتا ہوں۔ اس بار آیا ہوں تو متھرا میں فسادات شروع تھے۔ لاری اڈہ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ آپ لوگوں کو دیکھا۔ آپ کے چہرے مہرے سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ بھی مسلمان ہیں۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ اب ایسا ہے کہ ہم لوگ

یہاں رات ہونے تک آرام کریں گے۔ میں نے پتہ کر لیا تھا گوالیار جھانسی کو گاڑ رات گیارہ بجے کے بعد جائے گی۔ اب تم لوگ یہاں بیٹھو میں ساتھ والے گاؤں ۔ کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔"

پراسرار دیہاتی ہمیں ویران حویلی کے کھنڈر میں بٹھا کر چلا گیا۔ اس کی گٹھڑ ہمارے پاس ہی پڑی تھی۔ ہم نے کھول کر دیکھا اس میں کانچ کی چوڑیاں اور رنگ دوپٹے پراندے تھے۔

پاروتی نے پراسرار دیہاتی کی گٹھڑی باندھ کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"میری چھٹی حس کہتی ہے کہ اس آدمی کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ آخر اس نے صرف تمہاری شکل دیکھنے سے کیسے اندزہ لگا لیا کہ تم مسلمان ہو؟"

تھوڑا بہت شک میرے دل میں بھی تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے فساد زدہ علاقے میں ہم دونوں کو ایک ہی طرف سہمے بیٹھا ہوا دیکھ کر قیاس لگایا ہو کہ ہم مسلمان ہیں اور چونکہ وہ خود مسلمان ہے اس لئے اسے ہم سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہو۔ جب میں نے اس خیال کا اظہار پاروتی سے کیا تو وہ بولی۔

"تم بہت سیدھے سادے آدمی ہو۔ میرے ساتھ رہ کر اتنی مصیبتیں اٹھانے کے بعد بھی تمہیں آدمی کی پہچان نہیں آئی۔ بہرحال ہمیں اس آدمی سے ہوشیار رہنا ہو گا۔"

"وہ تو ہم ضرور ہوشیار رہیں گے۔"

پاروتی نے مجھے مشورہ دیا کہ میرے پاس جو رقم ہے وہ میں جیب سے نکال کر وہیں کھنڈر میں کہیں چھپا دوں۔ رات کو جاتی مرتبہ وہاں سے نکال لیں گے۔ اس کا یہ مشورہ مجھے پسند آیا۔ میں نے جیب سے رقم نکال کر دیکھی سو سو کے چار نوٹ اور اوپر کچھ ریزگاری اور کچھ روپے روپے کے نوٹ تھے۔ میں نے انہیں ایک رومال میں باندھ کر وہیں کونے میں ایک پتھر کے نیچے رکھ دیا۔ پھر ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد پراسرار دیہاتی بھی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لفافہ تھا کہنے لگا۔

"متھرا شہر کے پرانے علاقے میں کرفیو لگ گیا ہے۔ یہ پوری کچوریاں میں قریبی گاؤں سے لایا ہوں۔ وہاں ایک آدمی بتا رہا تھا کہ پرانے شہر میں ہندوؤں نے کئی مسلمانوں کو شہید کر دیا ہے۔ ایک مسجد کو بھی آگ لگا دی ہے۔"

پاروتی ہندوؤں کی ذہنیت کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

"مسلمانوں نے کئی سو سال تک ہندوؤں پر حکومت کی ہے۔ ہندو اب ہندوستان کے مسلمانوں سے اس کا بدلہ لے رہے ہیں۔"

پراسرار دیہاتی نے کہا "ہندو شروع ہی سے مسلمانوں کا دشمن رہا ہے۔ ہندوستان کا کون سا ایسا شہر ہے جہاں ہولی اور شب برات کے موقع پر فساد نہیں ہوتا۔ ہندو تو مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے۔"

اس دوران پراسرا دیہاتی نے لفافے میں سے پوریاں' کچوریاں اور آلو کی بھاجی نکال کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ یہ خاص ہندو کھانا تھا۔ جو مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر اس وقت مجھے بڑی بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا - "کیا تم نہیں کھاؤ گی؟"

مجھے معلوم تھا کہ ناگن بن جانے کی شکتی حاصل کر لینے کے بعد پاروتی کھانے پینے اور سونے سے بیزار ہو چکی ہے۔ وہ بولی "مجھے بھوک نہیں ہے تم لوگ کھاؤ۔"

پراسرار دیہاتی نے ایک کچوری پاروتی کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی یہ کھا کر دیکھو۔ یہ تو خاص متھرا کا تحفہ ہے۔ یہ میں مسلمان کی دکان سے لایا ہوں۔"

پاروتی نے مجبوراً کچوری لے کر کھالی۔ کچوریاں بڑی مصالحہ دار تھیں - میں تین چار کھا گیا۔ میں نے دیکھا کہ پراسرار دیہاتی صرف پوریاں کھا رہا ہے۔ کچوری کو اس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ جب میں نے اسے کچوریاں کھانے کو کہا تو وہ بولا۔

"مجھے حکیم جی نے کچوریاں کھانے سے منع کر رکھا ہے۔ مجھے شوگر کی بیماری

ہے۔"

پراسرار آدمی یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ میں پانی لاتا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پاروتی سے کہا۔

"ہم خوامخواہ اس پر شک کر رہے تھے۔ یہ تو بڑا نیک دل آدمی ہے۔"

پاروتی نے جمائی لی - میں نے کہا۔

"تمہیں تو نیند آ رہی ہے۔ یہ کیسے ہو گیا؟"

پاروتی نیند بھری آواز میں بولی۔

"معلوم نہیں۔ بڑی نیند آ رہی ہے۔"

اور وہ وہیں ایک طرف کو لڑھک گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا۔ وہ یا تو سو رہی تھی یا بیہوش ہو گئی تھی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرا سر چکرایا اور اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میرے آس پاس گھپ اندھیرا تھا۔ میرا سر ابھی تک بھاری تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے پاروتی کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اب مجھے اندھیرے میں دھندلا دھندلا دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں نہ پاروتی تھی نہ ہی وہ پراسرار دیہاتی تھا۔ میں نے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ زمین پر پوری اور کچوریوں کے خالی پتے اور لفافہ پڑا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ پراسرار دیہاتی نے کچوریوں میں بیہوشی کی دوائی ملائی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے میں اور پاروتی بیہوش ہو گئے۔ وہ ضرور کوئی خاص قسم کا سانپوں کا ماہر سپیرا تھا۔ جس نے پاروتی کو پہچان لیا تھا کہ اس عورت میں ناگن بن جانے کی شکتی ہے۔ اسی لئے وہ ہمارے تعاقب میں لگ گیا تھا۔ اور ایک خاص منصوبہ بنا کر وہ پاروتی کے بیہوش ہو جانے کے بعد اسے اٹھا کر لے گیا۔ ذرا میرا سر ہلکا ہوا تو میں کھنڈر سے باہر نکل آیا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ دور دور تک اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے اپنی چھپائی ہوئی رقم کا خیال آ گیا۔ میں دوڑ کر کھنڈر میں آیا۔ کونے میں

پتھر ہٹا کر دیکھا۔ وہاں رومال میں بندھی ہوئی ساری رقم موجود تھی۔ نوٹ اور ریزگاری رومال میں سے نکال کر اپنے کرتے کی اندر والی خاص جیب میں رکھی اور سوچنے لگا کہ مجھے اس پراسرار دیہاتی کو کہاں تلاش کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے اس نے سب جھوٹ بولا تھا کہ وہ گوالیار جارہا ہے۔ اور وہاں گاؤں گاؤں پھر کر چوڑیاں اور عورتوں کے سنگھار کی چیزیں فروخت کرتا ہے۔ مجھے پراسرار دیہاتی کی گٹھڑی یاد آگئی۔ میں واپس کھنڈر میں گیا اور جھک کر پاؤں ادھر ادھر چلاتے ہوئے اندھیرے میں اسکی گٹھڑی تلاش کرنے لگا۔ وہ مجھے ایک طرف پڑی ہوئی مل گئی۔ میں اسے باہر لے آیا۔ اسے ایکبار پھر کھول کر دیکھا۔ ستاروں کی مدھم سی روشنی میں مجھے گٹھڑی میں سوائے کانچ کی چوڑیاں اور دوپٹوں کے اور کچھ بھی نہ ملا۔ میں نے گٹھڑی کو وہیں ایک طرف پھینک دیا اور سوچنے لگا کہ اس آدمی نے ہمیں دوپہر کے وقت کچوریاں کھلا کر بے ہوش کیا تھا اور اس وقت رات ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تو اب تک بے ہوش پاروتی کو لے کر کہیں کا کہیں نکل چکا ہو گا۔ ظاہر ہے پاروتی بے ہوش ہی ہو گی۔ ہوش میں آنے کے بعد تو وہ ناگن بن کر ایک سیکنڈ میں اس آدمی کو ہلاک کر سکتی تھی اور واپس بھی آ جاتی۔ اگر وہ اب تک کھنڈر میں واپس نہیں آئی تو اس کا مطلب ہے کہ یا تو وہ ابھی تک بے ہوش ہے یا اس آدمی نے اسے مزید بے ہوشی کی کوئی [illegible] پلا دی ہو گی یا انجکشن لگا دیا ہو گا۔ اگر مجھے رات کے وقت ہوش آیا تھا تو یقیناً پاروتی کو بھی اس وقت ہی ہوش آیا ہو گا۔ اگر پراسرار دیہاتی پاروتی کو مزید دوائی یا انجکشن لگا کر بے ہوش نہیں کر سکا تو پاروتی ضرور اب تک ناگن بن کر اسے ہلاک کر چکی ہو گی اور ممکن ہے کہ میرے پاس واپس کھنڈر میں چلی آ رہی ہو۔ مگر وقت کافی نکل گیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس وقت وہ آدمی بے ہوش پاروتی کو کسی لاری یا ریل گاڑی میں ڈال کر کہاں پہنچ چکا ہو۔ وہ لاری یا ریل گاڑی کے مسافروں کو یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا تھا کہ یہ میری بیمار بیٹی ہے۔ بے ہوش ہو گئی ہے۔ اسے دوسرے شہر کے کسی خاص ہسپتال میں علاج کے لئے لے جا رہا ہوں۔

میں ایک دوراہے پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرف جاؤں۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ مجھے کھنڈر میں کچھ دیر رک کر پاروتی کا انتظار کر لینا چاہئے۔ ہو سکتا ہے اس نے ہوش میں آنے کے بعد ناگن بن کر پراسرار دیہاتی کو ہلاک کر ڈالا ہو اور اب ناگن کے روپ میں یا عورت ہی کی شکل میں کھنڈر کی طرف واپس چلی آ رہی ہو تا کہ مجھ سے دوبارہ آ کر مل جائے اور مجھے اپنی روداد سنائے۔ پاروتی کے ساتھ جو گزری تھی وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بعد میں جب پاروتی نے مجھے سارا قصہ سنایا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں ماورائیت کی دنیا میں داخل ہو چکا تھا اور اب عقل کو حیران کر دینے والے واقعات سامنے آ رہے تھے۔ میں وہیں کھنڈر کے باہر ایک طرف بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ رات بڑی حبس آلود تھی ذرا سی ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ویسے بھی مجھے اس وقت فساد زدہ شہر کی طرف جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ شہر کے کس حصے میں کرفیو لگا ہے کہاں نہیں لگا ہوا۔ سوچا رات اسی کھنڈر میں گزارنی چاہئے دن نکلے تو واپس لاریوں کے اڈے پر جا کر معلوم کروں گا کہ یہ پراسرار آدمی کون تھا۔ شاید وہاں ایک آدھ ایسا آدمی مل جائے جو اسے جانتا ہو۔ کیونکہ اب میرا جھانسی کی طرف جانا بیکار تھا۔ پاروتی کے بغیر میں جھانسی جا کر کیا کرتا۔

کسی نہ کسی طرح کبھی اونگھ کر کبھی اٹھ کر ٹہلتے ہوئے میں نے رات گزار دی۔ آسمان پر صبح کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی تو میں کھنڈر سے نکل کر متھرا شہر کی طرف چل پڑا۔ جس طرف سے وہ آدمی ہمیں لے کر آیا تھا میں اسی راستے سے ہوتا ہوا ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ یہاں دیکھا کہ سٹیشن کے باہر اور اندر سینکڑوں مرد' عورتیں' بچے' بوڑھے ہجوم کی شکل میں بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ متھرا شہر کے مسلمان ہیں جو بلوائی ہندو سکھوں سے کسی طرح جانیں بچا کر گھروں سے بھاگ کر سٹیشن پر آ گئے ہیں اور دوسرے شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔

سڑکوں پر ہندوؤں کی ٹولیاں راشٹریہ گیت گاتی گزر رہی تھیں۔ میں نے ایک ر والے سے کہا۔

"بھیا مجھے گوالیار والے لاری اڈے پر پہنچا دو۔"

وہ بولا۔ "دس روپے لوں گا۔"

میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا اور رکشے میں بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"شہر کے اندر بلوہ ہو رہا ہے۔ باہر سے لے کر جانا ہو گا۔"

وہ شہر کے باہر والی سڑک پر سے ہوتا ہوا خدا جانے کون کون سے راستوں سے رکشا نکال کر آخر اسی لاری اڈے پر پہنچ گیا جہاں میں نے پہلی بار اس پراسرار آدمی دیکھا تھا۔ لاری اڈے پر بھی مسافروں کا کافی رش تھا۔ ظاہر ہے یہ سب مسلمان تھے جان بچا کر ہندوؤں کے متعصب ترین شہر متھرا سے جانیں بچا کر دوسرے شہروں بھاگ رہے تھے۔ میں اس جگہ پر آ گیا جہاں وہ پراسرار آدمی بیٹھا گلاس میں چائے رہا تھا۔ قریب ہی چائے کا کھوکھا تھا جہاں پان سگریٹ بھی بکتے تھے۔ اوپر ہندی اور ار میں لکھا تھا۔ "جمنا داس پان سگریٹ شاپ۔"

میں نے ہندو بن کر کھوکھے والے کو نمسکار کیا اور کہا۔

"مہاراج! کل یہاں ایک آدمی زمین پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کے پاس ایک گٹھڑی بھی تھی۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ وہ آدمی کون تھا۔"

میں نے یونہی اللہ توکل اس سے یہ سوال پوچھ لیا تھا۔ کیونکہ لاری اڈے پر دن میں سینکڑوں آدمی چائے پینے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ دکاندار کس کو یاد رکھ سکے ہے۔ میری توقع کے خلاف کھوکھے والے ہندو لالے نے گلاس میں چمچ ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں اس سے کیا کام ہے بھیا؟"

مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"مہاراج! بات یہ ہے کہ کل میں نے اسی لاری اڈے پر اس آدمی سے اپنی پتنی کے لئے چاندی کی چار چوڑیاں خریدی تھیں۔ گھر جا کر معلوم ہوا کہ وہ تو لوہے کی چوڑیاں ہیں۔ ان پر چاندی کا پانی پھرا ہوا ہے۔"

کھوکھے والا ہنس کر بولا۔

"وہ بڑا نوسرباز چلتر باز ہے۔ بھیا تم مارے گئے۔ اب وہ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

میں نے لہجہ بڑا عاجزانہ بنا کر کہا۔

"مہاراج! وہ مجھ سے دھوکہ کر کے پچاس روپے لے گیا ہے۔ اگر آپ اس کا کوئی اتہ پتا بتا دیں تو میں اس سے ایک ایک پائی وصول کر لوں گا۔"

کھوکھے والا ایک گاہک سے بھی گفتگو کر رہا تھا۔ میری طرف تھوڑی دیر کے لئے متوجہ ہو کر بولا۔

"بھیا! اس کا نام رام داس ہے۔ وہ پہلے شہر کی گلیوں میں سانپوں کا تماشہ دکھایا کرتا تھا۔ یہ دھندا نہ چلا تو وہ اصلی نقلی چوڑیاں گلی گلی بیچنے لگا۔ مجھے اس کے ٹھکانے کا پتہ نہیں۔ تم ایسا کرو کہ یہاں سے کوسی پور کو جو سڑک جاتی ہے اس کے دسویں یا گیارہویں میل پر ایک ڈھکا ہوا کنواں آتا ہے۔ وہاں گنیش جی کا چھوٹا سا مندر ہے۔ اس کے پجاری سے رام داس کا پوچھ لینا شاید وہ تمہیں اس چلتر باز کا کوئی اتہ پتہ بتا دے۔"

میرے لئے یہ کافی سے زیادہ معلومات تھیں۔ میں نے لاری اڈے پر ہی چائے اور پوریوں کا ناشتہ کیا اور پوچھتا پوچھتا متھرا سے جو کوسی پور کو سڑک جاتی تھی اس پر آ گیا۔ یہ چھوٹی پختہ سڑک تھی۔ دونوں طرف درخت تھے۔ ان کے پیچھے آبادیاں تھیں۔ دس گیارہ میل کا سفر تھا۔ میں نے ایک تانگہ کرا لیا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ تانگہ سڑک پر ایک خاص رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ یہ تانگہ لاہور کے تانگوں کی طرح کا نہیں تھا بلکہ یکہ تھا جس پر سفر کرنا اپنے

آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے برابر تھا۔ لیکن سڑک پختہ تھی اس لئے ہچکولے زیادہ نہیں لگ رہے تھے۔

دسویں گیارہویں میل کے درمیان ڈھکا ہوا کنواں آگیا۔ یہ ایک بڑا سا گول کنواں تھا جس پر چھت ڈالی ہوئی تھی۔ ایک طرف سے اس کا منہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ وہاں گدی بچھا کر ایک ہندو لالہ بیٹھا لوگوں کو پانی پلاتا تھا۔ قریب ہی برگد کے گھنے درخت کے پہلو میں چھوٹا سا مندر تھا۔ مندر کے باہر کئی ایک جٹا دھاری جوگی جسم پر راکھ مل کر بیٹھے سلفہ وغیرہ پی رہے تھے۔ عورتیں ان کی حلوہ پوری سے سیوا کر رہی تھیں۔ ان میں سے دو ایک سادھو بالکل ننگے تھے۔ میں مندر کے پجاری کا پوچھ کر اس کے پاس پہنچا۔ میں نے وہاں اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا۔ پجاری کی توند واقعی بہت موٹی اور مٹکے کی طرح پھولی ہوئی تھی۔ وہ پیتل کی لٹیا پاس رکھے، مورتی کے پاس بیٹھا پوجا کرنے والوں سے پیسے وصول کر کے انہیں گیندے کا ایک ایک پھول دیتا جاتا تھا۔ جب میں نے اسے ذرا فارغ دیکھا تو اس کے پاس جا کر ہندوؤں کی طرح نمسکار کیا اور کہا۔

"مہاراج! میں گوالیار سے آیا ہوں۔ رام داس چوڑی والے کو ملنا چاہتا ہوں میرے پتا جی سخت بیمار ہیں۔ رام داس چوڑی والے کے بارے میں سنا ہے کہ اس کے پاس جوڑوں کے درد کی بڑے اچھی دوائی ہے۔ مجھے اس کا پتہ بتا دیں۔ آپ کی بڑی کرپا ہو گی۔"

پجاری نے گول گول آنکھیں گھما کر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پھر مورتی کے اوپر رتن جو کے پھولوں کا ہار چڑھاتے ہوئے کہا۔

"اسی رام داس کا پوچھتے ہو جو ناگی بھی ہے؟"

ناگی سے اس کا مطلب سپیرے سے تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں مہاراج اسی رام کا پوچھ رہا ہوں۔"

پجاری نے کہا۔

"اس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ تو ہے نہیں۔ کبھی کبھار ادھر سے گزرتا ہے۔ تم ایسا کرو

بھیا۔ یہاں سے اتر کی طرف جاؤ۔ آگے سڑک کی بائیں جانب مڑ جانا۔ رانی کی حویلی آئے گی۔ وہاں ناگیوں کے کچھ جھونپڑے ہیں۔ رام داس تمہیں وہیں ملے گا۔"

میں نے پجاری کو دھنباد کہہ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور سڑک پر آ کر شمال کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ حبس کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو گیا۔ وہیں درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ ایک سواریوں والا یکہ ادھر سے گزرا تو اس میں سوار ہو گیا اور کوچوان سے کہا۔

"بھیا جی! مجھے رانی کی حویلی کے پاس اتار دینا۔"

دیہاتی ٹائپ کی سواریوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ خدا جانے رانی کی حویلی میں کون سی پراسرار بات تھی۔ یکہ ٹک ٹک کرتا سڑک پر رواں تھا۔ میں اگلی سیٹ پر دو سواریوں کے درمیان سمٹ کر بیٹھا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد مجھے بائیں جانب ویران سے علاقے میں کچھ درختوں کے درمیان ایک پرانی عمارت نظر آئی۔ یکے والے نے یکہ روک دیا اور کہا۔

"وہ سامنے رانی کی حویلی ہے بھیا۔"

میں یکے سے اتر کر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف چلا جن کے درمیان پرانی عمارت نظر آ رہی تھی۔ پجاری نے کہا تھا کہ اس حویلی کے پاس کچھ جھونپڑیاں ہیں وہیں پراسرار دیہاتی یعنی رام داس آتا جاتا ہے۔ حویلی کھنڈر بن چکی تھی۔ بارش اور دھوپ نے شکستہ دیواریں سیاہ کر دی تھیں۔ بڑے دروازے کے دونوں پٹ غائب تھے۔ اور دیواروں کے ساتھ ساتھ اونچی گھاس اگ رہی تھی۔ میں حویلی کے قریب سے گزرا تو اندھیری ڈیوڑھی میں سے ایک کالی بلی نکل کر درختوں کی طرف بھاگ گئی۔

حویلی کے پیچھے مجھے نیم کے درختوں کے نیچے تین چار جھونپڑیاں دکھائی دیں۔ قریب گیا تو ایک بوڑھا آدمی جھونپڑی کے باہر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ ذرا پرے دو عورتیں برتن دھو رہی تھیں۔ یہ لوگ خانہ بدوش قسم کے تھے۔ میں نے بوڑھے کو نمسکار کیا۔ اس نے بھنوئیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے بابو کس سے ملنا ہے؟"

میں نے رام داس کا نام بتایا تو بوڑھے نے حویلی کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں حویلی میں دیکھو۔ وہ کل آیا تھا۔ حویلی میں تھوڑی دیر رہا۔ پھر چلا گیا۔ کیوں کیا بات ہے؟ رام داس تو سپیرا ہے۔ اس سے تمہیں کیا کام پڑ گیا بابو؟"

میں نے کہا۔ "بس ایک ضروری کام پڑ گیا تھا۔ کچھ معلوم ہے وہ کدھر گیا ہو گا؟"

بوڑھے نے سر ہلایا۔ "کچھ معلوم نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ اکیلا آیا تھا یا اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی؟"

بوڑھا مزے سے ناریل پی رہا تھا۔ بولا۔

"اکیلا تھا۔ عورت اس کے پاس کہاں سے آئے گی؟"

میں نے سوچا کہ حویلی کے کھنڈر میں چل کر دیکھنا چاہئے شاید وہاں پاروتی کا کوئی سراغ مل جائے۔ میں حویلی کی طرف چل پڑا۔ حویلی جتنی باہر سے خستہ حال تھی اس سے زیادہ اندر سے بوسیدہ اور ویران تھی۔ میں صرف اس خیال سے وہاں چلا آیا تھا کہ پراسرار دیہاتی اگر یہاں آیا تھا تو پاروتی بھی بے ہوشی کی حالت میں اس کے پاس ہی ہو گی۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی کھوج مل جائے۔ حویلی کی کوٹھڑیوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کسی کوٹھڑی کا دروازہ سلامت نہیں تھا۔ ایک طرف سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جاتی تھیں۔ میں بڑے غور سے جائزہ لیتا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل میں آ گیا۔ یہاں ایک دالان تھا۔ فرش اکھڑا ہوا تھا۔ ایک طرف برآمدہ تھا۔ پیچھے دو کوٹھڑیاں نظر آئیں جن میں سے ایک کا دروازہ غائب تھا۔ دوسری کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ دروازہ کھولا تو اندر سے لوبان کی تیز خوشبو آئی۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ دروازہ کھولنے سے دالان کی تھوڑی سی روشنی اندر پڑی۔ کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ کوٹھڑی میں مٹی کے دو مٹکوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ مٹکے درمیانے سائز کے تھے اور ان کے منہ کپڑا لپیٹ کر بند کئے ہوئے تھے۔ میں ایک مٹکے کے پاس آ کر اسے جھک کر دیکھنے لگا۔ مٹکے کے منہ پر کپڑا خوب کس کر باندھا گیا تھا۔ اس کے گرد رسی باندھ کر اسے مزید مضبوط کر دیا گیا

تھا۔ میں نے مٹکے کو ہلایا کہ کہیں اس کے اندر کوئی پرانا خزانہ نہ ہو۔ مگر اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ میں دوسرے مٹکے کے پاس آ گیا۔ اسے بھی ہلا جلا کر دیکھا۔ اندر سے مٹکے خالی لگتے تھے۔ اگر اندر کوئی شے ہوتی تو ہلانے جلانے سے ضرور آواز پیدا ہوتی مگر کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں کوٹھڑی سے نکل کر واپس دالان میں آیا تو مجھے سیڑھیوں میں دو آدمیوں کی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ دونوں آدمی باتیں کرتے اوپر آ رہے تھے۔ وہاں چھپنے کے لئے سوائے مٹکوں والی کوٹھڑی کے اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں دوڑ کر کوٹھڑی میں آ گیا۔

کوٹھڑی میں اوپر چھت کے ساتھ چھوٹی سی پرچھتی بنی ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور اچھل کر پرچھتی پر چڑھ کر اس کے اندر سمٹ سمٹا کر چھپ کر بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ دونوں آدمی دالان میں سے گزر اوپر حویلی کی چھت کی طرف چلے جائیں گے۔ مگر وہ سیدھے اسی کوٹھڑی کی طرف آئے جس کی پرچھتی میں میں چھپا ہوا تھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ دالان کی روشنی میں میں نے دو دیہاتی قسم کے کالے رنگ کے آدمیوں کو دیکھا جنہوں نے سروں پر گیروے صافے باندھ رکھے تھے۔ کندھوں پر سپیروں والے جھولے لٹک رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بین تھی۔ دونوں سپیرے لگ رہے تھے۔ وہ کوٹھڑی کے اندر آ کر مٹکوں کے پاس بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔

"دروازہ تو بند کر دو۔"

دوسرے سپیرے نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے سے دالان کی روشنی جو اندر آ رہی تھی رک گئی اور کوٹھڑی میں اندھیرا چھا گیا۔ میں بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ مجھے ڈر بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر ان لوگوں کو میری موجودگی کا علم ہو گیا تو خدا جانے میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ دونوں سپیرے ہٹے کٹے تھے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ کوٹھڑی میں کیا کرنے آئے ہیں۔ اندھیرے میں اب وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اتنے میں ایک سپیرے نے دوسرے سے کہا۔

"ارے گنگوا دیا تو جلا لے۔"

پھر ماچس کی تیلی جلانے کی آواز آئی۔ کوٹھڑی میں جلتی ہوئی دیا سلائی کی روشنی گئی۔ سپیرے نے چراغ نکال کر سامنے رکھ لیا تھا۔ اس نے چراغ روشن کر دیا۔ میں سانس روکے یہ ساری کاروائی خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جس سپیرے نے چراغ جلایا تھا وہ بین کو کپڑے سے صاف کرنے لگا۔ دوسرے سپیرے نے پہلے ایک مٹکے کا منہ کھولا۔ اندر ہاتھ ڈالا تو سانپ کی پھنکار کی آواز نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ اس نے ہاتھ مٹکے سے باہر نکالا تو ایک کالے رنگ کا سانپ اس کی کلائی سے لپٹا ہوا تھا۔ اسی طرح اس نے دوسرے مٹکے کا منہ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا اور اس میں سے بھی سانپ نکال لیا۔ پھر دونوں سانپوں کو اس نے زمین پر چھوڑ دیا۔ دونوں سانپ زمین پر آتے ہی کنڈلی مار کر ایک دوسرے کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ پہلے سپیرے نے بین بجانی شروع کر دی۔ دوسرا سپیرا رومال سے دونوں سانپوں کو چھیڑنے لگا۔ دونوں سانپوں نے پھنکارتے ہوئے اپنے پھن کھول دیئے اور بین کی آواز یا بین کے ادھر ادھر لہرانے پر جھولنے لگے۔ سانپ جھومتے ہوئے کبھی ایک دوسرے کے ساتھ لگ جاتے۔ کبھی ایک سانپ دوسرے سانپ کے گرد چکر لگانے لگ جاتا۔ یہ کھیل کوئی دس پندرہ منٹ تک جاری رہا۔ مجھے پرچھتی میں گھس کر بیٹھے بیٹھے پسینہ آنے لگا تھا۔ اب میں پہلے سے زیادہ خوف زدہ تھا۔ کیونکہ پکڑے جانے کی صورت میں یہ لوگ مجھ پر سانپ چھوڑ سکتے تھے اور وہاں میری لاش کو بھی کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

جب سانپوں کو نچانے اور رجھانے کا کھیل ختم ہوا اور سپیرے نے بین بجانی بند کر دی اور دوسرے سپیرے نے سانپوں کو اٹھایا اور باری باری اپنے اپنے مٹکوں میں بند کر کے اوپر کپڑا لپیٹ دیا۔ پھر دونوں جلتے ہوئے دیئے کے پاس بیٹھ گئے اور بیڑیاں نکال کر پینے لگے۔ ایک سپیرے نے کہا۔

"چھجو بھائی! رام داس قسمت کا بڑا دھنی نکلا۔ سنا ہے ناگن ماتا کی کوئی ناگن عورت اس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔"

دوسرے سپیرے نے بیڑی کا کش لگا کر کہا۔

"سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر یقین نہیں آیا۔ کہاں رام داس چور اچکا سپیرا اور کہاں ناگن ماتا کی ناگن عورت۔۔۔۔"

پہلے سپیرے نے کہا۔

"ارے رام داس تو مہیشور میں اہلیا بائی کی چھتری والی سادھ میں چلہ کاٹ رہا ہے کہ ناگن عورت کی شکتی اس میں آ جائے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھے کبھی یقین نہیں تھا کہ اس ویران حویلی کی پرچھتی میں چھپے چھپے گوہر مراد مل جائے گا اور پراسرار دیہاتی سپیرے اور پاروتی کا سراغ معلوم ہو جائے گا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سننے لگا۔ مگر اس کے بعد وہ کچھ دیر بیٹھ کر دوسرے سپیروں کی باتیں کرتے رہے اور پھر دیا بجھا کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ وہ دروازہ بند کر گئے تھے۔ میں پرچھتی سے نیچے اترا اور سوچنے لگا کہ یہ مہیشور کہاں ہے جہاں اہلیا بائی کی چھتری والی سادھ ہے کیونکہ پاروتی کی تلاش میں اب مجھے وہاں جانا تھا۔

میں حویلی سے نکلا اور متھرا کو جانے والی سڑک پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے ایک سواریوں والے یکے میں بیٹھ کر متھرا شہر واپس آ گیا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میشور نام کا شہر کہاں ہے جہاں اہلیا بائی کی چھتری والی سادھ ہے۔ یہ معلومات مجھے ریلوے سٹیشن سے ہی مل سکتی تھیں۔ چنانچہ میں متھرا کے ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔ وہاں انکوائری سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ پہلے مجھے کھنڈوہ جانا پڑے گا۔ وہاں سے کھرگون جانا ہو گا۔ کھرگون میں دریائے نربدا کے کنارے سے ریاست ہلکر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ ریاست کی سرحد پر پہلا شہر میشور آتا ہے۔ اسی شہر کے باہر ایک پہاڑی پر اہلیا بائی کی چھتری والی سادھ ہے۔ یہاں ایک پرانا قلعہ بھی ہے۔ ریلوے کے انکوائری کلرک نے بتایا کہ کھنڈوہ جانے والی گاڑی شام کو پیچھے دلی سے آئے گی۔ جتنی معلومات کی مجھے ضرورت تھی وہ مجھے مل گئی تھیں۔ سب سے پہلے مجھے کھنڈوہ جانا تھا۔ ست پڑا کے جنگلاتی علاقے میں واقع یہ شہر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں وہیں سٹیشن پر ہی بیٹھ گیا۔ دوپہر کا کھانا بھی سٹیشن پر ہی کھایا۔ سٹیشن پر اب قدرے امن امان تھا۔ فسادات کی وجہ سے شہر کے جو مسلمان خاندان گھر بار چھوڑ کر سٹیشن پر آ گئے تھے وہ دوسرے شہروں کو جا چکے تھے۔

سٹیشن پر بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی۔ ٹکٹ والی کھڑکی کھل گئی۔ میں نے متھرا سے کھنڈوہ تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا اور جس پلیٹ فارم پر گاڑی کو آنا تھا وہاں آ کر

گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ کم بخت گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ میں بیٹھا رہا۔ آخر شام کے کوئی سات سوا سات بجے گاڑی آئی۔ گاڑی میں بہت زیادہ رش تھا۔ دلی میں بھی فسادات شروع ہو چکے تھے۔ وہاں سے اور آس پاس کے علاقوں سے مسلمان بھاری تعداد میں بمبئی کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ میں بھی ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ متھرا سے کھنڈوہ تک کا بڑا لمبا سفر تھا۔ راستے میں گوالیار آیا۔ جھانسی آیا۔ بھوپال آیا۔ ہوشنگ آباد آیا۔ اس طرح سفر کرتے کرتے گاڑی ایک رات اور ایک دن کے سفر کے بعد دوسرے دن رات کے ایک بجے جا کر کہیں کھنڈوہ پہنچی۔ اس طرف حالات بڑے پرسکون تھے۔ مشرقی پنجاب دلی اور متھرا کے مقابلے میں یہاں کافی امن امان تھا۔ اگرچہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے کی یہاں بھی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ مجھے ہندوستان اور اس کی آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی میں تو پاروتی کی تلاش میں وہاں آیا تھا اور اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خدا کرے جہاں میں جا رہا ہوں وہ مل جائے۔ سٹیشن پر سے ہی میں نے کھرگون اور میشور شہر کے بارے میں معلوم کیا کہ وہاں سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ مجھے ساری معلومات مل گئیں۔ مجھے کھنڈوہ سے بس میں سفر کر کے کھرگون اور وہاں سے میشور پہنچنا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

میں وہیں مسافر خانے میں ایک طرف پڑ کر سو گیا۔ صبح کافی دن چڑھے آنکھ کھلی۔ ریلوے کے ریفریشمنٹ روم کے غسل خانے میں جا کر نہایا۔ سٹیشن کی کنٹین پر آ کر تھوڑا بہت کھایا پیا اور پتہ کرتے کرتے اس لاری اڈے پر آ گیا جہاں سے کھرگون اور میشور کو بسیں جاتی تھیں۔ یہ پرانی قسم کی کھڑکھڑا ٹائپ کی لاریاں تھیں ان کی چھتوں پر بھی مسافر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک بس کھرگون قصبے کی طرف جا رہی تھی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ آدھ گھنٹے بعد کھرگون پہنچا۔ وہاں سے ایک دوسری بس پکڑی اور دریائے نربدا کے کنارے پر آباد میشور پہنچ گیا۔

یہ ریاست ہلکر کا ایک بڑا قصبہ تھا۔ شہر نہیں تھا۔ کچے پکے مکان تھے۔ آبادی

ٹیلوں پر اور ٹیلوں کے دامن میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ قصبہ اپنے پرانے قلعوں اور محلوں اور باؤلیوں کے کھنڈرات کی وجہ سے بہت مشہور ہے او سارا سال سیاح یہاں آتے رہتے ہیں۔ میں نے اہلیا بائی کی سمادھ کا ایک آدمی سے پوچھا۔ اس نے دور ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"وہ چھتری دیکھ رہے ہو ناں۔ بس وہی اہلیا بائی کی چھتری والی سمادھ ہے۔"

یہ سمادھ ایک پہاڑی پر واقع ہے اور راستہ درختوں کھیتوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ میں اسی وقت سمادھ کی طرف چل پڑا۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر بنے ہوئے مکانوں کی چھتیں ٹین کی تھیں۔ کہیں کہیں سرخ کھپریل کی ڈھلواں چھتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں پیدل چلا جا رہا تھا۔ کھیت ختم ہوئے تو جنگلی جھاڑیاں شروع ہو گئیں - پھر درختوں کے جھنڈ آ گئے۔ ان کے آگے دریائے نربدا بہہ رہا تھا۔ اس دریا کو وہاں نربدا ندی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دریا کا پاٹ ہمارے پنجاب کی کسی بڑی نہر جتنا ہی تھا - اوپر ایک پل بنا ہوا تھا۔ ایک طرف گھاٹ بھی تھا جہاں سے کشتیاں دوسرے کنارے پر جاتی تھیں۔ میں پل پر سے ہو کر دریا کے دوسرے کنارے پہنچا۔ وہاں سے اس پہاڑی کی چڑھائی شروع ہو جاتی تھی جس کے اوپر اہلیا بائی کا سمادھ تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر سمادھ کی چھتری دکھائی دے رہی تھی۔

پہاڑی چھوٹی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹے میں میں اوپر پہنچ گیا۔ یہ سمادھ وہاں کے لوگوں کے مطابق راجہ ہلکر کی بیوی کا تھا مگر اس کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ یہ صدیوں پرانی عمارت تھی۔ عمارت کی ایک جانب چھوٹا سا میوزیم بھی تھا جہاں شیشے کے شو کیسوں میں نوادرات رکھے ہوئے تھے۔ سیاح ان کی تصویریں اتار رہے تھے۔ میں محتاط ہو کر چل پھر رہا تھا۔ اگر پراسرار دیہاتی سپیرا یہاں موجود تھا تو وہ مجھے دیکھ کر وہاں سے فرار بھی ہو سکتا تھا اور پاروتی جس حالت میں بھی اس کے ساتھ تھی وہ اسے اپنی ساتھ بھگا کر لے جا سکتا تھا۔ میں سیاحوں کے درمیان چہرہ چھپانے کی کوشش کرتا ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں سوائے غیر ملکی سیاحوں اور دو ایک گارڈز کے اور کوئی

آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ اگر پراسرار سپیرا رام داس یہاں آ چکا ہے تو وہ کہاں ہو گا؟ یہاں کونسی جگہ ایسی ہے کہ جہاں وہ پاروتی کی طاقت حاصل کرنے کے لئے چلہ کاٹ رہا ہے؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور ان کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بہرحال مجھے پراسرار سپیرے کو ہر حالت میں تلاش کرنا اور اس کے قبضے سے پاروتی کو آزاد کرانا تھا۔ میں عمارت کی پچھلی طرف آ گیا۔ یہاں پہاڑی کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا گلی نما راستہ سمادھ کی عمارت کے شمال کی طرف کسی قلعے کے کھنڈر کی طرف جاتا تھا۔ اس راستے کی دونوں جانب پتھر کی مورتیاں ایستادہ تھیں۔ یہ ساری کی ساری مورتیاں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ ان کی شکلیں غیر انسانی تھیں۔ ایک مورتی کی پتھر کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ میرے دل میں اس مورتی کو توڑنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ میں وہیں رک گیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا کہ وہاں کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا۔ یہ تنگ راہ داری ساری خالی پڑی تھی۔ میں نے مورتی کی زبان کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا۔ مگر وہ تو پتھر کی تھی۔ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلی۔ فرش پر ایک جگہ پتھر پڑا تھا۔ میں نے پتھر اٹھا لیا۔ سوچا سب سے پہلے اس کافر مورتی کی زبان توڑتا ہوں۔

میں نے پتھر زور سے مورتی کی زبان پر مارا۔ مورتی کی زبان اس ضرب سے تھوڑی سی ٹوٹ گئی۔ میں دوسری ضرب لگانے لگا تو اچانک مورتی کے پاؤں کے نیچے پتھر کی دیوار کی ایک سل اپنی جگہ سے گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ پہلے تو میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر غور سے اس چوکور روشندان کی طرح کے سوراخ کو دیکھنے لگا جو دیوار میں فرش سے تھوڑا اوپر نمودار ہو گیا تھا۔ میں نے جھک کر سوراخ کے اندر دیکھا۔ اندر سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں اور وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے نیچے کوئی تہہ خانہ ہو جہاں پاروتی بے ہوش یا قید میں پڑی ہو۔ یہ خیال قدرت کی طرف سے میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے اللہ

کا نام لیا اور سوراخ میں داخل ہو کر دیوار کو پکڑ پکڑ کر دو تین سیڑھیاں نیچے اتر گیا۔ جیسے جیسے نیچے اتر رہا تھا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا تھا۔ سیڑھیاں بھی نیچے اترتی جا رہی تھیں۔ میں نے ہمت نہ ہاری۔ دل کو مضبوط کیا۔ دل میں کلمہ شریف پڑھا اور ساری سیڑھیاں اتر گیا۔ میرے پاؤں فرش کے ساتھ ٹکرائے۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ واقعی مجھے اپنے ہاتھ بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں ٹٹول کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور اندھیرے میں جتنی آنکھیں کھول سکتا تھا کھول کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر مجھے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ سوچا خوامخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ مجھے واپس چلے جانا چاہئے۔ اوپر دیکھا۔ سیڑھیوں کے اوپر جو روشندان نما چوکور سوراخ تھا وہ شاید اپنے آپ بند ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس میں سے دن کی روشنی اندر نہیں آ رہی تھی۔ میں واپس جانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف مڑنے لگا تو مجھے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے سسکی بھری ہو۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مگر میں اندھیرے میں تہہ خانے کی دیوار کے ساتھ لگ کر وہیں کھڑا رہا۔ اچانک دوسری بار پھر سسکی بھرنے کی آواز آئی۔ میں نے سانس روک لیا اور اپنے کان آواز پر لگا دیئے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ سسکی کی آواز کس کی ہو سکتی ہے۔ تیسری بار سسکی کی آواز سسکار میں بدل گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جیسے کوئی سی سی کر رہا ہو۔ پھر سسکاروں کے درمیان پھنکار کی آواز سنائی دی۔

دہشت کے مارے مجھے پسینہ آ گیا۔

یہ یقیناً کوئی زہریلا سانپ تھا جس نے اندھیرے میں مجھے دیکھ لیا تھا اور اب سسکارتا پھنکارتا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں تیزی سے اندازہ لگا کر سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ عین اسی وقت مجھے کسی کے گہرا سانس بھرنے اور کسی کو پکارنے کی آواز سنائی دی۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔ میں نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ پاروتی کی آواز تھی۔ میں نے فوراً بلند آواز میں کہا۔

"پاروتی! تم کہاں ہو؟"

اس اندھیرے تہہ خانے کی چھت یقیناً اونچی تھی۔ کیونکہ میری آواز نے کافی گونج پیدا کی تھی۔ دوسری جانب سے مجھے پاروتی نے کمزور اور نحیف آواز میں میرا نام لیا۔

"انور! انور! یہاں آؤ"

اب میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ میں نے پاروتی کو اپنا نام انور بتایا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ میرا نام نہیں ہے۔ محبت، جنگ اور پردیس میں آدمی کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔

پاروتی کی آواز نے مجھے ایک دم شیر دل بنا دیا۔ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

"تم کہاں ہو؟"

پاروتی کی آواز آئی۔

"آ جاؤ۔ آ جاؤ۔ تہہ خانے میں۔۔۔>

وہ رک رک کر بول رہی تھی جیسے اسے بڑی کوشش کر کے بولنا پڑ رہا ہو۔ آواز بھی کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آگے کوئی دوسرا تہہ خانہ بھی تھا۔ میں دیوار کو ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ایک جگہ دیوار ختم ہو گئی۔ میں وہیں بیٹھ کر ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا۔ نیچے ایک اور سیڑھی تھی۔ میں سیڑھیاں اتر گیا۔ یہ پتھر کی سیڑھیاں تھیں اور چار پانچ ہی تھیں۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو آگے پتھریلا فرش تھا۔

پاروتی کی سسکار کی آواز برابر آ رہی تھی اور میں اسی آواز کی سمت آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اندھیرے تہہ خانے کے فرش پر پاؤں کے بل بیٹھا تھا۔ میں نے آواز دی۔

"پاروتی! تم کہاں ہو؟ میں تہہ خانے میں پہنچ گیا ہوں۔"

ایک لمبی سسکار کے ساتھ پاروتی کی کمزور اور رکتی ہوئی آواز آئی۔

"میں پٹاری میں بند ہوں۔ میں ناگن کی شکل میں ہوں۔"

میرے خدایا۔ بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا

اور اندھیرے میں دیوار کو تلاش کر کے اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ میرے پاؤں فرش پر رکھی کسی چیز سے ٹکرائے۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور ہاتھوں کو بڑھا کر ٹٹولا۔ یہ پٹاری تھی جس کے اوپر پتھر کی سل رکھی ہوئی تھی۔

"پاروتی! کیا اسی پٹاری میں تم قید ہو؟"

"ہاں" پاروتی نے آہ بھر کر کہا۔

میں نے سل کو ہٹا دیا۔ پٹاری کے اندر ہاتھ ڈالا۔ میری انگلیاں ایک سانپ کے لچکیلے جسم سے ٹکرائیں۔ ساتھ ہی پاروتی کی آواز آئی۔

"آہ انور! خدا نے تمہیں میری مدد کے لئے بھیج دیا۔ مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔ جلدی کرو۔ سپیرا آ گیا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے سانپ کو جو اصل میں پاروتی ناگن کے روپ میں تھی پٹاری میں سے نکال کر اپنی کلائی کے گرد لپیٹا اور اندھیرے میں دیوار کا سہارا لئے راہ بناتا پہلے ایک تہہ خانے سے نکلا پھر دوسرے تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر مورتی والے چوکور سوراخ میں سے باہر روشنی میں آ گیا۔ تنگ گلی بالکل خالی تھی۔ میں نے دن کی روشنی میں پاروتی کو دیکھا۔ وہ نسواری رنگ کے سانپ کے روپ میں تھی اور نڈھال نظر آ رہی تھی۔ اس کا پھن سمٹا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے پاروتی کہ میں عین وقت پر آ گیا۔ میں اسی دن سے تمہاری تلاش میں تھا جب سے تم رانی کی حویلی میں سے غائب ہوئی ہو؟"

پاروتی کہنے لگی۔ "یہ میری تم سے محبت ہے جس نے مجھے اتنی طاقت عطا کر دی ہے کہ میں ناگن بن کر بھی تم سے انسانی آواز میں بات کر سکتی ہوں۔ ورنہ شروع میں مجھے بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ اب یہاں سے نکل چلو۔"

میں نے اسے کہا۔

"تم انسانی شکل میں واپس کیوں نہیں آ جاتیں۔ تم تو عورت سے ناگن اور ناگن سے عورت بن سکتی ہو۔"

ناگن پاروتی نے سرد سسکار بھر کر کہا۔

"میری یہ طاقت اس سپیرے نے ختم کر دی ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم اب کبھی انسانی شکل میں واپس نہ آ سکو گی۔"

پاروتی کی آواز آئی۔

"یہ ساری باتیں تمہیں پھر کسی وقت بتاؤں گی پہلے یہاں سے بھاگ چلو۔ اور مجھے چھپا لو۔"

ناگن پاروتی سانپ کی شکل میں فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ لمبی نہیں تھی۔ میں نے اسے قمیض کے اندر ڈال کر قمیض کے بٹن بند کر لئے۔ ناگن پاروتی میری کمر کے گرد لپٹ گئی تھی۔ وہاں سے اہلیا بائی کی سادھ والی عمارت کی طرف آنے کی بجائے میں پتھر کی مورتیوں والی گلی میں آگے چل پڑا۔ آگے ایک پرانے قلعے کا کھنڈر نظر آ رہا تھا۔ وہاں سے ڈھلان پر بنی ہوئی پتھریلی سیڑھیاں پہاڑی سے نیچے جا رہی تھیں۔ میں ان سیڑھیوں پر سے نیچے اترنے لگا۔ اس وقت آسمان پر بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لگتا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔ میں جس مقصد کی خاطر میشور آیا تھا وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اب وہاں میرا کوئی کام نہیں تھا۔

پاروتی نے قمیض کے اندر سے پوچھا۔

"یہ کونسی جگہ ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ ہم اس وقت کھنڈوہ سے کافی دور دریائے نربدا کے کنارے آباد میشور نام کے شہر میں ہیں اور سپیرے نے اسے پہاڑی پر واقع اہلیا بائی کی سادھ کے کھنڈر کے ایک تاریک تہہ خانے میں قید کیا ہوا تھا۔ پاروتی نے کمزور آواز میں کہا۔

"میرے خدا نے مجھے بچا لیا۔ انور! تمہارا خدا اب میرا خدا بھی ہے۔ میں نے ہندوؤں کے بھگوان کو چھوڑ دیا ہے۔"

میرے لئے یہ بڑی خوشی کی بات تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"خدا تمہیں سیدھی راہ پر ضرور لے آئے گا۔ تم مظلوم اور بے گناہ عورت ہو۔"

میں ساتھ ساتھ پہاڑی پر بنی ہوئی بے ترتیب سیڑھیاں بھی اترتا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا تمہیں اس ذلیل سپیرے نے ناگن بنا دیا ہے۔ اگر تم اپنی مرضی سے ناگن بنی ہو تو انسانی روپ میں کیوں نہیں آتیں؟؟"

پاروتی نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

"میری روح تھکی ہوئی ہے انور! ابھی مجھ سے خدا کے لئے کچھ نہ پوچھو۔ سب سے پہلے مجھے کسی جگہ تھوڑا سا دودھ لے کر پلاؤ۔ مجھ پر سپیرے کے منتروں کا بہت شدید اثر ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ میں دودھ کا بندوبست کرتا ہوں۔"

پہاڑی سے نیچے اترنے کے بعد میں اس جانب چلنے لگا جدھر میشور نامی قصبے یا چھوٹے شہر کی آبادی نظر آ رہی تھی۔ خود مجھے بھی بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں آبادی کے ایک چھوٹے سے بازار میں آ گیا۔ یہاں دکانیں کھلی تھیں۔ ایک جگہ مجھے ایک دکان کے باہر ویشنو بھنڈار لکھا ہوا نظر پڑا۔ یہ چھوٹا سا ویشنو ہوٹل تھا جہاں صرف دال سبزیاں ہی پکتی تھیں۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ ہوٹل ایک دکان کی طرح کا تھا۔ اندر تین چار میزیں بچھی تھیں۔ میں کونے والی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ اپنے لئے چاول اور سبزی منگوائی اور پاروتی کے لئے دودھ کا ایک کپ بھی منگوایا۔ ہوٹل کے ملازم نے مجھ سے پوچھا۔

"صاحب آپ کھانے کے ساتھ دودھ پیئے گا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں یہ میری عادت ہے۔"

نوکر ایک تھالی میں ابلے ہوئے چاول اور سبزی ڈال کر لے آیا۔ ساتھ ایک کپ میں دودھ لا کر اس نے میز پر رکھ دیا۔ دکان میں صرف ایک گاہک اس وقت بیٹھا کھانا

کھا رہا تھا جس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے دودھ کا کپ نیچے فرش پر میز کے قریب ہی رکھا اور پاروتی سے آہستہ سے کہا۔

"میں نے دودھ کا کپ نیچے رکھ دیا ہے۔"

اور موقع دیکھ کر پاروتی کو قمیض کے اندر سے نکالا اور چپکے سے نیچے میز کے پاؤں کے پاس رکھ دیا۔ پاروتی کے سانپ نے اپنا منہ کپ میں ڈالا اور دودھ پینا شروع کر دیا۔ میں چاول کھانے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ جتنی دیر تک پاروتی ناگن دودھ پیتی رہی ہوٹل کا کوئی ملازم ادھر نہ آیا۔ جب دودھ کا کپ خالی ہو گیا تو میں نے ایک ہاتھ نیچے ڈال کر سانپ کو اٹھایا اور اپنی قمیض کے اندر ڈال کر خاموشی سے چاول کھانے میں مصروف ہو گیا۔ سانپ اپنے آپ میری کمر کے گرد لپٹ گیا۔ پاروتی کی آواز آئی۔

"اب مجھے اپنے اندر کچھ توانائی محسوس ہونے لگی ہے۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اس وقت میں تم سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ نوکر ادھر آ رہا ہے۔"

ہوٹل کا ملازم میرے پاس آ کر بولا۔

"صاحب کچھ اور چاہیئے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔۔۔"

ملازم ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"صاحب دودھ کا کپ کہاں چلا گیا؟"

میں نے جلدی سے نیچے فرش پر سے کپ اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

"لے جاؤ۔ میں نے دودھ پی لیا ہے۔"

نوکر حیران ضرور ہوا کہ آخر مجھے دودھ پینے کے بعد خالی کپ فرش پر رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے کھانا کھا کر ہاتھ دھوئے۔ ہوٹل والے کو بل ادا کیا اور باہر سڑک پر آ گیا۔ بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ پاروتی نے میری قمیض کے اندر سے پوچھا۔

"کیا مینہ پڑنے لگا ہے؟ مجھے بارش کے پانی کی خوشبو آ رہی ہے۔"

سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے۔ میں نے موقع دیکھ کر پاروتی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہاں لوگ ہیں۔ کچھ دیر کے لئے خاموش رہو۔"

وہ چپ ہو گئی۔ بوندا باندی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ میں سیدھا بسوں کے اڈے پر آ گیا۔ یہاں سے بس میں بیٹھا اور کھنڈوہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔ اس دوران بس راستے میں دو دفعہ رکی۔ میں بس سے اتر کر تنہا جگہ دیکھ کر پاروتی سے دو چار باتیں کر لیتا۔ وہ بار بار یہی کہتی کہ جس طرح بھی ہو سکے اس علاقے سے نکل جاؤ۔ سپیرا ضرور ہماری تلاش میں ہو گا۔ کھنڈوہ میں بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ یہ بوندا باندی سارا رستہ جاری رہی تھی۔ ریلوے سٹیشن پر آ کر میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ یہاں میرے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے پاروتی سے پوچھا کہ اب ہمیں کس طرف جانا چاہئے۔ وہ بولی۔

"یہاں سے مجھے ناگ پور لے چلو۔ وہاں چل کر تمہیں بتاؤں گی کہ سپیرے نے مجھ پر جو منتر پھونکا ہوا ہے اس کا توڑ کیا ہو گا اور میری طاقت کیسے واپس آئے گی۔"

ناگ پور کو گاڑی دو گھنٹے بعد جاتی تھی۔ یہ وقت میں نے وہیں سٹیشن پر گزارا۔ مجھے ٹرین کا ایک ہی ٹکٹ لینا تھا۔ میں ٹکٹ لے کر ٹرین میں بیٹھ گیا۔ ناگ پور وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ ٹرین نے دوسرے روز مجھے ناگ پور پہنچایا۔ سٹیشن کے پاس ہی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں میں نے ایک کمرہ لے لیا=۔ یہاں میں نے قمیض کے اندر سے ناگن پاروتی کو نکال کر پلنگ پر رکھ دیا۔ وہ نسواری رنگ کے سانپ کی شکل میں تھی۔ کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔ یہاں ایک بار پھر اس نے دودھ منگوا کر پیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے کہ اس کی طاقت اسے واپس مل جائے۔

ناگن پاروتی نے کہا۔

"اس شہر کے جنوب میں ایک شمشان گھاٹ ہے جہاں ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔ تم وہاں جا کر پتہ کرو کہ وہاں کسی مردے کو کب جلایا جائے گا۔ میں اس

کمرے میں ہی رہوں گی۔"

میں نے اسے تاکید کی وہ کسی جگہ چھپ کر بیٹھے۔ اس کے بعد میں ہوٹل سے نکلا اور شہر کے جنوب کی طرف نکل گیا۔ پوچھتا پوچھتا میں شمشان گھاٹ پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ رات کو ایک مردے کو جلایا جائے گا۔ میں نے واپس آ کر پاروتی کو بتا دیا۔ وہ کہنے لگی۔

"مجھے ساتھ لے کر رات کے وقت شمشان گھاٹ چلنا ہو گا۔"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں ہوٹل کے کمرے میں ہی رہا۔ جب رات ہو گئی تو میں پاروتی کو قمیض کے اندر چھپا کر شمشان گھاٹ کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہلے سے ایک مردے کو جلایا جا رہا تھا۔ چتا میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دو آدمی لمبی لمبی سلاخوں سے جلتی ہوئی لکڑیوں کو ہلا جلا رہے تھے۔ میں نے پاروتی کو اپنی کلائی پر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ گردن اٹھا کر چتا کے شعلوں کو تک رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"جب یہ دونوں آدمی جلتی ہوئی لاش کے قریب سے چلے جائیں تو مجھے چتا کے پاس لے چلنا۔"

میں شمشان گھاٹ میں ایک جگہ اندھیرے میں درختوں کے نیچے بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ آدمی کب چتا سے الگ ہوتے ہیں۔ چتا کے شعلے آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگے تھے۔ تب دونوں آدمی وہاں سے چلے گئے۔ پاروتی بھی میری کلائی سے لپٹی چتا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"آگ کو مدھم ہو لینے دو۔"

کوئی ایک گھنٹے بعد چتا کی آگ صرف انگاروں کی شکل میں باقی رہ گئی۔ پاروتی نے کہا۔

"اب مجھے چتا کے پاس مردے کے سرہانے کی طرف لے چلو۔"

میں چتا کے پاس مردے کے سر کی جانب کوئی دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر آ کر بیٹھ گیا۔ پاروتی کہنے لگی۔

"تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔ چتا کے پاس جاؤ اور وہاں سے تھوڑی سی راکھ ک
چیز میں رکھ کر لے آؤ۔"

وہاں کوئی برتن وغیرہ تو تھا نہیں - راکھ گرم تھی۔ میں نے پاروتی کو وہیں زمین رکھ دیا اور اندھیرے میں جھک کر ایک گرا ہوا درخت کا چوڑا پتا اٹھایا اور جھک کر چ ہوئے چتا کے پاس آ گیا۔ یہاں آگ کی بڑی گرمی تھی۔ جس طرح سے بھی ہو سکا م نے چتا کی تھوڑی سی راکھ پتے پر رکھی اور پارتی کے پاس لے آیا۔ پاروتی بولی۔

"اسے زمین پر رکھ دو۔"

میں نے راکھ والا پتا زمین پر رکھ دیا۔ ہمارے اردگرد اندھیرا اور خاموشی تھی صرف چتا کے آس پاس انگاروں کی ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ پاروتی نے جو سان کی شکل میں تھی راکھ والے پتے کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ میں اندھیر میں ایک طرف بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ تک وہ راکھ کے گرد چکر لگا رہی۔ اس کے بعد اس نے پھن کھول دیا اور راکھ کے پاس منہ لے جا کر زور سے پھنکاری ماری راکھ اڑ کر اس کے جسم پر پڑی۔ پاروتی راکھ میں لوٹ پوٹ ہونے لگی پھر وہ رینگتی ہوئی میرے پاس آئی اور انسانی آواز میں بولی۔

"مجھے میری طاقت واپس مل گئی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ ناگن سے انسانی شکل میں واپس آ گئی۔

پاروتی انسانی شکل میں میرے سامنے کھڑی تھی۔

اندھیرے میں وہ مجھے پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم انسانی شکل میں واپس آ گئیں۔"

وہ اپنے کھلے بالوں کو باندھتے ہوئے بولی۔

"اب ہمیں اس قسم کے سپیروں سے بڑا محتاط رہنا ہو گا۔ یہ کوئی معمولی سپیرا نہیں تھا۔ اس کے پاس منتروں کی زبردست طاقت تھی۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں ناگن بن کر ہوٹل میں میرے ساتھ جانا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہوٹل والوں کو معلوم ہو جائے کہ میرے ساتھ ایک عورت بھی ہوٹل میں آئی ہے۔"

پاروتی کہنے لگی۔ "تم نے ٹھیک سوچا ہے۔ میں ناگن کی شکل میں ہی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

دوسرے لمحے پاروتی نے دوبارہ ناگن کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے اسے قمیض کے اندر چھپایا اور ہوٹل میں واپس آ گیا۔ کمرے میں آ کر میں نے دروازے کو اندر سے چٹخنی لگائی۔ بتی جل رہی تھی۔ میں نے پاروتی کو نکال کر پلنگ پر رکھ دیا۔ وہ اسی وقت اپنی اصلی شکل میں واپس آ گئی۔ میں اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگی۔

"تم نے میری خاطر بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ تم نے میرے ساتھ دوستی کا پورا ح نبھایا ہے مگر اب میں نہیں چاہتی کہ تم میری خاطر اپنے آپ کو کسی مصیبت میں ڈالو۔"

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تمہیں تمہارے شہر میں پہنچا کر میں واپس بنگال کے جنگلوں کی طرف نکل جاؤں۔ میں اکیلی ہی سنتھالی سپیروں سے انتقام لوں گی۔ تمہیں اب میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

دل تو میرا بھی یہی چاہتا تھا کہ واپس اپنے شہر اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے پاس پاکستان چلا جاؤں۔ پاکستان بن چکا تھا۔ میں نئی اسلامی مملکت کی خوشیوں میں شریک ہو چاہتا تھا لیکن پاروتی کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ اسے اکیلا چھوڑنے کو دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"پاروتی! میں تو کسی بھی وقت تم سے الگ ہو کر اپنے نئے وطن پاکستان جا سکتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو کم از کم تمہیں سنتھالی سپیروں کے علاقے میں چھوڑ کر واپس جاؤں۔"

پاروتی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"نہیں انور! تمہیں اپنے ماں باپ سے بچھڑے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ اور اب تو آزاد اسلامی ملک پاکستان بھی بن چکا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم پاکستان اپنے ماں باپ کے پاس چلے جاؤ اور نئے اسلامی ملک پاکستان کی ترقی کے واسطے کام کرو۔"

میں نے اسے کہا کہ میرا بھی دل یہی چاہتا ہے کہ ہمارا نیا اسلامی ملک پاکستان بن گیا ہے میں وہیں جا کر اپنے نئے ملک کی ترقی اور خوشحالی کے واسطے جو کچھ بھی کر سکتا ہوں کروں مگر تمہیں اکیلا چھوڑنا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس کے جواب میں پاروتی کہنے لگی۔

"تم میری فکر نہ کرو۔ میں اب اکیلی نہیں ہوں۔ میرے پاس خدا کی دی ہوئی ایک طاقت بھی ہے جو مصیبت کے وقت میرے کام آئے گی۔"

"مگر جس طرح اس پراسرار دیہاتی سپیرے نے تمہیں اپنے قبضے میں کر لیا تھا اسی طرح کوئی اور طاقتور سپیرا بھی تمہیں اپنے پھندے میں پھنسا سکتا ہے۔ پھر تم کیا کرو گی؟"

پاروتی نے کہا۔

"اب ایسا نہیں ہو گا۔ کم از کم کسی انسان سپیرے میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ اب مجھے قابو کر سکے۔ یہ تو کوئی دیوتا ہی ایسا کر سکتا ہے اور میں ہندوؤں کے دیوتاؤں پر یقین نہیں رکھتی۔ کوئی دیوتا وغیرہ نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا۔

"پاروتی! اگر تم دیوی دیوتاؤں اور مورتی پوجا وغیرہ کو نہیں مانتی ہو تو پھر تم اسلام قبول کیوں نہیں کر لیتی؟"

پاروتی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میرے اندر ایک زبردست تبدیلی آ چکی ہے۔ ہو سکتا ہے میں اندر سے مسلمان ہو گئی ہوں لیکن میں زبان سے اس کا اعتراف ایک خاص وقت آنے پر کروں گی۔ اب تم سو جاؤ مجھے تو نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں جاگ کر تمہاری حفاظت کروں گی۔"

پاروتی صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ صبح ہوٹل کا کوئی ملازم وغیرہ آئے تو خود دروازہ نہ کھولے۔ مجھے جگا دے۔ میں واقعی سخت تھک چکا تھا اور مجھے نیند آ رہی تھی۔ پاروتی نے بتی بجھا دی۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور پھر گہری نیند سو گیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب پاروتی مجھے کندھے سے ہلاتے ہوئے جگا رہی تھی۔ ساتھ ہی میں نے دروازے پر دستک دینے کی آواز سنی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پاروتی نے کہا۔ "کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے ہوٹل کا ملازم ہو گا۔ تم باتھ روم میں جا کر چھپ جاؤ۔"

پاروتی باتھ روم میں چلی گئی ۔میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر ہوٹل کا ملازم لڑکا چائے کا گلاس لئے کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"صاحب جی! آپ کے لئے چائے لایا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ صبح صبح چائے ضرور پیتے ہوں گے آپ شہر کے بابو ہیں نا؟"

میں نے چائے اس سے لے لی اور کہا۔

"میرا ناشتہ اوپر ہی لے آنا اور سنو۔ دودھ کا گلاس بھی لانا۔ میں ناشتے پر دودھ ضرور پیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے صاحب!"

لڑکا چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی اور پاروتی کو آواز دی۔

"باہر نکل آؤ۔ لڑکا چلا گیا ہے۔"

پاروتی غسل خانے سے نکل کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"تمہارے پاس اگر کچھ پیسے بچے ہوں تو بازار سے میری لئے ایک نئی سوتی ساڑھی اور اپنے لئے قمیض پتلون لے آؤ۔ تمہارے کپڑے بھی پرانے ہو گئے ہیں۔"

میں نے جیب سے پیسے نکال کر گنے۔ ابھی ڈیڑھ پونے دو سو روپے موجود تھے۔ میں نے کہا۔

"پیسے تو ہیں مگر میرا خیال ہے ہمیں تھوڑی کنجوسی سے کام لینا چاہئے۔ مجھے پاکستان بھی پہنچنا ہے اور یہ بڑا لمبا سفر ہے۔"

پاروتی نے کہا۔ "اس کی تم فکر نہ کرو۔ ضرورت پڑنے پر پیسوں کا انتظام ہو جائے گا۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔ چنانچہ میں خاموش ہو گیا۔ پاروتی سے چائے کا پوچھا تو اس نے کہا کہ مجھے اب کسی شے کی حاجت نہیں رہی۔ اگر چاہوں تو پی سکتی ہوں۔ ناشتے پر تم نے دودھ منگوایا ہے۔ وہ پی لوں گی۔ میں چائے پیتا رہا۔ پاروتی

میرے سامنے بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس راستے سے ہو کر پاکستان جاؤں گا۔ میں نے کہا۔

"سیدھا راستہ تو یہی ہے کہ یہاں سے دلی، دلی سے میرٹھ انبالہ اور جالندھر لدھیانہ سے ہوتا ہوا امرتسر اور پھر وہاں سے سرحد پار کر کے پاکستان پہنچ جاؤں گا۔"

پاروتی نے کہا۔

"مگر پنجاب میں تو بڑے فسادات ہو رہے ہیں۔ تم نے خود ہی تو مجھے بتایا تھا کہ مشرقی پنجاب سے مسلمان مہاجرین کے جو قافلے پاکستان کو جاتے ہیں ان پر ہندو سکھوں کے جتھے حملے کر رہے ہیں اور مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر دوسرا تو کوئی راستہ نہیں ہے۔"

اس وقت میرے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ میں بمبئی سے کسی بحری جہاز کے ذریعے بھی پاکستان پہنچ سکتا ہوں۔ لیکن قسمت میں جو لکھا تھا اور جو رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات آگے چل کر میرے ساتھ پیش آئے انہیں بھی تو کوئی نہیں مٹا سکتا تھا۔ پاروتی نے گردن اٹھا کر کہا۔

"لیکن میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں گی۔ میرے ہوتے ہوئے تم پر کوئی ہاتھ اٹھا کر تو دیکھے۔ ایسا بدلہ لوں گی کہ ساری عمر نہیں بھولے گا۔"

اس رات ناگ پور کے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہم نے طے کر لیا کہ پاروتی مجھے پاکستان پہنچانے کے بعد واپس جنوبی بنگال کے جنگلوں میں اپنے دشمن سنتھالی سپیروں سے انتقام لینے کے لئے واپس چلی جائے گی اور میں پاکستان اپنے گھر بار والوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت مجھے اس حقیقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مشرقی پنجاب میں کس قدر ہولناک حالات ہیں اور ہندو سکھ کتنے وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ انڈیا کے اخباروں میں مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں صحیح طور پر شائع نہیں ہوتی تھیں۔

چونکہ پاروتی کو اب کسی بھی سپیرے کا خوف نہیں رہا تھا اور اس کے اندر ا طاقت پیدا ہو چکی تھی کہ کوئی بھی دنیاوی طاقت رکھنے والا سپیرا اس کا کچھ نہیں بگ سکتا اس لئے اس نے میرے ساتھ انسانی شکل میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے ہم سٹیشن پر آ گئے۔ ناگ پور ہندوستان کے بالکل وسط میں واقع ہے اور یہاں بمب حیدر آباد دکن اور مدراس سے آنے والی ساری گاڑیاں آتی ہیں اور یہ بہت بڑا جنکش ہے اس لئے ہمیں کوئی ایک گھنٹے بعد دلی جانے والی گاڑی مل گئی۔ یہ شہر دلی سے بہ دور ہے۔ ہم جس ریل گاڑی میں سوار ہوئے وہ جبل پور الٰہ آباد کانپور' لکھنؤ' شاہجہ پور' بریلی' اور مراد آباد سے ہوتی ہوئی کوئی تیسرے دن رات کے دس بجے دلی پہنچ میں تو ٹرین میں سفر کرتے کرتے تنگ آ گیا۔ راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آ پاروتی نے بڑے سکون اور خاموشی سے سفر طے کیا۔

دلی سے ہمیں مشرقی پنجاب کے لئے ٹرین تبدیل کرنی تھی۔

معلوم ہوا کہ صبح صبح ایک گاڑی جالندھر امرتسر جا رہی ہے۔ مجھے لاہور جانا تھ انکوائری کلرک نے بتایا کہ چونکہ پاکستان بن گیا ہے اور پاکستان مسلمانوں کا ایک آز ملک ہے اس لئے انڈیا سے کوئی گاڑی لاہور نہیں جاتی۔ صرف جالندھر یا زیادہ سے زیادہ امرتسر تک گاڑیاں جاتی ہیں۔ پاروتی نے مجھے کہا۔

"امرتسر تک کے دو ٹکٹ لے لو۔ آگے دیکھا جائے گا۔ وہاں سے شاید لاہور کے لئے کوئی لاری وغیرہ مل جائے۔"

مجھے یہاں کے اس وقت کے خونیں حالات کا بالکل علم نہیں تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ ہم نے دلی سے امرتسر تک کے دو ٹکٹ لے لئے اور وہیں پلیٹ فارم پر ایک طرف بیٹھ گئے۔ گاڑی کے چلنے میں ابھی پوری رات پڑی تھی۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور گاڑی نے صبح پانچ بج کر دس منٹ پر روانہ ہونا تھا میں نے پاروتی سے کہا۔

"تم تو نیند اور کھانے پینے سے بے نیاز ہو چکی ہو مگر مجھے تو بھوک بھی لگتی ہے

نیند بھی آتی ہے۔ مجھ سے یہاں ساری رات نہیں بیٹھا جائے گا۔"

"تو پھر کیا کریں؟ تم ہی بتاؤ۔"

میں نے مشورہ دیا۔

"کیوں نہ شہر میں چلتے ہیں۔ چاندنی چوک کے کسی مسلمان ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ پھر وہیں چائے پئیں گے اور واپس آ جائیں گے۔۔۔"

پاروتی کو میرا مشورہ پسند آیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"مگر تم نے ہی کہا تھا کہ دلی میں بھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ یہاں بھی مسلمانوں کے گھروں کو لوٹ کر ہندو آگ لگا رہے ہیں۔"

میں رک گیا۔

"یہ تو ہے۔ لیکن آخر ایسا بھی کیا ہے۔ ہم دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ اگر حالات اچھے ہوئے تو چاندنی چوک میں کھانا کھائیں گے حالات خراب ہوئے اور دکانیں ہوٹل بند ہوئے تو واپس آ جائیں گے۔"

پاروتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ چلو۔"

دلی سٹیشن کے باہر مجھے محسوس ہوا کہ وہ رونق نہیں ہے کچھ ویرانی ویرانی سی تھی۔ لوگ بھی کم نظر آ رہے تھے۔ زیادہ تر ہندو سکھ پولیس کے سپاہی دکھائی دے رہے تھے۔ پاروتی نے بھی اس فرق کو محسوس کیا اور بولی۔

"دلی سٹیشن کے باہر تو لگتا ہے کرفیو لگا ہوا ہے۔"

میں چاندنی ہوٹل کے مسلمان ہوٹل میں کھانا ضرور کھانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"کرفیو نہیں لگا ہوا۔ ویسے رات کو آج کل لوگ کم ہی نکلتے ہیں۔"

ایک ٹیکسی والے نے کہا کہ چاندنی چوک کے دس روپے لوں گا۔ میں نے کہا بھائی دس روپے تو بہت زیادہ ہیں۔ دو چار روپے کی بات کرو۔ وہ بولا۔ "بھائی صاحب وہاں پیدل جا کر تو دکھائیں۔"

میں ٹیکسی کے اندر بیٹھ گیا۔

"چلو بھائی دس روپے ہی لے لینا۔"

پاروتی پہلے ہی ٹیکسی میں سوار ہو چکی تھی۔ ٹیکسی چاندنی چوک کی طرف چل پڑی۔ سٹیشن سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی محسوس ہوا کہ یہ وہ دلی شہر نہیں ہے جہاں آدھی آدھی رات تک لوگ سیریں کرتے تھے۔ سڑکیں تقریباً خالی تھیں۔ کوئی کوئی گاڑی یا تانگہ گزر جاتا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"کیا یہاں کرفیو لگا ہے؟"

ڈرائیور نے کہا۔ "کرفیو تو نہیں لگا۔ کل تک لگ جائے گا کیونکہ سبزی منڈی میں بڑا خون خرابہ ہوا ہے۔"

اس نے رک کر ہم سے پوچھا کہ ہم مسلمان ہیں؟ میں نے کہا۔

"الحمدللہ ہم مسلمان ہیں۔"

ٹیکسی ڈرائیور بھی مسلمان تھا۔ کہنے لگا۔

"بابو جی! دلی میں ہندو سکھوں نے مسلمانوں کا بڑا قتل عام کیا ہے۔ مسلمانوں نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کر رہے ہیں مگر ہندو سکھوں کے ساتھ ان کی اپنی پولیس اور فوج ہے۔ مسلمان پولیس سے تو ایک ہفتہ پہلے اسلحہ لے لیا گیا تھا۔ آپ کہاں سے آ رہے ہیں بابو جی؟"

میں نے کہا۔ "ناگ پور سے۔"

"میری مانیں بابو جی! آپ چاندنی چوک نہ جائیں واپس سٹیشن پر چلے چلیں۔ چاندنی چوک میں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بھائی اگر وہاں کرفیو نہیں لگا تو کوئی بات نہیں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور بڑے غور سے سڑک پر دائیں بائیں اور سامنے دیکھتا ہوا گاڑی چلا رہا تھا۔ بولا۔

"اچھا بابو جی! جو اللہ کو منظور۔"

میں نے کہا۔ "زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اسے واقعی کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔ مجھے معلوم نہیں ٹیکسی کن سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی جب چاندنی چوک کے قریب پہنچی تو ڈرائیور نے گاڑی ایک طرف لے جا کر کھڑی کر دی۔ سڑک خالی تھی۔ سامنے چوک بھی خالی خالی تھا۔ کچھ دکانیں ضرور کھلی ہوئی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور جو مسلمان تھا کہنے لگا۔

"بابو جی! واپس چلے چلیں۔ عورت بھی ساتھ ہے۔ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔"

میں نے دور سے دکانوں کی روشنی دیکھ کر اس سے پوچھا۔

"کیا وہ چاندنی چوک ہے؟"

وہ بولا۔ "ہاں جی۔ مگر وہاں جو دکانیں آپ کو کھلی نظر آ رہی ہیں وہ ہندوؤں کی دکانیں ہیں۔"

میں اور پاروتی ٹیکسی سے باہر نکل آئے۔ میں نے ڈرائیور کو دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"بھائی ہم تو چاندنی چوک کے کسی مسلمان ہوٹل میں کھانا کھانے آئے ہیں۔ اب تو کچھ کھا پی کر ہی واپس جائیں گے۔ تم بے شک واپس چلے جاؤ۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کرایہ لے کر جیب میں رکھا اور بادل نخواستہ ٹیکسی سٹارٹ کر کے واپس چلا گیا۔ پاروتی کہنے لگی۔

"اگر وہاں کوئی مسلمان ہوٹل کھلا ہوا نہ ملا تو ہم واپس سٹیشن کس طرح پہنچیں گے یہاں تو کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔"

میں نے کہا۔ "دیکھا جائے گا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔"

ہم چلنے لگے تو پاروتی نے میرا بازو تھام کر مجھے روک لیا اور بولی۔

"میرا خیال ہے مجھے انسانی شکل میں تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہئے۔ میں ناگن بن کر تمہارے ساتھ ساتھ سڑک پر چلتی ہوں اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کم از کم میں تمہاری مدد تو کر سکوں گی۔"

میں نے کہا۔ "اور اگر تمہیں دیکھ کر کسی نے تمہیں اینٹ پتھر سے کچل دیا تو پھر کیا ہو گا؟"

اس نے کہا۔ "میں اندھیرے میں چلوں گی۔ ویسے بھی میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔"

یہ کہہ کر دوسرے لمحے پاروتی میرے پاس کھڑی کھڑی غائب ہو گئی۔ میں نے جھک کر سڑک پر دیکھا۔ پاروتی نسواری رنگ کے سانپ کی شکل میں کنڈلی مار کر بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم آگے آگے چلو۔ میں اندھیرے میں تمہارے ساتھ ساتھ چلتی رہوں گی۔"

میں چاندنی چوک کی طرف چل پڑا۔ چوک میں بڑی بے رونقی تھی۔ اکثر دکانیں بند تھیں۔ دو چار دکانیں کھلی تھیں۔ ان دکانوں کے باہر تین پولیس والے رائفلیں پاس رکھے سٹولوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں دو سکھ تھے۔ ظاہر ہے تیسرا سپاہی ہندو ہی ہو گا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا تھا کہ دلی کی مسلمان پولیس سے اسلحہ لے کر انہیں نہتا کر کے گھروں کو بھیج دیا گیاہے۔ میں فٹ پاتھ پر جگت سینما کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے بائیں جانب دیکھا۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر پاروتی بھی سانپ کی شکل میں فٹ پاتھ پر رینگتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ میں نے جھک کر کہا۔

"اس سے تو بہتر تھا کہ تم انسانی شکل میں میرے ساتھ چلتیں۔"

مجھے پاروتی کی آواز آئی۔

"تم خاموشی سے چلتے جاؤ۔ ادھر کس طرف جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "مجھے یاد ہے جگت سینما کے ساتھ والی سڑک پر مسلمانوں کا ایک ہوٹل ہے۔ شاید مغل ہوٹل اس کا نام ہے۔ وہیں جا رہا ہوں۔"

میں پولیس والوں کے سامنے سے کچھ فاصلے پر سے گزرا تو سکھ سپاہی نے آواز دے کر پوچھا۔

"کون ہو بھئی؟ کدھر جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "سردار جی ہوٹل میں چائے پینے جا رہا ہوں۔"

"اچھا وقت نکالا ہے تم نے چائے پینے کے لئے۔" سکھ سپاہی نے طنزاً کہا۔ "جاؤ چائے پیو اور اگر بچ جائے تو ہمارے لئے بھی چائے لیتے آنا۔"

پاروتی مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر اندھیرے میں تھی۔ کہنے لگی۔

"لگتا ہے ادھر کوئی خطرہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "اب میں واپس تو جانے سے رہا۔"

اور میں چوک میں سے گزر کر جگت سینما کے پہلو والی چھوٹی سڑک کی طرف آ گیا۔ جگت سینما بند تھا۔ سڑک ویران تھی۔ سڑک پر صرف ایک ہی سٹریٹ لیمپ روشن تھا۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا ایک دکان کے اوپر مغل ہوٹل لکھا تھا۔ یہی وہ ہوٹل تھا جو مجھے یاد رہا تھا۔ مگر افسوس کہ ہوٹل بند پڑا تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"پاروتی! ہوٹل تو بند پڑا ہے۔ میرا خیال ہے واپس سٹیشن پر چل کر ہی چائے پیتے ہیں۔"

"اچھا خیال ہے۔ چلو۔ واپس چلو۔"

واپسی پر میں پولیس کے سپاہیوں کے پاس سے گزرنے لگا تو سکھ سپاہی نے طنز کی۔

"پی آئے چائے؟"

میں نے کہا۔ "سردار جی ہوٹل تو بند ہے۔"

دوسرا سپاہی جو یقیناً ہندو تھا کہنے لگا۔

"وہ ہوٹل تو مسلمان کا ہوٹل ہے۔ تم کون ہو بھئی کیا مسلمان ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں! میں مسلمان ہوں۔"

تینوں سپاہی سٹول پر سے اٹھ کر میرے قریب آ گئے۔ انہوں نے ایک طرح سے

مجھے گھیرے میں لے لیا۔ سکھ سپاہی نے میری گردن پکڑ کر کہا۔

"مجھے لگتا ہے تم یہاں ہندوؤں کی دکانوں کو آگ لگانے آئے تھے۔ کیوں او۔ بتا پیچھے کہاں آگ لگا کر آئے ہو؟"

میں نے سکھ سپاہی کا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا۔

"میں کوئی آگ واگ لگانے نہیں آیا۔ میں تو مغل ہوٹل میں کھانا کھانے تھا۔"

میں نے ایک طرف نظر گھما کر دیکھا۔ پاروتی مجھ سے کوئی پندرہ فٹ کے فاصلے سٹول کے پیچھے اندھیرے میں فٹ پاتھ پر موجود تھی اور ہماری طرف دیکھ رہی تھی سکھ سپاہی میرے ہاتھ جھٹکنے سے غصے میں آ گیا۔ اس نے میری گردن دبوچ لی اور بو

"چل اوئے تھانے۔"

دوسرے سپاہی بھی مجھے تھپڑ مارنے لگے۔ سکھ سپاہی مجھے گھسیٹنے لگا۔ اس کے ! مجھے سانپ کی پھنکار کی آواز آئی اور جس سکھ سپاہی نے مجھے گردن سے دبوچ رکھا اور مجھے گھسیٹ کر لئے جا رہا تھا اس کی گرفت اچانک میری گردن پر ڈھیلی پڑ گئی اور دھڑام سے فٹ پاتھ پر گر پڑا۔ دوسرے سپاہی اس کو اٹھانے لگے تو ایک ایک کر۔ وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گئے۔ پاروتی کے سانپ نے اپنا کام کر دیا تھا۔ مجھے پاروتی کی آو آئی۔

"اب یہاں سے بھاگ چلو۔ میری فکر نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

تینوں سپاہی فٹ پاتھ پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ چوک خالی ہونے کی و سے کسی نے یہ ڈرامہ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میں سڑک پر جس طرف سے آیا تھا ا طرف دوڑ پڑا۔

میں فٹ پاتھ پر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پاروتی ضرور پیچھے رہ گئی ہو گی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سانپ آدمی سے زیادہ تیز دوڑتا ہے۔ جب میں چوک سے کافی آگے نکل گیا تو میں دوڑنے کی بجائے تیز تیز چلنے لگا۔ میں نے چلتے چلتے اپنی دائیں بائیں جانب دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے سانپ کہیں نظر نہ آیا۔ مگر سانپ نے مجھے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سانپ کو اندھیرے میں بھی نظر آ جاتا ہے۔ مجھے پاروتی کی آواز آئی۔

"فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

میں نے تیز تیز چلتے ہوئے ایک نظر پیچھے گردن موڑ کر دیکھا۔ چاندنی چوک میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے پاروتی سے پوچھا۔

"تم نے ان کو مار تو نہیں دیا؟"

پاروتی نے جواب دیا۔

"دو آدمی تمہیں تھپڑ مار رہے تھے۔ ایک سکھ تمہیں گھسیٹ رہا تھا۔ میں انہیں کیسے زندہ چھوڑ سکتی تھی۔ میں نے انہیں ڈس کر پورا زہر ان کے خون میں شامل کر دیا۔ اب تک تو ان کے جسم پانی بن کر بہہ گئے ہوں گے۔"

میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ مگر پاروتی انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بھی جب سے اس نے سنا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہندو اور

کر مسلمانوں کو قتل کر کے ان کے گھروں کو آگ لگا رہے ہیں وہ ہندو سکھوں کی دشمن ہو گئی تھی۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتی تھی کہ ہندو اور سکھ بنیادی طور پر بزدل ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ظالم ہوتے ہیں اور ظلم کرتے ہوئے وہ گھٹیا سطح پر اتر آتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مسلمان ایک بہادر اور کشادہ دل قوم ہے۔ مسلمان دشمن کو معاف بھی کر دیتا ہے اور عورتوں بوڑھوں اور بچوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔

اس قسم کی باتیں پاروتی کے ذہن میں پیدا ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ خدا اسے سیدھی راہ پر لا رہا تھا۔ میں اب تیز تیز نہیں چل رہا تھا۔ دوڑتے اور تیز تیز چلنے سے میں تھک گیا تھا اور سانس بھی چڑھ گیا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر ایک بند دکان کے پھٹے پر بیٹھ گیا۔ پاروتی بھی اندھیرے میں سے نکل کر رینگتی ہوئی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔

"یہاں کوئی سواری بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اور مجھے سٹیشن کا راستہ معلوم نہیں ہے۔"

پاروتی سانپ نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔"

"تمہیں اتنی جلدی کیسے معلوم ہو گیا؟"

پاروتی کی آواز آئی۔

"سانپ جس راستے سے ایک بار گزر جاتا ہے وہ راستہ اسے ہمیشہ کے لئے یاد ہو جاتا ہے۔"

مجھے سڑک پر دور سے ایک تانگہ آتا نظر آیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"شاید یہ تانگہ خالی ہے۔ میں اسے روکتا ہوں۔"

وہ کہنے لگی۔ "اگر خالی نہ بھی ہوا تو تم اس پر سوار ہو جانا کم از کم اس علاقے سے تو نکل جائیں گے۔"

تانگہ قریب آیا تو وہ خالی تھا۔ میں نے ہاتھ دیا۔ کوچوان نے تانگہ روکتے ہوئے

کہا۔

"صرف سٹیشن تک جاؤں گا بابو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے بھی سٹیشن پر ہی جانا ہے۔"

میں جلدی سے تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگہ خالی سڑک پر دوڑنے لگا۔ اس سے پہلے میں نے پاروتی سانپ کو اٹھا کر اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ دلی ریلوے سٹیشن کے سامنے ایک باغ ہوا کرتا تھا۔ تانگہ اس باغ کے قریب پہنچا تو میں نے کوچوان کو پیسے دیئے اور وہیں اتر پڑا۔ میں ایک طرف اندھیرے میں آ گیا۔ میں نے پاروتی کو قمیض کے اندر سے نکال کر کہا۔

"پاروتی! میرا خیال ہے اب تمہیں سانپ بن کر میرے ساتھ سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہتر ہے کہ اپنی انسانی شکل میں آ جاؤ۔ کم از کم ایک دوسرے سے سب کے سامنے بات تو کر سکیں گے۔"

پاروتی اسی وقت انسانی شکل میں آ گئی۔ ہنس کر بولی۔

"تم تو اب اپنے ماں باپ کے پاس پاکستان جا رہے ہو۔ وہاں میں نہیں ہوں گی تو کس سے باتیں کرو گے؟ خیر وہاں تو تمہارے گھر والے ہوں گے بہن بھائی ہوں گے۔ تم تو مجھے بھول جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں پاروتی! ایسی بات نہیں ہے۔ ہمارا اتنا عرصہ ساتھ رہا ہے۔ اور پھر ہم ایک دوسرے کے گہرے دوست بھی ہیں۔ میں تو تمہیں پاکستان جا کر ضرور یاد کیا کروں گا۔ ہو سکتا ہے تم مجھے بھول جاؤ۔"

ہم آہستہ آہستہ ریلوے سٹیشن کی عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ پاروتی نے اداس آواز میں کہا۔

"نہیں انورا! میں بھی تمہیں نہیں بھلا سکوں گی۔ تم نے میرے اندر پیار کی جو جوت جگا دی ہے وہ ہمیشہ روشن رہے گی۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگرچہ مجھے بھی پاروتی سے ایسا ہی پیار ہو چکا تھا مگر

میں پیار محبت کے ڈائیلاگ بول کر اس تصویر میں مزید رنگ نہیں بھرنا چاہتا تھا تا
آخر ایک روز مٹ جانا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم بھی میرے ساتھ پاکستان چلی چلو۔ وہاں تمہیں بہادر، مہمان نواز اور کشادہ د
لوگ ملیں گے تم بڑی خوش رہو گی۔"

پاروتی نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ ہو سکتا ہے میں کبھی نہ کبھی تمہیں ملنے پاکستان آ
جاؤں۔ میں اب بھی یہی کہوں گی کہ مجھے مسلمانوں کے ملک پاکستان جا کر بڑی خوشی ہو
گی۔ تم مجھے اپنا پتہ دیتے جانا۔ میں تمہیں ملنے کم از کم ایک بار پاکستان ضرور آؤں
گی۔"

میں نے اسے کہا۔

"میں تمہیں امرتسر میں اپنا ایڈریس ضرور لکھوا دوں گا۔ بلکہ یاد کرا دوں گا۔"

پاروتی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تم مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ چاہے نہ بتاؤ مگر میں تمہارے
پاس پہنچ جاؤں گی تمہاری خوشبو مجھے تمہارے پاس لے آئے گی شاید تمہیں معلوم
نہیں۔ سانپ اگر ایک بار کسی کے لباس یا اس کے جسم کی بو کو سونگھ لے تو وہ سات
سمندر پار کر کے بھی اس شخص کے پاس پہنچ جاتا ہے۔"

ہم باتیں کرتے ریلوے سٹیشن کی عمارت کے اندر آ گئے۔ یہاں عجیب ویرانی سی
چھائی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر بھی بہت کم مسافر نظر آ رہے تھے۔ زیادہ تر ہندو سکھ ہی
تھے۔ پولیس کے سپاہی بھی سکھ ہی تھے۔ پاروتی اور میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔
ٹرین کا کچھ پتہ نہیں تھا کب روانہ ہو گی۔ پاروتی نے دلی کی دہشت زدہ فضا کو محسوس
کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ ہندو اور سکھ ہندوستان کے مسلمانوں کے دشمن
ہیں۔ انہیں موقع ملا تو وہ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔ دیکھ لو۔ ہندوستان میں ایسا ہی ہو

ا ہے۔ خدا مسلمانوں کو اس قوم سے محفوظ رکھے۔"

میں نے کہا۔

"مشرقی پنجاب میں بھی مسلمانوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔"

پاروتی نے فکر مند ہو کر کہا۔

"میں تمہیں انڈیا کا بارڈر کراس کرا کر ہی واپس آؤں گی۔ تمہیں امرتسر میں اکیلا
یں چھوڑوں گی۔"

"جو میرے خدا کو منظور۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

رات کے دو ڈھائی بجے کہیں امرتسر جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر لگی۔ وہ
لے ہی مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ میں اور پاروتی ایک ڈبے میں کسی نہ کسی طرح
ُس کر بیٹھ گئے۔ کافی انتظار کروانے کے بعد ٹرین روانہ ہوئی۔ ٹرین جس وقت انبالے
پہنچی تو صبح ہو چکی تھی۔ میں نے انبالے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر برقعہ پوش مسلمان
رتوں کو ایک ہجوم کی شکل میں اپنے بال بچوں اور مردوں کے ساتھ بے کسی کے عالم
ں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ یہ انبالے کے مسلمان مہاجرین تھے جو شاید کسی سپیشل ٹرین کے
ظار میں تھے۔

انبالے سے ہماری گاڑی چلی تو راستے میں کوئی سٹیشن ایسا نہ تھا جہاں مسلمان
اجرین سینکڑوں کی تعداد میں بے سر و سامانی کے عالم میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ مشرقی
جاب شروع ہوا تو کھیتوں پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور کہیں کہیں دھواں اٹھتا نظر
جاتا تھا۔ ظاہر ہے یہ مسلمانوں کے گھر تھے جنہیں نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ گاڑی
جالندھر سٹیشن پر رکی تو پلیٹ فارم پر ہر طرف سکھ ہی سکھ نظر آ رہے تھے جو تلواریں،
ندوقیں لئے پھر رہے تھے۔ پاروتی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور آہستہ سے کہا۔

"یہاں تو حالات بہت خراب ہیں۔"

جالندھر سے ٹرین چلی تو ایک جگہ ریلوے لائن کے ساتھ کٹی ہوئی بے شمار لاشیں
ھر ادھر پڑی تھیں۔ کھیتوں میں گھروں کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ یہاں مسلمانوں کے کسی

قافلے پر سکھوں کے جتھے نے حملہ کر دیا تھا۔ ٹرین امرتسر شہر کے مضافات میں داخل چکی تھی۔ اس شہر کے گلی کوچوں بازاروں سے میں اچھی طرح واقف تھا۔

ٹرین امرتسر کے پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔

پلیٹ فارم پر ہندو سکھ کرپانیں اور اسلحہ لئے دندناتے پھر رہے تھے۔ وہ ہر ڈبہ اخل ہو کر پوچھتے۔ یہاں کوئی مسلمان تو نہیں ہے؟ دو سکھ کرپانیں ہاتھوں میں ہمارے ڈبے میں بھی آ گئے۔ ایک سکھ نے پوچھا۔

"یہاں کوئی مسلمان تو نہیں ہے؟"

مسافر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک مسافر نے کہا۔

"سردار جی! یہاں مسلمان کا کیا کام۔"

سکھ نے میری طرف گھور کے دیکھا۔

"تم مجھے مسلے لگتے ہو۔ نکل آؤ باہر۔"

پاروتی نے کہا۔

"یہ میرا پتی ہے میں ہندو ہوں۔ میرا نام پاروتی ہے۔"

سکھ نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

"ابھی اس کے ختنے دیکھ کر پتہ چل جائے گا کہ یہ ہندو ہے کہ مسلہ"

دونوں سکھ مجھے کھینچتے ہوئے ڈبے سے باہر لے آئے۔ پاروتی بھی باہر نکل آئی وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

"یہ میرا پتی ہے۔ میں ہندو ہوں۔ ہم مسلمان نہیں ہیں۔"

وہاں تین چار اور سکھ آ گئے۔ ان کے پاس بھی تلواریں تھیں۔

"چلو اوئے اس کو اندر لے جا کر دیکھو مسلمان ہے کہ ہندو۔"

وہ مجھے سامنے والے کمرے میں لے گئے۔ دوسرے لمحے ان پر یہ راز کھل گیا میں مسلمان ہوں۔ پاروتی بھی دوڑتی ہوئی کمرے میں آ گئی یہ پلیٹ فارم پر ریلوے کوئی دفتر تھا۔ بالکل خالی پڑا تھا۔ دونوں سکھوں نے مجھے پکڑ کر فرش پر گرا دیا۔ ایک

سکھ کے پاس کرپان تھی۔ اس نے کرپان میری گردن پر چلانی چاہی۔ میں تڑپ کر اس کے نیچے سے نکل گیا۔ دوسرے سکھ نے تلوار والا ہاتھ اٹھایا کہ ایک ہی وار سے میری گردن الگ کر دے مگر اب پاروتی میری مدد کو وہاں پہنچ چکی تھی۔

پاروتی نے سکھ پر چھلانگ لگا دی۔ اور اسے اپنے ساتھ ہی دوسری طرف گرا لیا۔ میں نے دوسرے سکھ کے کرپان والے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ اس دوران پاروتی پہلے سکھ کی گردن میں ناخن چبھو کر اسے ہلاک کر چکی تھی۔ پاروتی نے دوسرے سکھ کی گردن پر دونوں ہاتھ زور سے مارے اور اپنی انگلیوں کے ناخنوں سے اس کی گردن نوچنے لگی۔

بس اتنا ہی کافی تھا۔ خدا جانے اس کے ناخنوں میں ایسا ہلاکت خیز زہر کہاں سے آ گیا تھا۔ دوسرا سکھ وہیں دہرا ہو کر بے حس ہو کر منہ کے بل فرش پر گر پڑا۔ اب باہر سے سکھوں کے اندر آ جانے کا زبردست خطرہ تھا۔ پاروتی نے ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔

"ان کی لاشیں اس طرف کر دو۔ جلدی کرو۔"

ہم نے دونوں سکھوں کی لاشوں کو میز کے نیچے دھکیل دیا۔ باہر سے دوسرے سکھ غنڈوں کی آواز آئی۔

"باہر نکلو نہام سنگھا۔ اندر کیا کر رہے ہو؟"

میں نے پاروتی سے کہا۔

"اب کیا کریں؟"

پاروتی کا خیال تھا کہ باہر سکھ ادھر ادھر ہو گئے ہوں گے اور وہ یہ کہتی ہوئی مجھے لے کر باہر نکل جائے گی کہ میرا خاوند ہندو ہے۔ تمہارے ساتھیوں کو پتہ چل گیا ہے مگر سکھ باہر ہمارے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ دیوار میں دروازہ تھا۔ میں نے اسے کھولا تو وہ غسل خانہ تھا۔ غسل خانے میں بھی ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ پاروتی نے اسے کھولا۔ دوسری طرف احاطہ تھا جہاں گائے بندھی تھی۔ ہم تیزی سے نکل کر احاطے میں آئے اور دوڑتے ہوئے سٹیشن کی عقبی سڑک پر نکل گئے۔ یہاں چھوٹے سے باغیچے میں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی جس کو سکھوں نے توڑ پھوڑ دیا تھا۔

ہمیں پلیٹ فارم پر سکھوں کے نعروں کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید انہیں اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کا پتہ چل گیا تھا۔ پاروتی نے کہا۔

"کسی طرف کو بھاگ چلو۔ میں تمہیں دشمنوں کے اتنے ہجوم سے نہیں بچا سکوں گی۔ بھاگو۔"

ہم نے دوڑتے ہوئے سڑک پار کی۔ سامنے لکڑیوں کا ٹال تھا۔ اس کی بغل سے ایک راستہ کھیتوں کی طرف جاتا تھا۔ ہم دوڑتے ہوئے کھیتوں میں آ گئے۔ یہاں فصل کھڑی تھی۔ ہم نے فصل کے درمیان جو پگ ڈنڈی تھی اس پر جتنی تیزی سے بھاگ سکتے تھے بھاگنا شروع کر دیا۔ کھیت ختم ہو گئے۔ ایک چھوٹا سا میدان آ گیا جہاں خالی تانگے کھڑے تھے۔ ہم وہاں سے بھی بھاگتے ہوئے گزر گئے۔ آگے کسی احاطے کی اونچی دیوار آ گئی۔ ہم دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے ریالٹو سینما کے عقب میں آ گئے۔ یہ سینما میرا جانا پہچانا تھا۔

وہاں آ کر ہم ٹاہلی کے درخت کے نیچے بے دم سے ہو کر گر پڑے۔ پاروتی کا سانس اتنا نہیں پھولا تھا۔ مگر میرا سانس بہت پھول گیا تھا۔ بعد میں پاروتی نے مجھے بتایا کہ ناگن ہونے کی وجہ سے اس کا دم زیادہ نہیں پھولا تھا۔ جب ذرا میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے پاروتی سے کہا کہ ہمیں اب سٹیشن کی طرف ہرگز نہیں جانا چاہئے۔

اس نے پوچھا۔

"تم اس شہر سے واقف ہو۔ یہ کونسا علاقہ ہے اور یہاں سے پاکستان کی سرحد کس طرف ہے کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ تمہیں جتنی جلدؔ ہو سکے پاکستان کی سرحد کے اندر پہنچا دوں۔"

میں نے کہا۔

"ہم سکھوں سے کافی دور نکل آئے ہیں۔ مگر پاکستان کو جو سڑک جاتی ہے اس پر ایک بہت بڑا گوردوارہ ہے۔ شہر کی جو حالت دیکھ رہا ہوں اس کے پیش نظر وہاں میرا بچ

کر نکلنا ممکن نہیں لگتا۔"

"ہم سڑک چھوڑ کر کھیتوں کھیت بارڈر کی طرف چلتے ہیں۔ ابھی دونوں ملک نئے نئے آزاد ہوئے ہیں بارڈر پر کوئی فوج وغیرہ نہیں ہو گی۔"

اس کا یہ مشورہ بڑا اچھا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم یہاں سے خالصہ کالج کی طرف چلتے جائیں تو آگے کھیتوں کھیت چھ ہرٹہ کا گوردوارہ پار کر کے اسی طرح کھیتوں میں چلتے لاہور پہنچ سکتے ہیں۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ امرتسر شہر مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے اور جس طرف ہم جانے والے ہیں اس طرف سکھ غنڈے کھیتوں میں کئی مسلمانوں کو قتل کر چکے ہیں اور ان کی لاشیں وہیں پڑی ہیں۔ اور سکھ آس پاس کے کھیتوں میں چھپے ہوئے مسلمانوں کو تلاش کر رہے ہیں۔

میں نے پاروتی کو ساتھ لیا اور کھیتوں میں خالصہ کالج کی طرف چل پڑا۔ فضا میں ایک دہشت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شہر کی طرف دو تین جگہوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے پاروتی کو دھوئیں کے بادل دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ مسلمانوں کے مکان جل رہے ہیں۔"

کھیت میں فصل اونچی تھی۔ فصل ختم ہوئی تو بائیں جانب کچھ فاصلے پر امرتسر کے دائم گنج کی آبادی کے مکان دکھائی دیئے۔ ان مکانوں پر بھی ایک سکوت طاری تھا۔ آگے کھیت میں کسی فصل کی دیوار آ گئی۔ ہم اس دیوار کی اوٹ میں چل رہے تھے۔ یہ کھیت ختم ہوا تو آگے چھوٹا سا چھپڑ آ گیا۔ یہاں کٹی ہوئی دو انسانی لاشیں پڑی تھیں۔ پاروتی نے میرا بازو تھام لیا۔ یہ مسلمانوں کی لاشیں ہی ہو سکتی تھیں۔ اور آگے گئے تو کھیتوں میں جگہ جگہ انسانی لاشیں پڑی تھیں جن کا خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔ پاروتی کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

اچانک ایک طرف سے آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں اٹھیں۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ فصل ہمارے چہروں تک آتی تھی۔ ہم نے چار پانچ سکھوں کو بلمیں اور تلواریں لئے دائم گنج کی آبادی کی طرف دوڑتے دیکھا۔ ہم وہیں دبک کر بیٹھے رہے۔ جب سکھ

ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ہم پھرچھ ہرٹہ کی طرف تیز تیز قدموں کے ساتھ چلنے لگے۔ خالصہ کالج کی عمارت بائیں جانب پیچھے رہ گئی تھی۔ کھیتوں میں ایک طرف تین چار مکان تھے۔ ادھر سے ایک بوڑھا آدمی ہمیں دیکھ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر اس طرح ہلانے لگا جیسے ہمیں رک جانے کا اشارہ کر رہا ہو۔ پاروتی نے کہا۔

"یہ بوڑھا کیا کہہ رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کچھ بھی ہو ہمیں رکنا نہیں چاہئے۔"

ہم تیز تیز چلتے گئے۔ بوڑھا کھیت میں سے گزر کر ہمارے سامنے آگیا وہ سکھ نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"السلام علیکم!"

میں وعلیکم السلام کہہ کر رک گیا۔

"بابا تم مسلمان ہو؟"

بوڑھے کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر جسم کمزور تھا۔ سر پر اس نے صافہ باندھ رکھا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہاں بیٹا میں مسلمان ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بھی مسلمان نکلے۔ سکھوں نے یہاں مسلمانوں کو بہت قتل کیا ہے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب کسی مسلمان کا خون نہیں بہنے دوں گا۔ بستی مین جو کوئی بچا کھچا مسلمان ملا اسے یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں گا۔ بیٹا اس طرف آ جاؤ آگے بڑا خطرہ ہے۔ جلدی کرو۔ سکھوں کا جتھہ ادھر کو آ رہا ہے۔"

ہم پہلے ہی ڈرے ہوئے تھے۔ ایک مسلمان کو دیکھا تو کچھ حوصلہ ہوا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ وہ ہمیں کھیتوں میں جو مکان تھے اس طرف لے گیا۔ راستے میں وہ بولتا جا رہا تھا۔

"امرتسر میں مسلمانوں پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ ہندو سکھوں نے ڈوگرہ فوج کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا بڑا خون بہایا ہے۔ جلدی چلو بیٹا۔"

وہ ہمیں ایک مکان میں لے آیا۔ مکان خالی پڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"میں دائم گنج میں نان بائی کی دکان کرتا تھا۔ سکھوں نے حملہ کیا تو یہاں آ کر چھپ گیا۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں باہر جا کر معلوم کرتا ہوں کہ سکھوں کا جتھہ ادھر تو نہیں آ رہا۔ ہاں دروازہ اندر سے بند کر لینا۔"

یہ کہہ کر وہ بوڑھا مکان سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔

"یہ تو کوئی فرشتہ ہمیں مل گیا ہے۔ نہیں تو ہمیں سکھوں کے جتھے نے زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔"

یہ مکان کا چھوٹا سا کمرہ تھا جو بالکل خالی تھا۔ صرف ایک پرانی چارپائی دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی تھی۔ بوڑھے کو گئے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ باہر کچھ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ یہ آواز قریب آئی تو میں نے دروازے کے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ وہی بوڑھا آدمی جو ہمیں مکان میں چھوڑ کر گیا تھا دو سکھوں کے ساتھ کسی بات پر جھگڑتا ہوا کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ دونوں سکھوں میں سے ایک سکھ کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔

"ایک عورت بھی ساتھ ہے۔ جوان عورت ہے میں زیادہ پیسے لوں گا۔"

تلوار والے سکھ نے جھومتے ہوئے اسے گالی دی۔

"اوئے نٹھ جا لالہ نہیں تو تیری گردن اڑا دوں گا۔ جتنے پیسے دیئے ہیں ٹھیک ہیں۔"

بوڑھا کہنے لگا۔

"سردارا۔ بڑی مشکل سے گھیر کر دونوں مسلمان مرد عورت کو لایا ہوں۔ دس روپے ہی دے دو۔"

دوسرے سکھ نے اسے فحش گالی دے کر ہاکی اٹھائی تو وہ بوڑھا جو اصل میں ہندو

تھا اور جس کا کام اس آبادی کے بچے کھچے مسلمانوں کو گھیر کر لانا تھا وہاں سے چلا گیا۔

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے گھبراہٹ میں پاروتی سے کہا۔

"پاروتی! ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ وہ بوڑھا ہندو تھا۔ اس نے ہمیں سکھوں کے حوالے کر دیا ہے۔ دو سکھ ہماری طرف آ رہے ہیں۔"

اتنے میں سکھوں نے دروازے کو زور سے دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ سکھوں نے دروازے پر ہاکی اور لاتیں برسانا شروع کر دیں۔ کمرے میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی روشندان تھا۔ دروازہ ٹوٹنے لگا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"پاروتی! کچھ کرو۔ لگتا ہے اب بچنا مشکل ہے۔"

پاروتی نے مجھے دروازے سے ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

"تم ادھر ہو جاؤ۔"

میں کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ دروازے کی چٹخنی اکھڑ گئی۔ دروازہ کھل گیا اور دونوں سکھ بڑکیں مارتے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ اس دوران پاروتی ناگن کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ جیسے ہی دونوں سکھ اندر آئے اور میری طرف بڑھے پاروتی کے سانپ نے ان دونوں کو اچھل کر ڈس دیا۔ یہ کچھ ایسے عتاب کا زہر تھا کہ دونوں سکھ اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے۔ ناگن پاروتی نے ایک غلطی کی وہ پھنکارتا ہوا پھن پھیلا کر ان کے سامنے آ گئی۔

جس سکھ کے ہاتھ میں تلوار تھی اس میں ابھی کچھ سکت باقی تھی دوسرا سکھ گر پڑا تھا۔ پہلے سکھ نے گرتے گرتے تلوار والا ہاتھ سانپ پر مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے تلوار پاروتی کو لگی اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا سکھ بھی ڈھیر ہو گیا۔

ایک لمحے کے لئے تو میں جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہا۔ پاروتی ناگن کے روپ میں تھی اور اس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ دونوں ٹکڑے فرش پر پڑے تھے=۔ اوپر

والے ٹکڑے کا پھن سکڑ گیا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر پاروتی ناگن کے دونوں ٹکڑے اٹھائے۔ گردن سے ذرا نیچے تلوار نے سانپ کو کاٹ دیا تھا۔ خون ذرا سا بھی نہیں بہا تھا۔ میں نے سانپ کے دونوں ٹکڑے، جیب میں ڈالے اور کھلے دروازے سے نکل کر باہر آیا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ میں دوڑ کر مکان کے پیچھے چلا گیا۔ پیچھے باجرے کا کھیت تھا۔ ایک پگڈنڈی بارڈر کی جانب جو علاقہ تھا اس طرف جا رہی تھی۔ مگر اب مجھے اس طرف نہیں جانا تھا۔ مجھ پر ایک بھاری ذمے داری عائد ہو چکی تھی۔ مجھے پاروتی کی زندگی پھر سے واپس لانے کے لئے کوہ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے میں واقع کیلاش پربت جانا تھا۔ میں نے وہیں سے اپنا رخ اس سڑک کی طرف کر لیا جو امرتسر شہر کے قریب سے گزرتی ہوئی آگے جالندھر لدھیانہ انبالے کی طرف جاتی تھی۔

میرا خیال تھا کہ میں جس چھوٹی سڑک پر جا رہا ہوں یہ جالندھر لدھیانے کی طرف ہی جاتی ہو گی۔ لیکن میرا خیال غلط تھا۔ یہ کچی سڑک امرتسر کی جیل کے قریب جا کر دائیں جانب ایک برساتی نالے کے پل کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نالے کے پل پر سے گزر کر دوسری طرف آیا تو میرے سامنے کمپنی باغ کے درختوں کی قطاریں تھیں امرتسر جیل کی طرف میں پہلی بار آیا تھا۔ سڑک اور کھیتوں پر ایک دہشت طاری تھی۔ کہیں کہیں سوائے ملٹری کے سپاہیوں کے اور کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ میں ان سے بھی چھپ کر آگے نکل گیا۔ صرف اس ڈر سے کہ اگر انہوں نے پکڑ کر میری تلاشی لی اور میری جیب سے کٹا ہوا سانپ نکلے گا جس کو وہ زمین پر پھینک کر کچل ڈالیں گے اور پھر شاید میں پاروتی کی زندگی کبھی نہیں بچا سکوں گا۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی تھا کہ یہ ساری ملٹری ہندو ڈوگرہ اور ہندو گورکھوں کی ملٹری ہے انہیں جب معلوم ہوا کہ میں مسلمان ہوں تو وہ مجھے کبھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہندو ملٹری نے بھی امرتسر میں ہندو سکھوں کے ساتھ مل کر سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کیا تھا۔ امرتسر کے کمپنی باغ کی ایک ایک سڑک میری دیکھی ہوئی تھی۔ یہاں سے مجھے جالندھر انبالے کی طرف جانے والی جی ٹی روڈ کا راستہ بھی آتا تھا۔ میں باغوں باغ جی ٹی روڈ پر نکل جانا چاہتا تھا۔ امرتسر شہر کی طرف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اوپر سے شام ہو رہی تھی۔ میں کمپنی باغ والی مال روڈ کی طرف جانے کی بجائے اس سڑک پر آگیا جو ریالٹو سینما اور پوسٹ آفس

کی عمارت کے آگے سے ہو کر بڑے ہسپتال کی طرف جاتی تھی۔ یہ کمپنی باغ کی مشرقی سڑک تھی۔ بالکل خالی پڑی تھی۔ میں کپڑوں سے ہندو ہی معلوم ہوتا تھا۔ تنگ موری کی پتلون تھی اور ماتھے پر ہندوؤں کی طرح میں نے ایک لال بندی بھی لگائی ہوئی تھی۔ یہ اگست 1947ء کے آخری دن تھے۔ فضا میں بڑا حبس تھا۔ کمپنی باغ کے درخت شام کے اندھیرے میں دھندلے ہو رہے تھے۔ ریالٹو سینما والی سڑک جس پر میں جا رہا تھا دور تک خالی پڑی تھی۔ میں ریالٹو سینما سے ذرا پہلے چوک میں سے کمپنی باغ کی طرف ہو گیا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ آگے ملٹری نہ ہو۔ کمپنی باغ ویران پڑا تھا۔ میں الیگزنڈرا گراؤنڈ میں سے ہوتا ہوا کمپنی باغ کے اس حصے میں آگیا جہاں اس کا رام باغ والا گیٹ تھا۔ یہاں سے میں چھوٹی نہر پر چڑھ گیا۔ یہ چھوٹی سی نہر دومونی کی طرف سے آتی تھی اور کمپنی باغ کو سیراب کرتی تھی۔ نہر کے کنارے چلتا چلتا میں دومونی پر جا کر بائیں جانب ہنسلی کے اوپر چلنے لگا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ یہ ہنسلی دراصل اسی نالے کی چھت تھی جس میں سے نہر کا تازہ پانی امرتسر کے دربار صاحب والے تالاب میں جا کر گرتا تھا۔

آگے ریلوے لائن آگئی۔ میں ہنسلی سے اتر کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میرا رخ جالندھر انبالے کی طرف تھا مگر میں وہاں تک پیدل نہیں جا سکتا تھا۔ کوئی ریل گاڑی بھی ملنی مشکل تھی۔ کیونکہ اس وقت پاکستان سے ہندو سکھ شرنارتھیوں سے بھری ہوئی ٹرینیں ہی آتی تھیں اور ان کا بھی کوئی وقت نہیں تھا کہ کب آ جائیں۔ ویسے بھی ان میں بیٹھنا خطرناک تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ہندو سکھ شرنارتھیوں کو مجھ پر مسلمان ہونے کا شک پڑ جائے۔ میں اللہ توکل ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ امرتسر کے چالیس کنوئیں بھی گزر گئے۔ اس کے بعد رات کا اندھیرا پوری طرح چھا گیا۔

یہ فسادات کی خون آلود رات تھی۔ ہر طرف وحشت طاری تھی۔ اگست کی حبس آلود رات کی فضا میں آگ اور خون کی بو رچی ہوئی تھی۔ ریلوے لائن سے دور ایک

گاؤں میں لگی ہوئی آگ نظر آئی۔ ست سری اکال کے نعرے بھی سنائی دیئے۔ میں موت کے منہ میں چلا جا رہا تھا۔ خیال آیا کہ یہاں کسی جگہ چھپ کر رات گزار دینا چاہئے۔ صبح کی روشنی میں آگے چلوں گا تاکہ معلوم تو ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں لیکن پھر سوچا کہ رات کے اندھیرے میں تو میں پھر بھی خطرناک علاقے سے گزر جاؤں گا۔ دن کی روشنی میں سکھوں کے قابو آ گیا تو پاروتی کے ساتھ میں بھی ختم ہو جاؤں گا۔

میرے پاس اتنے پیسے موجود تھے کہ میں بڑی آسانی سے کیلاش پربت پہنچ سکتا تھا۔ کیلاش پربت پہنچنے کے لئے مجھے جالندھر سے انبالے جانا تھا جہاں سے گاڑی بدل کے مراد آباد اور پھر گورکھپور کی طرف نکل جانا تھا۔ اس کے آگے شمال کی جانب ہمالیہ پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہمالیہ کی پہاڑیوں میں ہی کیلاش پربت نام کی ایک پہاڑی تھی۔ یہ سب کچھ مجھے پاروتی نے سمجھا دیا ہوا تھا۔ اس پہاڑی کے دامن میں کوئی مندر تھا۔ مندر کے صحن میں ایک تالاب تھا۔ اس تالاب میں مجھے پاروتی ناگن کے جسم کے ٹکڑے کسی ڈبے میں بند کر کے چھ دن تک رکھنے تھے۔ ساتویں دن پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں نے آپس میں جڑ جانا تھا اور پاروتی نے سانپ کے روپ میں پھر سے زندہ ہو جانا تھا۔

یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ مگر جان کا خطرہ صرف مراد آباد تک ہی تھا۔ اخبارات کے ذریعے معلوم ہوتا تھا کہ آگے گورکھپور کے علاقے میں اتنے زیادہ فسادات نہیں ہو رہے۔

بہرحال مجھے کسی نہ کسی طرح کیلاش پربت پہنچنا ہی تھا۔ سوال یہ تھا کہ جالندھر سے انبالے تک کیسے پہنچا جائے۔ پاروتی کے ساتھ امرتسر کی طرف سفر کرتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں شہروں میں ہندو سکھ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے تھے اور ان شہروں میں ایک بھی مسلمان نہیں بچا تھا۔ سب سے پہلے مجھے جالندھر پہنچنا تھا۔ میں وہاں تک پیدل نہیں جا سکتا تھا۔ ریلوے لائن کے ساتھ چلتے چلتے میں تھکا تو نہیں تھا مگر

اندھیرے میں میرے پاؤں بار بار پتھروں پر پڑ رہے تھے۔ وہاں کوئی روشنی وغیرہ بالکل نہیں تھی۔ دونوں جانب اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔

میں نے غلطی کی جو شام کے وقت اس طرف نکل آیا۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں کمپنی باغ میں کسی جگہ درختوں میں چھپ کر رات گزار دیتا۔ بار بار یہی افسوس ہو رہا تھا۔ مگر اب واپس کمپنی باغ بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ شہر میں کرفیو لگ گیا ہو۔ چلتے چلتے مجھے ایک طرف کھیتوں میں کچھ فاصلے پر جھلملاتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔

میں رک کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ کسی گاؤں کی روشنی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر گاؤں کی روشنی ہوتی تو اس کے ساتھ دوسری اور روشنیاں بھی ضرور نظر آتیں یہ ایسی روشنی تھی جیسے کسی نے درختوں کے اندھیرے میں کوئی چراغ جلا رکھا ہے۔

میرے قدم بے اختیار اس روشنی کی طرف اٹھ گئے۔ میں اونچی ریلوے لائن سے نیچے اتر کر روشنی کی طرف کھیتوں کھیت چل پڑا۔ چھ سات کھیتوں میں سے گزرنے کے بعد میں اس روشنی کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ بڑے گھنے سیاہ تاریک درخت ہیں۔ ان کے نیچے ایک جگہ چراغ جل رہا ہے میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا دوسری طرف سے درختوں کے پاس آ گیا۔ میں نے ایک جھونپڑی دیکھی جس کے آگے چوکور مٹی کا چبوترا تھا۔ چبوترے کی اینٹوں پر دیا روشن تھا۔ جھونپڑی کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس پر کوئی بوریا بھی نہیں لٹک رہا تھا۔ وہاں کوئی آدم زاد بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میں چبوترے کے قریب آ کر رک گیا۔ مجھے ایک جانب دیئے کی مدھم روشنی میں ایک کنوئیں کی چرخی نظر آئی۔ یہاں ایک کنواں بھی تھا۔ شاید یہ کوئی تکیہ تھا۔ فسادات کی وجہ سے یہاں جو ملنگ درویش وغیرہ رہتے تھے وہ یا تو قتل ہو گئے تھے اور یا بھاگ کر پاکستان چلے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ جھونپڑے کے اندر دیکھنا چاہئے۔ اگر جھونپڑا خالی ہوا تو یہاں بڑے آرام سے میں رات بسر کر سکوں گا۔

جیسے ہی میں جھونپڑے کی طرف بڑھا۔ پیچھے سے کسی مرد کی بھاری آواز آئی۔

"کون ہے تو؟"

میرے قدم وہیں رک گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دیئے کی روشنی میں مجھے ایک آدمی نظر آیا جس کا سر منڈا ہوا تھا۔ بدن پر درویشوں والا سیاہ لمبا کرتہ اور تہمد تھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے مجھ سے پنجابی میں بات کی تھی۔ میں نے پنجابی میں ہی جواب دیا۔

"مسافر ہوں۔ پیاس لگی تھی پانی پینے آ گیا ہوں۔"

"یہاں بیٹھ جا میں تمہیں پانی پلاتا ہوں۔"

چبوترے پر صف بچھی ہوئی تھی - میں صف پر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی جھونپڑی کے اندر گیا اور میرے لئے کسی مٹکے میں سے مٹی کے آبخورے میں پانی بھر کر لے آیا۔

اس نے آبخورہ میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے پانی پیا اور آبخورہ صف پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بس راستہ بھول گیا تھا۔"

میں اسے یہ بتاتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ میں مسلمان ہوں یا ہندو ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ پراسرار فقیر ہندو ہے یا مسلمان۔۔۔۔۔۔ اس لئے میں نے گول مول بات کہہ دی تھی۔ وہ میرے سامنے صف پر بیٹھ گیا۔ اس نے کرتے کی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر کھولا۔ اسے میری طرف بڑھا کر کہا۔

"سگریٹ پیتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "جی نہیں شکریہ!"

"لے لو۔ میں جانتا ہوں تم سگریٹ پیتے ہو ڈرو نہیں۔ یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ تم مسلمان ہو یا ہندو ہو تو اپنے گھر ہو گے۔ یہاں بے فکر ہو کر بیٹھو۔ سگریٹ لگاؤ۔"

سگریٹ کڑوا اور سخت تھا۔ مجھے پہلے ہی کش کے ساتھ کھانسی آ گئی۔ وہ آدمی

"گلے کو اتنا نازک کیوں بنا رکھا ہے؟ میرے پاس تو تمہیں یہی تار کا سگریٹ ملے گا۔"

تار مارکہ سگریٹ اس زمانے میں دنیا کا سب سے گھٹیا سگریٹ تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں تمباکو کی بجائے سڑکوں کی مٹی اور گھاس بھری ہوتی تھی۔ مجھے دوسرا کش لگانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس آدمی نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے نام بتایا تو وہ ہنس کر بولا۔

"مسلمان ہو۔ موت سے چھپتے پھر رہے ہو گے۔"

میں اس کی اس بات پر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس کی آنکھون میں کچھ ایسی چمک اور مقناطیسی کشش تھی کہ میں زیادہ دیر اس کی طرف نہ دیکھ سکا۔ میں نے نظریں جھکا لیں اور کہا۔

"مجھے آپ بھی مسلمان لگتے ہیں۔"

"ہاں میں بھی مسلمان ہوں۔ مگر تمہاری طرح موت سے چھپتا نہیں پھرتا۔"

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا آپ رات کے وقت یہاں آتے ہیں یا دن کے وقت بھی آتے ہیں؟"

وہ بولا۔ "رات اور دن میں کیا فرق ہوتا ہے؟ میں دن کے وقت بھی اسی جگہ رہتا ہوں رات کو بھی یہیں رہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "آپ کے چاروں طرف ہندو سکھ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ آپ کسی قافلے کے ساتھ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے؟"

وہ بولا۔ "کیا پاکستان میں کوئی اور خدا ہے؟ اگر خدا نے مجھے بچانا ہے تو یہاں بھی بچا لے گا۔ یہاں بھی وہی خدا ہے۔"

اس آدمی کی باتیں میری سمجھ سے بالا تھیں۔ میں نے کہا۔

"مجھے انبالے جانا ہے۔ کیا یہاں آگے کسی جگہ سے مجھے انبالے جانے والی کوئی

گاڑی مل سکے گی؟"

وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ پھر بولا۔

"تمہیں آگے کرتار پورے کے سٹیشن سے ہی جالندھر انبالے جانے والی کو گاڑی مل سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"مگر ساری گاڑیاں پاکستان سے آنے والے ہندو سکھ شرنارتھیوں کی ہیں۔ اور م مسلمان ہوں۔ مجھے وہاں جان کا خطرہ ہے۔"

"جان کا خطرہ تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ آدمی کو کہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں جان خطرہ ہے اور کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں بھی جان کا خطرہ ہے۔ تم کس خطرے بات کر رہے ہو؟"

یہ پراسرار آدمی پھر معرفت کی باتیں کرنے لگا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ س تھیں۔ میں نے کہا۔

"اچھا آپ یہ بتائیں کہ کرتار پورے کا سٹیشن یہاں سے کتنی دور ہے؟"

وہ کہنے لگا۔ "رات یہاں پڑے رہو۔ صبح بتا دوں گا تم کو بھوک لگی ہو گی تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ مجھے مہمان زہر لگتے ہیں اور مہمانوں کی خدمت کرنا تو بہت ہی زہر لگتا ہے۔ مگر تم مجھ پر مصیبت بن کر نازل ہو گئے ہو تو تمہیں ک نہ کچھ کھلانا ہے پڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ جھونپڑی میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں تھ تھی جس میں گرم گرم کابلی چنوں کا پلاؤ تھا۔ پلاؤ میں سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ خ جانے اندر کونسی دیگ پک رہی تھی کہ جہاں سے وہ گرم گرم پلاؤ نکال کر لے آیا تھا

"لو کھاؤ۔"

اس نے تھالی میرے ہاتھوں میں تھما دی۔

"اب تمہارے لئے پانی بھی اندر سے لانا پڑے گا۔ بڑی مصیبت ہے۔"

میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ جب میں کھانا کھا چکا تو اس نے مجھ سے کہا۔

"تمہیں ڈر لگا ہے کہ کہیں رات کو سکھ آ کر تمہیں مار نہ ڈالیں اس لئے تم جھونپڑی میں جا کر سو جاؤ۔ میں باہر سو جاؤں گا۔"

جھونپڑی میں ایک جھلنگا چارپائی پڑی تھی جس پر نہ کوئی بستر تھا نہ تکیہ۔ باہر سے اس آدمی کی آواز آئی۔

"تکیئے کی جگہ بے شک باہر سے ایک اینٹ لے جاؤ۔"

خدا جانے یہ بات اس آدمی نے طنز کے انداز میں کہی تھی یا واقعی وہ چاہتا تھا کہ میں اینٹ کا سرہانہ بنا کر سوؤں۔ بہرحال میں نے جھونپڑی کے حبس اور گرمی میں رات کاٹ دی۔ صبح اٹھا تو وہ آدمی چبوترے کی صف پر ایک طرف بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"نہانا ہے تو کنوئیں پر بوکے نکال کر نہا لو۔"

میں نے صرف منہ ہاتھ ہی دھویا۔ پھر میں اس کے پاس آ کر صف پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کرتار پورہ یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"دس بارہ میل تو ہو گا۔ سوچ لو۔ پیدل جاؤ گے تو راستے میں تمہیں سکھ مار ڈالیں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا میں تمہارے لئے چائے لاتا ہوں۔"

وہ جھونپڑی کے پیچھے درختوں میں چلا گیا۔ واپس آیا تو ہاتھ میں ٹین کا ٹرے تھا جس میں چائے کی چینک، دو پیالیاں اور ایک بند پڑا تھا۔

"یہ لو ناشتہ کر لو۔ میں تو صرف چائے پیوں گا۔"

میں بڑا حیران ہو رہا تھا کہ یہ شخص گرم گرم چائے کہاں سے لے آیا ہے۔ پیچھے

درختوں میں مجھے تو کوئی چائے کی دکان نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر اس نے چولہے پر خو بنائی تھی تو اتنی جلدی وہ چائے نہیں بنا سکتا تھا جتنی جلدی وہ چائے لے کر آیا تھا۔ رات کو بھی جھونپڑے سے وہ کابلی چنے کا پلاؤ لے آیا تھا۔ میں نے جھونپڑی میں صبح کی روشنی میں اچھی طرح دیکھا تھا وہاں کوئی پلاؤ کا دیگچہ وغیرہ نہیں تھا۔ پانی کا مٹکا بھی نہیں تھا۔ میں نے بند کے ساتھ چائے پی - اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم انبالے کیا لینے جا رہے ہو؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"وہاں میرے کچھ رشتے دار پھنسے ہوئے ہیں۔ انہیں نکالنے جا رہا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ سگریٹ کا کش لگا کر بولا۔

"جھوٹ بولنے سے تمہیں کیا مل گیا ہے؟"

میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور کہا۔

"کیا پاکستان سے آنے والی ہندو سکھوں کی ریفیوجی ٹرین کرتار پورے ٹھہرتی ہے؟"

"کیوں نہیں ٹھہرے گی۔ یہ شرنارتھیوں کی بلائیں تو جگہ جگہ اتر رہی ہیں۔"

ابھی دھوپ زیادہ تیز نہیں ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ گرمی ہونے سے پہلے پہلے کرتار پورے کے جتنا نزدیک پہنچ سکتا ہوں پہنچ جاؤں۔ میں اس آدمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملانے لگا تو اس نے اپنا ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔

"ٹھیک ہے۔ ہاتھ ملانے کی کوئی ضرورت نہیں - اب تم جاؤ۔ نہیں تو سکھ آ جائیں گے۔ سکھ آ گئے تو میں تو بڑے آرام سے مر جاؤں گا۔ تم بڑا شور مچاؤ گے۔"

میں وہاں سے آگے روانہ ہو گیا۔

میں کھیتوں کھیت چلتا ایک بار پھر ریلوے لائن پر آ گیا۔ ریلوے لائن پر چلنا زیادہ محفوظ تھا۔ اور اس طرح میں راستے سے بھٹک بھی نہیں سکتا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی ۔گرمی بڑھ گئی تھی۔ مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ اردگرد بڑی ویرانی تھی۔ کھیتوں میں کوئی آدمی

نظر نہیں آتا تھا۔ دور دور کہیں کہیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا میں موت کا خوف طاری تھا۔ مجھے لائن پر کچھ دور ریلوے کا سگنل دکھائی دیا۔ یہ کوئی سٹیشن تھا۔ میں چلا جا رہا تھا کہ جھاڑیوں میں مجھے ایک انسان کی لاش نظر آئی۔ میں ذرا آگے گیا تو لائن کے آس پاس کتنی ہی کٹی پھٹی لاشیں دکھائی دیں۔ پرانے کپڑے اور سامان بکھرا پڑا تھا۔ میں ڈر کر ریلوے لائن سے نیچے اتر آیا اور جھاڑیوں سے ہٹ کر چلنے لگا۔

کیکر کے درخت پر میں نے دو چھ چھ سات سات مہینوں کے معصوم بچوں کی ننگی لاشیں لٹکتی دیکھیں تو میں مارے خوف کے تیز تیز چلنے لگا۔ یہ مسلمان مہاجرین کا کوئی قافلہ ہو گا جس پر سکھوں نے حملہ کر کے مسلمان مہاجروں کو قتل کر دیا تھا اور ان کے بچوں کے سینے میں برچھیاں مار کر ان کی لاشیں درختوں سے لٹکا دی تھیں۔ وہاں عورتوں کی کٹی ہوئی لاشیں بھی تھیں یہ ساری عورتیں ادھیڑ عمر اور بوڑھی تھیں۔ ظاہر ہے جوان عورتوں کو اغوا کر لیا گیا ہو گا۔

آج اتنی مدت کے بعد جب میں اس دل ہلا دینے والے منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لاتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ہمارے بزرگوں نے کتنی قربانیاں دی تھیں پاکستان کے لئے۔ اور ہم نے پاکستان کو کس حال تک پہنچا دیا ہے۔ مجھے اپنے پیچھے ریل کے انجن کی سیٹی سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دن کی روشنی میں دور سے ایک ٹرین آتی دکھائی دی۔ چھوٹا سا سٹیشن تھوڑی دور تھا۔ اس کے پلیٹ فارم کا جنگلا مجھے نظر آ رہا تھا۔ مجھے جان کا خوف بھی تھا۔ میں اس ٹرین پر بھی سوار ہونا چاہتا تھا۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ مجھے اس چھوٹے سے سٹیشن کا نام یاد نہیں رہا۔ میں ایک طرف چھپ کر بیٹھ گیا۔ ٹرین آ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ پاکستان سے آنے والی ہندو سکھ شرنارتھیوں کی ٹرین تھی۔ چھت پر بھی لوگ اپنا سامان لادے بیٹھے تھے۔ لوگ اترنے لگے۔ ان میں زیادہ تعداد سکھوں کی تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنا سامان اتار رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ پاکستان سے جو ہندو سکھ انڈیا آ رہے تھے وہ اپنا سامان بھی ساتھ لا رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ رواداری مسلمان کے خون میں شامل ہے۔ وہ معاف کرنا بھی جانتا

ہے اور دشمن سے انتقام لینا بھی جانتا ہے۔ مسلمان کے دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے۔ جبکہ میں اس حقیقت کا شاہد ہوں یعنی گواہ ہوں کہ سن 47ء کے فسادات میں سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو بڑی بیدردی سے شہید کیا تھا۔ بچوں تک کو معاف نہیں کیا تھا۔ میں نے درختوں پر معصوم بچوں کی ٹنگی ہوئی لاشیں دیکھی ہیں۔ میں یہ لاشیں پاکستان کی نئی نسل کے ان نوجوانوں کو دکھانا چاہتا ہوں جو انڈیا کی فلمیں اور انڈیا کے گانے نہ صرف گھروں میں لے جا کر دیکھتے اور سنتے ہیں بلکہ ان گانوں پر ڈانس بھی کرتے ہیں۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ انڈیا کے گانوں پر نہیں بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی لاشوں پر رقص کر رہے ہیں جنہیں انڈیا کے ہندو سکھوں نے قتل کر دیا تھا۔

مجھے اس ٹرین میں بیٹھنا تھا کیونکہ یہ ٹرین آگے جا رہی تھی۔ میں ایک ڈبے میں گھس کر فرش پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ وہاں کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔ ٹرین تھوڑی دیر بعد چل پڑی۔ ایک سکھ نے مجھے گھور کر دیکھا اور پنجابی میں پوچھا۔

"کہاں سے آئے ہو تم؟"

میں نے بھی پنجابی میں کہا۔

"جی میں لاہور سے آ رہا ہوں۔"

"وہاں کہاں رہتے تھے؟" سکھ نے پوچھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اسے مجھ پر کچھ شک ہو رہا ہے کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ خدا جانے۔ شاید میری شکل پر لکھا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ میں لاہور کی ایک ایک گلی ایک ایک بازار سے واقف تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کونسے محلے میں ہندوؤں کی اور کونسے علاقے میں سکھوں کی آبادی زیادہ ہے۔ میں نے کہا۔

"سنت نگر میں ہمارا مکان تھا جی مسلمانوں نے اسے آگ لگا دی۔ میرے ماتا پتا جی بھی میرے ساتھ ہی نکلے تھے۔ سٹیشن کی طرف جاتے ہوئے وہ مجھ سے بچھڑ گئے۔"

سکھ مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک پوٹلی کھول کر ٹین کا ڈبہ نکالا۔ اس میں دال کے نمکین لڈو تھے۔

"یہ لو تم بھی کھاؤ۔"

میں ایک لڈو لے کر کھانے لگا۔ ٹرین آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ سکھ کے ساتھ اس کی فیملی اور دوسرے ہندو سکھ شرنارتھی بھی بیٹھے تھے۔ وہ سب پاکستان کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ اگر کوئی ان میں سے میری طرف دیکھتا تو میں ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ اس طرح ٹرین کبھی تیز چلتی کبھی آہستہ چلتی کبھی رکتی رات

کے وقت انبالے پہنچی۔ یہاں سے مجھے مراد آباد کے لئے گاڑی بدلنی تھی۔ میں ڈبے سے اتر گیا۔ سانپ کی شکل میں پاروتی کی کٹی ہوئی لاش یعنی سانپ کے جسم کے دونوں ٹکڑے رومال میں بندھے میری جیب میں تھے۔ مراد آباد میں بھی بڑے خوفناک فسادات ہوئے تھے۔ سٹیشن پر ویرانی برس رہی تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ یہاں سے کلکتہ اور اوپر گورکھپور کی جانب ٹرینیں چل رہی تھیں۔ میں نے ایک قلی سے پوچھا کہ گورکھپور جانے والی ٹرین کس وقت روانہ ہوتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجھے مراد آباد سے لکھنؤ جانا ہو گا' لکھنؤ سے مجھے گورکھپور جانے والی گاڑی ملے گی۔

میرے پاس پیسے موجود تھے۔ میں نے سب سے پہلے سٹیشن پر ہی تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ اور پلیٹ فارم کے ایک کونے میں بیٹھ کر لکھنؤ جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ ساڑھے دس بجے ایک گاڑی آئی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ اس گاڑی نے مجھے آدھی رات کے وقت گورکھپور پہنچایا۔ گورکھپور میں کچھ امن و امان کی صورت تھی۔ یہاں سے کوہ ہمالیہ کی چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ پاروتی نے ایک بار مجھے سمجھاتے ہوئے بتایا تھا کہ گورکھپور میں بیرگنج جانے والی چھوٹی لائن کی ریل گاڑی میں سوار ہوں گا۔ بیرگنج سے ایک پہاڑی سڑک اوپر کیلاش پربت کے مندر کو جاتی ہے۔

گورکھپور اتر کر وہیں سٹیشن کے مسافر خانے میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ یہاں اتنی گرمی نہیں تھی جتنی پنجاب کے میدانی علاقے میں تھی۔ حبس بھی نہیں تھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا مسافر خانے میں کافی لوگ تھے - خدا جانے یہ مسافر تھے یا شرنارتھی تھے۔ مجھے ہر جگہ اپنے آپ کو ہندو ہی ظاہر کرنا تھا۔ کیونکہ میں ہندو اکثریت کے علاقے میں سفر کر رہا تھا اور ہندوؤں کے مندر میں جا رہا تھا۔

میں نے وہیں رات گزار دی۔ یہ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ بیرگنج کو ایک میٹر گیج یعنی چھوٹی ریلوے لائن والی ٹرین دوپہر کو جائے گی۔ مجھے یہ وقت سٹیشن پر ہی گزارنا تھا۔ اگرچہ لوگوں کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ شہر میں امن و امان ہے اور کرفیو بھی اٹھا لیا

گیا ہے مگر میں شہر میں جا کر اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ دوپہر کے وقت میں نے مسافر خانے میں ہی تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ پھر بیرگنج جانے والی چھوٹے ڈبوں کی ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی تقریباً خالی تھی۔ میں اپنے ڈبے میں کونے والی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اوپر میں جہاں جا رہا تھا ادھر کوہ ہمالیہ کی پہاڑیوں کے دامن میں ہندوؤں کے بڑے بڑے مندر تھے۔ گاڑی میں کئی سادھو لوگ بھی بیٹھے تھے۔ وہ بڑے مزے سے چوکڑیاں مار کر سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ لوگ ان کی خاطر تواضع کر رہے تھے۔ میرے ڈبے میں سادھو کوئی نہیں تھا۔ مندروں کی یاترا کرنے والے یاتری ہی تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ مندر کی مورتیوں پر چڑھانے کے لئے پھولوں کے ہار اور خدا جانے کیا کیا کچھ لے جا رہے تھے۔

گاڑی چلنے لگی تو ایک بوڑھی عورت ڈبے میں آ گئی۔ اس کے سفید بال رسیوں کی طرح کے تھے۔ اس نے ایک گٹھڑی اٹھائی ہوئی تھی۔ وہ سیدھی میرے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس عورت کی عمر ساٹھ ستر کے قریب ہو گی۔ رنگ کالا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ اس نے گیروے رنگ کی میلی سی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ گٹھڑی اس نے پاس ہی رکھ دی۔ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ اس کے منہ میں چند ایک دانت ہی باقی رہ گئے تھے۔ بولی۔

"بیٹا میں غریب بھکشنی ہوں۔ کیلاش ماتا کے درشن کرنے جا رہی ہوں۔"

میں مسکرا کر خاموش رہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

گارڈ نے جھنڈی ہلائی۔ انجن نے سیٹی دی اور گاڑی جھک جھک کرتی پلیٹ فارم پر کھسکنے لگی۔ بوڑھی عورت نے گٹھڑی میں ہاتھ ڈال کر ایک پوٹلی نکالی۔ پوٹلی میں سے نسواری رنگ کا سفوف نکال کر ہتھیلی پر رکھا۔ اوپر دوسری ہتھیلی آہستہ سے ماری اور پھر سفوف کا پھکا منہ میں ڈال لیا۔ کہنے لگی۔

"میرے دانت نہیں ہیں۔ بھنگ تمباکو پیس کر کھا لیتی ہوں تم بھی کیلاش جی کی یاترا کو جا رہے ہو بیٹا؟"

میں نے گول مول سا جواب دیا۔

"ہاں ماتا جی۔ وہیں ایک جگہ جا رہا ہوں۔"

وہ اپنا پوپلا سا منہ چلا رہی تھی کہنے لگی۔

"کیلاش ماتا کے مندر کی یاترا کرنے میں ہر سال جاتی ہوں۔ پہلے ماتا جی کی مورتی کے درشن کرتی ہوں۔ پھر ناگ دیوتا کے مندر میں جا کر ناگ پوجا کرتی ہوں۔"

میں پھر بھی کچھ نہ بولا۔ اتنا مجھے پتہ چل گیا تھا کہ یہ عورت کیلاش پربت کے سارے مندروں اور خاص طور پر ناگ دیوتا کے مندر سے بھی واقف ہے۔ مجھے اصل میں اسی ناگ مندر میں جانا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اس سے ناگ مندر کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ پھر خیال آیا کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ میں راز داری سے کام لینا چاہتا تھا۔ یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ بوڑھی عورت بڑی زبردست سپیرن ہے اور وہ ناگن پاروتی کی بو پا کر ہی میرے ڈبے میں آئی تھی۔ اور جان بوجھ کر اس نے ناگ دیوتا کی باتیں شروع کی تھیں۔

بوڑھی عورت ناگ دیوتا کے بارے میں بتانے لگی۔

"ناگ دیوتا بڑے شکتی مان دیوتا ہیں بیٹا کیا تم نے ان کے درشن کئے ہیں؟"

مجھے ناگ دیوتا کے درشن کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ اگر مجھے ناگ دیوتا سانپ کے روپ میں کہیں مل جاتے تو میں اینٹ مار کر اسے وہیں ہلاک کر دیتا۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔"

بوڑھی عورت ایسی چالاکی سے باتیں کر رہی تھی کہ آخر مجھے اس سے پوچھنا ہی پڑا کہ ناگ دیوتا کا مندر کس جگہ پر ہے۔ وہ کہنے لگی۔

"بیٹا تم کیوں فکر کرتے ہو۔ میں تمہیں خود وہاں لے جا کر ناگ دیوتا کے درشن کراؤں گی۔ یہ مندر پہاڑیوں کے درمیان بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ وہاں تو کوئی کوئی

یاتری ہی جاتا ہے۔ مگر میں تمہیں خود ساتھ لے کر جاؤں گی۔ اکیلے جاؤ گے تو راستہ بھول جاؤ گے۔ کیلاش پربت کی پہاڑیوں میں اگر کوئی راستہ بھول جائے تو اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کئی یاتری ان پہاڑیوں میں بھٹک کر گم ہو چکے ہیں۔"

اس مکار عورت نے مجھے کچھ ایسا ڈرایا کہ مجھے کہنا ہی پڑا۔

"ماتا تم مجھے اپنے ساتھ ہی ناگ دیوتا کے مندر میں لے جانا۔"

وہ بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

"تمہارا کیا نام ہے بیٹا؟"

میری زبان پر ہندوانہ ایک ہی نام آیا۔ میں نے کہہ دیا۔

"میرا نام موہن لال ہے۔ میں امرتسر سے آیا ہوں۔ میرے پتا جی بیمار ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ناگ دیوتا کے مندر کے تالاب کا پانی لا کر انہیں پلایا جائے۔ یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں مندر کے تالاب کا پانی لینے جا رہا ہوں۔"

بوڑھی سپیرن جھوم اٹھی۔ سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے ہاتھ باندھ کر خدا جانے کس زبان میں منتر پڑھنے لگی۔ وہ منتر پڑھتے پڑھتے مجھ پر پھونکیں بھی مارتی جا رہی تھی۔ میں دل میں ہنس رہا تھا کہ یہ کیسی احمق عورت ہے ۔ اس کو معلوم ہی نہیں کہ میں ہندو نہیں ہوں اور اس کے ناگ دیوتا کے وجود ہی کو نہیں مانتا اور اگر میرا بس چلے تو میں ہمالیہ کی پہاڑیوں کے سارے مندروں کے بت پاش پاش کر دوں۔ بوڑھی سپیرن منتر ختم کر چکی تھی۔ کہنے لگی۔

"بیٹا! ناگ دیوتا کے تالاب کا جل امرت ہے چاہے کوئی روگ لگا ہو تالاب کے امرت جل کا ایک گھونٹ پلا دو۔ سارے روگ جاتے رہیں گے۔"

کوئی دو اڑھائی گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرین بیر گنج کے چھوٹے سے پہاڑی سٹیشن پر آ کر رک گئی۔ بوڑھی سپیرن مجھے اپنے ساتھ لے کر ڈبے سے اتری۔ وہ میرے ساتھ بالکل شفیق ماں ایسا سلوک کر رہی تھی۔ میں اپنی غرض کی وجہ سے اس کے ساتھ ہو گیا تھا کہ یہ عورت مجھے میری منزل تک پہنچا دے گی ورنہ مجھے ناگ مندر تک پہنچنے میں

کافی پریشانی اٹھانی پڑتی۔ کیونکہ وہاں کوئی شخص میری راہ نمائی کرنے والا نہیں تھا۔ عورت مجھے بے ضرر بھی لگ رہی تھی۔ ہم سٹیشن سے باہر آ گئے۔ باہر دو تین یکے کھڑے تھے۔ یہ علاقہ ایسا تھا کہ کہیں زمین اونچی اور کہیں نیچی تھی۔ دور دور تک پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں اس عورت سے ناگ دیوتا کے مندر کا پتہ معلوم کرنے کے بعد بیرگنج کے کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔ جب میں نے بوڑھی سپیرن سے کہا کہ مجھے ناگ مندر کا پتہ سمجھا دو۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا تو وہ بولی۔

"رام رام کرو بیٹا! تم اکیلے وہاں کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ یہ مندر تو کیلاش پربت کے اوپر بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ ایک سرنگ میں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ تم میرے ساتھ جاؤ گے۔ میں بھی ادھر ہی جا رہی ہوں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ میں اس عورت کے ساتھ ہی چلوں۔ اس طرح آسانی سے ناگ دیوتا کے مندر میں پہنچ جاؤں گا۔ میں نے سپیرن سے کہا۔

"ماتا میں تو کل ناگ مندر جاؤں گا۔ میں سفر سے بڑا تھک گیا ہوں۔ اب میں کسی ہوٹل میں جا کر آرام کروں گا۔"

بوڑھی سپیرن منہ اوپر نیچے چلاتے ہوئے کہنے لگی۔

"جیسے تمہاری مرضی بیٹا۔ تم مجھے اپنا ہوٹل دکھا دو۔ میں تمہیں صبح وہاں سے لے لوں گی۔"

"اچھا ماتا میرے ساتھ آؤ۔"

بیرگنج ایک نیم پہاڑی قصبہ تھا۔ وہاں ایک ہی معقول ہوٹل تھا یہ ایک منزلہ مکان تھا جس کو ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کمرے کا کرایہ معمولی تھا۔ میں نے بوڑھی سپیرن سے کہا۔

"ماتا جی! میں اسی ہوٹل میں ہوں گا۔ کل صبح کے نو بجے تم آ جانا۔ پھر چل پڑیں گے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! ایسا ہی کرتے ہیں۔ تم آرام کرو۔ میں کل صبح آؤں گی۔"

بوڑھی عورت یعنی بوڑھی سپیرن چلی گئی۔ ابھی تک مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت بڑی مکار سپیرن ہے اور وہ ایک خاص مقصد دل میں رکھ کر میرے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ جب وہ چلی گئی تو میں نے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جا کر جیب میں سے رومال نکال کر کھولا۔ پاروتی کے سانپ کے روپ میں دونوں ٹکڑے اسی طرح موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ ان ٹکڑوں کو کسی چھوٹے سے ڈبے میں بند کر کے رکھنا چاہئے۔ پھر وہی ڈبہ میں اسی طرح کیلاش مندر کے تالاب میں ڈال دوں گا۔ میں نے ہوٹل کے نوکر سے ٹین کا ایک چھوٹا خالی ڈبہ منگوایا اور پاروتی کے سانپ جسم کے دونوں ٹکڑے اس میں ڈال کر ڈبے کو بند کر دیا۔ یہ ڈبہ اتنا چھوٹا تھا کہ میری جیب میں آسانی سے آ جاتا تھا۔ جس رومال میں میں نے پاروتی کے سانپ کے ٹکڑوں کو پہلے باندھ کر رکھا ہوا تھا وہ رومال میں نے اپنی دوسری جیب میں رکھ لیا۔ رات میں نے ہوٹل میں گزاری۔

دوسرے دن سورج نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی بوڑھی سپیرن آ گئی۔ میں تھوڑی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا اور نیچے ہوٹل میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ میں نے بوڑھی سپیرن کو بھی ناشتہ کرایا۔ آخر وہ میری بے غرض مدد کر رہی تھی۔ مجھے اس کی اتنی خاطرداری تو ضرور کرنی چاہئے تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"ماتا! میں اوپر جا کر تیار ہوتا ہوں تم یہیں بیٹھ کر چائے پیو۔"

وہ مجھے دعائیں دیتی ہوئی بولی۔

"بیٹا! بھگوان تیرا سات جنموں میں بھلا کرے تو میری بڑی خدمت کر رہا ہے۔ فکر نہ کر۔ میں بھی تجھے ناگ دیوتا کے مندر میں پہنچا کر واپس آؤں گی۔"

مجھے تیار کیا ہونا تھا۔ بس منہ ہاتھ دھویا - پاروتی کے سانپ کے ٹکڑوں والا ڈبہ سنبھال کر جیب میں رکھ لیا۔ بوڑھی سپیرن نیچے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ گٹھڑی اس کے ساتھ ہی تھی۔ کہنے لگی۔

"بیٹا یہاں سے یکہ لے لیں گے۔ اوپر ڈبروگڑھ تک یکے جاتے ہیں۔ آگے

پہاڑیوں میں پیدل سفر شروع ہو گا۔"

ایک یکہ ہم نے کرا لیا۔ اور اونچے نیچے نیم میدانی کھیتوں میں سے گزرتے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈبرو گڑھ کے گاؤں میں پہنچے۔ یہاں سے ہمارا پیدل سفر شروع ہو گیا۔ بالکل ایسا علاقہ تھا جس طرح ہمارے کوہ مری جاتے ہوئے تریٹ کے مقام سے پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک بڑی ہری بھری وادی میں ہم جا رہے تھے۔ میں نے بوڑھی عورت سے کہا۔

"ماتا تم تھک تو نہیں جاؤ گی؟ ہمیں کتنا پیدل چلنا پڑے گا؟"

وہ کہنے لگی۔

"ارے بیٹا میری تو ساری عمران پہاڑیوں میں آتے جاتے گزر گئی ہے۔ ہر سال ناگ دیوتا کی یاترا کو آتی ہوں۔ ہر مہینے میں ایک بار درشن کرنے بھی ضرور آ جاتی ہوں۔ بس ہمیں ایک دن ایک رات لگ جائے گی مندر تک پہنچتے پہنچتے۔"

میل دو میل چلنے کے بعد چڑھائی شروع ہو گئی۔ یہ ہمالیہ کی ترائی کے ٹیلے تھے راستے میں کہیں کہیں کوئی چھوٹا سا گاؤں بھی آ جاتا۔ چھوٹے چھوٹے جھونپڑی نما مکان ہوتے جن کے آگے مٹی اور پتھروں کے چبوترے بنے ہوئے ہوتے۔

اس وقت آسمان پر بادل جمع ہونے لگے۔ بوڑھی سپیرن نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"زور کا مینہ برسے گا۔ یہ تو بارش کا طوفان لگتا ہے۔ ہمیں کہیں رک جانا گا۔"

بادل اتنے گہرے نہیں تھے۔ مگر میں نے ست پڑا کے جنگلوں کے بادل دیکھے تھے۔ میں نے سوچا شاید ہمالیہ کی ترائی میں ایسے ہی بادل طوفانی بارش لاتے ہوں۔ میں اس بوڑھی عورت کی ایک ایک بات پر یقین کرتا جا رہا تھا جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا مگر یہ میری بے وقوفی تھی اور بیوقوف آدمی ضرور مار کھاتا ہے۔ قدرت کے اصول اور ضابطے عقل مند آدمی کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیونکہ قدرت خود اصول اور ضابطے کی پا

ہے۔

میں نے اس عورت سے کہا۔

"آگے کوئی گاؤں ہو گا۔ وہاں کسی جھونپڑے میں پناہ لے لیں گے۔"

وہ بولی۔ "ہاں آگے ایک گاؤں آ رہا ہے۔ مجھے یاد ہے۔"

بادل اتنے گہرے سیاہ نہیں تھے لیکن آپس میں گھل مل گئے اور لگتا تھا کہ بارش ہو گی۔ ایک ٹیلے کا چکر کاٹ کر ہم آگے بڑھے تو کھپریل کی چھتوں والے چھ سات بوسیدہ سے مکان دکھائی دیئے۔ بوڑھی سپیرن نے ایک عورت سے آگے جا کر بات کی اور پھر مجھے اشارے سے بلایا۔

"یہ بڑے دھرمی لوگ ہیں۔ یاتریوں کی بڑی سیوا کرتے ہیں۔ انہیں دو چار روپے دے دو۔"

میں نے عورت کو چار روپے دیئے۔ وہ روپے لے کر بڑی خوش ہوئی۔ اس نے ایک مکان کا دروازہ کھول دیا۔ اندر پیاز کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کونے میں پیازوں کا ڈھیر لگا تھا۔ عورت کے آدمی نے اندر دو چارپائیاں ڈال دیں اور ہمارے لئے مٹی کے گلاسوں میں چائے بنا کر لے آیا۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ کھپریل کی ڈھلوان چھت پر بارش کی آواز آنے لگی۔ بوڑھی سپیرن چارپائی پر بیٹھ کر اپنی گٹھڑی کھولنے لگی۔

"بیٹا! اس میں میرے دو چار کپڑے، تمباکو اور تھوڑا سا گڑ ہے۔ یہ گڑ کالی ماتا کے مندر کا پرشاد ہے۔"

اور اس نے پوٹلی میں سے گڑ کی ڈلی نکال کر تھوڑا سا گڑ توڑ کر مجھے دیا۔ گڑ کا رنگ سنہری تھا۔ اس کے ساتھ تل اور بادام بھی لگے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"اسے کھاؤ۔ یہ پرشاد ہے۔ انکار نہ کرنا کالی ماتا ناراض ہو گی۔"

مجھے کالی ماتا کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں تھی لیکن گڑ کی رنگت اور تل بادام دیکھ کر میرا جی للچا گیا۔ میں نے گڑ کا ٹکڑا لے کر منہ میں ڈال لیا۔ واقعی گڑ بڑا لذیذ تھا۔

بوڑھی سپیرن گٹھڑی میں سے نکالے ہوئے پرانے کپڑوں کو جھاڑ کر تہہ کر رہی تھی اور بولے بھی جا رہی تھی۔

"تم بڑے بھاگ وان ہو جو ناگ دیوتا کے درشن کرنے جا رہے ہو۔ تمہاری جو خواہش ہو گی وہ ضرور پوری ہو جائے گی۔ وہاں سے کوئی سوالی خالی نہیں جاتا۔۔۔"

بوڑھی سپیرن باتیں کئے جا رہی تھی۔ میں دوسری چارپائی پر بیٹھا اسے باتیں کرتا دیکھ رہا تھا کہ مجھے اچانک ایک چکر سا آیا اور مجھے اتنا یاد ہے کہ میں پیچھے کو گرا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

ہوش اس وقت آیا جب میں باہر برآمدے میں فرش پر پڑا تھا۔ مکان کا مالک اور اس کی پہاڑن بیوی میرے پاس بیٹھے مجھے ہوش میں لانے کی تدبیریں کر رہے تھے۔ میں نے ہوش میں آتے ہی پوچھا۔

"مجھے کیا ہو گیا تھا؟"

پہاڑن عورت نے کہا۔ "پتہ نہیں کیا ہوا تھا؟"

اس کا خاوند کہنے لگا۔

"ہم تو تمہارے لئے کھانا تیار کرنے میں لگے تھے کہ تمہاری ماتا جی مکان کا دروازہ بند کر کے میرے پاس آئی۔ کہنے لگی۔ میرا بیٹا سفر کرتے کرتے بہت تھک گیا ہے۔ اب وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ اسے جگانا مت۔ میں اس کے لئے جنگل سے ایک جڑی بوٹی لینے جا رہی ہوں۔ وہ چلی گئی۔ ہم نے تمہیں نہ جگایا۔ جب شام ہونے لگی تو ہمیں تمہاری فکر لگی۔ ہم نے جا کر دیکھا کہ تم بے ہوش پڑے تھے۔۔۔۔۔۔"

میں نے جلدی سے اٹھ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرا بٹوا جس میں پیسے تھے اور ٹین کی وہ ڈبی جس میں ناگن پاروتی کے ٹکڑے رکھے تھے غائب تھی۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ یہ عورت اسی لئے میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اسے ناگن پاروتی کے جسم کے ٹکڑے چاہئے تھے اور وہ انہیں اڑا لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔

اس وقت رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

پہاڑی مکان کے برآمدے میں مٹی کے تیل کی لالٹین ستون کے ساتھ لگی جل رہی تھی۔ میں نے مکان کے مالک سے پوچھا کہ بوڑھی عورت کو گئے کتنی دیر ہو گئی ہے۔ اس نے کہا۔

"وہ تو دن کے وقت ہی چلی گئی تھی۔"

اس کا مطلب تھا کہ میں سارا دن بے ہوش پڑا رہا تھا۔ کاش میں اس عیار عورت کا گڑ نہ کھاتا۔ اس میں بے ہوشی کی دوائی ملی ہوئی تھی۔ اب کیا کروں؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھ سے پاروتی چھین لی گئی تھی۔ یقیناً یہ بوڑھی عورت کوئی سپیرن تھی اور اس نے میری جیب میں پڑے ہوئے پاروتی کے سانپ کے ٹکڑوں کی بو سونگھ لی تھی اور وہ اسے ہتھیانے کے لئے میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ پاروتی نے کئی بار مجھے کہا تھا کہ اب جب کہ مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی ہے کہ انسانی شکل سے سانپ کی شکل اختیار کر سکتی ہوں تو میں دشمن سپیروں کے لئے بڑی قیمتی ہو گئی ہوں۔ اگر کوئی سپیرا مجھے اپنے قبضے میں کر لیتا ہے اور اسے ناگ دیوتا کے وہ خفیہ منتر بھی آتے ہیں جن کے پڑھنے سے میری یادداشت گم ہو سکتی ہے تو وہ مجھ سے بڑے بڑے خطرناک کام لے سکتا ہے۔ اس لئے اگر کبھی میرے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا اور کسی انسان نے مجھے معمولی سانپ سمجھ کر مار دیا تو میری لاش کو بہت سنبھال کر رکھنا اور کیلاش پربت کے مندر تک جاتے ہوئے

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے کہ تم ناگن پاروتی کے سانپ کی لاش لے جا ر
ہو۔

افسوس میں بوڑھی عورت سے دھوکا کھا گیا جو ضرور بڑی خطرناک سپیرن تھی۔ پاروتی کی لاش کے ٹکڑے مجھے بے ہوش کر کے لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی خدا جانے اب وہ اسے اپنے قبضے میں کر کے اس سے کیسے کیسے برائی کے کام نہیں گی۔ میرا فرض ہو گیا تھا کہ میں اس مکار بوڑھی سپیرن کا کھوج لگا کر اس سے پاروتی لاش کے ٹکڑے کسی طرح واپس لوں۔ میں نے پہاڑی آدمی سے پوچھا۔

"ماتا یہاں سے کس طرف گئی تھی؟"

میرا خیال تھا کہ وہ اوپر ناگ دیوتا کے مندر کی طرف گئی ہو گی۔ مگر پہاڑیا
لگا۔

"میں رسوئی میں اپنی عورت کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے رسوئی کی کھڑکی تمہاری ماتا کو دیکھا تھا۔ وہ نیچے وادی میں شہر کی طرف جا رہی تھی۔ کیا تمہیں وہ بتا نہیں گئی تھی؟ تم بے ہوش کیسے ہو گئے تھے؟ کیا تم نے زیادہ دارو پی لیا تھا؟"

میں نے اسے تو کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں ہاتھ ڈال دیکھا۔ یہاں میں نے سو روپے کا ایک نوٹ تہہ کر کے چھپا کر رکھا ہوا تھا کہ اگر چوری ہو گیا تو یہ روپے میرے کام آ سکتے ہیں۔ سو کا تہہ کیا ہوا نوٹ مجھے مل گیا۔ جیب میں وہ رومال بھی تھا جس میں میں نے پاروتی کے سانپ کے روپ میں کٹے ہو ٹکڑے باندھے تھے اور پھر اس میں سے نکال کر ٹین کے ڈبے میں بند کر لئے ت میں یہ رومال پھینکنے لگا۔ پھر سوچا کہ یہ پاروتی کی نشانی ہے۔ اور میں نے رومال کو د کر تہہ کر کے پچھلی جیب میں سو روپے کے نوٹ کے ساتھ ہی سنبھال کر رکھ لیا۔ نے دیہاتی آدمی سے کہا۔

"میں واپس بیر گنج جاؤں گا۔ کیا یہاں سے کوئی خچر وغیرہ مل جائے گا جو مجھے یہ لے جائے؟"

وہ کہنے لگا۔

"ہمارے پاس تو ایک گائے ہی ہے - وہ ہم تمہیں نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ گئو ا پر ہم سواری نہیں کرتے۔ مگر رات کے اندھیرے میں تمہیں نہیں جانا چاہئے۔ ائی کے جنگل میں رات کو بھالو اور چیتے نکل آتے ہیں۔"

میں مکار سپیرن کو جلد سے جلد پکڑنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم مجھے وہ راستہ بتا دو جو بیر گنج کو جاتا ہے۔ ہم جس راستے سے آئے تھے وہ مجھے یاد نہیں رہا۔"

آدمی نے کہا۔

"اگر تم ضرور جانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ۔"

اس نے لالٹین اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور میرے آگے آگے چلنے لگا۔ ڈھلان سے اتر کر ہم ایک پہاڑی پگ ڈنڈی پر آ گئے۔ یہ پگ ڈنڈی دو چار موڑ گھومنے کے بعد ایک کچے راستے پر نکل آئی۔ پہاڑیا بولا۔

"یہ راستہ بیر گنج کو جاتا ہے۔ میں ایک بار پھر تمہیں یہی کہوں گا کہ رات کے اندھیرے میں جنگل میں سفر کرنے میں بڑا خطرہ ہے۔ ادھر رات کو بھالو چیتے نکل آتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تمہارا دھنواد بھائی۔۔۔۔۔۔"

اور میں بیر گنج کو جانے والے کچے راستے پر اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ یہ پہاڑی راستہ تھا۔ دونوں جانب جھاڑیاں تھیں جن میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ارد گرد چھوٹے بڑے ٹیلے تھے جو رات کے اندھیرے میں بڑے ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ میں چلتا گیا۔ راستہ اترائی کا تھا۔ اس لئے میری رفتار تیز تھی۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ بیر گنج وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ کیونکہ جب مکار عورت مجھے ساتھ لے کر بیر گنج سے چلی تھی تو کوئی آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد ہم چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں آ گئے تھے جہاں اس سپیرن نے مجھے بے ہوش کیا تھا۔ لیکن رات کی تاریکی کی وجہ سے مجھے رک رک کر

چلنا پڑ رہا تھا۔ ذرا کسی طرف سے کوئی کھڑکا ہوتا تو میں رک جاتا کہ کہیں کوئی بھالو یا چیتا نہ ہو۔ لیکن خدا کا کرم شامل حال رہا۔ مجھے راستے میں کوئی چیتا یا ریچھ نہ ملا اور ایک جگہ اترائی اترتے ہوئے مجھے کچھ فاصلے پر بیرگنج کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آنے لگیں۔

میں بیرگنج پہنچ گیا۔ یہاں میں اسی ہوٹل میں آگیا جہاں میں نے رات گزاری تھی۔ یہ ہوٹل جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک شکستہ سے پرانا دو منزلہ مکان تھا جس کو ہوٹل بنا دیا گیا تھا۔ میں نیچے ہوٹل کی دکان میں ہی بیٹھ گیا۔ میں نے پانی پیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ چاول دال منگوا کر کھائے۔ ہوٹل کا لڑکا مجھے بوڑھی سپیرن کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ وہ پانی کا جگ لے کر آیا تو مجھ سے پوچھنے لگا۔

"صاحب تمہاری ماتا جی بھی دوپہر کو یہاں آئی تھی - بھوجن کر کے چلی گئی تھی۔"

میں نے چونک کر لڑکے کی طرف دیکھا۔

"وہ کس وقت آئی تھی؟"

لڑکے نے میری طرف حیرانی سے دیکھا اور کہا۔

"بارش ہو رہی تھی۔ دن کے نو دس بجے آئی تھی۔ وہ بارش میں بھیگ رہی تھی۔ یہاں اس کمرے میں اس نے دوسری ساڑھی پہنی اور بھوجن کیا تھا۔ پھر شہر کی طرف چل دی۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ آگے بڑا شہر گورکھپور ہی ہے۔ بیرگنج سے وہ سیدھا گورکھپور گئی ہو گی۔ گورکھپور ایک بڑا شہر تھا۔ میں اسے وہاں کہاں تلاش کروں گا؟ وہ کہاں مل سکے گی؟ کہیں وہ گورکھپور سے بھی آگے تو نہیں نکل گئی ہو گی؟ مجھے یہی سوال پریشان کر رہے تھے۔ اس وقت رات کے نو سوا نو بجے کا وقت ہو گا۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"اس وقت بیرگنج سے کوئی لاری یا ریل گاڑی گورکھپور کو جاتی ہے؟"

لڑکے نے کہا۔

"لاری تو کوئی نہیں جاتی۔ ریل گاڑی شاید مل جائے۔"

میں نے کھانے کا اور کمرے کا جو تھوڑا بہت بل بنتا تھا ادا کیا اور سیدھا بیرگنج کے سٹیشن پر آگیا۔ رات کے بارہ بجے کہیں جا کر مجھے ایک گاڑی ملی جو گورکھپور سے ہوتی ہوئی پٹنہ کو جاتی تھی۔ کوئی دو بجے رات گورکھپور پہنچا۔ اگرچہ گورکھپور کے بارے میں یہی پتہ چلا تھا کہ یہاں شروع شروع میں ہندو مسلم فساد ہوئے تھے مگر اس کے بعد امن امان ہو گیا تھا۔ لیکن سٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ شہر میں رات کا کرفیو لگا ہوا ہے جو صبح نو بجے کھلے گا۔ پلیٹ فارم پر بہت سے مسافر رکے ہوئے تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ اس علاقے میں اب مجھے ہندو مسلم کی پہچان ہو گئی تھی۔ اگرچہ بظاہر دیکھنے میں دونوں کے روپ ایک سے ہوتے تھے۔ مگر مسلمان کے کندھے پر ڈالے ہوئے سرخ خانے دار پرنے کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن فسادات کی وجہ سے اب مسلمانوں نے پرنے رکھنے چھوڑ دیئے تھے۔ اب صرف داڑھی سے پتہ چلتا تھا کہ یہ مسلمان ہے۔ میں بھی پلیٹ فارم پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ میرے ماتھے پر جو سرخ بندیا لگی تھی وہ میں نے اتار کر پھینک دی تھی۔ یہ میں نے اس وقت لگائی تھی جب میں پاروتی کی سانپ لاش کے ٹکڑے لے کر کیلاش پربت کو ہندو بن کر جا رہا تھا۔ اب مجھے ہندو بنے رہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کیونکہ گورکھپور میں مسلمانوں کی کافی آبادی تھی۔

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ گورکھپور کے سٹیشن پر بتیاں روشن تھیں۔ یہ کافی بڑا شہر تھا۔ میں پلیٹ فارم پر کتابوں رسالوں کے ایک بند کھوکھے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے - ظاہر ہے عیار سپیرن اس وقت تک نہ جانے کہاں کی کہاں نکل چکی ہو گی۔ مجھے کوئی منصوبہ بندی کر کے اس کی تلاش شروع کرنی تھی۔ اس کا سراغ مجھے سپیروں سے یا کسی ایسے ہندو سے ہی لگ سکتا تھا جہاں ناگ دیوتا کی پوجا ہوتی ہو۔ خدا جانے گورکھپور میں کوئی ایسا مندر تھا بھی یا نہیں۔ یہ معلومات مجھے شہر میں صبح کرفیو کھلنے کے بعد ہی مل سکتی تھیں۔ اس بات کا ڈر بھی تھا کہ

اگر یہاں رات کا کرفیو لگا ہے تو ضرور شہر میں بلوہ ہوا ہو گا۔ میں شہر سے ناواقف تھا۔ کھلے بندوں شہر میں جانا خطرے کاباعث بھی ہو سکتا تھا۔

میں اسی الجھن میں بیٹھا سوچتا رہا۔ میرے قریب ہی ایک فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک عمر رسیدہ مرد تھا جس کی داڑھی تھی۔ چار خانے کی دھوتی اور بنیان پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دو تین عورتیں اور دو بچے تھے۔ یہ مسلمان فیملی لگتی تھی۔ میرا جی چاہا کہ ان سے شہر کے حالات کے بارے میں کچھ معلوم کروں۔ میں اٹھ کر ان کے پاس گیا۔ عمر رسیدہ بزرگ کو السلام علیکم کہا اور وہیں بیٹھ گیا۔

بزرگ نے وعلیکم السلام کہہ کر مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور منہ دوسری طرف کر کے اپنی عورتوں سے دبی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔

"بھائی صاحب میں مسلمان ہوں۔ پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ بیرگنج اپنے ایک عزیز سے ملنے گیا تھا۔ یہاں آ کر پھنس گیا ہوں۔ کیا شہر میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے؟"

اس آدمی نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"میاں! ہمیں تو کچھ معلوم نہیں۔ ہم تو لکھنؤ سے آئے ہیں۔ کان پور جانے والی گاڑی کا انتظار ہے۔ کہتے ہیں صبح جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے جانا تو اصل میں پاکستان ہے۔ میں پاکستان کے شہر لاہور کا ہی رہنے والا ہوں مگر سنا ہے پنجاب میں ہندو سکھ مسلمانوں کے قافلوں اور ریل گاڑیوں پر حملے کر رہے ہیں۔ اور مسلمان مہاجرین کو قتل کر رہے ہیں۔ اس لئے اب یہی سوچا ہے کہ یہاں سے کلکتے چلا جاؤں۔ وہاں سے بمبئی جاؤں اور وہاں سے سمندری جہاز میں سوار ہو کر کراچی کی طرف نکل جاؤں۔"

"ہاں میاں! تمہارے لئے یہی راستہ مناسب رہے گا مشرقی پنجاب میں تو ہر طرف آگ لگی ہے۔ سکھ ہندو مل کر مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہے ہیں۔ انہیں قتل کر رہے ہیں۔ مہاجرین کی جو ریل گاڑیاں پاکستان جاتی ہیں ان کو راستے میں ہی روک کر کاٹ ڈالتے ہیں۔"

یہ ساری باتیں مجھے معلوم تھیں۔ میں گورکھپور شہر کے بارے میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہاں ہندوؤں کی آبادی کتنی ہے اور کیا یہاں کوئی ایسا مندر بھی ہے جہاں سانپوں کی پوجا ہوتی ہے۔ جب میں نے بڑے طریقے سے یہ باتیں ان سے پوچھیں تو وہ بزرگ کہنے لگے۔

"میاں ان ہندوؤں کے مذہب میں تو ہر جانور کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ کوئی مذہب نہیں ہے گورکھپور میں مسلمان بھی رہتے ہیں مگر اس شہر میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ سنا ہے یہاں ایک مندر ہے جہاں سانپ کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے جلدی سے کہا۔

"یونہی پوچھ رہا تھا۔ بھلا مجھے ان ہندوؤں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

اس بزرگ سے گورکھپور میں ایک ایسے مندر کا سراغ مجھے مل گیا تھا جہاں ناگ کی پوجا ہوتی تھی۔ اب مجھے اس مندر میں جا کر اس مکار بوڑھی سپیرن کا سراغ لگانا تھا کہ کہیں وہ وہاں تو نہیں آئی۔ میری تفتیش اسی طرح ایک ایک قدم ایک ایک مرحلہ کر کے آگے بڑھ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ عورت میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اب میں سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کے مطابق چل کر ہی اس کا کوئی کھوج لگا سکتا تھا۔

کسی نہ کسی طرح رات گزر گئی۔ دن نکلا تو پلیٹ فارم پر کچھ رونق نظر آنے لگی۔ مسافر چائے کی کینٹین پر جا کر اپنے لئے اور اپنے بال بچوں کے لئے ناشتے کا سامان خریدنے لگے۔ میں نے بھی وہیں پلیٹ فارم پر ناشتہ کیا اور کرفیو کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں اس پلیٹ فارم پر آ گیا جس کے گیٹ میں سے باہر شہر کا بازار نظر آ رہا تھا۔ بازار خالی پڑا تھا۔ سٹیشن کے بالکل سامنے ایک چھوٹے سے پلاٹ میں فوارہ لگا تھا جو بند تھا۔ پولیس کے کچھ سپاہی ہاتھ میں ڈنڈے لئے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

کرفیو کھلنے کا سائرن بجا تو بازار میں رکشے یکے اور لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ خدا جانے لوگ کہاں کہاں سے نکل کر سڑک پر آ گئے تھے۔ میں بھی سٹیشن سے

باہر آگیا۔ مجھے اب ہندو بن کر یعنی اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے ناگ پوجا والے مند کا پتہ معلوم کرنا تھا۔ تانگہ سٹینڈ پر تین چار یکے خالی کھڑے تھے۔ ایک کوچوان شکل صورت سے ہندو لگتا تھا۔ اس کو صرف میں ہی پہچان سکتا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"بھیا شہر میں کچھ شانتی ہوئی ہے کیا۔؟"

وہ بولا۔ "شانتی کیوں نہیں ہو گی بابو جی۔ مسلوں کو مار دیا ہے یا نکال دیا ہے شہ سے۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں سمجھ گیا کہ کوچوان ہندو ہے۔ میں نے کہا۔

"بھیا کیلاش پربت ناگ دیوتا کے درشنوں کو گیا تھا۔ اب گورکھپور کے ناگ مند میں بھی پوجا کرنے کا خیال ہے۔ پھر واپس اپنے شہر رامپور چلا جاؤں گا۔ کیا مجھے ناگ مندر لے چلو گے؟"

"ناگ جی کے مندر کا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں ہاں وہی۔۔۔"

"بیٹھ جاؤ۔"

میں یکے میں بیٹھ گیا۔ یکہ شہر کی سڑک پر چل پڑا۔ کرفیو کھلتے ہی دکانیں بھی کھل گئی تھیں۔ لوگ سودا سلف لینے گھروں سے نکل آئے تھے۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی جو اپنی وضع قطع سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ یکہ دو مندروں کے سامنے سے بھی گزرا۔ آخر کوچوان نے مجھے ایک بازار کے کونے پر لے آیا۔ کہنے لگا۔

"یہ رہا ناگ جی کا مندر بابو۔"

یہ مندر بھی ویسا ہی تھا جیسا اکثر بڑے شہروں میں چھوٹے مندر میں نے دیکھے تھے۔ احاطہ تھا۔ احاطے میں پیپل اور نیم کے درخت تھے۔ کونے میں بہت بڑا چبوترہ تھا جس کے اوپر مخروطی مینار والی مندر کی عمارت کھڑی تھی۔ مینار کے اوپر زعفرانی رنگ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ کرفیو کھلا ہی تھا۔ بہت ہندو لوگ پوجا پاٹھ کرنے وہاں

آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ مندر کے اندر گھنٹیاں اور سنکھ بج رہے تھے۔ میں نے احاطے میں ایک طرف کھڑے ہو کر چاروں طرف غور سے دیکھا۔ یہاں بھی درختوں کے نیچے کہیں کہیں سادھو دھونی رمائے بیٹھے تھے اور لوگ ان کے آگے پوری کچوری کے دونے رکھ رہے تھے۔ سادھو لمبی جٹائیں چھوڑے چلم منہ سے لگائے چرس مدک پی رہے تھے۔ یہاں مجھے وہ عیار سپیرن کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ اندر چل کر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر مندر میں آ گیا۔ ہندوؤں کے دوسرے مندروں کی طرح یہاں بھی ایک تنگ سا کمرہ تھا جس میں دم گھٹ رہا تھا۔ لوبان اور ہرمل کی بو سے فضا سخت بوجھل ہو رہی تھی۔ دیوار میں پتھر کا ایک سیاہ رنگ کے سانپ کا بت بنا ہوا تھا جس نے پھن کھول رکھا تھا۔ اس کے پھن کے اوپر دو دیئے جل رہے تھے۔ سانپ کے پھن پر سیندور کا پوچا پھیرا ہوا تھا۔ ہندو عورتیں اور مرد اس کے آگے سجدے کر رہے تھے۔ میں نے سانپ کے بت کی طرف ایک نظر دیکھا۔ عورتوں پر نگاہ ڈالی جس شکل کی مجھے تلاش تھی وہ شکل وہاں نظر نہ آئی تو میں مندر سے باہر نکل آیا۔ میں چبوترے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ میں نے دو آدمیوں کو دیکھا جو قریب ہی ایک درخت کے پاس کھڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کو میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ یہ آدمی جب میں مندر میں داخل ہوا تو اس کے گیٹ کے ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا تھا اور جب میں مندر کے چبوترے کی طرف جا رہا تھا تو میں نے یونہی پلٹ کر دیکھا تو یہ آدمی میرے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ ہٹا کٹا آدمی تھا۔ رنگ کالا تھا۔ گردن بھینسے کی طرح موٹی تھی اور سر کے درمیان سے بودی باہر نکلی ہوئی تھی۔ اب یہی آدمی اپنے کسی ساتھی کو لے کر وہاں آ گیا تھا۔ غالباً اسے مجھ پر شک ہوا تھا کہ میں ایک اجنبی ہوں اور مندر میں آیا ہوں۔ ہو نہ ہو میں ضرور مسلمان ہوں گا۔ مجھے یکے والے ہندو نے بھی بتایا تھا کہ ان مندروں میں کسی مسلمان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلمان غلطی سے مندر میں آ

جائے تو پجاری کے آدمی اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔ شاید ان آدمیوں کو میرے مسلمان ہونے کا علم ہو گیا تھا۔ انہیں مجھ پر کچھ نہ کچھ شک ضرور پڑ چکا تھا۔ شہر کی فضا فسادات کی وجہ سے پہلے ہی کشیدہ تھی۔

میں نے وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن تقدیر میں کچھ ایسی باتیں کاتب تقدیر لکھ دیتا ہے کہ وہ پوری ہو کر ہی رہتی ہیں۔ انسان لاکھ ہاتھ پاؤں مارے وہ ہو کر ہی رہتی ہیں۔ جب میں نے مندر سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تو ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی آ گیا کہ مندر کے پیچھے بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہئے۔ ہو سکتا ہے عیار سپیرن وہاں نظر آ جائے۔ کیونکہ وہ عورت کیلاش پربت سے اتر کر اسی طرف آئی تھی۔ میں وہیں سے چبوترے کی دیوار کے عقب کی طرف گھوم گیا۔ یہ مندر کا پچھواڑہ تھا۔ یہاں نیم کے درخت ادھر ادھر اگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں۔ کونے میں ایک کچا کوٹھا تھا۔ جس کے باہر بندھی ہوئی بکری مے مے کر رہی تھی۔ دیوار کی ایک جانب گائے بندھی ہوئی تھی۔ یہاں سپیرن تو کجا کسی انسان کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

میں واپس جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ اچانک مجھے کسی نے پیچھے سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں بوکھلا گیا۔ میں نے ان دیکھے آدمی کے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کی تو مزید دو آدمی آ گئے اور انہوں نے آتے ہی میرے منہ میں کپڑا ٹھونسنا شروع کر دیا۔ میں نے پہچان لیا ان میں دو آدمی وہی تھے جو میرا پیچھا کر رہے تھے۔ جس نے مجھے جکڑ رکھا تھا وہ وہی بودی والا کالا کلوٹا ہندو تھا۔ میں نے شور مچانے کی بڑی کوشش کی مگر میرا منہ کپڑا ٹھونس کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس دوران ایک ہندو نے میرے ختنے دیکھ لئے۔ وہ چلا کر بولا۔

"ارے مسلا ہے مسلا! اس کو لے چلو۔ تم نے ٹھیک کہا تھا بھیکو!"

بھیکو اس کالے کلوٹے بھینسا نما ہندو کا نام تھا جس نے سب سے پہلے پیچھے سے آ کر مجھے دبوچا تھا۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھے اور مجھے اٹھا کر سامنے کونے میں جو کوٹھا تھا اس کے اندر لے گئے اور زمین پر پھینک کر باہر سے

کنڈی لگا دی۔ کسی نے کہا۔

"پجاری جی سے کہو۔ مسلمان پکڑا ہے۔ آج اماوس کی رات ہے۔ شو بھگوان کے ناگ جی نے خود ہی اپنی بھینٹ کے لئے مسلمان بھیج دیا ہے۔۔۔"

میرا خون خشک ہو گیا۔ یہ لوگ مجھے اپنے ناگ دیوتا پر قربان کرنے والے تھے۔

میں نے اللہ سے دعا مانگی۔

"اللہ پاک! مجھے ان کافروں سے بچا لے۔"

میرے ہاتھ پیر رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔

میں اندھیری کوٹھڑی میں فرش پر ایک طرف منہ کر کے پڑا تھا۔ میرے ہاتھ انہوں نے پیچھے باندھے تھے جس کی وجہ سے میں سیدھا نہیں لیٹ سکتا تھا۔ یاخدا! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ لیکن میں جس راستے پر چل پڑا تھا وہاں میرے ساتھ یہی کچھ ہونا تھا۔ کہاں بمبئی جا رہا تھا اور بغیر ٹکٹ پکڑا گیا۔ ٹی ٹی نے مجھے اندھیری رات کو جنگل میں اتار دیا۔ اس کے بعد واقعات کیسی کیسی خوفناک شکلیں اختیار کرتے چلے گئے اور میں پھنستا ہی چلا گیا۔ لیکن ابھی تو میں رسیوں سے بندھا کوٹھڑی میں بند تھا اور جیسا کہ ان ہندوؤں نے کہا تھا یہ لوگ ناگ دیوتا پر میری قربانی دینے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہندوستان کے کونے کونے میں پھر کر اس کے شہروں دیہاتوں اور جنگلوں میں آوارہ گردی کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں میں مبتلا ہو کر مجھے ہندوؤں کی بہت سی باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ ان کے مذہب میں میں نے ایسی ایسی باتیں دیکھی تھیں کہ جو نہ صرف درندگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھیں بلکہ تہذیب و شائستگی سے گری ہوئی اور کراہت انگیز بھی تھیں۔ مثال کے طور پر راجستھان میں کالی ناتھ کا مندر ہے جہاں چوہوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس مندر میں بڑے پلے ہوئے موٹے موٹے چوہے چاروں طرف بڑی آزادی سے چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ لوگ ان کے آگے دودھ حلوہ اور مٹھائیاں رکھتے ہیں۔ کراہت کی بات یہ ہے کہ وہاں بیٹھ کر لوگ جس تھال میں

مٹھائی یا دال چاول کھاتے ہیں چوہے بھی اسی تھال کے کناروں پر بیٹھ کر ساتھ ساتھ کھاتے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ پوجا کرنے والے چوہوں کے منہ سے لڈو لے کر خود بڑے مزے سے کھا لیتے ہیں ذرا غور کریں۔ دنیا کا کوئی ایسا آدمی جس میں ذرا سی بھی عقل ہو گی کبھی یہ مکروہ حرکت نہیں کر سکتا۔ لیکن راجستھان کے اس مندر میں پوجاپاٹھ کرنے آنے والے لوگ چوہوں کو اپنے کھانے کی تھالی میں بٹھا کر ان کے ساتھ کھاتے اور ان کا جوٹھا دودھ بڑے شوق سے پیتے ہیں۔ یقین کریں پاکستان کا قیام ایک قدرتی عمل تھا۔ مسلمان میں اور ہندو میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور یہ بھی یقین کریں کہ اگر مسلمانوں میں صادق اور جعفر ایسے غدار وطن پیدا نہ ہوئے ہوتے تو پاکستان سلطان ٹیپو کے زمانے میں ہی بن چکا ہوتا۔

اگر آپ کے دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے بندھے ہوں اور پاؤں بھی رسی سے بندھے ہوں تو آپ زیادہ دیر ایک پہلو پر لیٹے نہیں رہ سکتے۔ میرا کندھا شل ہو گیا اور میں اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ اس طرح تھوڑا سکون ضرور ملا مگر کبھی میں چہرہ ایک پہلو پر کرتا کبھی دوسری طرف کر لیتا۔ اس قسم کی مصیبت بھی مجھ پر پہلے نہیں پڑی تھی۔ دروازہ کوئی باہر سے کھول رہا تھا۔ میں نے دروازے پر نظریں جما دیں۔ دروازے کے کھلتے ہی دن کی روشنی بھی تین آدمیوں کے ساتھ اندر آئی تھی۔ انہوں نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ ان لوگوں کی آوازوں سے میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے مجھے یہاں باندھ کر پھینکا تھا۔

سب سے پہلے انہوں نے میری آنکھوں پر کس کر پٹی باندھ دی۔ پھر مجھے ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھایا اور باہر لے گئے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ باہر اور اندر کا صرف اتنا فرق تھا کہ کوٹھڑی کے گھپ اندھیرے میں جب انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی تو اندھیرے میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ باہر چونکہ دن کی روشنی تھی اس لئے صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کچھ روشن روشن ہو گئی تھی مگر نظر پھر بھی نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگا جیسے انہوں نے مجھے کسی سٹریچر پر ڈال دیا ہے۔ پھر یہ

سٹریچر چل پڑا۔ کچھ دور جانے کے بعد سٹریچر ڈھلان پر اترتا محسوس ہوا۔ مجھے ان لوگوں کے قدموں کی آواز ساتھ سنائی دے رہی تھی۔ اس کے بعد ان میں سے ایک آدمی بولا تو اس کی گونج سی پیدا ہوئی۔ معلوم ہوا کہ مجھے زمین کے نیچے کسی جگہ لے جایا جا رہا تھا۔ فضا بھی تھوڑی گرم ہو گئی تھی۔ میں زندگی سے مایوس تو نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ زندگی اور موت تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن لگ یہی رہا تھا کہ میری موت کا جو وقت مقرر ہوا تھا وہ وقت آن پہنچا ہے۔

سٹریچر ایک طرف کو مڑنے کے بعد سیدھا ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ رینگنے لگا اور پھر رک گیا۔ مجھے لوبان اور ہرمل کی تیز بو آنے لگی۔ سب سے پہلے میرے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کھول دی گئیں۔ لیکن دو آدمیوں نے دائیں بائیں سے میرے بازوؤں کو پکڑے رکھا۔ میری آنکھوں کی پٹی بھی کھول دی گئی۔ سب سے پہلے میں نے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی مشعل کو دیکھا۔ اس طرح کی تین چار مشعلیں دیوار کے ساتھ لگی جل رہی تھیں۔ یہ ایک بڑا تہہ خانہ تھا جس کے درمیان میں پھن دار سانپ کا بت نصب تھا۔ بت کے آگے گول دائرے میں بنا ہوا گڑھا تھا گڑھے کے کنارے اونچے تھے۔ پہلے میں اسے کنواں سمجھا مگر گڑھے میں ایک آدمی چل پھر رہا تھا۔ اس کا صرف سر مجھے نظر آتا تھا۔ وہی تین آدمی جو مجھے لے کر وہاں آئے تھے۔ انہوں نے مجھے چمڑے کی پٹی سے سٹریچر کے ساتھ باندھ دیا۔ سٹریچر ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میں نے آواز کو ذرا رعب دار بناتے ہوئے پوچھا۔

"تم لوگ مجھے یہاں کس لئے لائے ہو؟"

"ابھی پتہ چل جائے گا کہ تمہیں یہاں کیوں لائے ہیں؟"

فرش پر سامنے والی دیوار کے ساتھ دری بچھی تھی۔ دری پر لال رنگ کے بڑے بڑے تکئے پڑے تھے۔ تینوں آدمی دری پر جا کر بیٹھ گئے اور آپس میں سر جوڑ کر بڑی رازداری سے باتیں کرنے لگے۔ تہہ خانے کا ایک دروازہ بھی تھا مگر اس دروازے کے پٹ نہیں تھے۔ دروازے پر لال رنگ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ تہہ خانے میں اترائی اتر کر آنا

پڑتا تھا۔ مجھے آدمیوں کی آوازیں آئیں۔ تینوں آدمی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پردہ ہٹا اور مزید تین آدمی اندر آ گئے۔ ان میں دو آدمی دبلے پتلے تھے اور ایک آدمی گول مٹول اور موٹا تھا۔ اس کی توند باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ان سب نے دھوتی بنیان پہنی ہوئی تھی۔ صرف موٹے آدمی نے کندھے پر زعفرانی پٹکا ڈال رکھا تھا۔ اس کے ماتھے پر سرخ رنگ کی تین لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ یہ مندر کا بڑا پجاری لگتا تھا۔

وہ آتے ہی دری پر درمیان والے بڑے تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ باقی لوگ اس کے دائیں بائیں ادب سے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک وہاں خاموشی چھائی رہی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ شاید یہاں خاموشی کا کوئی چلہ کاٹنے آئے ہیں۔ بڑے پجاری نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ایک آدمی جلدی سے اٹھ کر تہہ خانے سے نکل گیا۔ کوئی تین منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ اپنے ساتھ تین عورتوں کو لے کر آ گیا۔ ان عورتوں نے بھڑکیلے رنگوں کی ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ بالوں میں سرخ پھولوں کے گجرے تھے اور چہروں پر زبردست میک اپ کیا ہوا تھا۔ تینوں عورتیں باری باری موٹے پجاری کے پاس گئیں۔ جھک کر اس کے پاؤں چھو کر ماتھے پر لگائے اور بڑے ادب سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئیں۔ تینوں نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ بڑے پجاری نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"پاربتی جی کا ناچ شروع ہو"

شو دیوتا کو ہندو تباہی بربادی کا دیوتا مانتے ہیں۔ اس دیوتا کے سر پر بالوں کا جوڑا بندھا ہوتا ہے اور جوڑے میں ایک سانپ پھن کھولے بیٹھا دکھایا جاتا ہے۔ دو سانپ شو دیوتا کے بازوؤں سے اور ایک سانپ اس کی گردن سے بھی لپٹا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ پاربتی اس دیوتا کی بیوی کا نام ہے انڈیا میں سانپوں کی پوجا کرنے والے شو کو ہی اپنا بڑا دیوتا مانتے ہیں اور دور دراز دیہات اور جنوبی ہند کے پاس ماندہ علاقوں میں آج بھی سانپ دیوتا کے آگے زندہ عورتوں اور بچوں کی قربانی دی جاتی ہے۔

پجاری کا اشارہ پا کر تینوں عورتیں اٹھیں اور درمیان میں سانپ کا جو بڑا سا بت

رکھا ہوا تھا اس کے گرد ڈانس کرنے لگیں۔ وہ ساتھ ساتھ خدا جانے کس زبان کا کوئی گیت بھی گا رہی تھیں۔ میں سٹریچر پر تقریباً نیم جان پڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ ساری تیاریاں میری موت کی تیاریاں تھیں۔ یہ لوگ خدا جانے مجھے کیسی اذیت ناک موت مارنے والے تھے۔ بس میں دل میں خدا کے حضور دعائیں مانگ رہا تھا۔ رقص جاری تھا کہ دری پر بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے دو آدمی اٹھے۔ سانپ کے بت کے پیچھے گئے اور وہاں پڑے ہوئے دو ڈمرو اٹھا کر لے آئے اور ڈمرو بجاتے ہوئے وہ بھی رقص کرنے والی عورتوں میں شامل ہو کر سانپ کے بت کے گرد چکر لگانے لگے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد رقص کرنے والی عورتیں اور ڈمرو بجانے والے مرد سانپ کے مجسمے کے آگے جو اونچی منڈیر والا گڑھا کھدا ہوا تھا اس کی ایک جانب قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ آدمی ڈمرو بجا رہے تھے مگر عورتیں رقص کرنے کی بجائے گانا گا رہی تھیں اور ہاتھ باندھ کر دائیں بائیں جھوم رہی ہیں۔ اب موٹا پجاری اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا سانپ کے بت کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ گیت اور ڈمرو کی آواز تھم گئی۔ پجاری نے ہاتھ باندھ کر سانپ کے بت پر نگاہیں جما کر اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے اس دوران باقی آدمیوں نے سب سے پہلے میرے ہاتھ ایک بار پھر پیچھے رسی سے کس کر باندھ دیئے۔ پٹی کھول کر مجھے سٹریچر سے اتارا اور بازوؤں سے پکڑ کر سانپ کے بت کے سامنے گڑھے کی منڈیر کے پاس لے آئے۔

جیسے ہی میں گڑھے کی منڈیر یا دیوار کے پاس آیا ڈمرو بجانے والوں نے زور زور سے ڈمرو بجانا اور عورتوں نے دوبارہ گانا شروع کر دیا۔ ایک بار پھر وہاں شور مچ گیا۔ اسی شور میں دو آدمیوں نے مجھے پیچھے سے اٹھا کر گڑھے میں پھینک دیا۔ میں گڑھے میں مٹی کے ڈھیر پر گرا۔ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا سر منڈیر سے تھوڑا اونچا تھا مگر میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ میں ان لوگوں کا منہ تک رہا تھا جو مشعلوں کی روشنی میں عورتوں کے ہاتھ پکڑ کر دیوانہ وار ڈانس کر رہے تھے۔ پجاری میرے سامنے کھڑا زور زور سے اشلوک پڑھ رہا تھا۔

پھر ایک دم سے شور تھم گیا۔

پجاری نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ فوراً تین آدمی دیواروں پر سے مشعلیں اتار کر لے آئے اور یہ مشعلیں گڑھے کی دیوار پر لگے ہوئے کنڈوں میں پھنسا دی گئیں۔ ان کی روشنی گڑھے میں بھی پڑنے لگی۔ میں نے دیکھا۔ گڑھے میں مٹی ہی مٹی تھی۔ اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے یہی سمجھا کہ یہ لوگ مجھے گڑھے میں پھینک کر چلے جائیں گے۔ ان کا مقصد یہ ہو گا کہ میں یہاں بھوکا پیاسا رہ کر اپنے آپ مر جاؤں۔ لیکن میری یہ خوش فہمی فوراً ہی دور ہو گئی۔ دو آدمی گڑھے میں اتر گئے۔ انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر گڑھے کی دیوار کے ساتھ لگا کر زبردستی بٹھا دیا۔ اور پیچھے دیوار میں لوہے کی ہک لگی تھی۔ مجھے رسی سے اس ہک کے ساتھ اس طرح باندھ دیا کہ میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ دونوں آدمی گڑھے میں سے باہر نکل گئے۔ میں اوپر دیکھ رہا تھا۔ باہر خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر کسی نے گڑھے کی دیوار کے اوپر بڑا سا ٹوکرا لا کر رکھ دیا۔ میں نے مشعلوں کی روشنی میں ایک آدمی کو دیوار پر چڑھتے دیکھا۔ وہ ٹوکرے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے کوئی نعرہ لگایا۔ جس کے جواب میں دوسرے آدمیوں نے بھی نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ نعروں کے شور میں دیوار پر کھڑے آدمی نے ٹوکرے کا ڈھکنا اٹھا کر پرے پھینکا اور ٹوکرا میرے اوپر الٹ دیا۔ میری چیخیں نکل گئیں۔

ٹوکری میں سانپ تھے جو میرے اوپر آ کر گرے اور پھنکاریں مارنے لگے۔ میری چیخوں کی آواز پر باہر عورتوں اور مردوں نے اونچی آوازوں میں اشلوک گانے شروع کر دیئے۔ باہر پھر ایک شور مچ گیا۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ لوگ گڑھے کے گرد چکر لگا رہے ہیں لیکن گڑھے میں کوئی نہیں جھانک رہا تھا۔ گڑھے کے اندر میرے ساتھ ایک عجیب کرامت ہو گئی۔ مجھ پر سانپوں کا جو ٹوکرا پھینکا گیا تھا اس میں چھوٹے بڑے کتنے ہی سانپ تھے۔ سانپ مجھ پر گرتے ہی پھنکارنے اور میری گردن کندھوں اور بازوؤں پر چڑھنے لگے۔ لیکن فوراً ہی خدا جانے کیا بات ہوئی کہ ایک ساتھ سارے کے سارے سانپ میرے جسم سے اتر گئے۔ ان کی پھنکاریں خاموش ہو گئیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران

رہ گیا کہ سارے کے سارے سانپ جو بیس پچیس تو ضرور تھے مجھ سے پانچ فٹ کے فاصلے پر اکٹھے ہو کر کنڈلیاں مار کر بیٹھ گئے اور میری طرف پھن اٹھا کر دیکھنے لگے۔

میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ شاید خدا نے میری فریاد سن لی تھی اور سانپوں کو مجھ سے الگ کر دیا تھا۔ پھر یہ خیال آیا کہ شاید سانپ باری باری آگے آئیں گے اور مجھے ایک ایک کر کے ڈستے چلے جائیں گے۔ پجاری نے شاید انہیں اسی طرح سدھلایا ہوا ہو۔ مگر ایسی بھی کوئی بات نہ ہوئی۔ ایک منٹ دو منٹ گزر گئے اور سانپ اپنی جگہ پر بیٹھے مسلسل میری طرف تکتے رہے۔ اس دوران باہر ڈمرو اور عورتوں مردوں کے اونچی اونچی اشلوک گانے کی آوازیں تیز ہوتی گئیں۔ شاید وہ مجھے اس وقت دیکھنا چاہتے تھے جب سارے سانپوں نے مجھے ڈسنے کے بعد میرا جسم نوچ نوچ کر ادھیڑ دیا ہو۔

اچانک کسی مرد نے اونچی آواز میں نعرہ بلند کیا۔

اس کے ساتھ ہی گانے اور ڈمرو کی آواز خاموش ہو گئی۔ میں نے اوپر گڑھے کی منڈیر کی طرف دیکھا۔ وہاں کتنے ہی انسانی چہرے مجھے اس طرح بندھا ہوا بیٹھا اور سانپوں کو ایک جگہ کنڈلی مارے پھن کھولے بیٹھا دیکھ کر حیران تھے۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے گڑھے میں مجھے اور سانپوں کو دیکھ رہے تھے۔ پجاری نے ایک آدمی کو زور سے بازو ہلا کر کہا۔

"سلاخ چلاؤ۔ جلدی کرو۔ وقت نکلا جا رہا ہے۔"

ایک آدمی نے لمبی سلاخ گڑھے میں ڈالی - سلاخ آگے سے مڑی ہوئی تھی۔ اس نے سلاخ سے ایک سانپ کو پکڑا اور میرے اوپر ڈال دیا۔ سانپ نے پھنکار ماری اور جیسے میرے جسم سے خوف زدہ ہو کر جلدی سے بھاگ کر دوسرے سانپوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ یہ بات میری سمجھ سے بھی باہر تھی کہ آخر سانپ مجھ سے خوف کھا کر کیوں بھاگا ہے۔ پجاری اوپر سے دوسرے آدمیوں اور عورتوں کے ساتھ گردن نکالے یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے سلاخ والے آدمی کو غصے میں کہا۔

"سارے سانپ اس مسلے کے اوپر ڈال دو۔"

سلاخ کی مدد سے باری باری دو دو تین تین کر کے میرے اوپر سانپ پھینکے گئے مگر ہر بار یہی ہوا کہ جیسے ہی سانپ میرے جسم پر گرتا وہ تڑپ کر ایک طرف کو چھلانگ لگاتا اور تیزی سے رینگتے ہوئے دیوار کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ اب پجاری اور اس کے آدمی حیران ہونے کے ساتھ کچھ خوف زدہ بھی ہو گئے تھے۔ ادھر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وجہ جو بھی ہو لیکن یہ سانپ مجھے کاٹیں گے نہیں۔ میں نے سوچا اس موقع سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہئے۔ کوئی پتہ نہیں کچھ دیر کے بعد ان سانپوں کا خوف دور ہو جائے اور یہ مجھ پر حملہ کر دیں۔ میں نے چہرہ اوپر اٹھا کر رعب دار آواز میں کہا۔

"تم دیکھ رہے ہو کہ ان سانپوں نے مجھے کچھ نہیں کہا اور میرے غلام بن گئے ہیں۔ نیچے آ کر میری رسیاں کھول دو نہیں تو میں ان سانپوں کو حکم دوں گا اور تم سب کو اوپر آ کر ڈس لیں گے۔"

بڑا پجاری' اس کے ساتھی اور عورتیں پہلے ہی مجھ سے بے حد متاثر ہو چکی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ سانپوں نے مجھے کچھ نہیں کہا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ جب میں نے رعب دار آواز میں انہیں اپنی رسیاں کھولنے کا حکم دیا فوراً ایک آدمی سیڑھی لگا کر گڑھے میں اتر آیا - اس نے میری رسیاں کھول دیں اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"شما کر دیں مہاراج!"

میں گڑھے سے باہر نکلا تو سب ہاتھ جوڑ کر ادب سے کھڑے تھے۔ بڑے پجاری نے کہا۔

"مہاراج! آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ شو دیوتا کے داس ہیں؟"

میں نے کہا۔

"اگر میں پہلے بتا دیتا تو اس کا یہ اثر نہ ہوتا جو اب ہوا ہے۔ تم میں سے کسی نے میری بات کا یقین نہیں کرنا تھا۔"

پجاری نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"مہاراج! آپ تو مسلمان ہیں۔ پھر شو مہاراج کے اتنے پوتر داس کیسے بن گئے؟

میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"خبردار موٹے پجاری! ایسی باتیں مت پوچھو۔ یہ راز ہے جس کو تم نہیں سم سکتے۔ فوراً میرے اشنان اور بھوجن پانی کا بندوبست کیا جائے۔

وہ لوگ بڑے احترام کے ساتھ مجھے تہہ خانے سے نکال کر مندر کے ایک خاص کمرے میں لے گئے جہاں فرش پر قالین بچھا تھا۔ تکئے لگے تھے۔ میں نے غسل کیا کھانا کھایا۔ اور بڑے مزے سے ٹانگیں پسار کر گاؤ تکئے کے سہارے نیم دراز ہو گیا ایک آدمی میرے بازو اور دو آدمی میرے پاؤں دبا رہے تھے۔ یہ راز بعد میں کھلا ک ٹوکرے کے سانپ مجھ سے خوف زدہ ہو کر یا میرا ادب کرتے ہوئے ایک طرف ہٹ ک کیوں بیٹھ گئے تھے۔ یہ سارا کرشمہ اس رومال کا تھا جس میں میں نے ناگن پاروتی ک لاش کے دونوں ٹکڑے پہلے باندھے ہوئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ سانپ کے ٹکڑ ٹین کے ڈبے میں بند کرتے وقت یہ رومال میں نے پھینکا نہیں تھا۔ اس رومال می ناگن پاروتی کے جسم کی بو رچی ہوئی تھی ان سانپوں کو مجھ سے ناگن پاروتی کی بو آ تھی جس کی وجہ سے سانپوں نے مجھے کچھ نہیں کہا تھا۔ ناگن پاروتی بہت بڑی طاقت بن چکی تھی اور سارے سانپ اس کا احترام کرتی تھے۔ اب میں آسانی سے عیار سپیر کا سراغ لگا سکتا تھا۔

ناگ مندر کا بڑا پجاری میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ میری بہت زیادہ ٹہل سیوا کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ عیار سپیرن کا اسی سے کھوج لگوانا چاہئے۔ میں نے اپنی آواز میں جلال پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں نے مجھے رسیوں سے باندھا۔ مجھے سانپوں کے گڑھے میں پھینکا۔ تم اندھے اور بہرے ہو۔ تم جھوٹے پجاری ہو۔ میری شکل صورت سے تم لوگ یہ اندازہ بھی نہ لگا سکے کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں۔ بلکہ شو دیوتا کا خاص اوتار ہوں۔ موٹا پجاری ہاتھ باندھ کر دو زانو بیٹھ گیا۔ عاجزی سے بولا۔

"مہاراج شما کریں۔ ہم سے بھول ہو گئی۔"

میں نے کہا "تم سے تو اس مندر کے سانپ اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ جنھوں نے مجھے فوراً پہچان لیا اور ادب سے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ تم جھوٹے پجاری ہو۔ تمہیں تمہاری غلطی کی سزا ضرور ملے گی۔"

موٹا پجاری گڑگڑانے لگا۔ میں نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں صرف ایک صورت میں معافی مل سکتی ہے۔"

"آگیا مہاراج۔" پجاری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

میں نے کہا۔ "اس شہر گورکھ پور میں اس وقت ایک مکار سپیرن موجود ہے۔ ہم پاروتی دیوی کا پجاری سانپ لے کر کیلاش پربت کو جا رہے تھے کہ اس مکار سپیرن نے

وہ سانپ چرا لیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ لیکن ہم تمہیں بھی سزا دینا چاہتے ہیں۔ فوراً اس کا کھوج لگاؤ اور اسے پکڑ کر ہمارے سامنے پیش کرو۔"

جب میں نے موٹے پجاری کو سپیرن کا حلیہ بتایا تو وہ پکار اٹھا۔

"مہاراج یہ ضرور دھنوتی سپیرن ہے - وہ بڑی مکار ہے مہاراج۔ مجھے معلوم ہے اس کا ڈیرہ کہاں ہے۔ میں ابھی اسے پکڑ کر لاتا ہوں۔"

مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ پاروتی ناگن مجھے مل جائے گی۔ موٹے پجاری کو میں نے اسی وقت سپیرن کی تلاش کے لئے روانہ کر دیا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ عیار سپیرن کو پکڑے چلا آ رہا ہے۔ اس نے سپیرن کو میرے بارے میں ضرور بتا دیا ہوگا کہ میں شو دیوتا کا ایک روپ ہوں اور سانپ مجھے سجدے کرتے ہیں۔ کیونکہ سپیرن مجھے پہچاننے کے باوجود آتے ہی میرے قدموں پر گر پڑی اور معافیاں مانگنے لگی۔ میں نے زوردار آواز میں کہا۔

"پاروتی دیوی کا پجاری سانپ کہاں ہے؟"

اس نے قمیض کے اندر سے تھیلی نکال کر میرے قدموں میں رکھ دی اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"مہاراج سانپ اس میں موجود ہے۔"

میں نے تھیلی کھول کر دیکھا۔ اس میں پاروتی ناگن کے ٹکڑے موجود تھے۔ اسی وقت تھیلی میں نے اپنے قبضے میں کر لی اور موٹے پجاری سے کہا۔

"اس چور سپیرن کو لے جا کر تین دن کے لئے اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دو۔"

پجاری کے نوکر اسی وقت سپیرن کو پکڑ کر لے گئے۔ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہاں میرا راز کھل جاتا یعنی پاروتی کا وہ رومال جس کی وجہ سے سانپ میری پوجا کرتے تھے گم ہو جاتا مجھے وہاں سے نکل کر کیلاش پربت کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے تھا۔ چنانچہ میں نے موٹے پجاری سے کہا۔

"ہم صبح صبح کیلاش کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ ہمارے لئے سواری کا

بندوبست کیا جائے۔"

رات میں نے موٹے پجاری کے کمرے میں گزاری۔ صبح کو اٹھا تو باہر تین خچر موجود تھے۔ ایک خچر پر کھانے پینے کا سامان لدا ہوا تھا اور دوسرے خچر پر ایک نوکر سوار تھا۔ اس نوکر کو میرے ساتھ محافظ کے طور پر سفر کرنا تھا۔ میں اپنے خچر پر بیٹھ گیا۔ سارے پجاری مجھے الوداع کہنے کے لئے باہر موجود تھے۔ میں بڑی شان سے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

مندر سے نکلنے کے بعد میں نے اپنا رخ گورکھ پور کے ریلوے اسٹیشن کی طرف کر دیا۔ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر میں خچر سے اتر گیا اور نوکر سے کہا کہ وہ بیر گنج کے مندر کے باہر میرا انتظار کرے - اور اسے کہا "اگر میں پہلے پہنچ گیا تو میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔"

نوکر دونوں خچر لے کر چل پڑا۔ گورکھ پور سے بیر گنج تک نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ اور وہاں بہت شارٹ کٹ یعنی مختصر فاصلے والے راستے بھی تھے۔ بیر گنج سے آگے کیلاش پربت تک دشوار گزار پہاڑی سفر شروع ہوتا تھا۔ چنانچہ میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر بیر گنج جانا چاہتا تھا۔ میں ٹکٹ لے کر گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی آئی تو میں اس میں سوار ہو گیا۔

بیر گنج پہنچ کر بڑے مندر میں آ گیا۔ نوکر ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ دوپہر کے وقت نوکر بھی آ گیا۔ وہاں سے ہمارا پہاڑی سفر شروع ہو گیا۔ یہ کافی مشکل سفر تھا۔ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ راستے میں بے شمار گھاٹیاں اور ندی نالے آئے۔ خچروں کی وجہ سے ہمارا سفر آسانی سے کٹتا چلا گیا۔ راستے میں ہی ہمیں رات آ گئی۔ بارش بھی شروع ہو گئی۔ ایک ٹیلے کے دامن میں ایک چھوٹا سا مندر نظر پڑا۔ ہم خچروں کو لے کر وہاں چلے گئے۔ وہاں پر کوئی پجاری نہ تھا۔ نہ کسی دیوی دیوتا کا بت ہی تھا۔ ایک خالی کوٹھڑی تھی جس کی شکل مندر کی طرح کی تھی۔ ساری رات موسلا دھار مینہ برستا رہا۔ صبح ہوئی تو ہم کیلاش پربت کی طرف چل پڑے۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ پہاڑوں کی بارش

ایسی ہوتی ہے کہ کہیں پانی وغیرہ کھڑا نہیں ہوتا۔ صرف درخت، جھاڑیاں اور گھاس گیلی تھی۔ درختوں کے نیچے سے گزرتے تو شاخوں پر رکا ہوا پانی ٹپ ٹپ ہم پر گرتا۔ سارا دن سفر کرتے رہے۔

نوکر کو کیلاش پربت کے ناگ مندر کا راستہ معلوم تھا۔ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے ہمیں دور اوپر ایک جگہ پہاڑیوں میں مندر کے عکس دکھائی دیئے۔ نوکر نے مجھے وہ عکس دکھاتے ہوئے کہا۔

"مہاراج وہ ہے کیلاش پربت کا ناگ مندر۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پاروتی کا ناگن کے روپ میں کٹا ہوا جسم تھیلی میں بند میرے پاس تھا۔ کیلاش پربت کے مندر کے احاطے میں آکر ہم خچروں سے اتر پڑے۔ وہاں کوئی آدمی دکھائی نہ دیا۔ نوکر کہنے لگا۔

"مہاراج سردیوں میں یہاں یاتری نہیں آتے۔ صرف بڑا پجاری موجود ہوتا ہے۔ میں اس کو جاکر بلاتا ہوں۔"

میں نے اسے جانے دیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ پجاری کے آگے میری بڑھ چڑھ کر تعریف کرے گا۔ تھوڑی دیر میں ایک گول مٹول توند والا ناٹے قد کا پجاری نوکر کے ساتھ مندر کے برآمدے میں نمودار ہوا۔ اس نے آتے ہی میرے قدم چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"ہمارے دھن بھاگ مہاراج کہ آپ ہمارے مندر میں تشریف لائے۔"

میں نے بڑی شان سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے لئے ایک علیحدہ کمرے کا انتظام کردو۔ ہم کچھ روز یہاں رہ کر شو دیوتا کی پوجا کریں گے۔"

"تشریف لایئے مہاراج۔"

مجھے اسی مندر میں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جو شاید وہاں سب سے آرام دہ کمرہ تھا۔ کیلاش پربت کی ان پہاڑیوں میں کافی سردی تھی۔ مجھے پہننے کے لئے پجاری نے ایک

اونی فرغل بھی دیا۔ کمرے میں بڑا سا آتشدان تھا۔ اس میں آگ روشن کر دی گئی۔ نوکر کو میں نے وہیں سے واپس جانے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ میرے پاؤں چھو کر واپس چل دیا۔ پجاری میرے لئے کھانا اور گرم قہوہ لے کر آگیا۔ میں کھانا کھاتا رہا اور وہ میرے سامنے ادب سے ہاتھ باندھے بیٹھا رہا۔

میرا بستر لگا دیا گیا تھا۔ آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کی وجہ سے کمرے میں ہلکی سی گرمائش تھی۔ میں کھانا کھانے کے بعد قہوہ پینے لگا۔ پجاری بولا۔

"مہاراج اگر آپ کا حکم ہو تو میں رات کو سونے سے پہلے دیوتاؤں کا رس پیش کروں۔"

میں سمجھ نہ سکا کہ دیوتاؤں کا رس کیا ہوتا ہے۔ میں سمجھا کوئی خاص قسم کا قہوہ ہوگا۔ میں نے کہا۔

"ہاں! تمہیں اجازت ہے اب تم جاسکتے ہو۔"

پجاری چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے بڑے تھیلے میں سے پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں والی تھیلی نکالی۔ اسے کھول کر سانپ کے ٹکڑوں کو غور سے دیکھا۔ ان کا رنگ سیاہ ہوتا جارہا تھا۔ مجھے ان ٹکڑوں کو جتنی جلدی ہوسکے کسی ڈبے میں بند کرکے اس مندر کے تالاب میں ڈبو دینا اور پھر دس روز تک وہاں انتظار کرنا تھا۔ پجاری سے میں نے پوچھ لیا تھا۔ تالاب جسے کیلاش سرودر بھی کہتے تھے مندر کے پیچھے تھا۔ رات ہو گئی تھی۔ مندر میں چراغ روشن ہو گئے تھے۔ ایک بڑا چراغ میرے کمرے میں بھی جل رہا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر اونی فرغل کو جسم کے گرد لپیٹے تالاب کے مشاہدے کے لئے چل پڑا۔

مندر کے پیچھے ایک لمبا چوڑا برآمدہ تھا۔ اس برآمدے کے آگے سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا تالاب بنا ہوا تھا۔ جس میں کنول کے پھول بھی کھلے تھے۔ اور مچھلیاں بھی کناروں پر جلتے چراغوں کی روشنی میں تیرتی نظر آرہی تھیں۔ سردی بڑی شدید تھی۔ اوپر ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیاں دن کے وقت مجھے صرف نظر آئی تھیں۔ میں اپنے

کمرے میں آ گیا۔ میں نے یہی سوچا کہ رات کے پچھلے پہر جب مندر کے سارے آدمی گہری نیند سو رہے ہوں گے تو پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں کو ڈبے میں بند کر کے تالاب میں ڈبو دوں گا۔ مجھے کسی ایسے ڈبے کی تلاش تھی جس میں تالاب میں ڈوبنے کے بعد پانی داخل نہ ہو سکے۔ کمرے میں مجھے کچھ شیشے کی بوتلیں پڑی تو مل گئیں مگر ڈبہ نہ ملا۔ میں نے سوچا کہ سانپ کے ٹکڑوں کو کسی بوتل میں بند کرکے تالاب میں ڈال دیتا ہوں مگر مشکل یہ تھی کہ بوتل ڈوب نہیں سکتی تھی۔ فوراً تالاب کی سطح پر آجاتی۔

اس کا میں نے ایک حل تلاش کرلیا۔ میں نے سوچا کہ بوتل کے ساتھ ایک پتھر باندھ دوں گا۔ پھر خیال آیا کہ پاروتی نے بوتل کا نہیں کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے کسی ڈبے میں بند کرکے تالاب میں ڈالنا۔ مگر وہاں ڈبہ کہیں سے نہیں مل رہا تھا۔ میں بستر پر کمبل اوپر کرکے بیٹھ گیا۔ آتشدان میں آگ مدھم پڑ گئی تھی۔ کمرہ خوب گرم ہو گیا ہوا تھا۔ اتنے میں دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہو تم؟" میں نے رعب سے پوچھا۔

کسی عورت کی آواز آئی۔ "مہاراج میں ہوں رکمنی۔"

میں نے سوچا مندر کی نوکرانی ہے۔ پجاری نے میرے لئے کوئی مٹھائی وغیرہ بھیجی ہوگی۔ میں نے کہا۔ "اندر آجاؤ۔"

دروازہ کھلا اور ایک نوجوان عورت ہاتھوں میں طشت لئے سر جھکائے بڑے ادب سے چلتی داخل ہوئی۔ میرے پلنگ کے پاس آکر اس نے طشت پتھر کی تپائی پر رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔

میں نے پوچھا۔ "یہ کیالائی ہو؟"

وہ بولی "مہاراج جی نے سوم رس بھیجا ہے۔"

سوم رس؟ میں سوچنے لگا۔ اف میرے خدایا! پجاری نے جو دیوتاؤں کا رس بھجوانے کے لئے کہا تھا۔ وہ یہ سوم رس ہی تھا۔ سوم رس اس علاقے کی دیسی شراب تھی۔ میں نے رکمنی سے کہا۔

"رکمنی! ہم جب یاترا پر آتے ہیں تو سوم رس کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ اسے واپس لے جاؤ۔"

"جو حکم مہاراج۔"

وہ طشت اٹھا کر واپس دروازے کی طرف گئی تو میں نے کہا۔

"رکمنی ہمیں شو دیوتا کی چتا کے. بال رکھنے کے لئے ٹین کے بند ڈبے کی ضرورت ہے۔ کہیں سے ہمیں ٹین کا ڈبہ لادو۔"

رکمنی نے گردن جھکا کر کہا۔ "جو حکم مہاراج۔"

وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ٹین کا گول ڈبہ تھا۔ میں نے ڈبہ لے کر چراغ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ لپٹن چائے کا ڈبہ تھا۔ مجھے ایسے ہی ڈبے کی ضرورت تھی۔ میں نے رکمنی سے کہا۔ "اب تم جاسکتی ہو رکمنی۔"

وہ ادب سے سر جھکا کر واپس چلی گئی۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگالی۔ پلنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ ڈبے کو کھول کر دیکھا۔ اس کا ڈھکنا ایسا تھا کہ ایک بار بند ہونے کے بعد مشکل سے کھلتا تھا۔ میں نے سانپ کے ٹکڑوں والی تھیلی کھول کر اس میں سے پاروتی کے جسم کے ٹکڑے نکال کر بڑی احتیاط سے رکھ دیئے اور کہا۔

"پاروتی مجھے یقین نہیں آتا کہ تم دوبارہ زندہ ہوکر انسانی شکل میں واپس آسکوگی۔"

مجھے تو اس وقت تک یہ بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ ناگن سے عورت اور عورت سے پھر ناگن بن جاتی ہے۔ میں اس وقت بھی اور آج بھی اسے اپنی آنکھوں کا فریب سمجھتا ہوں۔ بہرحال جب آدمی گھر سے ایڈونچر کرنے نکلتا ہے اور خاص کر ہندوستان کے جنوبی جنگلوں میں سفر کرتا ہے تو اس کے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آتے ہیں۔ یہ وہ جنگل ہیں جہاں قدم قدم پر توہمات اور پراسرار اور ناقابل یقین واقعات سے واسطہ پڑتا ہے۔

میں نے پاروتی کی سانپ لاش کے ٹکڑوں کو ڈبے میں اچھی طرح سے بند کرکے

اپنے سرہانے کے نیچے رکھ لیا۔ اس کے بعد سوگیا۔ صبح صبح میری آنکھ کھل گئی۔ یہ بات میں نے تجربہ کرکے دیکھی تھی کہ اگر آدمی کو صبح صبح اٹھنا ہو اور وہ اپنے آپ سے یہ کہہ کر سو جائے کہ میں صبح چار بجے اٹھ بیٹھوں گا۔ تو ٹھیک چار بجے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ رات کو میں بھی اپنے دل سے یہی کہہ کر سویا تھا کہ میں منہ اندھیرے جاگ جاؤں گا۔

اس وقت ابھی رات کا اندھیرا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ میرے کمرے کا چراغ بجھ چکا تھا۔ آتشدان کی آگ بھی اتنی مدھم پڑ گئی تھی کہ لکڑی کے انگاروں پر سفید راکھ کی تہہ چڑھ چکی تھی۔ میں نے پاروتی کے ٹکڑوں والا ٹین کا چوکور ڈبہ فرغل کے اندر چھپایا۔ سر پر چادر ڈالی اور آہستہ سے کنڈی کھول کر کمرے سے نکل گیا۔ باہر سخت سردی تھی۔ یہ ہمالیہ کے پہاڑوں کی سردی تھی۔ تیز ہوا نہیں چل رہی تھی مگر ہوا ایسے لگتا تھا جیسی سردی کی وجہ سے جم گئی ہے۔ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر گہر کے بادل اترے ہوئے تھے۔ میں دبے پاؤں چلتا مندر کے عقبی برآمدے میں آگیا۔ تالاب دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے باریک رسی رات کو ہی سنبھال کر رکھ لی تھی۔ تالاب کے پاس جا کر میں نے ایک بڑے سے پتھر کو رسی کے ساتھ باندھ کر ٹین کے ڈبے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا اور کونے میں اسے تالاب کے پانی میں اتار دیا۔ پتھر نیچے گیا اور ٹین کے ڈبے کو بھی ساتھ ہی نیچے لے گیا۔ میرا مقصد اور میرا فرض پورا ہو گیا تھا۔ اب مجھے دس دن تک وہاں رہ کر پاروتی کے دوبارہ زندہ ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ جس کے بارے میں مجھے بالکل یقین نہیں تھا۔ لیکن مجھے ہر حالت میں وہاں رہ کر اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ مجھے پاروتی سے دلی محبت ہو گئی تھی اور میں دل سے یہی چاہتا تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے دوبارہ زندہ ہو جائے۔ میرا ایمان تھا کہ اگر خدا چاہے گا تو پاروتی دوبارہ زندہ ہو کر انسانی شکل میں واپس آ جائے گی۔

میں تالاب کے پاس بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ یہاں دس دن خیریت سے کٹ

جائیں۔ کسی کو معلوم نہ ہو جائے کہ میں نے یہاں ٹین کا ڈبہ تالاب میں ڈالا ہے۔ اگر کسی نے ڈبہ نکال لیا تو پاروتی نے مجھے بتا دیا تھا کہ پھر میں کبھی اس دنیا میں واپس نہ آ سکوں گی۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں یہیں کسی جگہ گیان دھیان کرنے کے بہانے بیٹھ کر ڈبے کی نگرانی کرنا شروع کر دوں۔ لیکن جب سردی کا خیال آیا تو یہ خیال دل سے نکال دیا۔ اس علاقے میں واقعی بے حد سردی تھی میں اٹھ کر واپس اپنے کمرے کی طرف چلا۔ ابھی برآمدے میں ہی قدم رکھا تھا کہ ایک ستون کے پیچھے سے اچانک کوئی عورت نکل کر میرے سامنے آ گئی۔ یہاں کچھ دور ستون کے طاق میں جلتے چراغ کی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے عورت کو پہچان لیا۔ یہ وہی عورت رکمنی تھی جو رات کو میرے لئے دیوتاؤں کا رس لے کر آئی تھی اور جس نے مجھے ٹین کا ڈبہ بھی لا کر دیا تھا۔

میں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ یونہی سیر کرتا ادھر آ گیا تھا کہا۔

"یہاں صبح کا سماں بڑا اچھا ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے یہاں گیان دھیان کروں۔"

رکمنی مسکرا رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"مہاراج! رشی منی لوگ یہیں بیٹھ کر گیان دھیان کیا کرتے تھے۔"

مجھے شک ہوا کہ کہیں اس نے مجھے تالاب میں ڈبہ ڈالتے دیکھ نہ لیا ہو۔ میں نے پوچھا۔

"تم یہاں اس وقت کیا کر رہی ہو؟"

رکمنی نے کہا۔

"مہاراج! میں تو روز منہ اندھیرے اٹھ کر ناگ مندر کے سات چکر لگاتی ہوں پرانے شاستروں میں لکھا ہے کہ جو دیوداسی دو مہینے منہ اندھیرے اٹھ کر ناگ مندر کے سات پھیرے لگائے گی اس کو سورگ میں جگہ ملے گی۔"

میرا شک دور ہو گیا۔ رکمنی کو بالکل معلوم نہیں ہوا تھا کہ میں وہاں کیا کرنے آیا تھا یا میں نے تالاب میں کوئی ڈبہ ڈالا ہے۔ میں نے کہا۔

"اچھا رکمنی! سکھی رہو۔"

اور میں اسے آشیرباد دے کر اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ کمرے کی گرم فضا میں آتے ہی مجھے سکون نصیب ہوا۔ کمرے کی فضا باہر کی کڑاکے کی سردی کے مقابلے میں گرم اور پرسکون تھی۔ گورکھ پور کے مندر کے نوکر نے کیلاش پربت کے اس ناگ مندر کے پجاری کو میرا تعارف کراتے ہوئے یہی بتایا تھا کہ میں دیوتا شو کا اوتار ہوں اور مجھے سانپ سجدہ کرتے ہیں۔ دوسرے دن پجاری میرے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ اس نے پوچھا۔

"مہاراج! کیا یہ سچ ہے کہ ناگ آپ کی پوجا کرتے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس لئے کہ میں شو دیوتا کا اوتار ہوں۔ سانپ مجھے دیکھتے ہی ادب سے سر جھکا دیتے ہیں۔ اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو تجربہ کر کے دیکھ لو"

پجاری بولا۔

"مہاراج! ویسے تو مجھے آپ کے اوتار ہونے کا پورا وشواش ہے۔ مگر میرا دل چاہتا ہے کہ میں سانپوں کو آپ کی پوجا کرتے دیکھوں۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ مکار پجاری یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میں کہیں فراڈیا تو نہیں ہوں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ رومال میرے پاس موجود تھا جس میں پاروتی کے جسم کی بو رچی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے سانپ میرے قریب نہیں پھٹکتے تھے بلکہ ادب سے دور کھڑے ہو جاتے تھے۔ میں نے پجاری سے کہا۔

"اس میں دیر کس بات کی ہے۔ ابھی تمہیں یہ چمتکار دکھائے دیتا ہوں۔ کہیں سے سانپ لے آؤ۔"

پجاری کے پاس اس وقت اس کی چہیتی دیوداسی رکمنی بھی کھڑی تھی۔ اس نے رکمنی کو اشارہ کیا۔ رکمنی اسی وقت گئی اور سانپوں کی پٹاری لے کر آ گئی۔ اس وقت لوگ میرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ پجاری نے سانپوں کی پٹاری درمیان میں رکھ دی

پھر اس کا منہ کھول دیا۔

پٹاری کے اندر سے تین سیاہ کالے سانپ پھنکارتے ہوئے باہر نکل آئے۔ میں اپنی جگہ پر بڑے اطمینان سے بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی یہ سانپ مجھے دیکھ کر فوراً ایک طرف ہٹ جائیں گے اور پھر ادب سے پھن اٹھا کر اس طرح کھڑے ہو جائیں گے جیسے میری تعظیم بجا لا رہے ہوں۔ مگر میں یہ دیکھ کر کچھ بے چین سا ہو گیا کہ سانپ میری طرف دیکھ کر ابھی تک پھنکار رہے تھے۔ ان میں سے ایک سانپ میرے قریب بھی آ گیا اور اس نے مجھے ڈسنے کی بھی کوشش کی۔ میں نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور یہ دیکھ کر میرا جسم خوف کے مارے سرد ہو گیا کہ میری جیب میں پاروتی کا رومال نہیں تھا۔ اچانک مجھے یاد آ گیا کہ پاروتی کا رومال میری دوسری پتلون میں ہے جو غسل خانے میں ٹنگی ہوئی ہے۔ میں ایک دم اٹھا اور یہ کہہ کر غسل خانے میں گھس گیا کہ

"ابھی آتا ہوں"

جلدی سے اپنی دوسری پتلون سے رومال نکال کر اپنی پتلون میں ڈالا اور باہر آ کر اسی طرح بیٹھ گیا۔ جیسے ہی میں بیٹھا تینوں سانپ ڈر کر ایک طرف ہو گئے۔ پھر وہ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے پھن کھول لئے اور جیسے بار بار پھن جھکا جھکا کر میری تعظیم بجا لانے لگے۔

پجاری بڑا عیار آدمی تھا اس کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے سانپ میرے قریب نہیں آتے۔ پہلے وہ چیز میرے پاس نہیں تھی۔ میں غسل خانے سے وہ چیز لایا ہوں۔ مگر اوپر اوپر سے اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ مجھ سے بڑا متاثر ہوا ہے۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! آپ سچ مچ اوتار ہیں۔"

جب وہ اور رکمنی چلے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور دل میں فیصلہ کیا کہ اب پاروتی کا رومال ہمیشہ اپنی جیب میں رکھا کروں گا۔ مگر آگے جو کچھ میرے ساتھ ہونے والا تھا اس کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔

مجھے دس دنوں کا حساب رکھنا تھا۔

وہاں کوئی کیلنڈر وغیرہ تو تھا نہیں کہ اس کو دیکھ کر معلوم کرتا کہ آج کونسا دن ہے اور کل کونسا دن ہو گا۔ میں نے دیوار پر ایک جگہ کوئلے سے نشان لگانے شروع کر دیئے۔ ایک دن گزر جاتا تو ایک نشان لگا لیتا۔ میں اس ناگ مندر میں صرف پاروتی کی خاطر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے سوا مجھے وہاں مندر کے پجاری اس کی دیوداسیوں اور سانپوں کی پوجا پاٹھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دن بھر میں وادیوں گھاٹیوں میں ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا رہتا۔ رات کو تھوڑی دیر کے لئے مندر میں آ کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا۔ پجاری کو میں یہ ظاہر کرتا کہ میں گیان دھیان میں مصروف ہوں۔ حقیقت میں میں سوچ رہا تھا کہ پاروتی اگر واقعی دوبارہ انسانی شکل میں واپس آگئی تو میں اسے ساتھ لے کر کلکتے اس کے کسی رشتے دار کے ہاں چھوڑ کر اپنے نئے آزاد وطن پاکستان چلا جاؤں گا اور پھر کبھی ان علاقوں میں آنے کا نام نہیں لوں گا۔ میں نے ان علاقوں میں بڑی تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائی تھیں۔

پجاری برابر میری خدمت کر رہا تھا۔ صبح شام مجھے اعلیٰ قسم کا کھانا میرے کمرے میں پہنچ جاتا تھا۔ کبھی نوکر لے کر آ جاتا۔ کبھی دیوداسی رکمنی کھانا لے کر آ جاتی۔ رکمنی کی عمر تیس برس کے قریب تھی۔ اس کی شکل سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ عام طور پر خاموش رہتی۔ میں بات کرتا تو وہ بھی کوئی بات کر لیتی۔ مگر اس کی آنکھوں کو دیکھنے

سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہرے راز کو دل میں چھپائے ہوئے ہے۔ ایک ایسا راز جس کو وہ مجھ سے چھپانا بھی چاہتی ہے اور مجھے بتانا بھی چاہتی ہے۔ اپنی آوارہ گردیوں کے دوران مجھے قسم قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا اور میں لوگوں کے چہروں کو تھوڑا تھوڑا پڑھ لیتا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ رکمنی کس راز کو چھپائے ہوئے ہے۔ ایک روز شام کو وہ میرے لئے کھانا لے کر آئی تو میں اس سے کیلاش پربت کی پہاڑیوں اور موسموں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"رکمنی! تم اتنی مدت سے یہاں رہ رہی ہو۔ کبھی تم سے کسی ایسے سادھو جوگی یا سپیرے کو دیکھا ہے جو سانپ کا روپ دھار لیتا ہو؟"

رکمنی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں نے ایسا کوئی سپیرا سنیاسی یا سادھو نہیں دیکھا۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کیا آپ نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں نے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن میں نے رشیوں سے سنا ہے کہ اگر کوئی سانپ پانچ سو سال تک زندہ رہے تو اس میں ایسی شکتی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جب چاہے انسان کی شکل بدل سکتا ہے۔"

رکمنی میری بات بے توجہی سے سن رہی تھی۔ اس نے دو ایک بار دروازے کی طرف اس انداز سے دیکھا کہ جیسے اسے شک ہو کہ کوئی ان کی باتیں سن رہا ہے۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں نے بھی سنا ہی ہے مگر ابھی تک اتنی شکتی والا سانپ نہیں دیکھا۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں اس عورت کے بارے میں کچھ دیر غور کرتا رہا۔ یہ دیوداسی مجھے پراسرار لگ رہی تھی۔ دن گزرتے چلے گئے میرے حساب سے جب نو دن گزر گئے اور دس تاریخ کی رات آئی تو میں ساری رات جاگتا رہا۔ کیونکہ پاروتی کے جسم والے ٹین کے ڈبے کو تالاب میں پڑے دس دن ہو گئے

تھے اور اب مجھے اسے رات کے پچھلے پہر تالاب میں سے نکالنا تھا۔ یہ بات واضح نہیں تھی کہ آیا پاروتی خود بہ خود ڈبے میں سے انسانی شکل اختیار کر کے باہر آ جائے گی یا میں اس کے جسم کے ٹکڑوں کو جوڑوں گا اور اس کے بعد وہ انسانی شکل اختیار کر کے اٹھ کھڑی ہو گی۔ جو بھی تھا مجھے رات کے پچھلے پہر سب سے پہلے پاروتی کے ڈبے کو تالاب سے باہر نکالنا تھا۔ میں نے ڈبے کو رسی سے باندھ کر تالاب کے کونے میں ڈال رکھا تھا اور رسی کو جھاڑیوں میں چھپا کر اوپر پتے اور گھاس ڈال دی تھی۔

مندر میں رات کے پچھلے پہر گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ میں ان کے بجنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئیں تو میں اونی لبادہ پہن کر کمرے سے خاموشی سے نکل کر تالاب پر آ گیا۔ میں نے گھاس پتے ہٹا کر رسی کو اندھیرے میں پکڑنے کی کوشش کی مگر رسی میرے ہاتھ نہ آئی۔ میں نے اسے ادھر ادھر ٹٹولا۔ رسی وہاں نہیں تھی۔ میں نے تالاب کے کنارے کو جھک کر دیکھا۔ اوپر سے کوئی رسی تالاب میں نہیں جا رہی تھی۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔

کیا کوئی پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں والا ڈبہ نکال کر لے گیا تھا؟ ایسا ہی ہوا تھا۔ رسی اپنے آپ تالاب میں نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے اسے جھاڑی کے ساتھ باندھ کر رکھا ہوا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا کسی نے مجھے تالاب میں ڈبہ ڈالتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ آدمی ڈبہ نکال کر لے جا چکا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک رات پہلے دیکھا تھا۔ رسی موجود تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ واردات دس تاریخ کی رات کو ہی ہوئی ہے۔ جس آدمی نے بھی ڈبہ چرایا تھا وہ ان دنوں کے پورے ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا مطلب بھی واضح طور پر نکلتا تھا کہ جس شخص نے ڈبہ نکالا ہے وہ جانتا تھا کہ ڈبے میں کسی ایسے سانپ کے جسم کے ٹکڑے بند ہیں جس نے دس دن گزرنے کے بعد انسانی شکل اختیار کرنی ہے۔

میں قدرتی طور پر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کام کسی بھیدی کا ہے اور وہاں اس راز کا

جاننے والا سوائے ناگ مندر کے بڑے پجاری کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے پجاری پر ہی شک پڑا۔ میں چپکے سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں سخت پریشان تھا۔ دن چڑھا اور رکمنی میرے لئے دودھ لے کر آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"اس مندر میں پجاری کے علاوہ اور کون کون رہتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"میرا مطلب ہے ان دنوں میں باہر سے کوئی جوگی یا سپیرا تو نہیں آیا؟"

رکمنی نے کہا۔

"کوئی نہیں آیا مہاراج! اس موسم میں بڑی سردی ہوتی ہے باہر سے سادھو جوگی لوگ نہیں آتے۔"

رکمنی چلی گئی۔ اس کے چہرے کی پراسراریت بہت زیادہ نمایاں تھی۔ میں سخت بے چین تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ کام سوائے مندر کے بڑے پجاری کے اور کسی کا نہیں ہے۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ پجاری پر میرے چمتکاروں یعنی کرامت کا گہرا اثر ہے۔ اگر میں نے اسے تھوڑا سا بھی ڈرایا دھمکایا تو وہ مان جائے گا کہ تالاب میں سے ڈبہ اسی نے نکالا تھا۔

میں نے دودھ کا پیالہ جلدی جلدی پیا اور پجاری کے کمرے کی طرف تیز تیز چل پڑا۔ پجاری اپنے کمرے میں آتشدان کے پاس ہرن کی کھال پر بیٹھا وید سامنے رکھے پڑھ رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا۔

"مہاراج! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور کہا۔

"پجاری جی! میری ایک بڑی قیمتی شے چوری ہو گئی ہے۔ مجھے شک ہے کہ اسے مندر کے کسی آدمی نے چرایا ہے۔"

پجاری نے وید کی کتاب بند کر دی اور میری طرف پوری طرح متوجہ ہو کر بولا۔

"مہاراج! یہاں کبھی کسی کی کوئی شے غائب نہیں ہوئی۔ آپ کی کونسی چیز چوری

ہوئی ہے؟"

میں نے ایک منٹ کے لئے سوچا۔ پھر اسے کہا۔

"میں نے مقدس گنگا کے پانی والا ڈبہ تپسیا کے لئے مندر کے تالاب میں ڈال رکھا تھا۔ آج صبح میں نے جا کر دیکھا تو ڈبہ وہاں نہیں تھا۔ میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ جس کسی نے میرا ڈبہ چرایا ہے اسے ڈبے سمیت میرے سامنے پیش کیا جائے۔"

پجاری بڑی عاجزی سے کہنے لگا۔

"مہاراج! میں ابھی سارے مندر کی آپ کے سامنے چھان پھٹک کرتا ہوں۔ یہاں ہمارے علاوہ دو تین دیوداسیاں ہی ہیں۔ ابھی ان سے پوچھ گچھ کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں اگر آپ کی چیز یہاں ہوئی تو وہ آپ کو ضرور مل جائے گی۔"

پجاری کی ان باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ ڈبہ اس نے چوری نہیں کیا۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں یا تو باہر سے کوئی چور آیا ہے یا پھر کسی دیوداسی نے تالاب میں سے ڈبہ نکال کر چھپا لیا ہے؟"

پجاری نے اسی وقت ساری دیوداسیوں کو بلا لیا۔ یہ کل چار دیوداسیاں تھیں۔ ان میں رکمنی بھی شامل تھی۔ پجاری نے بڑی سختی سے ان کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور کہا کہ اگر ان میں سے کسی نے پوتر گنگا جل کا ڈبہ تالاب میں سے نکالا ہے تو بتا دے نہیں تو ان سب کو ناگ دیوتا کا شراپ بھگتنا پڑے گا۔

ساری دیوداسیاں رونے لگیں۔ انہوں نے ہاتھ باندھ کر کہا کہ ہم نے گنگا جل کا ڈبہ دیکھا تک نہیں۔ ہم بے قصور ہیں۔ ہمیں معاف کیا جائے۔ میں نے بھی یہی اندازہ لگایا کہ ان میں سے کسی نے ڈبہ نہیں چرایا۔ تو پھر آخر وہ کہاں چلا گیا۔ ظاہر ہے کسی بھیدی نے اسے تالاب میں سے عین دسویں دن نکالا ہے۔ میں نے اپنے طور پر سراغ رسانی کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ دوپہر تک کمرے میں پیچ و تاب کھاتا اور سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مجھے بار بار پجاری کا ہی خیال آتا۔ اسی پر

شک پڑتا کہ یہ کام اس کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کی کڑی نگرانی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دن کے وقت تو پجاری سب کے سامنے رہتا تھا۔ صرف رات کو وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا اور رکمنی کے کہنے کے مطابق وہ ساری رات گیان دھیان میں مشغول رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ رات کے وقت کسی طریقے سے چھپ کر اس کی نگرانی کرنی چاہئے۔ مگر میں اس کے بند کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے کمرے کی صرف ایک ہی کھڑکی تھی جو مندر کے عقبی صحن کی طرف کھلتی تھی۔ یہ کھڑکی دن کے وقت بھی اور رات کے وقت بھی بند رہتی تھی۔ ہو سکتا ہے کھڑکی میں کوئی سوراخ یا درز ہو۔ میں اس میں سے پجاری کو دیکھ سکتا تھا۔

دن میں نے اپنے کمرے میں ہی گزار دیا۔ جب رات ہو گئی اور چاروں طرف اندھیرا اور خاموشی چھا گئی تو میں دبے پاؤں اپنے کمرے سے نکل کر پجاری کے کمرے کی عقبی کھڑکی کے پاس آ گیا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں آنکھ لگا کر ادھر ادھر کوئی سوراخ یا درز تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ چھوٹی سی درز تھی۔ میں نے اس کے ساتھ آنکھ لگا دی۔ مجھے پجاری کمرے کے وسط میں ہرن کی کھال پر آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کئے بیٹھا نظر آیا۔ وہ واقعی گیان دھیان میں مصروف تھا۔ میں دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر پجاری کا تھوڑی تھوڑی دیر بعد مشاہدہ کرتا رہا۔ وہ اسی طرح بیٹھا تھا۔ مجھے سردی لگنے لگی۔ سردی وہاں بہت زیادہ تھی اوپر پہاڑوں کی طرف سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔

میں مایوس ہو کر کمرے میں آ گیا۔ سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں کے ڈبے کا غائب ہو جانا میری لئے بہت بڑا حادثہ تھا۔ پاروتی کے بغیر کیلاش پربت سے واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے ہر حالت میں پاروتی کے ڈبے کا کھوج لگانا تھا۔ میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ دیوداسی رکمنی سے پوچھنا چاہئے۔ وہ پراسرار دیوداسی ہے۔ ہو سکتا ہے اسے کچھ معلوم ہو۔ صبح کے وقت جب

رکمنی میرے لئے دودھ لے کر آئی تو میں نے سب سے پہلے تو رکمنی کی تعریف کرنا شروع کر دی کہ وہ سب دیوداسیوں سے بڑھ کر خوبصورت اور عقل مند دیوداسی ہے۔ رکمنی اپنی تعریف سن کر خوش بھی ہوئی اور کچھ شرما بھی گئی۔ اس لئے کہ ایک قدرتی بات تھی۔ جب میں نے اس سے کہا کہ گنگا جل والا پوتر ڈبہ میری زندگی کی سب سے قیمتی چیز ہے اور میں اس کے بغیر واپس نہیں جا سکتا تو وہ خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"رکمنی! تم مجھے مندر کی ساری دیوداسیوں سے بڑھ کر اچھی لگتی ہو۔ میری بات کا وشواش کرو کہ اگر مجھے میرا ڈبہ نہ ملا تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔"

رکمنی نے بند دروازے کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔ جیسے اسے شک ہو کہ باہر کوئی ہماری باتیں سن رہا ہے۔ میں نے کہا۔

"بے فکر رہو۔ ہماری باتیں کوئی نہیں سن رہا۔ اگر تمہیں کسی راز کا پتہ ہے تو بے دھڑک مجھے بتا دو۔ میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا بلکہ تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔"

دیوداسی رکمنی مسلسل مجھے سنجیدہ نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

جب میں نے اپنی بات ختم کی تو اس نے آہستہ سے ایک ایسا سوال کر دیا جس نے مجھے سر سے پاؤں تک چونکا دیا۔ اس نے میرے چہرے پر نظریں جمائے پوچھا۔

"مہاراج! اس ڈبے میں اگر گنگا جل ہوتا تو اسے چور اٹھا کر نہیں لے جا سکتا تھا۔"

میں اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ بولی۔

"آپ خود ہی بتا دیں کہ ڈبے میں اگر گنگا جل نہیں تھا تو پھر کیا تھا؟"

میں نے رکمنی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"رکمنی! اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ ڈبہ کس نے چرایا ہے تو میں تمہیں بتا دوں گا کہ ڈبے میں کیا تھا؟"

رکمنی نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! معلوم نہیں کیوں آپ مجھے اچھے لگ رہے ہیں۔ آپ جس روز یہاں آئے تھے اسی وقت سے مجھے اچھے لگ رہے ہیں۔"

میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس دیوداسی کو سارا راز معلوم ہے۔ میں اس کی تعریف کر کے اس سے یہ راز اگلوانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"رکمنی! وشواش کرو۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو تم بھی بڑی اچھی لگی تھیں۔ تم بہت خوبصورت ہو....."

میں نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ رکمنی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ میں نے جب دیکھا کہ لوہا گرم ہے تو اس پر ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

"رکمنی! اگر تم مجھے بتا دو کہ میرا ڈبہ کس کے پاس ہے تو میں بھگوان شو جی کے آگے تمہاری بڑی پرارتھنا کروں گا...."

دیوداسی رکمنی کہنے لگی۔

"مہاراج! اس ڈبے میں آکاش کی کوئی اپسرا سانپ کے روپ میں بند تھی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں نا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں رکمنی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ وہ ڈبہ کس کے پاس ہے؟"

دیوداسی رکمنی نے مجھے ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان بیان کی۔ اس نے کہا۔

"مہاراج! بڑے پجاری کا ایک گرو دیو ہے جس کو سب راج گرو کہتے ہیں۔ آج رات وہ اچانک کیلاش پربت والے اپنے مندر سے اتر کر پجاری کے پاس آ گئے۔ میں ایک طرف کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ راج گرو نے کہا کہ یہاں ایک شخص آیا ہے جس کے پاس ایک ایسی ناگن ہے جو انسانی شکل بدل لیتی ہے۔ اس ناگن کو سانپ کے روپ میں کسی نے مار ڈالا تھا۔ یہ شخص اس کی لاش کے ٹکڑے ڈبے میں بند کر

کے لایا ہے اور اس نے ڈبے کو مندر کے تالاب میں دس دن کے لئے ڈال دیا ہے۔ اگر وہ ڈبہ ہمارے ہاتھ لگ جائے تو ہماری قسمت بدل سکتی ہے۔ راج گرو نے پجاری سے کہا کہ دس دن کے بعد یہ ناگن انسانی روپ میں ظاہر ہو جائے گی۔ میں اسے اپنے خاص منتر سے اپنے قبضے میں کر لوں گا۔ یہ ناگن زبردست طاقت کی مالک ہے۔ ہم اس کی مدد سے بھارت ورش کے سارے ناگ مندروں کو اپنے قبضے میں کر کے سب سے مہا پجاری بن سکتے ہیں۔ یہ سن کر ہمارے پجاری کو بھی لالچ آ گیا۔ اس نے کہا راج گرو! ہم ابھی جا کر تالاب سے ناگن کا ڈبہ نکال لاتے ہیں۔ وہ اسی وقت تالاب پر گئے اور ڈبہ نکال کر لے آئے راج گرو نے ڈبے کو سونگھ کر کہا۔ اس میں سے ناگن کی بو آ رہی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ اوپر پہاڑوں پر اپنے مندر میں لے جا رہا ہوں۔ وہاں جا کر میں اس پر منتر پڑھ کر پھونکوں گا۔ پھر یہ ہمارے قبضے میں ہو گی۔ اسے سورج نکلنے کے بعد کھولوں گا۔۔۔"

دیوداسی رکمنی یہ داستان سنا رہی تھی اور میں حیرانی سے سن رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"راج گرو ناگن کا ڈبہ لے کر اوپر اپنے پہاڑی مندر میں چلا گیا ہے۔"

میں پریشان ہو کر کمرے میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ میں نے رکمنی کا بازو پکڑ کر کہا۔

"رکمنی! کیا تم مجھے اس مندر کا پتہ بتا سکتی ہو جہاں راج گرو ناگن کا ڈبہ لے کر گیا ہے؟"

رکمنی نے کہا۔

"مہاراج! میں نے وہ مندر دیکھا نہیں ہے۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہاں سے دائیں پہاڑیاں چھوڑ کر اوپر ایک راستہ جاتا ہے۔ آدمی اس راستے پر ایک دن ایک رات سفر کر لے تو ایک جھیل آ جاتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ راج گرو کا مندر اسی جھیل کے آس پاس کسی جگہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں ابھی اس چور راج گرو کی تلاش میں جاتا ہوں۔"

رکمنی بولی۔ "مہاراج! راج گرو سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے چل دیا تھا اور وہ

گھوڑے پر سوار تھا۔ آپ اس کو راستے میں نہیں پکڑ سکیں گے۔ راج گرو ضرور کسی خفیہ راستے سے جا رہا ہو گا۔ مجھے معلوم ہے ان لوگوں نے اس قسم کے کاموں کے واسطے پہاڑوں میں خفیہ ٹھکانے اور خفیہ راستے بنا رکھے ہیں۔"

میں نے رکمنی کا شکریہ ادا کیا اور اسے تاکید کی کہ وہ یہ بات کسی کو نہ بتائے کہ میں کہاں گیا ہوں۔"

"میں بہت جلد اپنی چیز لے کر تمہارے پاس واپس آ جاؤں گا۔"

پجاری سے اس بارے میں کوئی بات کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ڈبہ اس کے ہاتھ سے نکل کر راج گرو کے قبضے میں جا چکا تھا۔ یہ راج گرو یقیناً کوئی بڑا جادوگر قسم کا آدمی تھا جس کو اوپر پہاڑوں میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ کیلاش پربت کے مندر میں کوئی شخص بڑی شکتی والی ناگن کی لاش لے کر آیا ہوا ہے۔

رکمنی کہنے لگی۔

"مہاراج! اوپر پہاڑوں میں برف جمی رہتی ہے وہاں بڑی سردی ہوتی ہے۔ میں آپ کو گرم کپڑے لا دیتی ہوں۔"

رکمنی چلی گئی۔ میں نے پاروتی کے جسم کی بو والا رومال سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا۔ رکمنی میرے لئے سر اور گردن کو ڈھانپ دینے والی اونی ٹوپی اور روئی کی بنڈی لائی تھی۔ میں نے اسے پہن لیا۔ میرے پاؤں میں چمڑے کے جوتے تھے۔ اندر میں نے گھٹنوں تک گرم جرابیں بھی پہن رکھی تھیں جو میں نے بیرگنج میں خریدی تھیں۔ میں نے رکمنی سے کہا۔

"اب میں جاتا ہوں۔ پجاری پوچھے تو کہہ دینا کہ میں کسی کام سے نیچے بیرگنج گیا ہوں اسے ہرگز پتہ نہ چلے کہ میں راج گرو کے تعاقب میں اوپر پہاڑوں پر گیا ہوں۔"

رکمنی نے کہا۔ "میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ آپ جلدی واپس آ جانا۔"

اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی تھی۔ مجھے اس وقت اس کی آنکھوں کی اداسی پر غور کرنے کی واقعی فرصت نہیں تھی۔ رکمنی کہنے لگی۔

"نیچے اصطبل میں خچر بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خچر لے جائیں۔ پیدل آپ نہیں جا سکیں گے۔"

میں نے رکمنی کا شکریہ ادا کیا اور خچروں کے اصطبل کی طرف چل دیا۔

ایک خچر کو کھول کر میں اس کے اوپر بیٹھ گیا اور دیوداسی رکمنی نے مجھے جو راستہ بتایا تھا خچر کو اس راستے پر ڈال دیا۔ آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہوا بند تھی۔ مگر سردی بہت تھی۔ شروع شروع میں راستہ دشوار گزار نہیں تھا۔ زمین غیر ہموار تھی مگر دونوں جانب جوار کے کھیت تھے اور پگ ڈنڈی بھی کشادہ تھی۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا پگ ڈنڈی سمٹتی گئی۔ کھیتوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب کہیں کہیں کسی ڈھلان پر کوئی کھیت نظر آ جاتا تھا۔ پہلے دونوں جانب پہاڑیاں دور دور تھیں۔ اب وہ قریب آ رہی تھیں۔ میں ایک پہاڑی دریا میں سے گزرا جس کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ ہر طرف پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ پانی صرف درمیان میں ایک ندی کی شکل میں بہہ رہا تھا۔ میں نے اتر کر پانی میں ہاتھ ڈالا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈا یخ تھا۔ دوپہر کے وقت میں ایسے علاقے میں سے گزر رہا تھا جہاں گھاٹیاں' برساتی نالے اور بڑی بڑی چٹانیں جگہ جگہ کھڑی تھیں۔ یہاں پہاڑیاں خشک بنجر اور نسواری رنگ کی تھیں۔ چٹانوں کے پتھر دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ہرے بھرے جنگل پیچھے رہ گئے تھے۔ کافی بلندی پر پہاڑیوں کی ڈھلانیں اوپر برف پوش چوٹیوں تک چلی گئی تھیں۔ یہ کوہ ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیاں تھیں۔

ابھی تک راستے میں کہیں کہیں کوئی پہاڑی گاؤں آ جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر کی سلوں کی ڈھلواں چھتوں والے جھونپڑا نما مکان تھے۔ بیچ میں ایک تنگ سا بازار

ہوتا۔ دو چار دکانیں ہوتیں۔ ایک گاؤں آیا تو میں نے خچر کو چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ ایک دکان کے باہر بیٹھ کر روٹی کھائی۔ چائے پی۔ اس دوران خچر بھی گھاس وغیرہ چر کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ گاؤں والوں سے آگے مندر کا راستہ پوچھا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔

یہ ایک دن اور ایک رات کا سفر تھا۔ رکمنی نے مجھے راج گرو کے مندر کی یہ نشانی چلتے وقت بتائی تھی کہ جب مندر قریب آتا ہے تو برف پوش پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ابھی یہ پہاڑیاں دور اوپر مجھ سے کافی فاصلے پر تھیں۔ میں اونی ٹوپی اور اونی فرغل کی وجہ سے کافی گرم ہو کر خچر پر بیٹھا تھا۔ خچر آرام آرام سے پہاڑی راستوں پر چل رہا تھا۔ یہ ساری کی ساری چڑھائی تھی۔ مگر اتنی اونچی اور مشکل چڑھائی نہیں تھی۔

شام کے وقت ایک بنجر ٹیلے کی ڈھلان اتر کر ایک چھوٹی سی وادی آ گئی۔ یہاں تین چار سرسبز کھیتوں میں سرو کی طرح کے اونچے چھریرے درخت کھڑے تھے۔ ایک پتھر کا چھوٹا سا مکان بھی نظر آ رہا تھا۔ راستے میں خچر کو پلانے کے واسطے پانی کہیں نہیں ملا تھا۔ ان کھیتوں میں ایک جگہ چھوٹی سی پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ میں یہاں خچر سے اتر پڑا۔ خچر پانی پینے لگ گیا۔ میں نے بھی تھوڑا سا پانی پیا۔ پانی بہت سرد تھا۔ اتنے میں پتھر کے مکان میں سے ایک دیہاتی نکل کر میری طرف آیا۔ اس نے پہاڑی لہجے اور پہاڑی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ میں اوپر کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے راج گرو کے مندر کا بتایا تو وہ بولا۔

"وہ تو بہت دور ان برفانی پہاڑیوں کے اندر ہے۔ تم وہاں کیوں جا رہے ہو؟"

"میں نے کہا۔ "یاترا کرنے جا رہا ہوں۔"

دل میں کہا۔ راج گرو کی گردن توڑنے جا رہا ہوں۔ مجھے تمہارے مندروں کی یاترا سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ دیہاتی میرے لئے جوار کی روٹی اور دودھ لے آیا۔ دودھ کا رنگ سرخی مائل تھا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کس کا دودھ ہے۔ یہاں مجھے کوئی گائے تو نظر نہیں آ رہی۔"

وہ بولا۔ "یہ گھوڑی کا دودھ ہے۔"

میں نے دودھ کا پیالہ اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ دوست! میں روٹی کے ساتھ دودھ نہیں پیا کرتا۔"

وہ دودھ واپس لے گیا اور میرے لئے گڑ لے آیا۔ میں نے گڑ کے ساتھ بڑے مزے سے جوار کی روٹی کھائی۔ ٹھنڈا پانی پیا۔ دل میں خیال آیا کہ یہیں رات بسر کرنی چاہئے۔ پھر سوچا کہ ابھی کافی دن باقی ہے۔ جتنا سفر طے ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں نے دیہاتی کا شکریہ ادا کیا اور خچر پر سوار ہو کر آگے روانہ ہوا۔

اب کوئی باقاعدہ پگ ڈنڈی یا راستہ نہیں بنا ہوا تھا۔ بس سامنے والی برفانی پہاڑیوں کو نظر میں رکھ کر سفر کر رہا تھا۔ ایک پہاڑی کا موڑ گھوم کر اپنے راستے سے ہٹ جاتا تو اوپر والی برف پوش پہاڑیوں کو دیکھ کر پھر راستہ درست کر لیتا۔

جب سورج مشرقی برفانی پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے چلا گیا تو وادی میں اور پہاڑیوں کے نشیب میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ اس وقت مشرق کی جانب آسمان پر سیاہ کالے بادل نمودار ہوئے۔ یہ بادل میدانوں کے بادلوں سے بالکل مختلف تھے۔ میدانوں کے بادل تو اوپر اوپر سائبان کی طرح پھیلے ہوتے ہیں لیکن یہاں ہمالیہ کی بلندیوں پر بادل بالکل سامنے سے چلے آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں میں اور خچر بادلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں کسی اندھیری سرنگ میں داخل ہو گیا ہوں۔ بادل اس قدر ٹھنڈے اور گیلے گیلے تھے کہ میرے کندھے سردی کی وجہ سے کپکپانے لگے۔ ایک تو ویسے ہی سورج غروب ہو چکا تھا اوپر سے بادلوں نے مجھے گھیر لیا تو اور بھی اندھیرا چھا گیا۔ خچر دو ایک بار پریشان ہو کر اچھلا اور رک گیا۔ میں جلدی سے اتر پڑا اور خچر کی باگ پکڑ کر وہیں پتھر پر بیٹھ گیا۔ بادل سیاہ دھند کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ سردی سے میرے دانت بج اٹھے۔ مجھے ایسے لگا جیسے بادل میرے جسم کے اندر سے ہو کر گزر رہے ہیں۔ جب بادل نہ چھٹے اور میرے اردگرد اسی طرح سیاہ دھند چھائی رہی تو میں نے خچر کی باگ پکڑ لی اور اسے کھینچتے ہوئے جس پہاڑی راستے پر چل رہا تھا اسی پر آگے چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ تک راستہ ہموار رہا۔ پھر چڑھائی شروع ہو گئی۔

کچھ دور تک چڑھائی چڑھنے کے بعد میں بادلوں سے باہر نکل آیا۔ میں نے شام کے گہرے ہوتے اندھیرے میں نیچے دیکھا۔ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر سیاہ کالے بادل وادیوں پر ایسے پھیلے ہوئے تھے جیسے کسی نے وادیوں کو بادلوں سے بھر دیا ہو۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور خچر پر بیٹھ کر پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اوپر بھی بادلوں کے جمگھٹے آ گئے۔ آسمان پر جو غروب ہونے کے بعد سورج کی لالی سیاہ رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی وہ ان بادلوں میں غائب ہو گئی۔ یہ بادل بہت گھنے تھے۔ ان میں رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی اور ہلکی ہلکی گرج سنائی دینے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ کوئی ایسی جگہ جلدی سے تلاش کرنی چاہئے جہاں بارش کا یہ جو طوفان آ رہا ہے اس سے پناہ مل سکے۔

اپنی بائیں جانب تھوڑا اوپر آڑھی ترچھی کھڑی چٹانوں کے درمیان مجھے ایک شگاف دھندلا دھندلا سا نظر پڑا۔ میں نے خچر کو اسی طرف ڈال دیا۔ ابھی میں چٹانوں کے قریب ہی پہنچا تھا کہ بجلی چمکی اور بادل بڑے زور سے گرجے۔ پھر موٹی موٹی بارش کی بوندیں گرنے لگیں۔ میں خچر سے اترا اور اسے کھینچتے ہوئے چٹانوں کے درمیان سے ہو کر شگاف تک آ گیا۔ یہ شگاف اصل میں ایک قدرتی غار تھا۔ قدرت نے مجھے ایک بڑی اچھی پناہ گاہ عطا کر دی تھی۔ غار کافی کھلا اور کشادہ تھا۔ زمین پر چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اصل میں یہ ایک دریا تھا جو پہاڑوں کے اندر سے بہتا ہوا یہاں نکل آیا تھا مگر سردیوں کے موسم کی وجہ سے خشک ہو رہا تھا۔ میں نے زمین کو چھو کر دیکھا۔ زمین دریا کے پاٹ کی طرح گیلی تھی۔ خچر بھی میرے ساتھ غار میں آ گیا۔

اتنی دیر میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ سرد ہوا بھی چلنے لگی۔ مگر غار میں ہلکی ہلکی گرمائش تھی۔ میں ہاتھ بغلوں میں دے کر غار کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ غار کے دہانے پر اوپر پتھر باہر کو نکلے ہوئے تھے جن کی وجہ سے بارش کی بوچھاڑیں اندر نہیں آتی تھیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب رات بھی اسی غار میں بسر کروں گا۔ میں کافی دیر تک بیٹھا اندھیرے میں بارش کی آواز سنتا رہا۔ کافی تیز بارش ہو

رہی تھی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد بڑا تیز شور سنائی دینے لگا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ یہ کوئی برساتی نالہ تھا جس میں بارش کا ریلا اچانک آ گیا تھا اور بڑے زور شور سے پانی بہنے لگا تھا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں بارش کا پانی تو نہیں آ رہا تھا مگر سرد ہوا کے جھونکے بڑے تیز تھے۔ میں نے خچر کو وہیں چھوڑا اور خود اٹھ کر غار کے اندر چلا گیا۔ میں سونے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ غار میں اندھیرا تھا مگر محسوس ہوتا تھا کہ غار کافی کشادہ ہے اور اس کی چھت بھی اونچی ہے۔ میرے پاؤں تلے جو پتھر آ جاتے تھے ان کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ غار کی چھت اونچی ہے۔ میں دیوار کے ساتھ غار کے منہ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ یہاں اتنی سردی نہیں تھی۔ بارش اور برساتی نالے کا شور بھی زیادہ سنائی نہیں دیتا تھا۔

اندھیری اور طوفانی بارش والی لمبی رات مجھے وہیں بسر کرنی تھی۔ کچھ دیر تک اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا پاروتی کے بارے میں سوچتا رہا کہ راج گرو پجاری نے پاروتی کو انسانی شکل میں لانے کے بعد منتر پڑھ کر اپنے قبضے میں کر لیا ہو گا۔ اور پاروتی کی یادداشت غائب کر دی ہو گی۔ یہ بات پاروتی نے مجھے ایک بار بتائی تھی کہ اگر کوئی زبردست طاقت والے سپیرے نے مجھے پکڑ لیا اور اسے شیش ناگ کا منتر بھی آتا ہو گا تو وہ مجھے اپنے قبضے میں کر سکتا ہے۔ پھر میری یادداشت بھی غائب ہو جائے گی اور میں جن لوگوں کو پہلے دیکھ چکی ہوں' جن لوگوں سے پہلے مل چکی ہوں ان کو بالکل نہ پہچان سکوں گی۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ ایسی حالت میں پاروتی مجھے بھی نہیں پہچانے گی۔ پاروتی نے اتنی بات تو مجھے بتا دی تھی مگر آگے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا توڑ کیا ہو گا اور کس طریقے پر عمل کرنے سے اس کی یادداشت واپس آ سکے گی۔ یہی بات مجھے سخت پریشان کئے ہوئے تھی جس کی وجہ سے میری نیند غائب تھی۔ لیکن نیند آنا ایک قدرتی بات ہے اور نوجوانی میں آدمی کو بڑی جلدی نیند آ جاتی ہے۔ مجھے بھی رات کے کسی پہر نیند آ گئی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب میرا خچر زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول

کر دیکھا۔ غار کے دہانے میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے غار کی چھت کو دیکھا۔ یہ کسی مکان کی چھت نہیں تھی۔ پہاڑ کے اندر غار کی چھت تھی جس میں سے نوکیلے پتھر باہر نکلے ہوئے تھے اور جگہ جگہ سوراخ تھے۔ دیوار بھی کہیں باہر کو نکلی ہوئی تھی اور کہیں اندر کو دھنسی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زمین پر پانی کے بہنے کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی ایسا دریا یا پہاڑی نالہ تھا جس کا دہانہ اوپر برفانی چوٹیاں پر تھا اور برف پگھلنے کے بعد اس میں پانی آتا ہو گا۔ اگر یہ برساتی نالہ ہوتا تو اب تک جتنی بارش ہوئی تھی اس میں سیلاب آ چکا ہوتا۔

میں غار کے دہانے پر بندھے ہوئے خچر کے پاس گیا۔ اس کو تھپکی دی۔ باہر بارش بالکل نہیں ہو رہی تھی۔ کہیں کوئی درخت نہیں تھا۔ کسی پرندے کے چہچہانے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ مجھے خود بھی تھوڑا بہت کھانا پینا تھا اور خچر کو بھی کھلانا پلانا تھا۔ یہی فیصلہ کیا کہ غار سے نکل کر آگے چلا جائے۔ ہو سکتا ہے آگے کوئی گاؤں آ جائے۔ خچر کھول کر میں اس پر بیٹھ گیا۔ اسے آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے غار سے باہر نکالا اور جس پہاڑی راستے سے میں اوپر جا رہا تھا اسی راستے پر روانہ ہو گیا۔ بارش کے بعد ٹھنڈ زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ بات بڑی غنیمت تھی کہ ہوا تیز نہیں چل رہی تھی۔

یہ ساری چڑھائی ہی چڑھائی تھی۔ آس پاس بھی بڑی چٹانوں کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ میرا خچر ان پتھروں کے درمیان سے ہو کر قدم قدم چل رہا تھا۔ یہ اس علاقے کا خچر تھا اور اسے پہاڑوں پر چڑھنے کی بڑی مہارت تھی۔ میں کسی ایک پہاڑ کی چڑھائی نہیں چڑھ رہا تھا۔ بلکہ یہ بہت سے پہاڑوں کی ڈھلانوں سے مل کر ایک وسیع و عریض ڈھلان بنی ہوئی تھی۔ اس ڈھلان میں کہیں خچر گہری کھائی میں اتر جاتا۔ کبھی چٹانوں کے درمیان بنے ہوئے تنگ راستے سے گزرتا۔ اب اوپر اور دائیں بائیں کہیں کہیں سفید برف پتھروں سے چمٹی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ کافی دیر تک چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک کشادہ جگہ آ گئی۔ یہاں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے

بکھرے ہوئے تھے۔ کشادہ جگہ سے آگے پہنچے تو نشیب میں سیڑھیوں کی طرح بنے ہوئے دو تین ہرے بھرے کھیت دیکھ کر دل کو تسکین ہوئی کہ یہاں کسی نہ کسی دیہاتی کا مکان ضرور ہو گا۔ میں نے خچر کو کھیتوں کی طرف ڈال دیا۔ یہاں بھی کھیتوں کے قریب ہی اونچائی پر ایک گھر بنا ہوا تھا۔ میں اس طرف چلنے لگا۔ خچر کی پتھروں پر ٹاپوں کی آواز سن کر مکان میں سے ایک آدمی نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا حقہ تھا۔

اس آدمی نے میری بڑی خاطر داری کی۔ روٹی کھلائی۔ میرے خچر کے آگے چارہ ڈالا۔ اور میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جس ناگ مندر میں میں جا رہا ہوں وہ ابھی اوپر کافی فاصلے پر ہے۔ اس نے کہا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے برفانی علاقہ شروع ہو جائے گا۔ اس علاقے میں ایک جگہ مجھے تین برف پوش نوکیلی چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی نظر آئیں گی۔ ناگ مندر ان چٹانوں کے پیچھے ہے۔ یہ معلومات میرے لئے کافی تھیں۔ اس دیہاتی نے مجھے چار روٹیوں پر اچار ڈال کر ساتھ دے دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سفر پر چل پڑا۔

دیہاتی نے سورج غروب ہونے سے پہلے برفانی پہاڑیوں کے شروع ہو جانے کا کہا تھا۔ مگر دوپہر کے بعد ہی برف پوش ٹیلوں اور چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے تک میں برف پوش پہاڑیوں میں داخل ہو چکا تھا۔ اب میرا خچر برف پر چل رہا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کی وجہ سے سورج دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن دن کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ سفر اب اس طرح کٹ رہا تھا کہ کہیں چڑھائی آ جاتی اور کہیں برف پوش چٹانوں کے درمیان تھوڑی سی اترائی آ جاتی۔ دور اوپر کسی وقت پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں بھی نظر آ جاتی تھیں۔ میرے چاروں طرف اب برف ہی برف تھی۔ یہ برف نرم نہیں تھی۔ جمی ہوئی تھی جس کی وجہ سے خچر سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہا تھا۔ یہاں اتنی سردی نہیں محسوس ہو رہی تھی جتنی سردی نیچے تھی۔

جس وقت میں ایک برف پوش پہاڑی درے میں سے گزر کر دوسری طرف آیا شام کا ہلکاہلکا سرمئی اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ میں نے برفانی ٹیلوں کا جائزہ لیا تو مجھے اوپر ایک جانب تین برف پوش چٹانیں دکھائی دیں۔ یہ چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ یہی وہ چٹانیں تھیں جن کی دوسری طرف پجاری راج گرو کا مندر تھا۔ مجھے وہیں جانا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے رات کا اندھیرا ہو جائے گا اور راستہ تلاش کرنے میں دشواری ہو گی۔ میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ میں کسی جگہ رک کر رات گزار لوں اور اگلے روز دن کی روشنی میں ان چٹانوں کی طرف چلوں۔ وہاں برف ہی برف تھی۔ رات بسر کرنے کا کوئی ٹھکانہ بظاہر نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے خچر کو ایک طرف ڈال دیا۔ خچر ایک ٹیلے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ٹیلے کی دوسری جانب پہنچ کر میں نے اوپر نگاہ ڈالی تو میں نے خچر کو وہیں روک لیا۔ سامنے ایک پہاڑی کا چبوترہ سا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ چبوترے پر لکڑی کا چھوٹا سا ڈبہ نما کیبن بنا ہوا تھا۔ قدرت نے مجھے رات گزارنے کے لئے بڑی اچھی جگہ عنایت کر دی تھی۔ میں خچر کو لے کر پہاڑی چبوترے کی طرف چلنے لگا۔ یہاں بڑے بڑے پتھر راستہ روک رہے تھے۔ میں خچر سے اتر پڑا۔ اس کی باگ تھام کر پیدل چل پڑا۔ تھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد میں چبوترے کے سامنے آگیا۔ چبوترے پر اور لکڑی کے کیبن کی چھت پر برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ دو تین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ سیڑھیاں بھی برف پوش تھیں۔ میں نے خچر کو وہیں چھوڑا اور سیڑھیاں چڑھ کر لکڑی کے کیبن کا جائزہ لیا۔ خدا جانے یہ کیبن کس نے اور کس مقصد کے لئے یہاں بنایا تھا۔ کیبن کا لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ دروازے کے آگے چھوٹا سا برآمدہ تھا جس کے اوپر کیبن کی ڈھلانی چھت دو تین ستون پر کھڑی تھی۔

دروازے پر کوئی تالا نہیں پڑا تھا۔ شام کا اندھیرا رات کے اندھیرے میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا۔ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ فرش لکڑی کا تھا جس پر ایک طرف سوکھی گھاس کا ڈھیر پڑا تھا۔

لکڑی کی ایک بڑی چوکی تھی۔ چوکی پر لکڑی کا گول تھال رکھا تھا۔ اس تھال میں مٹی کا ایک دیا سلائی کا بکس پڑا تھا۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ جس دیہاتی نے مجھے دو روٹیاں دی تھیں اس نے مجھے ایک تام چینی کا پیالہ بھی دیا تھا کہ اگر پیاس لگے تو اس میں پانی ڈال کر پی لوں۔

سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ سوکھی گھاس کا گٹھا سا بنا کر باہر لے آیا اور خچر کے آگے ڈال دیا۔ خچر بڑے مزے سے گھاس کھانے لگا۔ کیبن میں آ کر میں نے چراغ روشن کر دیا وہاں پینے کا پانی کہیں نہیں تھا۔ میں نے ایک جگہ سے تھوڑی سی برف توڑ کر تام چینی کے پیالے میں ڈالی اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے چراغ کی لو پر گرم کرنے لگا۔ دو منٹ کے بعد برف پگھل کر پانی بن گئی۔ میں نے پیالہ جلتے ہوئے دیئے کے پاس ہی رکھ دیااور روٹی نکال کر کھانے لگا۔ پانی کے جلدی جلدی تین چار گھونٹ پئے۔ کیونکہ پانی سردی کی وجہ سے دوبارہ جمنے لگا تھا۔ روٹی کھانے کے بعد میں باہر آگیا۔ خچر ساری گھاس کھا گیا تھااور اب برف پر منہ مار رہا تھا۔ شاید وہ اپنی گرم زبان اور سانس کی گرمی سے برف میں سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔ میں اسے چبوترے پر لے آیا اور برآمدے میں ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ خود کیبن میں آکر سوکھے گھاس کے ڈھیر میں گھس کر سمٹ سمٹا کر بیٹھ گیا۔ گھاس نے مجھے گرم کردیا۔ میں نے دیا بجھا دیا اور وہیں گھاس پر اکٹھا ہو کر سو گیا۔

کچھ معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کچھ ایسا خیال آ رہا تھا کہ خچر نے زور سے برآمدے کے فرش پر پاؤں مارے تھے۔ میں نے کان لگا دیئے۔ خچر نے ایک بار پھر فرش پر پاؤں مارے۔ میں آہستہ سے اٹھا اور بند دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ باہر سفید برف کی وجہ سے رات اتنی اندھیری نہیں تھی جتنی میدانی علاقوں میں ہوتی ہے۔ میں نے ایک انسانی سایہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر ڈھلان کی طرف جاتے دیکھا۔ پہلے تو مجھے خوف محسوس ہوا کہ یہ کوئی ڈاکو یا قاتل قسم کا آدمی نہ ہو۔ پھر خیال آیا کہ اگر وہ ڈاکو یا قاتل ہوتا تو مجھے مار ڈالتا

اور میرا خچر کھول کر لے جاتا۔ لیکن اس نے دونوں میں سے ایک بھی کام نہیں کیا تھا سایہ جو مجھے نظر آیا تھا وہ بالکل انسان کی طرح تھا۔ پھر یہ کون تھا اور برآمدے میں کر غرض سے آیا تھا؟

پہلے تو میں نے سوچا کہ اس کا پیچھا کروں اور معلوم کروں کہ یہ کون تھا پھر سوچ کر وہیں کھڑا رہا کہ خوانخواہ مجھے کسی مصیبت میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے سے ہی میں جس مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں میرے لئے کافی ہے۔ میں نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور خشک گھاس کی ڈھیری میں آ کر گھس گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کچھ تجسس اور کچھ خوف کے مارے اب مجھے نیند نہیں آ رہی تھی میرا ذہن بار بار اس انسانی سائے کی طرف جاتا جو مجھے برآمدے سے اتر کر نشیب میں جاتا دکھائی دیا تھا۔ آخر یہ کون تھا؟ ضرور کوئی بھوت پریت ہو گا۔

یہی سوچتے سوچتے میں اونگھنے لگا۔ مجھے شروع ہی سے اونگھنا پسند نہیں رہا۔ مجھے بیداری اچھی لگتی ہے یا نیند اچھی لگتی ہے۔ لیکن اونگھنا جو بیداری اور نیند کی درمیانی حالت ہے سخت بری لگتی ہے۔ اس حالت میں ایک تو آدمی کو اپنے اوپر کنٹرول نہیں رہتا دوسرے گردن انتہائی بے بسی کے عالم میں کبھی ادھر کو گرنے لگتی ہے کبھی ادھر اپنے آپ جھک جاتی ہے۔ اونگھنے کی حالت میں انسان عجیب عجیب مضحکہ خیز شکلیں بنا ہے میں اونگھنے کی بجائے گھاس پر دراز ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں تاکہ سو جاؤں او اونگھنے کی کیفیت سے نجات ملے۔ نیند مجھے اپنی آغوش میں لینے ہی والی تھی کہ برآمدے میں میرے خچر نے زور زور سے پاؤں مارے۔ اس کے شور سے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جلدی سے دروازہ کھول کر دیکھا۔ خچر اب اطمینان سے کھڑا تھا۔ ایک آدھ منٹ میں دروازے میں کھڑا سفیدی مائل برفانی رات کے اندھیرے میں جائزہ لیتا رہا اس دفعہ مجھے وہ انسانی سایہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دروازہ بند کر کے گھاس کی ڈھیری آ کر بیٹھ گیا۔ اب نیند بالکل غائب تھی۔ یہ جگہ مجھے کچھ پراسرار اور آسیبی لگنے لگ تھی۔ دیا بجھا ہوا تھا۔ کیبن میں اندھیرا تھا۔ میں گھاس کی ڈھیری میں گھس کر خاموش

بیٹھا تھا۔

اچانک مجھے شوں شوں کی دو آوازیں سنائی دیں۔ خوف کے مارے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

اس سنسان برفانی پہاڑیوں میں رات کے سناٹے میں یہ آواز ایسی خوفناک لگی کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ باہر جا کر معلوم کروں کہ یہ آواز کس چیز کی ہے۔ جب تھوڑے وقفے کے بعد ایک بار پھر وہی آواز سنائی دی تو مجھے شک پڑا کہ باہر کوئی جنگلی ریچھ خچر کو کھانے نہ آگیا ہو اور یہ اس کی آواز نہ ہو۔ میں آہستہ سے اٹھا اور دروازہ کھول کر برآمدے میں نظر ڈالی۔

برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ خچر سر جھکائے ایک جگہ ایسی حالت میں کھڑا تھا جیسے کھڑے کھڑے سو گیا ہو۔ میں ہمت کر کے خچر کے پاس آگیا۔ خچر میری بو پا کر ذرا سا خرخرایا اور پھر اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ خچر زندہ تھا۔ وہاں کوئی جنگلی درندہ وغیرہ بھی نظر نہ آیا۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ میرے ہاتھ ٹھٹھرنے لگے۔ پھر بھی میں برآمدے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھوں کہیں درندہ مجھے دیکھ کر ادھر ادھر نہ ہو گیا ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ شاید خچر نے ہی شوں شوں کی تھی۔ میں واپس کیبن میں آ کر گھاس پر لیٹ گیا۔ خشک گھاس اس برفانی رات میں میرے لئے بستر سنجاب و سمور سے کم ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے جب مجھے اونگھ آئی تو میں نے اونگھ سے بچنے کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ سب خیریت ہے اب مجھے سو جانا چاہئے۔ چنانچہ میں سو گیا۔

آخر رات گزر ہی گئی۔

دن نکل آیا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو گئی۔ سورج ابھی تک بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ یہی بڑی غنیمت تھی کہ بارش رکی ہوئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں پہاڑوں میں جس بلندی پر پہنچ گیا ہوں وہاں اب بارش نہیں ہو گی بلکہ برف گرے گی۔ میں نے جلدی جلدی رات کی بچی ہوئی روٹی کھائی۔ پیالے میں تھوڑی سی برف ڈال کر اسے چراغ کی لو کے اوپر رکھ کر اس کا پانی بنایا اور پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔ کیبن سے گھاس لا کر میں نے خچر کے آگے ڈال دی تھی جسے وہ بڑے مزے سے کھا رہا تھا۔ جب خچر میری طرح تازہ دم ہو گیا تو ہم دونوں نے اوپر کی جانب اپنا سفر شروع کر دیا۔ دو پہاڑیوں کی ڈھلانیں جہاں آکر ملتی تھیں وہاں برف پر ایک قدرتی پگ ڈنڈی بن گئی تھی۔ خچر اسی پگ ڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ میں خچر پر بیٹھا تھا اور میری نگاہیں اوپر ان تین برف پوش چٹانوں پر لگی تھیں جہاں مجھے پہنچنا تھا۔ پہاڑیوں میں برفانی راستوں پر سفر کرتے ہوئے کبھی یہ چٹانیں میری نظروں سے اوجھل ہو جاتیں اور کبھی اچانک سامنے آ جاتی تھیں۔ اسی طرح سفر کرتے کرتے آخر میں اس پگ ڈنڈی پر آگیا جو سیدھی اوپر چٹانوں کی طرف جاتی تھی۔

میں نے اپنے دل میں سوچ لیا تھا کہ مجھے اوپر راج گرو کے پاس جا کر کیا کرنا ہو گا اور اسے کیا کہنا ہو گا۔ یہ حقیقت میرے پیش نظر تھی کہ اگر وہاں پر پاروتی موجود ہو گی تو راج گرو نے اپنے خاص منتر کی مدد سے اس کی یادداشت گم کر کے اسے اپنے قبضے میں کر رکھا ہو گا اور وہ مجھے دیکھ کر بھی نہیں پہچان سکے گی کہ میں اس کا ساتھی اور دوست ہوں۔ خچر آہستہ آہستہ برفانی پگ ڈنڈی کی چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ تینوں چٹانیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ جب خچر اور میں ان چٹانوں کے نیچے پہنچ گئے تو میں خچر سے اتر پڑا۔ اس کی باگ تھام لی اور برف پر احتیاط سے چلتا ہوا چٹانوں کے پیچھے آیا تو سامنے ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا جس کی مخروطی چھت کے اوپر پیتل کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ یہ کوئی مندر ہے۔ یہ مکان نما مندر بھی پتھروں کے ایک چبوترے پر بنا ہوا تھا اور اس کے آگے بھی چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ آدمی کوئی نہیں

تھا۔

ایک بات میرے حق میں بڑی اچھی ہوئی تھی کہ دیوداسی رکمنی والے مندر میں پجاری راج گرو نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس کو یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ ایک نوجوان ناگن عورت کی لاش کے ٹکڑے لے کر مندر میں آیا ہے جس نے لاش کے ٹکڑے ڈبے میں ڈال کر تالاب میں لٹکا رکھے ہیں لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ نوجوان میں ہوں۔ بقول دیوداسی رکمنی کے راج گرو نے اپنے گیان دھیان سے میرے بارے میں پتہ چلا لیا تھا اور وہ آدھی رات کے وقت وہاں پہنچا تھا اور پجاری سے مل کر پاروتی کی ناگن لاش والا ڈبہ تالاب سے نکال کر اسی رات منہ اندھیرے وہاں سے واپس روانہ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بے دھڑک ہو کر اوپر چلا جا رہا تھا کہ اگر راج گرو نے مجھے دیکھ بھی لیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ میں ہی وہ نوجوان ہوں جو ناگن عورت کے ٹکڑے لے کر کیلاش پربت پر آیا ہوا تھا۔ جہاں تک پاروتی کا سوال تھا تو اس کی یادداشت راج گرو نے منتر پڑھ کر ضرور غائب کر دی ہو گی۔ دوسری صورت میں وہ اس کے قابو میں آ ہی نہیں سکتی تھی اور یادداشت گم ہو جانے کی وجہ سے پاروتی کے لئے بھی میں اجنبی ہی ہوں گا۔ میں نے خچر کو ایک طرف چھوڑ دیا اور خود چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر راج گرو کے مندر کے برآمدے میں آ گیا۔ سامنے صحن میں پتھر کے سانپوں کے دو مجسمے بنے ہوئے تھے جن پر برف جمی ہوئی تھی۔

مندر کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ تین چار بار دستک دینے سے ایک عورت نے دروازہ کھول کر مجھے گھور کر دیکھا۔

"کون ہو؟ کیا کام ہے؟"

یہ عورت تبت کی لگتی تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور نتھنے کشادہ تھے۔ درمیانی عمر کی عورت تھی۔ اس نے گرم لہنگا اور اونی چغہ پہنا ہوا تھا۔ وہ اردو ٹھیک ٹھاک بول رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"راج گرو کے درشن کرنے بڑی دور سے چل کر آیا ہوں۔ میرا نام بھیکو ہے۔"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ سردی بہت تھی مگر مجبور تھا۔ عورت مجھے کچھ کہے بغیر دروازہ بند کر کے چلی گئی تھی۔ مگر اس کی شکل سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اندر سے کسی کو بلانے گئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسی عورت نے دوبارہ دروازہ کھولا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اندر ایک نیم روشن ڈیوڑھی تھی۔ آگے ایک دالان تھا جس کے فرش پر چھت نہ ہونے کی وجہ سے برف جمی ہوئی تھی۔ سامنے ستونوں والا پرانی ٹائپ کا والان تھا۔ عورت والان کے کونے والے کمرے یا کوٹھڑی کے دروازے پر جا کر رک گئی۔ اس نے دروازے کے باہر لٹکی ہوئی تانبے کی چھوٹی سی گھنٹی کو ہاتھ سے بجایا۔ اندر سے کسی کی بھاری مگر کرخت آواز آئی۔

"دروازہ کھلا ہے۔"

میں اس عورت کے ساتھ اندر داخل ہوا تو سامنے تخت پوش پر ایک موٹا بھاری بھرکم آدمی اونی چغہ اونی ٹوپی اور اونی لہنگا پہنے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے برفانی بھالو لگا۔ کمرے میں مٹی کے تیل کا بڑا لیمپ روشن تھا۔ دیواروں پر سانپوں کے بت بنے ہوئے تھے۔ جس تخت پر وہ بھالو نما انسان بیٹھا تھا اس کے پیچھے بھی دیوار پر پتھر کا ایک سیاہ سانپ پھن کھولے ہوئے تھا۔

میں نے جاتے ہی ہندوؤں کے طریقے سے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ وہ آدمی جو یقیناً پجاری راج گرو ہی تھا میری طرف اپنی زرد چمکیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"بھیکو مہاراج!"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"مہاراج! دھنبار کا رہنے والا ہوں۔ وہاں ایک ناگ مندر میں آپ کی بڑی تعریف سنی اور من میں چاہ پیدا ہوئی کہ جا کر آپ کے چرن چھوؤں اور آپ کی

خدمت کروں۔"

وہ سگار کا کش لگا کر بولا۔

"جاؤ جاؤ۔ یہاں تمہارے واسطے کوئی جگہ نہیں ہے۔ دفع ہو جاؤ۔ یہاں سے..... کانچی اسے یہاں سے نکال دو۔"

کانچی اس تبتی عورت کا نام تھا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف چلی۔ میرے ساتھ وہ بھی راج گرو کے کمرے سے باہر آ گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور میرے آگے آگے برآمدے میں چلنے لگی۔ میں اس کے پیچھے چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے کونسی ترکیب لڑانی چاہئے۔ اس پجاری راج گرو نے تو مجھے مندر میں گھسنے نہیں دیا۔ برآمدے کے آگے صحن تھا۔ صحن کے برفانی فرش پر چلتے ہوئے کانچی مکان یا مندر کی ڈیوڑھی میں آئی تو میں نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! میں راج گرو جی کی سیوا کرنے یہاں آیا تھا۔ اگر اس کی سیوا کئے بغیر مر گیا تو میری روح کو چین نہیں مل سکے گا۔"

کانچی نے ڈیوڑھی کے دروازے کو کھولنے کے بعد میری طرف دیکھا اور سر سے اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ میں باہر نکل جاؤں۔ میں اس تبتی عورت کا دل موم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔

"کانچی جی! ذرا سوچو ان برفانی پہاڑوں میں میں کہاں جاؤں گا۔ یہاں تو باہر سردی سے ٹھٹھر کر مرجاؤں گا۔"

جب میں نے دیکھا کہ کانچی کے چہرے پر میرے ساتھ ہمدردی کے تاثرات نمایاں ہو رہے ہیں تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"دیوی کانچی! بھگوان کیلئے میری مدد کرو۔ میں مندر میں بیٹھ کر ناگ دیوتا کی بھی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔"

تبتی عورت کے دل میں میرے بارے میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

میں جلدی سے دروازے کے ایک طرف ہو گیا۔ کانچی واپس چلی گئی۔ شاید وہ راج گرو کو یہ کہنے گئی تھی کہ مجھے ایک کام یاد آ گیا ہے تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔ یا خدا جانے کیا کرنے گئی تھی۔ بہرحال اس نے میری مدد کرنے کی حامی بھرلی تھی۔ واپس آئی تو یہ کہہ کر میرے آگے چل پڑی۔ "میرے ساتھ آ جاؤ۔" اس مندر کے بازو میں تیسری چٹان کے عقب میں ٹیلوں کی برفوں کے درمیان ایک راستہ جاتا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اس راستے پر آ گئی۔ آگے جا کر ٹیلے کے دامن میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس کی ڈھلواں چھت برف میں چھپی ہوئی تھی۔ کانچی دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ میں باہر کھڑا رہا۔ کانچی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"وہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو؟ اندر کیوں نہیں آتے؟"

میں جلدی سے اندر چلا گیا۔ یہاں بھی فرش لکڑی کا تھا۔ جس پر خشک گھاس کا بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا آتشدان تھا۔ کانچی نے دروازہ بند کرنے کے بعد مٹی کے تیل والا لیمپ روشن کر دیا۔ کہنے لگی۔

"مجھے تم پر ترس آ گیا ہے عیکو۔ تم یہاں رہ لینا۔ میں کسی طرح راج گرو پجاری کو منا لوں گی کہ تمہیں مندر میں نوکر رکھ لے۔"

میں نے کانچی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

"کانچی جی! تم دیوی ہو....."

وہ بولی۔

"لیکن اس جگہ سے باہر مت جانا۔ بہت ہی ضرورت پڑے تو پیچھے گھاٹی میں چلے جانا مگر اس وقت تک مندر کی طرف مت آنا۔ جب تک کہ میں پجاری راج گرو سے تمہاری نوکری کی بات پکی نہیں کر لیتی۔"

میں بغلوں میں ہاتھ دیئے خشک گھاس پر بیٹھا تھا۔

"تمہیں کھانے پینے کو میں یہاں دے جایا کروں گی۔"

میں نے کہا۔ "میرے خچر کا کیا بنے گا؟ وہ مندر کے باہر تھا۔ تم نے اسے ضرور دیکھا ہو گا۔"

کانچی کہنے لگی۔

"نیچے مندر کا ایک اصطبل ہے جہاں مندر کی گائے اور پجاری کے خچر بندھے رہتے ہیں۔ میں تمہارا خچر بھی وہیں لے جاؤں گی۔"

کانچی ساتھ والے کمرے میں گئی اور وہاں سے ایک بڑا لحاف نکال کر لے آئی۔ لحاف گھاس کے بستر پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ دروازہ بند کرنے سے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں دن کے وقت آتی ہوں تو لیمپ جلا لیتی ہوں۔ اوپر صرف روشندان ہے۔ ساتھ والے کمرے میں غسل خانہ بھی ہے۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

میں کانچی کے اس فیاضانہ سلوک پر خوش بھی ہوا اور حیران بھی ہو رہا تھا کہ آخر وہ مجھ پر اچانک اتنی مہربان کیوں ہو گئی ہے۔ شاید اسے مجھ پر ترس آ گیا تھا کہ میں اتنی دور سے وہاں گیان دھیان کرنے آیا ہوں اور پجاری نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ کانچی کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ وہ اندر سے پجاری راج گرو کے خلاف ہے اور اسے پسند نہیں کرتی۔ مجھے نہ تو وہاں کوئی گیان دھیان کرنا تھا اور نہ نوکری چاکری کرنی تھی میں تو وہاں پاروتی کی تلاش میں آیا تھا اور مجھے کچھ دیر وہاں رہ کر پاروتی کا سراغ لگانا تھا۔ میرا یہ مسئلہ کانچی نے حل کر دیا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے اصرار کے ساتھ کہا کہ جس طرح بھی ہو وہ مجھے راج گرو کی اجازت سے مندر میں کوئی کام دلا دے۔ کانچی نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور کوشش کرے گی۔ مکان سے جاتے ہوئے کانچی مجھے کہہ گئی کہ میں وہاں سے باہر کہیں نہ جاؤں اور جب تک وہ واپس نہیں آ جاتی میں کمرے میں ہی رہوں۔ اس نے آتشدان میں دو چار موٹی لکڑیاں جلا دی تھیں۔ کانچی کے جانے کے بعد میں آتشدان کے قریب ہو کر گھٹنوں پر لحاف ڈال کر بیٹھ گیا۔ جیب سے پاروتی کا رومال نکال کر اسے دیکھا۔ سونگھا۔ مجھے تو اس میں سے پاروتی سانپ کی کوئی بو نہیں آ

رہی تھی۔ لیکن میں انسان تھا۔ اس بو کو صرف سانپ ہی محسوس کر سکتے تھے۔ رومال کو تہہ کر کے میں نے جیب میں رکھ لیا۔

شام ہو گئی۔ میں کمرے میں ہی رہا۔ جب باہر اندھیرا ہونے لگا تو کانچی آ گئی۔ مندر میں وہ راج گرو اور دو تین پجاریوں کے لئے کھانا وغیرہ بھی بناتی تھی۔ آتی دفعہ وہ میرے لئے چاول رومال میں ڈال کر لے آئی۔ یہ نمکین چاول تھے۔ وہ آتشدان میں لکڑیاں ڈال کر آگ تیز کرنے لگی۔ میں چاول کھانے لگا۔ پھر دوسرے کمرے میں گئی اور میرے لئے قہوہ بنا کر لے آئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ راج گرو سے اس نے میرے بارے میں کوئی بات تو نہیں کی۔ کہنے لگی۔

"آج موقع نہیں ملا۔ کل ضرور کروں گی۔ ویسے بھی تمہارا مندر میں نوکر بن کر رہنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر تم میرے ہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکو گے۔ سب کو پتہ چل جائے گا۔"

اس نے بتایا کہ پجاری راج گرو نے ہر قسم کے سانپ پال رکھے ہیں جن کی وہ پوجا کرتا ہے۔

"اس نے مجھے بھی ایک سانپ دیا تھا۔ میں تمہیں وہ دکھاتی ہوں۔ یہ سانپ شیش ناگ دیوتا کی پیڑھی سے ہے۔"

کونے میں ایک مٹی کا بڑا سا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ وہ مٹکے میں سے ایک چھوٹی پٹاری نکال کر لے آئی۔ پٹاری سامنے رکھ کر اسے کھولا تو اس میں سے سنہری رنگ کا ایک بالشت بھر کا سانپ پھنکارتا ہوا باہر نکل آیا۔ کانچی نے سانپ کو پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

"یہ بڑا زہریلا سانپ ہے۔ پجاری کہتا ہے اس میں ایک ہزار سانپوں کا زہر ہے....."

اس دوران ایک عجیب بات ہوئی۔ یہ میرے لئے عجیب نہیں تھی مگر کانچی کے لئے بڑی حیران کر دینے والی بات تھی۔ سنہری سانپ نے اپنا چھوٹا سا پھن کھول کر میری طرف دیکھا۔ پھر کانچی کی کلائی سے اتر کر میرے قریب آیا اور کنڈلی مار کر سامنے

بیٹھ گیا اور اپنا پھن جھکا دیا۔

کانچی حیرت زدہ سی ہو کر کبھی مجھے اور کبھی سانپ کو دیکھتی۔ اس نے ساری زندگی ناگ مندر میں گزاری تھی۔ سمجھ گئی کہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مجھ پر جماتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟ مجھے بتا دو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

مجھے اس عورت سے پاروتی کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ قدرت نے اس عورت کا اعتماد حاصل کرنے کا ایک موقع دے دیا تھا۔ میں نے اسے یہ تو نہ بتایا کہ میرے پاس پاروتی ناگن کا رومال ہے جس کی بو کی وجہ سے سنہری سانپ میرے آگے جھک گیا ہے۔ میں نے پُر اعتماد لہجہ میں کہا۔

"کانچی! اب جبکہ میری طاقت کا راز تم پر اس سانپ نے کھول دیا ہے تو میں تمہیں اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں شیش ناگ کا اوتار ہوں۔ سانپ میری تعظیم کرتے ہیں۔"

سنہری سانپ ابھی تک اپنا پھن میرے آگے جھکائے بیٹھا تھا۔ میں تو ڈر کے مارے اسے ہاتھ نہیں لگا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہنے لگی۔

"مہاراج! آپ شیش ناگ دیوتا کے اوتار ہیں تو آپ کو یہاں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا۔ "کانچی! یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ دو لفظوں میں بات کروں گا۔ میں اپنی ایک دیوداسی ناگن کے ساتھ پرلوک سے دھرتی پر سیر کرنے آیا تھا۔ دیوداسی ناگن سانپ کے روپ میں میرے ساتھ تھی۔ گورکھپور شہر میں اچانک وہ میری کلائی سے اتر کر باغ میں پھرنے لگی ایک آدمی نے اسے دیکھا تو لاٹھی مار کر اسے ہلاک کر دیا۔ مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ میں نے ناگن کی لاش کے ٹکڑوں کو ڈبے میں بند کیا اور کیلاش پربت لے آیا۔ کیونکہ لاش کے ٹکڑوں والے ڈبے کو کیلاش پربت کے تالاب میں دس روز لٹکائے رکھنے کے بعد دیوداسی ناگن کو پھر سے زندہ ہو جانا تھا۔ میں نیچے مندر میں ڈبے

کو تالاب میں ڈبو کر دس دن تک بیٹھا رہا۔ مگر تمہارے پجاری راج گرو نے اپنی طاقت کے زور سے دیوداسی ناگن کا پتہ چلا لیا۔ بس وہ آخری رات کو مندر میں آیا اور پجاری سے مل کر دیوداسی ناگن والا ڈبہ نکال کر لے گیا۔ مجھے شیش ناگ دیوتا نے ساری بات بتا دی۔ چنانچہ اب میں اپنی دیوداسی ناگن کی تلاش میں راج گرو کے پیچھے یہاں آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دیوداسی ناگن کا سراغ لگاؤ اور پتہ کرو کہ پجاری راج گرو نے اسے یہاں کس جگہ رکھا ہوا ہے۔ میں تمہیں اس کے عوض تمہیں شیش ناگ کا سب سے اونچا منتر بتا دوں گا اور تم سب سے بڑی پجارن بن جاؤ گی۔"

کانچی بڑے غور سے میری گفتگو سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسرت و انبساط کی کیفیت تھی۔ سنہری سانپ اسی طرح پھن جھکائے میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"سانپ کو پٹاری میں بند کر دو اور مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا ہے؟"

کانچی نے سانپ پٹاری میں بند کر دیا اور میرے پاؤں کو چھو کر بولی۔

"مہاراج! میں آج سے آپ کی داسی ہوں آپ جو کہیں گے میں ویسے ہی کروں گی۔ مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ راج گرو۔ نیچے مندر میں کسی خاص چیز کی تلاش میں گیا تھا اور جب وہ واپس آیا تو بڑا خوش تھا اور اسی روز وہ اپنی گپھاہ میں چلا گیا تھا۔"

"اس کی گپھاہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

کانچی نے کہا۔ "یہ مندر میں کسی پجاری، کسی دیوداسی کو معلوم نہیں ہے۔ مگر میں سب معلوم کر لوں گی آپ مجھے صرف دو دن کی مہلت دے دیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ دو دن زیادہ ہیں۔ میں تمہیں کل کے دن کی مہلت دیتا ہوں۔ تمہیں ایک دن میں ساری جاسوسی کرنی ہو گی۔ کیا تمہیں منظور ہے؟"

مجھے یہ خطرہ تھا کہ راج گرو کہیں اتنی دیر میں پاروتی کو یہاں سے کسی دوسری جگہ نہ پہنچا دے۔ کانچی کو میری وجہ سے سب سے بڑی پجارن بننے کا موقع مل رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"جو حکم مہاراج! میں کل تک ساری باتیں معلوم کر لوں گی۔"

رات گزر گئی۔ دوسرے روز کانچی نے جاتے ہوئے بڑے ادب سے میرے پاؤں چھوئے اور کہا۔

"مہاراج! میں جاتی ہوں۔"

کانچی چلی گئی۔ اس بات کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کانچی اس مکار پجاری راج گرو کی بڑی چہیتی دیوداسی ہے اور وہ اس کے دل کا راز معلوم کر لے گی۔ صبح کی گئی کانچی دوپہر کو بھی نہ آئی۔ شام ہو گئی۔ پھر رات کا اندھیرا چھا گیا۔ اس وقت کانچی آ گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی خاص بات معلوم کر کے آئی ہے۔ آتے ہی اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ میرے پاؤں چھوئے اور سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"مہاراج! میں نے آپ کی دیوداسی ناگن کا سراغ لگا لیا ہے۔"

میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"کہاں ہے وہ؟"

کانچی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ راج گرو نے پاروتی کو اوپر برف پوش پہاڑیوں کے ایک زمیں دوز تہہ خانے میں بند کر رکھا ہے جو اس کی گپھاہ ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس عیار شخص نے پاروتی کے زندہ ہو جانے کے بعد اس پر اپنا منتر پڑھ کر اسے اپنے قبضے میں کر لیا ہوا تھا اور یہ بات بھی یقینی تھی کہ پاروتی کی یادداشت گم ہو چکی ہو گی۔ کانچی کہنے لگی۔

"اس بات کا سوائے راج گرو کے اور کسی کو علم نہیں ہے۔ میں ہی جانتی ہوں کہ میں نے یہ راز راج گرو سے کیسے اگلوایا ہے۔"

میں نے کانچی سے کہا۔

"شاباش! تب تم یہ معلوم کرو کہ راج گرو کی گپھاہ پہاڑوں میں کس جگہ پر ہے۔"

کانچی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! میں یہ بھی معلوم کر آئی ہوں۔"

میں نے کانچی کی ذہانت کی تعریف کی اور کہا۔

"اب مجھے اس گپھاہ تک لے چلو۔ جب میں دیوداسی ناگن کو دیکھ لوں گا تو تمہیں وہ خاص منتر بتا دوں گا جس کو سیکھنے کے بعد تم سب پجاری اور پجارنوں کی رانی بن جاؤ گی۔"

دوسرے دن جب رات آدھی گزر چکی تھی تو کانچی اور میں دو خچروں پر سوار اس گپھاہ کی طرف جا رہے تھے جس کے تہہ خانے میں پاروتی موجود تھی۔

ہم برف پوش پہاڑیوں میں چلے جا رہے تھے۔

کانچی خچر پر سوار میرے آگے آگے تھی۔ میرا خچر اس کے پیچھے تھا۔ پتھریلی پگ ڈنڈی پر برف جمی ہوئی تھی اگرچہ آدھی رات کا وقت تھا مگر اندھیرے میں برف کی سفیدی صاف نظر آ رہی تھی۔ ہوا نہیں چل رہی تھی اس وجہ سے سردی ناقابل برداشت نہیں تھی۔ ہمالیہ کے برفانی پہاڑوں میں جب تیز ہوا چلتی ہے تو سردی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ ہم کوئی ایک گھنٹہ خچروں پر بیٹھے سفر کرتے رہے۔ اس دوران ہم کئی برف پوش ٹیلوں اور گھاٹیوں میں سے گزرے آخر اس مقام پر پہنچ گئے جہاں بڑی بڑی برف پوش چٹانیں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ ان کے درمیان ایک گلی سی بن گئی تھی۔ یہاں آ کر کانچی نے خچر روکا اور نیچے اتر آئی - اس نے مجھے بھی خچر سے اترنے کا اشارہ کیا۔

خچروں کو چٹان کی دیوار کے پاس لے جا کر ایک پتھر سے باندھ دیا۔ میں سامنے والی چٹان کے نیچے کھڑا تھا۔ کانچی میرے پاس آئی اور آہستہ سے بولی۔

"ہم راج گرو پجاری کے تہہ خانے کے قریب آ گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ تہہ خانہ کہاں ہے؟؟"

اس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"جہاں یہ سامنے والی چٹان ختم ہوتی ہے وہاں چٹان کے اندر ایک شگاف ہے اس

شگاف میں سے ایک راستہ نیچے پجاری کی تہہ خانے والی گپھاہ کو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے مہاراج! آپ کی ناگن دیوداسی وہاں موجود ہو گی۔...."

میں نے کانچی سے کہا۔

"تم خچروں کے پاس میرا انتظار کرو میں پہلے خود تہہ خانے میں جاتا ہوں۔"

کانچی خچروں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ میں چٹان کے ساتھ ساتھ ہو کر آگے چلنے لگا۔ برفانی راستہ اونچے نیچے پتھروں کی وجہ سے غیر ہموار تھا۔ میں سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا چٹان جہاں ختم ہوئی وہاں کانچی کے بتانے کے مطابق اندر کی جانب ایک گہرا شگاف بنا ہوا تھا۔ میں جھک کر اس کے اندر چلا گیا اندھیرے میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے دیواروں کو ہاتھوں سے ٹٹولا۔ ایک جگہ چٹان کے شگاف کی دیوار پر ٹاٹ کا بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے اوپر اٹھایا تو مجھے نیچے ہلکی ہلکی روشنی میں پتھر کا زینہ دکھائی دیا۔ یہ روشنی کسی چراغ کی تھی جو نیچے تہہ خانے میں روشن تھا۔ اس کی روشنی زینے پر پڑ رہی تھی۔

میں دبے پاؤں زینہ اترنے لگا۔ چھ سات سیڑھیاں ہوں گی۔ آخری سیڑھی کے قریب پہنچا تو ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے کوئی عورت دھیمی آواز میں منتر پڑھ رہی ہو۔ میں زینے کی دیوار کے ساتھ لگ کر آخری سیڑھی پر آ گیا اور گردن آگے کر کے دیکھنے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا تہہ خانہ تھا۔ سامنے والی دیوار پر سانپ کا بت بنا ہوا تھا۔ اس کے آگے چوکور پتھر پر پیتل کی تھالی میں دو چراغ جل رہے تھے - ان کے پاس ایک عورت بیٹھی دونوں ہاتھ زانوؤں پر رکھے کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے بال کمر تک کھلے تھے۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے پاروتی کے بال فوراً پہچان لئے۔ یہ پاروتی ہی تھی۔ میں زینے سے ہٹ کر تہہ خانے کے فرش پر دو قدم چلا ہوں گا کہ پاروتی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس نے بڑے غصے سے پوچھا۔

"کون ہو؟ یہاں کیوں آئے ہو؟"

افسوس ..... اس مکار راج گرو پجاری نے پاروتی پر منتر پڑھ کر اس کی یادداشت

معطل کر دی تھی۔ پاروتی میری طرف دیکھ رہی تھی اور مجھے بالکل نہیں پہچان رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے کہا۔

"پاروتی! میں ہوں۔ تمہارا پرانا ساتھی کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟؟"

پاروتی غصیلی نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر اس نے دیوار کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر ایک سانپ باہر نکال لیا اور بولی۔

"اگر تم یہاں سے باہر نہ گئے تو میں سانپ سے ڈسوا دوں گی۔ یہ اتنا زہریلا سانپ ہے کہ تم کھڑے کھڑے پگھل جاؤ گے۔"

پاروتی کا رومال میرے پاس تھا۔ میں نے رومال جیب سے نکال لیا اور کہا۔

"پاروتی! یہ دیکھو۔ یہ وہ رومال ہے جس میں میں تمہاری لاش کے ٹکڑے ڈال کر کیلاش پربت کے تالاب پر لایا تھا۔ اس میں تمہارے جسم کی بو ہے۔ تم بے شک سانپ مجھ پر پھینک دو۔"

میں پاروتی کی طرف بڑھا تو اس نے سانپ مجھ پر پھینک دیا۔ سانپ میرے سینے سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ میں نے رومال اس کی طرف کر دیا۔ سانپ اسی وقت کنڈلی مار کر ادب سے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"یہ دیکھو۔ یہ تمہارے جسم کی بو کا کرشمہ ہے کہ سانپ نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ تم پاروتی ہو۔ راج گرو نے تم پر جادو کر کے تمہاری یادداشت غائب کر دی ہے۔"

مگر پاروتی پر میری کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں اس کے لئے بالکل اجنبی بن چکا تھا۔ اس نے سانپ کو جھک کر پکڑ لیا اور بولی۔

"تم کوئی مکار سپیرے ہو۔ یہ میرا رومال نہیں ہے۔ تم اس پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا ہے جس کی وجہ سے سانپ تمہارے آگے جھک گیا ہے۔ یہاں سے نکل جاؤ نہیں تو راج گرو پجاری تمہیں جلا کر راکھ کر دے گا۔"

میں نے سوچا پاروتی کو اس حالت میں قائل کرنے کی کوشش کرنا بیکار وقت ضائع

کرنے اور حالات کو مزید خطرناک بنانے کے مترادف ہو گا۔ مجھے کوئی دوسرا طریقہ سوچنا چاہئے۔ میں نے رومال جیب میں رکھ لیا اور پاروتی سے کہا۔

"شما کرنا دیوی جی! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں تمہیں اپنا دوست سمجھ بیٹھا تھا۔ اصل میں تمہاری شکل میری دوست پاروتی سے بہت ملتی ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں الٹے پاؤں گپھاہ سے نکل گیا۔ باہر آ کر میں نے ساری بات کانچی کو سنائی۔ وہ کہنے لگی۔

"میں جانتی تھی کہ تم راج گرو پجاری کے منتر کا توڑ نہیں کر سکو گے۔"

میں نے کہا۔ "کانچی! مجھے کوئی ترکیب بتاؤ جس سے میری دیوداسی کی یادداشت واپس آ جائے اور میں اسے لے کر یہاں سے چلا جاؤں۔"

کانچی نے کہا۔ "مہاراج! کیا آپ کے پاس ایسا کوئی منتر نہیں ہے جس سے آپ کی دیوداسی کی یادداشت واپس آ جائے؟؟"

میں نے جواب دیا۔

"اگر میرے پاس کوئی ایسا منتر ہوتا تو میں تمہیں کیوں کہتا۔"

کانچی خچروں کی رسی کھولنے لگی۔

"مہاراج! اس وقت یہاں سے چلے چلیں۔ مندر میں جا کر کچھ سوچیں گے۔ پیچھے پجاری راج گرو کو پتہ چل گیا کہ میں غائب ہوں تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔"

ہم خچروں پر سوار ہو گئے اور برفانی راستوں سے ہوتے ہوئے مندر واپس آ گئے۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ میں اس کے مکان پر ہی رہا۔ رات کو وہ میرے لئے کھانا لے کر آئی تو کچھ پریشان تھی۔ کہنے لگی۔

"راج گرو تمہاری دیوداسی کو ناگن بنا کر اپنے ساتھ ناگ پور لے جا رہا ہے جہاں وہ پاروتی کی مدد سے بڑے مندر میں جمع کیا ہوا سارا سونا نکلوا کر اپنے قبضے میں کر لے گا۔ اس طرح وہ آگے ترچناپلی کے ناگ مندر میں جا کر وہاں بھی جتنا سونا اور ہیرے جواہرات ہیں وہ اپنے قبضے میں کر لے گا۔ یہ مہاپاپ ہے۔ میں یہ پاپ نہیں ہونے دوں

گی۔"

مجھے ناگ مندر یا ترچناپلی کے مندروں کے سونے اور ہیرے جواہرات سے کو دلچسپی نہیں تھی۔ ان مندروں کے خزانے چاہے چور لے جائیں یا راج گرو لے جائے۔ میں تو صرف پاروتی کو وہاں سے کسی طرح نکال کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا تاکہ شہر میں جا کر اس کا علاج کرواؤں کہ شاید اس کی یادداشت واپس آ جائے۔ اس وقت کانچی بھی پاروتی کو وہاں سے فرار کروانے میں میری مدد کرنے پر مجبور تھی۔ اسے یہ ڈر تھا کہ اگر ان مندروں کا سارا خزانہ راج گرو نکال کر لے گیا تو دیوتا اس سے ناراض ہو کر اسے بددعا دیں گے کہ اس نے یہ معلوم ہوتے ہوئے کہ راج گرو پجاری ان مندروں کا خزانہ چرانے والا ہے اس کو روکنے کا کوئی جتن کیوں نہیں کیا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"اب تو پاروتی دیوداسی کا یہاں سے غائب کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

کانچی سخت پریشان تھی کہنے لگی۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ پجاری دولت کی ہوس میں پاگل ہو گیا ہے۔ اگر میں نے ان مندروں کی دولت کو نہ بچایا تو مجھ کو دیوتاؤں کی بددعا لگ جائے گی۔"

میرا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ میں نے کہا۔

"تو پھر پاروتی کو غائب کرنے کی کوئی ترکیب سوچو۔ اس کو ہوش میں ہم نکال نہیں لے جا سکتے۔ اسے کسی طرح بے ہوش کرنا پڑے گا اور یہ کام تم کر سکتی ہو۔"

کانچی کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

"نالنگا دیوداسی پاروتی کے لئے رات کا کھانا لے کر جاتی ہے۔ وہ میری سہیلی ہے میں اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اس سے کیا ہو گا؟"

کانچی بولی۔ "میں اس کے ساتھ مل کر پاروتی کے کھانے میں ایک ایسا سفوف دوں گی جس کے بعد وہ کھانا کھاتے ہی بے ہوش ہو جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "یہ کام تو تم نالنگا دیوداسی کو اپنے ساتھ ملائے بغیر بھی کر سکتی ہو۔ اس کو اعتماد میں لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اس نے راج گرو کو بتا دیا اور وہ کھانا پاروتی کو نہ دیا تو تمہاری خیر نہیں ہو گی۔"

کانچی غور کرنے لگی۔ بولی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ کام میں نالنگا کو بتائے بغیر بھی کر سکتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "راج گرو پاروتی کو یہاں سے ناگ پور کب لے جانے والا ہے؟"

اس نے بتایا کہ پرسوں رات کو وہ اسے لے کر یہاں سے نکل جائے گا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم وہ سفوف تیار رکھو۔ کل رات ہوتے ہی جب نالنگاہ پاروتی کے لئے کھانا لے کر جائے تو موقع پا کر کھانے میں سفوف ملا دینا۔ اس کے بعد ہم یہاں سے نکل کر گپھاہ پر پہنچ جائیں گے اور بے ہوش پاروتی کو اٹھا کر فرار ہو جائیں گے۔"

کانچی کہنے لگی۔

"ہاں۔ تمہارے ساتھ مجھے بھی یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ کیونکہ پجاری کو ضرور میری سازش کا پتہ چل جائے گا اور وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

ہم نے سارا پروگرام طے کر لیا۔ ایک فالتو خچر اصطبل میں پہلے سے تیار کر لیا۔ اس پر دو کمبل بھی ڈال دیئے۔ رات کو کانچی نے مجھے آ کر یہ خوش خبری سنائی کہ نالنگا کھانا لے کر پاروتی کی گپھاہ میں چلی گئی ہے اور اس نے کھانے میں بے ہوشی کا سفوف ملا دیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ اس سفوف کا اثر کتنی دیر تک رہے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ پاروتی دو تین گھنٹوں کے بعد ہی ہوش میں آ جائے۔ ہم راستے میں ہوں گے۔ اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ شور مچا کر بھاگ جائے گی اور واپس راج گرو کے

پاس پہنچ جائے گی۔"

کانچی نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ بے ہوشی کے سفوف کا اثر ساری رات اور سارا دن رہے گا۔ اتنی دیر میں ہم ان پہاڑیوں سے نکل کر نیچے کسی شہر یا قصبے میں پہنچ گئے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "تم سفوف اپنے پاس ہی رکھنا۔ اگر راستے میں پاروتی کو ہوش آنے لگا تو ہم یہ سفوف پانی میں گھول کر اس کے حلق میں ٹپکا دیں گے۔"

کانچی بولی۔ "تم نے ٹھیک کہا ہے۔ میں بے ہوشی کا سفوف اپنے پاس رکھ لیتی ہوں۔ ایسا کرو۔ تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں سفوف کی ڈبی لے کر ابھی آتی ہوں۔"

کانچی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد آئی اور کہا۔

"تم سفوف کی [illegible]"

جیسے وہ ہوش میں ہو اور خود بیٹھی ہوئی ہو۔ کانچی نے کہا۔

"مجھے اس کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا۔ ورنہ یہ راستے میں گر پڑے گی۔"

اس کا خیال ٹھیک ہے۔ کانچی بے ہوش پاروتی کے پیچھے اس طرح بیٹھ گئی کہ اس نے اسے ایک ہاتھ سے تھام کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں خچر کی باگ تھام لی۔ میں دوسرے خچر پر بیٹھ گیا۔ تیسرے خالی خچر کو ہم نے وہیں چھوڑنے کی بجائے ساتھ ہی لے لیا اور یوں ہمارا قافلہ کیلاش پربت کی پہاڑیوں سے نیچے کی طرف چل پڑا۔

باقی ساری رات ہم برفانی راستوں پر چلتے رہے۔ صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو ہم کافی نیچے اتر آئے تھے۔ اب برف اتنی زیادہ نہیں تھی اور ننگی پہاڑیاں شروع ہو گئی تھیں۔ کانچی [illegible] کہنے لگی۔

"میں نے اسی کے پاس جانے کا سوچ رکھا تھا ایک بار ناگن دیوی کی یادداشت واپس آ گئی تو پھر پجاری کے منتر کا اثر اپنے آپ اتر جائے گا اور مندروں میں دیوتاؤں کے خزانے محفوظ ہو جائیں گے۔"

ناشتہ کرنے کے بعد ہم پھر آگے چل پڑے۔ اسی طرح نئے اور دشوار گزار پہاڑی علاقے میں سفر کرتے کرتے ہم شام کے وقت بیرونگ پہنچ گئے۔ کانچی وہاں سے مجھے سیدھا بوڑھے تبتی کے گھر لے گئی۔

ایک چھوٹی سی جھالری سفید داڑھی والا بوڑھا اپنی کوٹھڑی میں صف پر لیمپ جلائے بیٹھا کوئی پرانی کتاب پڑھ رہا تھا۔ آگے چائے کی چینک اور پیالی پڑی تھی۔ اس نے کانچی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! بہت دنوں کے بعد تم سے ملاقات ہوئی۔ کیلاش پربت سے کب آئی ہو؟ یہ کون ہے؟ اور یہ بے ہوش لڑکی کون ہے؟"

کانچی نے بوڑھے تبتی سے میرا تعارف کرایا۔ پھر پاروتی کے متعلق اسے سارا قصہ بیان کر دیا۔ بوڑھے نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ پاروتی کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ پھر اس کی آنکھیں کھول کر غور سے ان کا معائنہ کیا اور بولا۔

"اس پر تمہارے پجاری نے سنگرینی منتر پڑھا ہے۔ میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔"

بوڑھے نے پاروتی کی ہتھیلی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور اونچی آواز میں کوئی منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ تین چار منٹ تک وہ منتر پڑھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے بے ہوش پاروتی کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بولا۔

"سنگرینی! سنگرینی! میں تاپتی کا لامہ ہوں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس عورت کے جسم سے نکل جا۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس عورت کے جسم سے نکل جا۔"

اس کے ساتھ ہی پاروتی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی - اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ جیسے کوئی بات کہہ رہی ہو۔ بوڑھے نے اس کے ہونٹوں کے ساتھ اپنا کان لگا دیا۔ وہ کچھ سن رہا تھا۔ کان پیچھے ہٹا کر بوڑھے نے کانچی کی طرف دیکھا اور

بولا۔

"کانچی بیٹی! سنگرینی نے کہا ہے کہ میں اس عورت کا جسم چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ مگر اس کو اپنی پچھلی زندگی کی باتیں یاد نہیں آ سکیں گی۔"

میں نے کہا۔ "بابا! اس کا کیا فائدہ ہوا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ اس کی یادداشت واپس آ جائے۔"

بوڑھے نے کہا۔

"یہ بات شاید تم دونوں کو معلوم نہیں کہ سنگرینی پر جو منتر پھونکا گیا تھا وہ آتشی ناگ کا منتر تھا۔ سنگرینی اسی منتر کی آتشی دیوی ہے۔ ایک سال کے بعد اس منتر کی آگ نے اس عورت کو جلا کر راکھ کر دینا تھا۔ میرے کہنے سے سنگرینی اس کے جسم سے نکل گئی ہے۔ اب اس عورت پر منتر کی آگ حرام ہو گئی ہے۔ اس کی یادداشت واپس لانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ہوش میں آنے کے بعد تم لوگوں کو بھی نہیں پہچانے گی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں ہو گا کہ اس پر راج گرو پجاری نے منتر پھونکا تھا اور یہ اس کے پاس رہ رہی تھی۔"

یہ ایک اچھی بات ہوئی تھی۔ مگر میں پاروتی کی یادداشت واپس لانا چاہتا تھا۔ میں اسے پھر سے پاروتی کی حالت میں نارمل دیکھنا چاہتا تھا۔ کانچی نے بوڑھے سے پوچھا۔

"بابا! کیا کسی طریقے سے اس عورت کی یادداشت بھی واپس آ سکتی ہے؟"

بوڑھے نے کہا۔ "ایک منٹ ٹھہرو۔"

اس نے صندوق میں سے ایک پرانی کتاب نکالی اور لیمپ کی روشنی میں اس کے ورق الٹنے شروع کئے۔ ایک جگہ اس نے انگلی رکھ کر کچھ سطریں غور سے پڑھیں اور بولا۔

"ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا ہے بابا؟" کانچی نے جلدی سے پوچھا۔

بوڑھے تبتی نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور بولا۔

"اس عورت کو لے کر بنارس شہر جاؤ وہاں چتر ویدی نام کا ایک پنڈت رہتا ہے۔ وہ سنگرینی منتر کا توڑ جانتا ہے۔ اگر وہ راضی ہو گیا تو اس عورت کو وہی پنڈت ٹھیک کر سکتا ہے۔"

ہم نے وہ رات وہاں رہنے کی بجائے بیرونگنج سے ریل گاڑی پکڑی اور بنارس کی طرف روانہ ہو گئے۔

ریل گاڑی گورکھپور پہنچی تو پاروتی کو ہوش آ گیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ ہوش میں آتے ہی شور مچا دے گی کہ تم مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟ میں پجاری راج گرو کی داسی ہوں۔ مجھے اس کی پاس پہنچاؤ۔ اس طرح لوگ اکٹھے ہو جاتے اور یہی سمجھتے کہ ہم ایک عورت کو اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ وہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتے اور میں ایک نئی مصیبت میں پھنس جاتا۔ مگر ایک عجیب بات ہو گئی۔ ہوش میں آتے ہی پاروتی نے آنکھیں کھول کر پہلے مجھے دیکھا۔ پھر کانچی کو دیکھا۔ پھر گاڑی کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔ مجھے پیاس لگی ہے۔"

کانچی نے اس وقت تھیلے میں سے میٹھی روٹی نکال کر اسے دی۔ ایک مسافر کی صراحی میں سے پانی پیالے میں ڈال کر اسے دیا۔ پاروتی بڑے آرام سے روٹی کھانے لگی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پاروتی کی اب پجاری راج گرو والی یادیں بھی اس کے ذہن سے غائب ہو گئی تھیں۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ پجاری کے پاس اوپر گپھا میں رہتی تھی۔ وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ وہ مجھے بالکل ایک نئی عورت لگ رہی تھی جس کو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ روٹی کھانے کے بعد پاروتی نے پانی پیا اور بولی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اور وہ جہاں پہلے لیٹی ہوئی تھی وہیں لیٹ گئی اور سو گئی۔ کانچی کہنے لگی۔

"یہ بڑی اچھی بات ہوئی ہے کہ اسے مکار پجاری راج گرو بھی یاد نہیں رہا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ اس کی زندگی سنگر کے منتر کی آگ سے محفوظ ہو گئی ہے۔ اس کمینے پجاری نے یہی سوچا تھا کہ جتنا عرص میں اس کی مدد سے مندروں اور خزانوں کی دولت سمیٹ سکتا ہوں سمیٹ لوں اس ک بعد اگر سنگرینی منتر کی وجہ سے اس کا جسم جل کر راکھ ہو جاتا ہے تو بے شک راکھ ہ جائے۔"

کانچی کہنے لگی۔

"اب بھگوان کرے کہ بنارس والا پنڈت اس کو ٹھیک کر دے۔ اس کی پرانی یادداشت واپس آ جائے۔"

میں نے کہا۔ "اور یہ پجاری کو بھی بھول جائے۔"

"پرانی یادداشت واپس آ گئی تو پجاری کو یہ اپنے آپ بھول چکی ہو گی۔"

کانچی نے یہ کہہ کر پاروتی کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر کہنے لگی۔

"تم پہلے کبھی بنارس گئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "شہر کے اندر کبھی نہیں گیا۔ ریل گاڑی میں ایک بار شہر کے قریب سے گزرا ضرور تھا۔"

کانچی بولی۔ "میں نے بنارس میں ایک سال گزارا ہے۔ میں اس شہر کے سارے گلی کوچوں سے واقف ہوں۔ یہ پنڈت چترویدی ضرور کوئی مشہور پنڈت ہو گا۔ بنارس شہر میں ایسے پنڈتوں کی کمی نہیں ہے۔ وہاں سے ہمیں اس کے گھر کا پتہ چل جائے گا۔"

میں اس اعتبار سے مطمئن ہو گیا تھا کہ پاروتی کو ہوش آ گیا ہے اور ہوش میں آنے کے بعد وہ مکار پجاری کی ساری یادیں بھول چکی ہے۔ ورنہ وہ شور مچا کر ہم سب کو حوالات میں بند کرا سکتی تھی۔ یہ بہت ہی سخت مرحلہ تھا جو آسانی سے گزر گیا تھا۔

اس کے لئے میں آج بھی جبکہ میں پاروتی ناگن کی کہانی لکھ رہا ہوں اس بوڑھے تبتی کا شکرگزار ہوں۔

گورکھپور سے ہم نے ٹرین بدلی اور بنارس جانے والی ریل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اس دوران پاروتی جاگ پڑی تھی اور چپ چاپ اپنی سیٹ پر بیٹھی خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی کو بھی نہیں پہچانتی تھی۔ اس کے لئے سارا ماحول اجنبی تھا۔ وہ کوئی بات بھی نہیں کرتی تھی۔ جس وقت بات کرنے کی بہت سخت ضرورت ہوتی تو صرف ایک بات کرتی اور خاموش ہو جاتی۔ جب ہم گورکھپور کے سٹیشن پر بنارس جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں نے پاروتی سے کہا۔

"پاروتی! کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟"

وہ میری طرف خالی خالی نظروں سے تکنے لگی۔ میں نے اسے ماضی کے کئی ایک واقعات یاد دلائے۔ مگر پاروتی کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہ ابھرا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے میری کوئی بات نہ سنی ہو۔ کانچی نے مجھے آنکھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور میں نے اس کے بعد پاروتی سے کوئی بات نہ کی۔

ٹرین دوپہر کے بعد بنارس پہنچی۔ پاروتی جاگ رہی تھی۔ اس نے نہ مجھ سے پوچھا نہ کانچی سے پوچھا کہ یہ کونسا شہر ہے۔ ہمارے ساتھ خاموشی سے ڈبے سے اتر کر سٹیشن سے باہر آ گئی۔ وہ اپنے آپ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔ لیکن بھاگنا تو دور کی بات ہے وہ ہم سے الگ بھی نہیں ہوتی تھی۔ کانچی کے ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ کانچی نے ایک دو بار اس سے بات بھی کی لیکن پاروتی نے کوئی جواب نہ دیا۔

بنارس پہنچنے کے بعد کانچی ہمیں ایک محلے میں لے گئی جس کی ایک تنگ سی گلی میں اس کی ایک سہیلی رہتی تھی۔ وہاں ہم تھوڑی دیر ٹھہرے۔ کانچی نے اس سے پنڈت چترویدی کے بارے میں پوچھا۔ اس کی سہیلی نے کہا۔

"یہ پنڈت تو سانپوں کے ساتھ رہتا ہے۔ تم اس کے پاس کیوں جا رہی ہو؟"

کانچی نے پاروتی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ اس کو بیماری لگ گئی ہے یا کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ یہ کسی کو نہیں پہچانتی۔ کسی سے بات نہیں کرتی۔ پنڈت جی سے ہم اس کا علاج کرانے آئے ہیں۔"

کانچی کی سہیلی نے بڑے غور سے پاروتی کو دیکھا اور کہا۔

"یہ پنڈت شہر سے باہر دریا کی ساتویں گھاٹ کے پیچھے ایک جھونپڑی میں رہتا ہے وہ کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ بس جھونپڑی میں ہی سارا دن گزار دیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ رات کے اندھیرے میں دریا پر جاتا ہے اور ایک ٹانگ دریا میں کھڑی کر کے کوئی چلہ کاٹتا ہے۔"

میرے لئے یہ باتیں کوئی انوکھی نہیں تھیں۔ بھارت میں میں نے تقریباً ہر سادھو جوگی سنیاسی کو اس قسم کی واہیات حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ کانچی کو بھی کوئی حیرانی نہ ہوئی تھی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ہم پاروتی کو لے کر دریائے گنگا کے ساتویں گھاٹ پر آ گئے۔ بنارس کے باہر دریائے گنگا کے کنارے کئی گھاٹ ہیں۔ ہر گھاٹ کو کسی نہ کسی جوگی نے سنبھال رکھا ہے وہیں ضعیف الاعتقاد ہندو مرد اور عورتیں اس جوگی کے پاس آ کر اس کو اپنی دنیاوی مشکلیں بیان کرتی ہیں اور جوگی ان سے روپے پیسے لے کر ان کی مشکلات کے الٹے سیدھے حل بتا دیتا ہے جن کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اگر ان میں سے کسی ایک عورت یا مرد کی مشکل اس کی اپنی کوشش کے نتیجے میں حل ہو جاتی ہے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ جوگی سادھو کی وجہ سے اس کی مشکل آسان ہوئی ہے اور یوں جوگی کی مشہوری ہوتی رہتی ہے۔

ساتواں گھاٹ دریا کے جنوب میں درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب تھا۔ ان درختوں میں ہمیں ایک جھونپڑی نظر آئی۔ کانچی نے کہا۔

"ضرور یہی پنڈت جی کی جھونپڑی ہو گی۔ چلو چل کر پتہ کرتے ہیں۔"

پاروتی خاموش کھڑی یوں ہماری باتیں سن رہی تھی۔ جیسے اسے ہماری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جیسے ہم کسی ایسی زبان میں باتیں کر رہے ہیں جو اس کی سمجھ سے باہر ہے۔ ہم جھونپڑی کی طرف آ گئے۔ یہاں ایک بوڑھا ہمیں دریا کی طرف جاتا ملا۔ کانچی نے اس سے پوچھا۔

"بابا! پنڈت چترویدی کی جھونپڑی یہی ہے؟"

بوڑھے نے کان کو ہاتھ لگا کر کہا۔

"یہی ہے۔"

اور یوں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے نکل گیا جیسے خوف زدہ ہو گیا ہو۔ پنڈت کی جھونپڑی کے آگے ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

"پنڈت جی پرنام!"

اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دوسری بات آواز دی۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے پنڈت جی اندر نہیں ہیں۔"

اب کانچی نے آواز دی تو اندر سے کسی نے غصیلی آواز میں جھڑک کر کہا۔

"کون ہو تم جو مجھے تنگ کرنے آ گئے ہو چلے جاؤ یہاں سے۔"

میں نے کہا۔ "پنڈت جی! ہم بڑی دور سے آپ کے درشنوں کو آئے ہیں۔"

کانچی نے بھی کہا۔ "گورودیو! ہم کیلاش پربت سے چل کر آئے ہیں۔"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ اس کے بعد پنڈت جی کی آواز آئی۔

"آ جاؤ اندر۔"

میں کانچی اور پاروتی پردہ ہٹا کر جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ جھونپڑی میں لوبان جل رہا تھا۔ ایک طرف سانپوں کی پٹاریاں قطار میں پڑی تھیں۔ ایک موٹا تازہ بھاری توند والا آدمی صرف دھوتی باندھے' شانوں پر گرم چادر ڈالے چوکڑی مار کر اس طرح

بیٹھا تھا جیسے گیان دھیان میں مصروف ہو۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ پنڈت چترویدی تھا۔ اس نے ہماری طرف بے نیازی سے دیکھا۔ ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔ وہ یوں چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس کا اس ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو۔

پنڈت نے پوچھا۔

"کس لئے آئے ہو۔ جلدی بتاؤ۔"

کانچی نے بات شروع کی۔ اس نے پنڈت کو بتایا کہ پاروتی میری چھوٹی بہن ہے۔ اس کے سر پر درخت گرنے کی وجہ سے چوٹ لگ گئی تھی۔ تب سے یہ چپ ہو گئی ہے۔ بہت کم بات کرتی ہے اور اسے کچھ یاد نہیں رہا کہ یہ کون ہے۔ اس کی یادداشت غائب ہو گئی ہے۔ پنڈت چترویدی نے پاروتی کو اپنے قریب بلایا۔ پاروتی خاموشی سے اٹھ کر پنڈت کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ پنڈت نے پاروتی کے ہاتھ کی لکیروں کو غور سے دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ کو ناک کے پاس لے جا کر سونگھا۔ میں پنڈت کے چہرے کو تک رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر اچانک ایک تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔

پنڈت نے پاروتی کو بے نیازی سے کہا۔

"پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاؤ۔ چلو...."

پاروتی ہمارے پاس آ کر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ پنڈت نے ایک پوتھی نکالی۔ اس کو غور سے پڑھا۔ پھر خالی کاغذ پر چند ایک لکیریں ڈال کر ان لکیروں کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ میں اور کانچی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ پنڈت نے پوتھی ایک طرف رکھ دی اور کانچی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"تمہاری بہن پر کسی نے جادو کیا ہوا ہے اس کی یادداشت درخت کے گرنے کی وجہ سے گم نہیں ہوئی۔"

میں نے فوراً کہا۔

"مہاراج! آپ بہت بڑے گیانی ہیں۔ میری پتنی کو ٹھیک کر دیں۔ ہم یہی آس لگا کر اتنی دور سے آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ ہی اسے ٹھیک کر سکتے ہیں۔"

پنڈت نے آنکھیں بند کر لیں۔ گہرا سانس لیا۔ ایک اور گہرا سانس لیا۔ آنکھیں کھول کر پاروتی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"میں نے اس بچی پر کئے گئے جادو ٹونے کا توڑ معلوم کر لیا ہے۔"

ہم بڑے خوش ہوئے۔ پنڈت نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"لیکن اس کے لئے مجھے اس پر خاص چلہ کرنا ہو گا۔ یہ چلہ تین راتوں کا ہو گا...."

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کانچی نے جھٹ کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے مہاراج! آپ یہ چلہ ضرور کریں ہماری بہن کو کسی طرح اچھا کر دیں۔ اس کی یادداشت واپس آ جائے۔ ہم آپ کی بڑی سیوا کریں گے۔"

پنڈت نے ایک بار پھر دو گہرے سانس لئے اور بولا۔

"آج رات تم اس بچی کو میری جھونپڑی میں چھوڑ کر خود دریا کے گھاٹ پر چلے جانا۔ دوسری رات بھی ایسا ہی کرنا۔ تیسری رات بھی یہی عمل دہرایا جائے گا۔ بھگوان نے چاہا تو تیسری رات کے بعد تمہاری بہن کی یادداشت واپس آ جائے گی۔ چلو جاؤ۔ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ مجھے گیان دھیان کرنا ہے۔"

پنڈت نے ہمیں جھڑک کر جھونپڑی سے باہر نکال دیا۔ میں تذبذب میں تھا۔ کانچی کہنے لگی۔

"تم دیکھ لینا اب پاروتی دیوی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ پنڈت بڑا گیانی دھیانی آدمی لگتا ہے۔"

میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں رات کے وقت اس پنڈت کے پاس پاروتی کو اکیلا چھوڑوں مگر دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اوپر سے کانچی کا بھی مجھ پر دباؤ تھا۔ یہ

خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے یہ پنڈت اپنے جنتر منتر سے پاروتی پجاری نے جو سنگر منتر پھونکا ہوا ہے اس کا جادو ٹوٹ جائے اور پاروتی پھر سے نارمل حالت میں آ جائے دل نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے اپنے دل کے اشاروں پر عمل نہ کرتے ہوئے پاروتی پنڈت کی جھونپڑی میں تین راتیں بسر کرنے کی اجازت دے دی۔ رات کے وقت بنارس شہر سے نکل کر پنڈت کی جھونپڑی پر آ گئے۔

لگتا تھا کہ وہ پہلے سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے پاروتی کو ہمارے سامنے جھونپڑی کے فرش پر بچھی ہوئی ہرنی کی کھال پر آلتی پالتی مار کر بٹھا دیا۔ پیتل کی تھا میں لوبان سلگا دیا اور خود بھی اس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ہمیں کہا کہ دریا کے گھاٹ پر چلے جائیں اور سورج نکلنے کے بعد آ کر پاروتی کو لے جائیں۔ ہم پاروتی کو پنڈت کی جھونپڑی میں اکیلی چھوڑ کر دریا کے گھاٹ پر آ کر ایک خالی چبوترے پر بیٹھ گئے۔ یہاں سے ہمیں دور گھنے درختوں کے نیچے جھونپڑی کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھونپڑی کے دروازے کو دیکھ لیتا تھا۔ جھونپڑی پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

دریا کے اس ساتویں گھاٹ پر دن بھر مسافروں سے بھری ہوئی کشتیاں آتی جاتی رہیں۔ ہم نے ایک کھوکھے کے باہر بیٹھ کر دوپہر کو تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ گنگا کے دریا کی سطح سنہری ہو رہی تھی۔ بنارس شہر کی عمارتوں پر بھی ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ سورج کی روشنی آہستہ آہستہ رات کے اندھیرے میں گھل مل گئی۔ میں اور کانچی دونوں چبوترے پر بیٹھے تھے۔ کسی کسی وقت ہم پنڈت کی جھونپڑی پر نگاہ ڈال لیتے تھے۔ جھونپڑی رات کے اندھیرے میں بے معلوم سی نظر آ رہی تھی۔ میری طبیعت کو نہ جانے کیوں ایک بے چینی سی لگ گئی تھی۔ میں اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ کانچی نے پوچھا۔

"کیا بات ہے تم مجھے پریشان لگ رہے ہو۔"

میں آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کانچی! یہ پنڈت کہیں کوئی بدمعاش آدمی تو نہیں ہے؟"

کانچی نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔

"یہ آدمی اگر ایسا ہوتا تو سارے بنارس شہر میں بدنام ہو گیا ہوتا۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ میری سہیلی نے بھی اس کے بارے میں بری رائے نہیں دی تھی۔"

"مگر جو بوڑھا ہمیں راستے میں ملا تھا اس نے تو پنڈت کی جھونپڑی کی طرف اشارہ کر کے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔"

کانچی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ پنڈت نے قسم قسم کے زہریلے سانپ پال رکھے ہیں اور وہ کسی سے نہیں ملتا۔ اس لئے لوگ اس سے ڈرنے لگے ہیں۔ اس کے سوا کوئی بات نہیں ہے۔ بے فکر ہو کر بیٹھو۔ تم دیکھ لینا پاروتی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر پجاری راج گرو کا منتر اس پر کبھی نہیں چل سکے گا اور ناگ پور ترچنا پلی کے مندروں کے خزانے محفوظ ہو جائیں گے۔"

کانچی کو اپنے مندروں کے خزانوں کی پڑی تھی اور مجھے پاروتی کی فکر لگی تھی کہ پنڈت اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کر بیٹھے۔ پاروتی نے تو آگے سے کچھ بولنا ہی نہیں تھا۔ کبھی خیال آتا کہ یہ پنڈت چھٹا ہوا بدمعاش ہے اور کبھی خیال آتا کہ نہیں۔ پنڈت بڑا پارسا اور پاکباز آدمی ہے۔ اسی کش مکش میں کبھی میں اٹھ کھڑا ہوتا۔ دو قدم دریا کے کنارے ٹہلتا اور کبھی کانچی کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ کانچی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"آخر تمہیں کونسی چیز اتنی پریشان کر رہی ہے؟"

میں نے صاف صاف کانچی کو اپنی دل کی کیفیت بیان کر دی۔ اس نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

"خبردار پنڈت بڑا رشی منی ہے۔ اس کے بارے میں ایسے خیال دل میں مت لاؤ۔ اس کی شہرت ایسی نہیں ہے۔"

اسی الجھن میں رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ گھاٹ پر بھی خاموشی طاری تھی۔ دریا کا پانی بڑے سکون سے بہہ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں دریا کے دوسرے کنارے پر بنارس شہر کے مکانوں کی روشنیاں کہیں کہیں جھلملا رہی تھیں۔ ان کا عکس بھی دریا کے پانی میں جھلملا رہا تھا۔

جب آسمان پر پچھلے پہر کی نیلی روشنی پھیلنے لگی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"مجھے مت روکنا۔ میں پاروتی کو دیکھنے جھونپڑی میں جا رہا ہوں۔"

اور میں اٹھ کر تیز تیز قدموں سے جھونپڑی کی طرف چلنے لگا۔ کانچی بھی میرے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ مجھے روک رہی تھی۔ مگر میں نے اس کی بالکل پرواہ نہ کی۔ اور جھونپڑی کے پاس جاتے ہی ٹاٹ کا پردہ اٹھا دیا۔ جھونپڑی خالی پڑی تھی۔ دیا جل رہا تھا۔ تھالی میں لوبان سلگ سلگ کر ختم ہو گیا تھا۔ وہاں نہ پنڈت تھا اور نہ پاروتی۔۔۔ میں نے غصے میں چلا کر کہا۔

"کانچی! جھونپڑی خالی ہے۔ تمہارا رشی منی پنڈت پاروتی کو لے کر بھاگ گیا ہے۔"

کانچی بھی جھونپڑی میں آ گئی۔ حیران نظروں سے خالی جھونپڑی کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ضرور باہر چلہ کر رہا ہو گا۔"

ہم نے دیکھا کہ جھونپڑی کی عقبی دیوار کا گھاس پھوس ایک جگہ سے ہٹا ہوا تھا اور وہاں ایک سوراخ بنا ہوا تھا۔ میں نے پنڈت کو گالی دی کر کانچی سے کہا۔

"وہ یہاں سے پاروتی کو بھگا کر لے گیا ہے سامنے سے اس لئے نہیں گیا کہ ہم اسے دیکھ لیں گے۔"

ہم دیوار کے شگاف میں سے نکل کر جھونپڑی کی دوسری طرف آ گئے۔ رات کے اندھیرے میں وہاں گہرا سناٹا تھا۔ کسی طرف کوئی نہیں تھا۔ میں نے پاروتی کو دو تین

آوازیں دیں۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ پاروتی میری آواز کا جواب نہیں دے گی۔ لیکن میں سخت غصے اور پریشانی کی حالت میں تھا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"وہ حرامی پنڈت زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔ ہمیں اس کا پیچھا کرنا چاہئے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

کانچی بھی حیران و پریشان تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پنڈت پاروتی کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ جھونپڑی کے پیچھے اندھیرے میں کہیں کہیں درخت تھے۔ دور شاید سڑک کی بتیاں تھیں جو روشن تھیں۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"وہ کوئی سڑک معلوم ہوتی ہے۔ جلدی سے آؤ۔"

ہم تیز تیز چلتے درختوں اور اونچے نیچے ٹبوں سے گزرتے سڑک پر آ گئے۔ سڑک خالی پڑی تھی۔ میرا دماغ کھول رہا تھا۔ میں سخت طیش کی حالت میں تھا کہ پنڈت کہیں مل جائے تو میں اس کی گردن اتار دوں۔ مگر میں مجبور تھا۔ اتنے میں ایک طرف سے کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔

یہ ایک بس کی روشنیاں تھیں جو ہمارے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ ہم بس سٹاپ پر کھڑے تھے۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"اس بس میں بیٹھ جاتے ہیں۔ پنڈت آگے گیا ہو گا۔"

بس میں مزدور پیشہ لوگ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ یہ بس صبح منہ اندھیرے مزدوروں کو لے کر کارخانوں کی طرف جا رہی تھی۔

کانچی نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ ہم آگے نہیں جائیں گے۔"

بس بمشکل ایک دو سیکنڈ رکی اور آگے چل دی۔ کانچی کہنے لگی۔

"ہمیں سب سے پہلے شہر چل کر پنڈت کو تلاش کرنا ہو گا۔ وہ اتنی جلدی یہاں سے باہر نہیں جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں کیا معلوم کہ وہ پاروتی کو لے کر کب کا یہاں سے نکل چکا ہے؟"

کانچی نے میرا بازو پکڑا اور مجھے کھینچتے ہوئے دریا کے گھاٹ کی طرف چلنے لگی۔

"ہم شہر میں اپنی سہیلی کے پاس جا کر معلوم کرتے ہیں۔ اسے پنڈت کے ٹھکانوں کا ضرور علم ہو گا کہ وہ کہاں کہاں جا سکتا ہے؟"

ہم ایک گھاٹ پر کشتی میں بیٹھ گئے۔ دریا پار کر کے بنارس شہر میں داخل ہوئے۔ شہر کی گلیوں کے مندروں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ لوگ پوجا پاٹھ کے لئے گھروں سے

نکل کر دریا کی طرف چل پڑے تھے۔ کانچی کی سہیلی بھی جاگ رہی تھی۔ جب ہم نے اسے بتایا کہ بدمعاش پنڈت پاروتی کو اغوا کر کے فرار ہو گیا ہے تو اسے یقین نہ آیا۔ کہنے لگی۔

"اس سے پہلے ہم نے پنڈت کے بارے میں ایسی کبھی کوئی بات نہیں سنی۔ آپ لوگوں کو ضرور کوئی مغالطہ ہوا ہے۔ وہیں جا کر تلاش کرو۔ پنڈت دریا پر کہیں ہو گا۔"

جب میں نے اسے بتایا کہ پنڈت کی جھونپڑی کی عقبی دیوار میں شگاف پڑا ہوا ہے اور وہ وہیں سے پاروتی کو لے کر فرار ہوا ہے تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔

"ہم نے سنا ہے کہ پنڈت کبھی کبھی ناگ پور کے مہاناگ مندر میں یاترا کرنے جایا کرتا تھا۔ وہ ضرور وہیں گیا ہو گا۔"

بھارت کے ملک میں اپنی آوارہ گردیوں اور جنگل جنگل شہر شہر پھرنے کے دوران مجھے کافی شہروں سے واقفیت ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"ناگ پور تو یہاں سے بہت دور ہے۔"

کانچی کی سہیلی نے کہا۔

"میرا من کہتا ہے کہ پنڈت ضرور پاروتی کو لے کر ناگ پور ہی گیا ہو گا۔ اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" کانچی نے پوچھا۔

اس کی سہیلی کہنے لگی۔

"ناگ پور کے مہاناگ مندر میں ایسی دیوداسیاں رکھی جاتی ہیں جو سانپوں کی پوجا کرتی ہیں۔ یہ دیوداسیاں مندر کے پجاری دوسرے شہروں سے عورتوں کو اغوا کر کے لاتے ہیں۔ عام طور پر یہ ایسی عورتیں ہوتی ہیں جن کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا۔ مندر کا مہاپجاری ایسی عورتوں کو بھاری رقم دے کر خرید بھی لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے پاروتی کو دیکھ کر پنڈت کے دل میں خیال آ گیا ہو کہ کیوں نہ اسے ناگ پور کے مندر میں لے جا کر فروخت کر دیا جائے۔"

کانچی کی سہیلی نے کوئی یقینی بات نہیں کی تھی۔ لیکن ہمارے سامنے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ جب میں نے کانچی کی سہیلی سے کہا۔

"کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ پنڈت یہیں کسی جگہ چھپا ہوا ہو؟"

اس کے جواب میں وہ عورت بولی۔

"کسی عورت کو اغوا کر کے وہ اس شہر میں کبھی نہیں رہے گا۔ میری مانو تم لوگ ناگ پور جاؤ۔ وہ تمہیں وہیں ملے گا۔ اب یہ میں نہیں بتا سکتی کہ تمہاری پاروتی بھی اس کے پاس ہو گی یا نہیں؟"

کانچی کو بھی معلوم تھا کہ ناگ پور کا شہر بنارس سے بہت دور ہے اور ہمارے پاس پیسے بھی نہیں تھے۔ اس نے اپنی سہیلی سے کچھ روپے ادھار مانگے تو وہ بولی۔

"میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ میں کسی کو ادھار بھی دے سکوں۔"

ہم مایوس ہو گئے۔ اس کی سہیلی نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! تم تو مندر کی دیوداسی ہو۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ بھارت کی ریل گاڑیوں میں سفر کرنے والے سادھو جوگی اور جوگنوں سے کوئی ٹکٹ نہیں پوچھتا۔ تم لوگ جوگی جوگن بن کر ناگ پور کیوں نہیں جاتے؟"

کانچی کی سہیلی نے بڑا اچھا مشورہ دیا تھا۔ اس طریقے سے ہمارا حلیہ بھی بدل جاتا اور پنڈت اگر وہاں ہوا تو وہ ہمیں پہلی نظر میں پہچان کر فرار ہونے کی بھی کوشش نہیں کرے گا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! تمہاری سہیلی نے بڑا اچھا مشورہ دیا ہے۔ ہم جوگی جوگن بن کر سفر کریں گے۔ اس طرح پنڈت بھی ہمیں اتنی جلدی نہیں پہچان سکے گا۔"

کانچی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔"

کانچی کے گھر میں ہی ہم نے جوگی جوگنوں والا لباس پہن لیا۔ کانچی نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہن لی۔ بال کھول لئے۔ گلے میں ریٹھوں کی مالا پہن لی۔ جب ہم

کانچی کی سہیلی کے گھر سے نکلے تو دن کافی نکل آیا تھا۔ ہم دونوں جوگی اور جوگن بنے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں کرمنڈل تھے۔ میرے ہاتھ میں ترشول بھی تھا۔ ماتھوں پر راکھ مل کر لال تلک لگایا ہوا تھا۔

ہم وہاں سے سیدھا ریلوے سٹیشن پر آ گئے۔ یہاں ایک بابو سے پوچھا کہ ناگ پور کو کونسی گاڑی جاتی ہے۔ اس نے دیوار پر لگے ہوئے بورڈ کو پڑھ کر بتایا کہ ناگ پور کو گاڑی ایک گھنٹے بعد جائے گی۔ ٹکٹ ہم نے نہیں لئے تھے۔ کیونکہ جیسا کہ کانچی کی سہیلی نے بتایا تھا اور میرا بھی تجربہ تھا بھارت ریل گاڑیوں میں سفر کرنے والے فقیر' جوگی' سادھو اور نابینا لوگ ٹکٹ نہیں خریدتے۔ انہیں ریلوے ٹکٹ معاف ہوتا ہے۔ ہم پوچھتے پوچھتے اس پلیٹ فارم پر آ گئے جہاں سے ناگ پور جانے والی گاڑی نے چلنا تھا۔ پلیٹ فارم پر بہت سے مسافر اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے تھے۔ ٹرین ابھی نہیں آئی تھی۔ ہم دونوں بھی ایک طرف بیٹھ گئے۔

گاڑی نے پیچھے کلکتہ جبل پور سے آنا تھا۔ اپنے وقت پر گاڑی چھک چھک کرتی پلیٹ فارم میں داخل ہو کر رک گئی۔ وہاں شور مچ گیا۔ مسافروں میں دھکم پیل شروع ہو گئی۔ ہم ایک ڈبے میں داخل ہوئے۔ وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہندو لوگ جوگی جوگنوں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ہمیں کوئی بددعا نہ دے دیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جوگی کی بددعا کبھی خالی نہیں جاتی۔ چنانچہ کوئی جوگی کسی کے گھر چلا جائے تو اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ہمیں کھڑے دیکھ کر دو مسافر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں بڑی عزت و تکریم کے ساتھ اپنی سیٹوں پر بٹھا دیا۔ ہم بھی بڑے مزے سے بیٹھ گئے۔ سادھو اور جوگی لوگ ہندوستان میں ہر جگہ مل جائیں گے۔ اسی طرح گائے اور بیل بھی بھارت کے شہروں میں عام چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے آوارہ بیل نظر آ جائیں تو لوگ فوراً اسے ذبح کر کے کھا جائیں۔ مگر ہندو لوگ ایسا نہیں کرتے۔ وہ گائے کو گئو ماتا اور بیل کو وشنو بھگوان کا اوتار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہندی بیل وسطی ہند میں ہندوؤں کا

ایک دیوتا بھی مانا جاتا ہے جس کی پوجا ہوتی ہے۔

ٹرین چل پڑی۔ بڑا لمبا سفر تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہمیں ان مسافروں کی و
سے راستے میں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ یہ ایک رات' ایک دن اور پھر پوری ایک
رات کا سفر تھا۔ دوسری رات کی صبح کو معلوم ہوا کہ ناگ پور قریب آ رہا ہے۔ سا
رستہ مسافروں نے ہمیں خوب کھلایا پلایا۔ پہلے مسافر اتر جاتے تو دوسرے مسافر آ
ہماری خدمت شروع کر دیتے۔ آخر گاڑی ناگ پور پہنچ گئی۔ ناگ پور بھارت کے و
میں واقع ہے۔ یہاں کے ناگ پوری سنگترے کسی زمانے میں بڑے مشہور تھے۔ لیک
پاکستان کے کنوؤں نے اس کی شہرت ختم کر دی ہے۔ ہندو سکھ پاکستان آتے ہیں
پاکستان کے کینو سوغات کی طرح ٹوکروں میں بھر کر ساتھ لے جاتے ہیں اور بھارت
جا کر دوستوں رشتے داروں کو بطور تحفہ دیتے ہیں۔

ناگ پور کا سٹیشن کافی وسیع تھا۔ شہر بھی کافی بڑا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رکی
میں اور کانچی باہر آ گئے۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"اب ہمیں معلوم کرنا چاہئے کہ یہاں مہاناگ مندر کس جگہ پر ہے۔"

ہم نے سٹیشن پر ہی معلوم کر لیا کہ مہاناگ مندر بھاگیری ندی کے دوسر
کنارے پر سرخ چٹانوں کے درمیان واقع ہے۔ ٹرین میں ہی مسافروں نے ہمیں
زبردست ناشتہ وغیرہ کروا دیا تھا۔ ہمیں بالکل بھوک نہیں تھی۔ ناگ پور شہر میں رکـ
چل رہے تھے۔ یہ سائیکل رکشے تھے۔ ابھی وہاں موٹر رکشے نہیں آئے تھے۔ ہمار
پاس تھوڑے سے پیسے تھے۔ ہم نے ایک رکشے والے کو روک کر کہا کہ ہمیں مہاناگ
مندر جانا ہے۔ کتنے پیسے لو گے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج! میں تو آپ کا سیوک ہوں۔ بیٹھئے میں مندر لئے چلتاہوں۔"

اس نے ہمیں ناگ مندر پہنچا دیا اور ایک پیسہ بھی نہ لیا۔ ہم نے دور سے ایک
اونچی جگہ پر سرخ چٹانوں کے درمیان مندر کے کلس کو دیکھا تو وہیں اتر گئے۔ ہما
ارادہ مندر کی پچھلی جانب سے داخل ہونے کا تھا۔ تاکہ اگر پنڈت مندر میں گیٹ

پاس کہیں موجود ہو تو ہمیں نہ دیکھ لے۔ یہ جگہ غیر آباد تھی۔ سرخ چٹانوں کا سلسلہ
دور تک پھیلا ہوا تھا۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ کہیں کہیں تاڑ کے درخت بھی تھے۔ مندر
کے اردگرد املی کے کچھ درخت کھڑے تھے۔

مندر کے عقب میں ایک صحن تھا جہاں جگہ جگہ سانپوں کے بت بنا کر چھوٹے
چھوٹے چبوتروں پر رکھے ہوئے تھے۔ یاتری اور پوجا کرنے والے مرد اور عورتیں آ کر
ان بتوں پر پھول چڑھاتیں اور ماتھا ٹیکتیں۔ سامنے مندر کا عقبی دروازہ تھا۔ دروازے
کے آگے ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس کی سیڑھیوں پر مجھے کچھ عورتیں اور مرد نہاتے
ہوئے نظر آئے۔ عورتوں نے باریک ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کو ایک
دوسرے سے کوئی شرم و حیا محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"کیا خیال ہے ہمیں مندر میں داخل ہونا چاہئے یا باہر بیٹھ کر جائزہ لینا چاہئے؟"

کانچی بولی۔ "میرا خیال ہے ہم یہاں ایک طرف تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاتے
ہیں۔"

وہاں اور بھی کئی سادھو وغیرہ دھونی رما کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے دھونی تو نہ
رمائی۔ بس ویسے ہی ایک درخت کے پاس بیٹھ گئے۔ ہم دیر تک بیٹھے رہے۔ تب کانچی
کہنے لگی۔

"اس طرح کب تک بیٹھے رہیں گے۔ تم ٹھہرو۔ میں اندر جا کر حالات کا جائزہ لیتی
ہوں۔"

کانچی مندر کے عقبی دروازے میں سے اندر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد ایک ادھیڑ عمر عورت اپنے ادھیڑ عمر مرد کے ساتھ میرے
پاس آئی۔ دونوں نے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔ باری باری میرے پاؤں چھوئے اور میرے
سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے جوگی سمجھ کر آ گئے ہیں۔ میں نے بھی
جوگیوں کے انداز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے بچہ۔۔۔ میرے پاس کس لئے آئے ہو؟"

مرد نے ہاتھ باندھ کر عاجزی سے کہا۔

"مہاراج! ہم پر بڑی پتا آن پڑی ہے۔ ہماری مدد کریں۔"

میں نے سوچا یہ خوامخواہ اپنی پتا سنا کر میرے کان کھائے گا میں خود پتا میں پڑا ہ ہوں۔ میں نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کہا۔

"جاؤ بابا جاؤ کسی دوسرے سادھو کو جا کر اپنی پتا سناؤ۔"

وہ بولا۔ "مہاراج! میری پتا یہاں کوئی نہیں سنتا۔ جو سنتا ہے اسے یقین نہیں آتا۔"

مجھے تھوڑی سی دلچسپی پیدا ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا ہے تمہاری پتا؟"

وہ کہنے لگا۔

"مہاراج! میرا ایک ہی جوان بیٹا ہے۔ اس کا نام رامو ہے مہاراج --- وہ ش
کے سب سے بڑے سیٹھ کی کوٹھی میں ملازم تھا سیٹھ نے اس پر چوری کا جھوٹا الزام کر حوالات میں بند کرا دیا ہے۔ مہاراج میرا بیٹا بے گناہ ہے۔"

میں نے بیزاری سے کہا۔

"جا کر کسی وکیل سے بات کرو۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

وہ بولا۔ "مہاراج! اصلی چور کو میں جانتا ہوں میں نے اسے چوری کرتے ہم دیکھا ہے۔ مگر میری بات کا کسی کو یقین نہیں آتا۔"

میں نے تعجب سے کہا۔

"کیسے پاگل آدمی ہو۔ اگر اصلی چور کو جانتے ہو اور تم نے اسے چوری کرتے ہم دیکھا ہے تو تھانیدار کے پاس کیوں نہیں جاتے۔ جا کر اسے کہو کہ اصلی چور کو گرفتار ک لے اور تمہارے بیٹے کو چھوڑ دے۔"

وہ آدمی بولا۔ "مہاراج! اصلی چور ایک سانپ تھا۔ نیلے رنگ کا سانپ۔۔ اسے اب کون پکڑے گا وہ تو چوری کر کے نکل گیا تھا۔"

میرے تھوڑے سے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے پوچھا۔

"اس نیلے سانپ نے کیا چیز چوری کی تھی؟ بھلا سانپ بھی کبھی چوری کرتا ہے؟"

اب اس آدمی نے مجھے جو کہانی سنائی وہ یہ تھی۔ جس مال دار سیٹھ کے ہاں اس کا بیٹا ملازم تھا وہ شہر کا بڑا امیر سیٹھ تھا۔ اس کی ایک انگوٹھی تھی جس میں ایک انمول ہیرا جڑا ہوا تھا۔ اس ہیرے کی قیمت کروڑوں روپے میں تھی۔ شہر ناگ پور میں اس ہیرے کا بڑا چرچا تھا۔ شہر میں سب کی زبان پر تھا کہ سیٹھ رام داس کے پاس ایک ایسا ہیرا ہے اس کی انگوٹھی میں جڑا ہوا۔ جس کی قیمت برطانیہ کے ملک کا بادشاہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔ وہ ہیرا آج تک کوئی چور اچکا بھی چوری نہیں کر سکا تھا۔ کیونکہ سیٹھ سارا دن انگوٹھی پہنے رکھتا تھا۔ صرف رات کے وقت ہیرے والی انگوٹھی اتار کر اپنے کسی نوکر کے کواٹر میں رکھ دیتا تھا کہ غریب نوکر کے بارے میں کون یقین کرے گا کہ اس کے پاس اتنی قیمتی انگوٹھی ہو گی۔ ایسا وہ چوروں ڈاکوؤں کو دھوکا دینے کے لئے کرتا تھا۔ وہ ہیرے والی انگوٹھی باری باری اپنے گیارہ ملازموں کے کواٹر میں چھپا دیتا تھا۔ اور نوکروں کو اس نے خبردار کر رکھا تھا کہ اگر ان کے ہاں سے انگوٹھی چوری ہوئی تو وہ انہیں ساری عمر کے لئے جیل بھجوا دے گا۔ ایسا وہ اس خیال سے کہتا تھا کہ اگر کسی نوکر کے دل میں خیال آ جائے کہ وہ کسی چور ڈاکو کے ساتھ مل کر انگوٹھی چوری کروا دے تو وہ اس ارادے سے باز رہے۔ اس کے ساتھ ہی سیٹھ نے کچھ ہٹے کٹے باڈی گارڈ ملازم رکھے ہوئے تھے جو اس رات کواٹر کے باہر چھپ کر پہرہ دیتے تھے کہ کوئی چور انگوٹھی چرانے کے لئے وہاں نہ آ جائے۔

اس آدمی نے داستان سناتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! آج صبح صبح منہ اندھیرے کی بات کرتا ہوں۔ آج رات کو سیٹھ کی قیمتی ہیرے کی انگوٹھی ہمارے کواٹر میں رکھی گئی تھی۔ میرے بیٹے نے اسے گتے کی ایک ڈبی میں بند کر کے اپنے سرہانے کے پاس رکھ دیا تھا۔ اس رات ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ساری رات جاگ کر گزاریں گے۔ میں، میری بیوی اور میرا اکلوتا بیٹا ہم ساری رات

جاگتے رہے اور چوکی پر رکھی اس ڈبی کی حفاظت کرتے رہے جس میں سیٹھ رام داس کی قیمتی انگوٹھی بند تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم اسے نکال کر دیکھ بھی لیتے تھے۔ جس وقت رات کا پچھلا پہر ہوا تو ایک عجیب بات ہوئی۔ میری بیوی سو گئی تھی۔ میں اور میرا بیٹا ہم دونوں جاگ رہے تھے کوٹھڑی میں بجلی کا بلب روشن تھا۔ ہیرے کی انگوٹھی والی ڈبی چوکی پر ہمارے سامنے پڑی تھی کہ اچانک مجھے سرسراہٹ کی آواز آئی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ پھر ہلکی سی پھنکار کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ ایک نیلے رنگ کا لمبا سانپ پھن اٹھائے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں اور میرا بیٹا اٹھ کر پرے ہٹ گئے۔ میں نے بیٹے سے کہا۔ اسے مار ڈالو۔ سانپ ہے۔ وہ کوئی ڈنڈا وغیرہ تلاش کرنے لگا۔ اتنے میں نیلے سانپ کے منہ سے ایک شعلہ سا نکلا۔ ہم ڈر کر دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ سانپ ہماری طرف آنے کی بجائے چوکی کی طرف گیا جس پر ہیرے کی انگوٹھی والی گتے کی ڈبی پڑی تھی۔ سانپ نے ہمارے دیکھتے دیکھتے انگوٹھی والی ڈبی کو منہ کھول کر پکڑا اور جدھر سے آیا تھا ادھر کو واپس چلا گیا۔ ہم سہمے ہوئے سانپ کو تکتے ہی رہ گئے۔ جب ذرا ہوش آیا تو ہم نے باہر نکل کر شور مچا دیا کہ سانپ سیٹھ صاحب کی انگوٹھی لے کر بھاگ گیا ہے۔ کوارٹر کے پاس سیٹھ کے جو خفیہ باڈی گارڈ چھپے ہوئے تھے وہ بھی نکل آئے۔ کوارٹر کے دوسرے ملازم بھی جاگ پڑے۔ کسی نے میری بات کا یقین نہ کیا۔ سب یہی کہتے تھے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ مہاراج! یہ میری بپتا ہے جو میں نے آپ کو سنا دی۔ سیٹھ کو پتہ چلا تو اس نے میرے اکلوتے بیٹے کو حوالات میں بند کروا دیا....."

اپنی عجیب و غریب کہانی سنانے کے بعد وہ آدمی اور اس کی بیوی آنسو بہانے لگے۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو وہ بھی اس کی بات پر یقین نہ کرتا اور یہی کہتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سیٹھ کی قیمتی انگوٹھی تم دونوں باپ بیٹے نے چرائی ہے۔ لیکن میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ واردات ناگ پور شہر میں ہوئی تھی۔ پنڈت چترویدی پاروتی ناگن کو اغوا کر کے اسی شہر میں لایا تھا۔ پاروتی میں یہ طاقت تھی کہ وہ

عورت سے ناگن بن جاتی تھی اور ناگن سے دوبارہ عورت کے روپ میں آ جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ ناگن بنتی تھی یعنی سانپ کا روپ بدلتی تھی اس سانپ کا رنگ نیلا ہوتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ پنڈت سانپوں کے علم کا ماہر ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ جس عورت پاروتی کو ہم اس کے پاس علاج کے لئے لے کر آئے ہیں اصل میں وہ بڑی طاقت والی عورت ہے مگر اس کی طاقت کچھ وقت کے لئے یادداشت کے ساتھ غائب ہو گئی ہے۔ پنڈت نے اپنے علم کے زور سے یہ بھی معلوم کر لیا ہو گا کہ یہ عورت ناگن ہے اور ناگن کا روپ بدل سکتی ہے اور اس سے ناگن کے روپ میں بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسے اغوا کر کے ناگ پور لے آیا کیونکہ ناگ پور کا مہاناگ کا مندر اپنی دولت ہیرے جواہرات کے خزانے کے لئے سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ پنڈت نے سکیم بنائی ہو گی کہ وہ پاروتی ناگن کو اپنے خاص منتروں کی مدد سے سانپ کے روپ میں بدل لے گا اور شہر میں کسی خفیہ جگہ ٹھکانہ بنا کر اس کے ذریعے ناگ مندر کے تمام قیمتی ہیرے جواہرات چوری کر لے گا۔ مہاناگ مندر کی دولت چرانے سے پہلے اس نے بطور امتحان پاروتی کو ناگن کے روپ میں سیٹھ کی قیمتی ہیرے کی انگوٹھی چرانے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ پنڈت نے معلوم کر لیا ہو گا کہ سیٹھ ہر رات اپنی انگوٹھی کسی نوکر کے گھر میں رکھتا ہے اور آج رات وہ اپنی انگوٹھی اس بدنصیب آدمی کے کوارٹر میں رکھنے والا ہے جو میرے پاس بیٹھا مجھے اپنی کہانی سنا کر آنسو بہا رہا تھا۔ چنانچہ پنڈت نے رات کے پچھلے پہر پاروتی ناگن کو سانپ کے روپ میں نوکر کے کوارٹر میں بھیجا۔ سانپ انگوٹھی منہ میں ڈال کر پنڈت کے پاس لے گیا۔

واقعات کی کڑیاں آہستہ آہستہ کھلتی چلی گئی تھیں اور میرے سامنے یہ بات واضح ہو گئی کہ بدمعاش پنڈت اسی شہر میں کسی خفیہ جگہ پر موجود ہے۔ کم از کم وہ اس مندر میں نہیں ہے۔ اور پاروتی ایک سانپ کی شکل میں اس کے پاس ہی ہے۔ اس دوران کانچی بھی واپس آ گئی۔ اس نے میرے پاس ایک بوڑھی عورت اور مرد کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو کوئی خاص خیال نہ کیا۔ مجھے کہنے لگی۔

"میں نے سارا مندر چھان مارا ہے۔ وہ آدمی جس کی ہمیں تلاش ہے۔ کہیں نہیں ہے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جس آدمی کی ہمیں تلاش ہے اس کا سراغ مل گیا ہے۔"

کانچی حیرت سے مجھے تکنے لگی۔

"کہاں ہے وہ؟"

"بیٹھو تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

کانچی حیرت سے مورت بنی میرے پاس بیٹھ گئی۔

میں کانچی کو وہ ساری کہانی سنانے لگا جو مجھے اس بوڑھے آدمی نے سنائی تھی تو مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں کے سامنے مجھے پاروتی ناگن کے بارے میں بات نہیں کرنی چاہئے۔ میں نے دونوں بوڑھے میاں بیوی سے کہا۔

"تم سامنے والے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی تمہیں بلاؤں گا۔"

دونوں بے چارے میرے اور کانچی کے پاؤں چھو کر اٹھے اور سامنے والے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے جس طرح ان لوگوں کی بپتا سنی تھی اور جس قسم کے ان سے سوال پوچھے تھے اس سے دونوں بوڑھے میاں بیوی کو امید پیدا ہو گئی تھی کہ میں ان کے دکھ کا علاج کر سکوں گا۔

تب میں نے نیلے سانپ کے ہیرے کی انگوٹھی چرا کر لے جانے کی ساری کہانی کانچی کو بیان کر دی۔ وہ بڑے غور سے سنتی رہی۔ کہنے لگی۔

"ہو نہ ہو یہ تمہاری ناگن دیوی ہی سانپ کے روپ میں انگوٹھی چرانے ان لوگوں کے کوارٹر میں گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ مکار پنڈت بھی اسی شہر میں ہے اس مندر میں میں نے سارا دیکھ لیا ہے۔ وہ مندر میں نہیں ہے۔"

میں نے کانچی سے کہا۔

"سب سے پہلے ہمیں پنڈت کی بجائے ناگن پاروتی کا کھوج لگانا ہو گا۔"

کانچی نے پوچھا۔

"ناگن دیوی تو سانپ کے روپ میں ہو گی اس کا سراغ ہمیں کیسے ملے گا؟"

میں نے جیب سے وہ رومال نکال کر اسے دکھایا جس میں سے پاروتی کے جسم کی بُو آتی تھی۔ میں نے کہا۔

"یہ پاروتی کا رومال ہے۔ اس میں اس کی بو رچی ہوئی ہے۔"

میں نے کانچی کو پاروتی کے بارے میں اصل واقعات بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کانچی نے رومال کو پکڑ کر سونگھا۔ کہنے لگی۔

"مجھے تو اس میں سے کوئی بو محسوس نہیں ہوئی۔"

میں نے اسے بتایا کہ اس بو کو صرف کوئی سانپ ہی محسوس کر سکتا ہے۔

"اور اگر ہمیں کوئی سانپ مل جائے تو ہم اسے رومال کو بو سنگھا کر پاروتی کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ سانپ اس رومال میں سے ناگن پاروتی کی بو سونگھ کر اس کی تلاش میں چل پڑے گا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

میں نے کہا کہ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں پاروتی دیوداسی کی طاقت سے واقف ہوں۔

"اور پھر میں سانپ کو حکم دوں گا کہ اس رومال میں سے جس ناگن کی بو آ رہی ہے اس کی تلاش میں نکل پڑے۔"

کانچی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو سکے گا۔ مگر اس کو بھی دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ مکار پنڈت کو اتنے بڑے شہر ناگ پور میں تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا اور اگر فرض کر لیا جائے اگر ہم اس کو ڈھونڈھ بھی لیتے ہیں تو وہ پاروتی ناگن کو جو یقیناً سانپ کے روپ میں ہو گی چھپا دے گا اور کبھی ہمارے حوالے نہیں کرے گا۔ اس لئے سب سے بہتر ترکیب یہی تھی کہ مکار پنڈت کی بجائے ناگن پاروتی تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"ہمیں کوئی ایسا سانپ حاصل کرنا ہو گا جس کی عمر دوسرے سانپوں کے مقابلے

میں زیادہ ہو۔"

کانچی کہنے لگی۔

"یہاں مہاناگ مندر میں بڑے بڑے پرانے سانپ ہیں چل کر دیکھتے ہیں۔ ہمیں کوئی نہ کوئی بوڑھا سانپ مل جائے گا۔"

دونوں بوڑھے میاں بیوی کچھ فاصلے پر درخت کے نیچے بیٹھے ہمیں باتیں کرتے دیکھ رہے تھے۔ کانچی نے کہا۔

"ان دونوں کو تم نے کس لئے بٹھا رکھا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔"

میں نے اشارے سے دونوں بوڑھے میاں بیوی کو بلایا۔ وہ ہاتھ باندھے جلدی سے ہمارے پاس آ کر ادب سے بیٹھ گئے۔ میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

"تم یہاں ٹھہرو۔ ہم تمہارے ساتھ تمہارے کوارٹر میں جا کر وہ جگہ دیکھیں گے جہاں سے نیلے سانپ نے ہیرے کی انگوٹھی چرائی تھی۔"

"جو حکم مہاراج!"

ہم دونوں میاں بیوی کو وہیں چھوڑ کر مہاناگ مندر کی طرف چلے۔ مندر میں یاتریوں اور پوجا کرنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ ہم دونوں جوگیوں کے بھیس میں تھے۔ کانچی مجھے مندر کے پیچھے جو صحن تھا وہاں لے گئی۔ یہاں پتھروں کے سانپوں کے بڑے بڑے مجسمے لگے تھے جن کے درمیان ہر قسم کے سانپ رینگ رہے تھے۔ کانچی کہنے لگی۔

"مہاراج! تمہیں سانپ کچھ نہیں کہتے۔ تم کوئی سانپ جو ذرا زیادہ عمر کا ہو پکڑ لو۔ اگرچہ اس مندر کے سانپوں کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ کسی کو نہیں ڈستے مگر پھر بھی مجھے ڈر لگتا ہے۔"

پاروتی کے جسم کی بو والا رومال میرے پاس تھا۔ میں ایک ایسی جگہ پر آ گیا جو ایک اونچے پتھر کی اوٹ میں تھی۔ یہاں قسم قسم کے رنگوں اور سائز کے سانپ ادھر ادھر

رینگ رہے تھے۔ میں نے ایک سانپ کو دیکھا جو سب سانپوں سے الگ چھوٹے سے پتھر کے پاس کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ مجھے یونہی محسوس ہوا کہ یہ سانپ باقی سارے سانپوں سے سمجھدار اور سنجیدہ سانپ ہے۔ یقیناً اس کی عمر بھی زیادہ ہو گی۔ اسی لئے یہ سب سے الگ بیٹھا ہے۔ میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا اچانک سانپ نے اپنی گردن اونچی کی۔ پھر ہلکی سی پھنکار مار کر اپنا پھن کھول دیا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ سانپ نے آہستہ سے اپنا پھن میرے آگے کر کے جھکا دیا۔

سانپ نے ناگن پاروتی والے رومال کی بو محسوس کر لی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سانپ کو پکڑا اور اسے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کانچی دو قدم پیچھے کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ سانپ ٹھیک رہے گا ناں؟"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے یہ ان سب سانپوں کا جوگی سانپ ہے۔ سب سے الگ گیان دھیان میں لگا تھا۔ چلو اب دونوں میاں بیوی کے ساتھ ان کے گھر چلتے ہیں۔"

سانپ کو میں نے کلائی کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ یہ زیادہ لمبا سانپ نہیں تھا۔ ہم مندر کے صدر دروازے والے صحن میں درخت کے پاس آ گئے۔ دونوں ادھیڑ عمر میاں بیوی ہمیں دیکھ کر ادب سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے بوڑھے سے کہا۔

"چلو۔ ہمیں اپنے کواٹر میں لے چلو۔"

اس کا کواٹر مہاناگ مندر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ شہر کے شمالی علاقہ تھا۔ کھیتوں کے پاس غریبانہ چھ سات کواٹر تھے۔ دونوں میاں بیوی ہمیں اپنے کواٹر میں لے گئے اور کوٹھڑی میں وہ چارپائی دکھائی جس کے پاس وہ چوکی پڑی تھی جہاں سے سانپ نے ہیرے کی انگوٹھی والی ڈبی اٹھائی تھی۔

اس کوٹھڑی میں ناگن پاروتی کی بو ابھی تک موجود تھی۔ یہ ہمیں محسوس نہیں ہو تھا مگر میری کلائی کے ساتھ لپٹے ہوئے سانپ کو فوراً محسوس ہو گیا۔ وہ میری کلائی سے

اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے سانپ کی یہ کیفیت دیکھ کر کانچی سے کہا۔

"کانچی! اس سانپ نے ناگن کی بو محسوس کر لی ہے۔ یہ رومال والی بو کے مقابلے میں زیادہ تیز ہے۔ کیونکہ ناگن نیلے سانپ کے روپ میں پچھلی رات کو یہاں آئی تھی۔"

وہ بولی۔ "تو پھر اپنا عمل شروع کر دو۔"

میں نے سانپ کو نیچے چوکی کے پاس اتار دیا اور اس کی طرف ذرا سا جھک کر کہا۔

"اگر تم میری زبان سمجھ رہے ہو تو سنو! یہاں تمہاری دیوی ناگن رات کو آئی تھی۔ یہاں اس کی بو تم نے سونگھ لی ہے۔ ہمیں اس کے پاس لے چلو۔"

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا لیکن مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ سانپ نے میرے الفاظ سمجھے ہوں گے۔ مگر میں حیران رہ گیا جب سانپ نے چوکی کے ساتھ اپنا منہ لگا دیا۔ جیسے وہ چوکی کو سونگھ رہا ہو۔ اس کے بعد وہ کوٹھڑی کے صحن میں نکل گیا۔ میں اور کانچی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ دونوں میاں بیوی پر میرے اس عمل کا بہت اثر ہوا۔ وہ ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ اپنے کواٹر میں ہی رہیں اور ہمارے ساتھ نہ آئیں۔

"سانپ ہمیں وہاں لے جا رہا ہے جہاں سیٹھ ہیرے کی انگوٹھی چرانے والا سانپ رہتا ہے۔ ہم انگوٹھی لے کر تمہارے پاس آ جائیں گے۔"

دونوں میاں بیوی ہمیں دعائیں دیتے وہیں بیٹھ گئے۔ اس دوران سانپ کواٹر کے صحن میں سے گزر کر باہر نکل چکا تھا۔ کانچی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس نے مجھے اشارے سے بلایا میں تیز تیز قدموں سے چلتا اس کے پاس آ گیا۔ ہم نے دیکھا کہ سانپ کواٹروں کے آگے جو کچا راستہ تھا اس کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ رات کو ناگن پاروتی نیلے سانپ کے روپ میں قیمتی انگوٹھی لے کر اسی راستے سے گزری تھی۔ ہمارا سانپ اسی راستے پر پاروتی کی بو لیتا چلا جا رہا تھا۔

دوسرے کواٹروں میں سے کچھ مرد عورتیں اور بچے باہر نکل کر یہ تماشہ دیکھنے لگے

کہ ایک سانپ زمیں پر رینگتا ہوا آگے آگے جا رہا ہے اور ایک جوگی اور جوگن اس کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔ سانپ ایک جگہ پہنچ کر کھیتوں میں اتر گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے کھیتوں میں اتر گئے۔ کچھ دور تک تماشہ دیکھنے والے مرد اور بچے ہمارے ساتھ آئے۔ پھر وہ واپس چلے گئے۔ اس وقت سانپ کھیتوں میں سے نکل کر ایک کھلے میدان میں آگیا ہوا تھا۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ ہم بھی اس کے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ کانچی کہنے لگی۔

"اب مجھے پورا وشواش ہے کہ یہ سانپ ہمیں ناگن دیوی کے نیلے سانپ کے پاس لے جائے گا۔"

میں بھی بہت حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔

سانپ میدان میں سوکھی گھاس اور جھاڑیوں میں سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔ میدان ختم ہوا تو سامنے ریلوے لائن آگئی۔ سانپ ریلوے لائن پر چڑھ گیا۔ اس وقت ایک ٹرین ناگ پور ریلوے سٹیشن کی طرف آ رہی تھی۔ انجن ڈرائیور نے لائن کے قریب ہمیں دیکھ کر زور سے وسل دیا۔ سانپ ریل کی پٹڑی پر چڑھ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ ریلوے لائن عبور کر کے دوسری طرف جانا چاہتا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ گاڑی کے نیچے نہ آ جائے۔ کیونکہ گاڑی بہت قریب آگئی تھی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم دونوں لائن پار کرتے۔ ہم وہیں ریلوے لائن سے چند قدم دور زمین پر بیٹھ گئے۔ ہماری نظریں ریل کی پٹڑی پر لگی تھیں۔ میں نے سانپ کو لائن کے اوپر سے بڑی تیزی سے گزرتے دیکھا۔ اتنے میں ٹرین آگئی اور شور مچاتی دھڑ دھڑاتی ہمارے سامنے سے گزرنے لگی۔ ریل گاڑی کے گزرتے ہی ہم نے دوڑ کر ریلوے لائن پار کی اور سانپ کو تلاش کرنے لگے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سانپ لائن کی دوسری طرف نیچے ایک جھاڑی کے پاس کنڈلی مار کر یوں بیٹھا تھا جیسے ہمارا انتظار کر رہا ہو۔

ہم اس کے قریب آئے تو وہ آگے چل پڑا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! لگتا ہے سانپ کو پتہ چل گیا ہے کہ ہمیں ناگن دیوی کی تلاش ہے۔"

کانچی پہلے ہی توہم پرست تھی کہنے لگی۔

"مہاراج! یہ سانپ ضرور کوئی رشی منی ہے اس سے کوئی پاپ ہو گیا ہو گا کہ اس نے سانپ کے روپ میں جنم لیا۔"

میں ان باتوں پر یقین رکھتا تھا نہ مجھے ان سے کوئی دلچسپی تھی۔ ہم سانپ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ سانپ کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی جگہ رک جاتا۔ گردن اٹھا کر اپنی زبان بار بار باہر نکالتا۔ اتنا مجھے معلوم ہو گیا ہوا تھا کہ سانپ اپنی زبان کے ذریعے فضا کو سونگھتا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر آگے چل پڑتا۔ اسی طرح سانپ کے پیچھے پیچھے چلتے جب ہمیں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو ہم تھک گئے۔ ہم ناگ پور شہر کے جنوب کی جانب کافی دور نکل آئے تھے۔ آہستہ آہستہ شہر ناگ پور کی آبادیاں پیچھے رہتی جا رہی تھیں۔ کانچی بہت تھک گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"سانپ کو پکڑ لو۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

میں نے آگے بڑھ کر سانپ کو پکڑ لیا اور وہیں بیٹھ گئے۔ سانپ کو میں نے کلائی کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ وہ اپنا سر اٹھائے منہ سامنے کی طرف کئے بار بار زبان باہر نکال رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے سامنے کی جانب سے ناگن پاروتی کے سانپ کی مسلسل بو آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے وہ بدمعاش پنڈت پاروتی کو لے کر شہر سے بہت دور نکل گیا ہے۔"

کانچی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"کہیں وہ اور آگے نہ نکل جائے؟"

مجھے بھی فکر لگا کہ اگر پنڈت ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو ہماری ساری محنت رائیگاں چلی جائے گی۔ چنانچہ تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد میں نے سانپ کو چھوڑ دیا۔ سانپ تیزی سے آگے چل پڑا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ آگے ایک ندی آگئی۔ ندی پر پل بنا ہوا تھا۔ ہم پل پر سے گزر کر ندی پار کر گئے۔ آگے ایک میدان

تھا۔ میدان میں کہیں کہیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے تھے۔ ہم میدان سے بھی گزر گئے۔ اس کے بعد ویران علاقہ شروع ہو گیا۔ ہماری بائیں جانب کچھ کارخانوں کی چمنیاں آہستہ آہستہ ہم سے دور ہوتی چلی گئیں۔ ایک کچا راستہ تھا جس پر کچھ آدمی سائیکلوں پر سوار جا رہے تھے۔ ایک بیل گاڑی گزر گئی۔ سانپ اس کچے راستے کو پار کر کے سامنے کی جانب جا رہا تھا جدھر جھاڑیاں تھیں اور دور درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔

سانپ رکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد دو تین مکان تھے۔ سانپ ان کے قریب سے نکل گیا۔ ہمیں سانپ کے پیچھے پیچھے چلتے مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ایک اونچی جگہ تھی۔ جیسے کسی نے بند باندھا ہوا ہو۔ اس کی دوسری جانب آئے تو دیکھا کہ سامنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ یہ وہی جھنڈ تھے جو ہمیں دور سے نظر آ رہے تھے۔ کانچی کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے آگے کوئی جنگل ہے۔"

مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ناگ پور کے جنوب میں آگے جا کر گھنا جنگل آ جاتا تھا۔ یہ جنگل اس قدر گھنا اور ویران تھا کہ دن کے وقت بھی ادھر لکڑیاں کاٹنے والے چھ سات آدمیوں کی ٹولی بنا کر جاتے تھے کہ اگر کوئی جنگلی درندہ حملہ کر دے تو اس کا مقابلہ کر سکیں۔ سانپ درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا تھا۔ کانچی کا سانس چلتے چلتے پھول گیا تھا۔ کہنے لگی۔

"سانپ کو روک لو۔ مجھ سے اب چلا نہیں جاتا۔"

میں نے دوڑ کر سانپ کو زمین پر سے اٹھا لیا۔ ہم ایک بار پھر وہیں بیٹھ کر آرام کرنے لگے۔ ہم اونچے اونچے گھنے درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ اس جنگل کے درختوں کی یہ پہلی قطار تھی۔ آگے اونچی اونچی جنگلی جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ کانچی کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔ کہنے لگی۔

"مجھے تو اس جنگل میں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن سانپ اندر جا رہا ہے۔ مجھے تو اس کا پیچھا کرنا ہی پڑے گا۔ ایسا کرتے ہیں تم ان درختوں کے نیچے بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ میں سانپ کے ساتھ جاتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ مکار پنڈت نے اس جنگل میں ہی کہیں ٹھکانہ بنایا ہوا ہو گا۔"

کانچی نے دائیں بائیں ایک نگاہ ڈالی اور کہا۔

"نہیں نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی میں یہاں اکیلی نہیں ٹھہر سکتی۔ یہاں مجھے بہت ڈر لگے گا۔"

دس پندرہ منٹ تک ہم وہاں بیٹھے رہے۔ اس کے بعد میں نے سانپ کو چھوڑ دیا اور اس کے پیچھے چلنے لگے۔ آگے اونچی اونچی گھاس تھی۔ سانپ کو نگاہ میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہمیں سانپ کے بالکل ساتھ لگ کر چلنا پڑ رہا تھا۔ خطرہ تھا کہ سانپ ایک بار نظروں سے اوجھل ہو گیا تو گھنی گھاس میں وہ پھر دکھائی نہیں دے گا۔

ہم گھاس کو ادھر ادھر ہٹا کر سانپ پر نگاہ رکھے آگے بڑھ رہے تھے۔ جنگل میں عجیب وحشتناک قسم کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی درخت پر سے پرندے کی بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جیسے جیسے ہم جنگل میں آگے جا رہے تھے جنگل زیادہ سنسان اور گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ کانچی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کہیں یہ سانپ بھی ہمیں دھوکہ تو نہیں دے رہا۔ کہیں یہ خود تو نہیں بھٹک گیا۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے ایسی بات نہیں ہے۔ سانپ اس وقت سے بالکل سیدھ میں چلا جا رہا ہے۔ اگر وہ بھٹک گیا ہوتا یا اسے ناگن پاروتی کی بو نہ آ رہی ہوتی تو سیدھا جانے کی بجائے ادھر ادھر دوڑ جاتا۔"

اونچی گھاس کا سلسلہ ختم ہوا تو پتھریلی زمین شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے پتھروں کے درمیان سے ہو کر سانپ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ ایک دو اونچی اونچی سیاہ رنگ کی چٹانوں کے قریب سے گزرے۔ پھر ایسے درخت دیکھے کہ جن کی جڑیں زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ان کی گھنی شاخیں نیچے تک آ گئی تھیں۔ ان کے تنوں پر جنگلی بیلیں

چڑھی ہوئی تھیں۔ کانچی میرے چلنے کی بجائے اب ڈر کے مارے بالکل میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی اور تھوڑی دور چلنے کے بعد پیچھے گردن پھیر کر دیکھ لیتی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"تم پیچھے کیوں دیکھتی ہو؟"

وہ بولی۔ "مجھے ڈر ہے پیچھے سے کوئی شیر چیتا حملہ نہ کر دے۔"

اس کا ڈر خوف حق بجانب تھا۔ مجھے خود کسی وقت ڈر لگنے لگتا کہ کسی طرف سے اچانک کوئی شیر یا چیتا نکل آیا تو ہم کیا کریں گے۔ ہمارے پاس تو پنسل بنانے والا چاقو تک نہیں تھا۔ ہم جنگل میں جب کافی دور نکل آئے تو اچانک سانپ رک گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر پھن کھول لیا اور سامنے کی جانب دیکھتے ہوئے بار بار پھنکارنے لگا۔

سامنے اونچی اونچی جنگلی جھاڑیوں نے ایک دیوار سی بنا رکھی تھی۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! میرا خیال ہے ہم پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے سانپ کو اٹھا لیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جھاڑیوں کی دیوار کو ایک جگہ سے ہٹایا تو دیکھا کہ آگے ایک پرانا تالاب تھا۔ تالاب کے کنارے کسی حویلی کا بوسیدہ کھنڈر تھا تالاب کی سطح پر بڑے بڑے پتے پھیلے ہوئے تھے۔ کانچی بھی میرے پاس جھک کر یہ منظر دیکھنے لگی۔ میں نے سانپ کو درمیان سے پکڑ کر ذرا آگے کیا تو وہ اپنا سر کھنڈر کی طرف بار بار اٹھانے اور پھنکارنے لگا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! مجھے یقین ہے کہ مکار پنڈت اس کھنڈر میں رہتا ہے اور ناگن پاروتی بھی وہاں موجود ہے۔"

کانچی اور میں اس جگہ جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ میں نے سانپ کو کلائی کے گرد لپیٹ کر اس کی گردن پکڑے رکھی تا کہ وہ میری کلائی سے اتر نہ جائے۔ کیوں کہ وہ کھنڈر کی طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کانچی کہنے لگی۔

"میں پہلے آگے جا کر دیکھتی ہوں کہ کھنڈر خالی ہے یا وہاں کوئی رہتا ہے۔"

میں نے اسے روک دیا۔

"نہیں نہیں۔ ابھی ٹھہرو۔ ہمیں بہت سوچ کر کوئی قدم اٹھانا ہو گا۔"

میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں اکیلا آگے جاتا ہوں۔ جب کانچی کو بتایا کہ میں اکیلا جا رہا ہوں تو اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو پکڑ لیا۔ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"بھگوان کے لئے مجھے اکیلی چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ چلو۔ مگر میرے پیچھے پیچھے آنا۔"

تالاب کے کناروں پر بہت جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے چل رہے تھے۔ کھنڈر کے قریب پہنچے تو میری کلائی میں لپٹا ہوا سانپ بے چین ہو گیا۔ اس نے پھن کھول لیا اور پھنکارنے لگا۔ وہ میری کلائی سے نکل جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے پکڑے رکھا۔ یہ کسی پرانی حویلی کا کھنڈر تھا جس کا آدھے سے زیادہ حصہ ڈھے چکا تھا۔ جس طرف سانپ کا منہ تھا ہم اس طرف سے کھنڈر میں داخل ہو گئے۔ ٹوٹی پھوٹی ڈیوڑھی میں مٹی اور پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ آگے ایک چھوٹا سا صحن تھا جس میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہم رک گئے۔

سانپ نے پھنکارنا بند کر دیا تھا مگر وہ کونے کی جانب کوٹھڑی کا جو دروازہ نظر آ رہا تھا اس طرف منہ کر کے بار بار اپنی دوشاخہ زبان کھول رہا تھا۔ میں نے کانچی سے سرگوشی میں کہا۔

"اس کوٹھڑی میں کچھ ہے۔ سانپ اس طرف اشارہ کر رہا ہے۔"

کانچی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر خوف طاری تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔

"ڈرو نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کونے والی کوٹھڑے کی طرف بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ

پاروتی اسی کوٹھڑی میں بند ہے اور مکار پنڈت بھی یقیناً اندر ہی ہو گا۔ دروازے کے قریب آ کر دیکھا کہ اس کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے سانپ کی طرف دیکھا۔ سانپ بند دروازے کی طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کانچی سے کہا کہ پنڈت تالا لگا کر کہیں گیا ہے۔ ناگن پاروتی اندر ہی ہو گی۔ میں نے ایک پتھر اٹھا کر تالے کو توڑ دیا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ سانپ ایک دم سے میری کلائی کے ساتھ چمٹ گیا۔ جیسے خوف زدہ ہو گیا ہو۔ دروازے میں سے دن کی روشنی کوٹھڑی میں داخل ہونے لگی تھی۔ ہم کوٹھڑی میں آ گئے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کونے میں ایک پٹاری پڑی ہے جس کے اوپر بڑا سا پتھر رکھا ہوا ہے۔ میں نے پتھر اٹھا کر پٹاری کھولی تو اس کے اندر سے ایک نیلے رنگ کا سانپ پھنکارتا ہوا باہر آ گیا۔

یہ پاروتی تھی جو نیلی ناگن کے روپ میں تھی۔

پٹاری سے باہر نکلتے ہی نیلے سانپ نے پھن کھول دیا۔ میری طرف دیکھا اور پھن سمیٹ کر زمین کے ساتھ لگا لیا۔ کانچی میرے پیچھے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"کیا یہی وہ سانپ ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں کانچی! میں نے ساپ کو سانپ نے مجھے پہچان لیا ہے۔ یہ پاروتی ناگن ہی سانپ کے روپ میں ہے۔"

وہ بولی۔ "تمہارے پاس جو پاروتی کا رومال ہے ہو سکتا ہے یہ اس کی بو پا کر خاموش ہو کر بیٹھ گیا ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں اسے پہچانتا ہوں۔ میں نے پاروتی ناگن کو اس سے پہلے اسی نیلے سانپ کی شکل میں کئی بار دیکھا ہے۔"

اس دوران سانپ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا میرے قریب آیا۔ پھر میرے سامنے سر جھکانے کی بجائے اچھل کر میرے گیروے کرتے پر چڑھ گیا۔ میری کلائی پر لپٹا ہوا سانپ تڑپ کر دور جا گرا۔ جیسے وہ نیلے سانپ سے ڈر گیا ہو۔ نیلا سانپ میرے کرتے پر رینگتا ہوا اپنے آپ میری کلائی پر آ کر لپٹ گیا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"دیکھا تم نے؟ یہ پاروتی ہی ہے۔ اگر کوئی دوسرا سانپ ہوتا تو دور سر جھکا کر بیٹھا رہتا۔ مگر یہ پاروتی ناگن ہے۔ میری دوست پاروتی ناگن۔ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سانپ کے روپ میں آنے کے بعد اس کی یادداشت بھی واپس

آگئی ہے۔"

کانچی خوش ہو کر بولی۔

"یہ تو بڑے اچھی بات ہوئی ہے۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ یہ انمول سانپ پنڈت کے قبضے سے کسی طرح نکل جائے اور ہمارے مندروں کے ہیرے جواہرات چوری ہونے سے بچ جائیں۔ اب اسے لے کر یہاں سے نکل چلتے ہیں۔ اگر مکا پنڈت آگیا تو کہیں ہم پر کوئی جادو ٹونا نہ کردے۔"

جو سانپ ہمیں پری تک لایا تھا۔ میں نے اسے کوٹھڑی میں ادھر ادھر دیکھا۔ مگر خدا جانے کہاں روپوش ہو چکا تھا۔ میں نے پاروتی کے نیلے سانپ کو کلائی سے اتار اس کے اپنے رومال میں ڈالا اور اپنے لمبے کرتے کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد کوٹھڑی سے نکلے اور یوں تیز تیز ایک طرف چلنے لگے جیسے ہم چوری کرکے بھاگ ر ہوں۔ ہم جس طرف سے آئے تھے اس طرف سے واپس نہ گئے۔ بلکہ کھنڈر پچھلی طرف سے ہو کر آگے ایک گہرے پہاڑی کھڈ میں اتر گئے۔ اس کھڈ کے اند چھوٹے بڑے پتھر بکھرے پڑے تھے۔ کھڈ سے باہر نکلنے کی بجائے ہم اسکے اندر ہ مشرق کی طرف چلتے گئے۔

کانچی کہنے لگی۔

"اب تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ ہمارا مہاناگ مندر میں واپس جانا ٹھیک نہیں۔ ہمیں تو جتنی جلدی ہو سکے ناگ پور شہر ہی سے نکل جانا چاہئے۔"

میں نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ وہ کمینہ پنڈت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پھر بھ ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم ناگ پور شہر کی طرف جانے بجائے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ نیچے جنوب کی جانب کسی دوسرے شہر کی طرف چلے جائیں - پھر وہاں جاکر سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

کانچی کہنے لگی۔ "میرا فرض تو پورا ہو گیا ہے۔ اس سانپ کے مل جانے سے ا پنڈت کے ہاتھ سے نکل جانے سے دیوتاؤں کا خزانہ پنڈت کے ہاتھ لگنے سے محفوظ

گیا ہے۔ میں اب واپس کیلاش پربت چلی جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "وہاں راج گرو پنڈت تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کو پتہ چل چکا ہو گا کہ اس کو قیمتی سانپ سے تم نے ہی محروم کیا ہے۔"

کانچی نے کہا۔ "میں اس کے مندر میں نہیں جاؤں گی میں کیلاش پربت سے آگے تبت اپنے آبائی وطن کی طرف چلی جاؤں گی۔"

ہم کھڈ میں چلے جا رہے تھے۔ کانچی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟ کیا پاروتی دیوی پھر سے انسانی شکل میں واپس آ جائے گی' میرا تو خیال ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکے گی۔ اگر انسانی شکل میں واپس آنا اس کے اختیار میں ہوتا تو تمہیں دیکھ کر جب اس کی یادداشت واپس آگئی ہے تو وہ انسانی شکل میں بھی واپس آ جاتی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ پنڈت نے اس پر کچھ ایسا منتر پھونکا ہوا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے دوبارہ انسانی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔"

کانچی بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔ پاروتی کی یادداشت خواہ سانپ کے روپ میں آتے ہی یا سانپ کے روپ میں آنے کے بعد مجھے دیکھ کر یا کسی بھی وجہ سے واپس آگئی تھی۔ مگر انسانی شکل میں واپس آنے یا سانپ کے روپ میں ہی مجھ سے باتیں کرنے کا اختیار اس کے پاس نہیں رہا تھا۔ پہلے جب کبھی وہ نیلے سانپ کا روپ بدلتی تھی تو مجھ سے انسانی آواز میں باتیں کر لیا کرتی تھی۔ لیکن اب اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ جب میں نے ان خیالات کا اظہار کانچی سے کیا تو وہ بولی۔

"تم اس سے بات کر کے دیکھو۔ ہو سکتا ہے تمہارے بات کرنے سے اس کے اندر کی چھپی ہوئی طاقت بیدار ہو جائے وہ انسانی آواز میں باتیں کرنے لگے۔"

ہم وہیں رک گئے۔ میں نے جیب سے نیلے سانپ کو نکال کر اپنے سامنے کیا اور کہا۔

"پاروتی مجھے یقین ہے کہ تم ہی پاروتی ہو تمہاری یادداشت واپس آگئی ہے اور تم مجھے پہچان رہی ہو۔ مجھ سے بات کرو۔"

نیلا سانپ اپنی گردن اٹھا کر جیسے ٹکٹکی باندھے میری طرف تکنے لگا۔ مجھے پاروتی ک
کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔

"پاروتی! میں تمہارا دیرینہ ساتھی ہوں مجھ سے پلیز اپنی آواز میں بات کرو۔"

میں نے دو تین بار یہ جملہ دہرایا مگر نیلے سانپ نے کوئی بات نہ کی۔ بس اپ
گردن میری کلائی کے ساتھ بے بسی کے عالم میں بار بار لگاتا رہا۔ کانچی بولی۔

"یقین کرو پاروتی دیوی تمہاری بات سن رہی ہے۔ سمجھ رہی ہے مگر وہ پنڈت ک
طلسمی منتر کی وجہ سے کچھ بولنے سے معذور ہے۔ وہ بات نہیں کر سکتی۔ نہ انسانی شکل
میں واپس آ سکتی ہے۔ تمہیں سب سے پہلے پاروتی پر جو طلسم کیا گیا ہے اسے توڑنا
گا۔"

میں نے نیلے سانپ کو جیب میں رکھا اور کہا۔

"پہلے یہاں سے نکلو۔ یہاں سے نکلنے کے بعد سوچیں گے کہ پنڈت کے طلسم
کس طرح توڑا جا سکتا ہے؟"

ہم کھڈ میں چلے جا رہے تھے۔ ہماری دونوں جانب کھڈ کی اونچی دیواریں تھیں
ان دیواروں پر جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہم کافی دیر تک اس گھاٹی کے اندر چ
رہے۔ آخر ایک جگہ باہر نکلے تو سامنے کچھ فاصلے پر ریلوے سگنل پر نظر پڑی۔ کا
اسے دیکھ کر بولی۔

"یہ ریلوے لائن ناگ پور سے اوپر کی جانب صوبہ بہار کو جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے ہم اسی طرف چلتے ہیں۔ لیکن ہمیں کسی سٹیشن
ٹرین پکڑنی ہو گی ہم پیدل کب تک چلتے رہیں گے۔"

ہم ریلوے لائن کے ٹریک پر چڑھ گئے اور مشرق کی طرف چلنے لگے۔ ناگ پور
سٹیشن ہمارے پیچھے رہ گیا تھا۔ اچانک ہمیں گڑ گڑ کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ
دیکھا۔ ریلوے لائن پر ایک ٹرالی چلی آ رہی تھی۔ اس کے اوپر سرخ جھنڈی لہرا ر
تھی۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"رک جاؤ! ہم اس ٹرالی پر آگے سفر کریں گے۔"

میں نے ٹرالی کو ہاتھ دیا۔ ٹرالی میں ریلوے کے افسر یا مکینک ٹائپ آدمی سوار
تھے۔ دو آدمی ٹرالی کو دھکا لگا رہے تھے۔ جوگی اور سادھو لوگوں کی بھارت میں بڑی
عزت کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ ٹرالی پر بیٹھے ہوئے ریلوے افسروں
نے ایک جوگی اور جوگن کو ہاتھ اٹھائے دیکھا تو اس نے ٹرالی رکوا لی اور ہم سے پوچھا
کہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا۔

"ہم جوگی لوگ ہیں۔ یاترا کو ادھر آئے ہوئے ہیں۔ چلتے چلتے تھک گئے ہیں۔
ہمیں اپنی ٹرالی پر بٹھا لو۔"

ریلوے افسر نے کہا۔ "بیٹھو مہاراج! بیٹھ جاؤ۔"

میں اور کانچی ٹرالی پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ٹرالی ریلوے لائن پر آگے چل
پڑی۔ ریلوے افسر نے پوچھا۔

"مہاراج! آپ کہاں جائیں گے؟"

میں نے اس سے سوال پوچھا۔

"آگے کونسا شہر ہے؟"

وہ کہنے لگا۔ "مہاراج آگے تو رائے پور کا شہر ہے مگر وہ شہر تو یہاں سے بہت دور
ہے۔"

میں نے کہا۔ "بھیا ہم صوبہ بہار کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ وہاں کے مندروں کی
یاترا کرنے کا ارادہ ہے۔"

ریلوے افسر نے کہا۔

"مہاراج! صوبہ بہار تو رائے پور کے آگے شروع ہوتا ہے اور پہلے بڑا شہر رانچی
آتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بس ہمیں رانچی ہی پہنچا دو۔"

ریلوے افسر ہنسنے لگا۔ بولا۔

"مہاراج! میری ٹرالی تو اگلے سٹیشن گڑھ تک جائے گی۔ وہاں سے آپ کسی ٹرین میں سوار ہو جائیں اور رائے پور چلے جائیں۔ رائے پور سے آپ کو رانچی کی گاڑی مل جائے گی۔"

مجھے اطمینان ہو گیا۔ اس ریلوے افسر نے ہمیں اس علاقے سے نکل کر صوبہ بہار میں پہنچنے کا راستہ دکھا دیا تھا۔ ٹرالی ایک خاص رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ اس کی سپیڈ ذرا کم ہونے لگتی تو دو قلی ریلوے لائن پر اتر جاتے اور لائن پر دوڑتے ہوئے اسے دھکا لگانا شروع کر دیتے۔ جب ٹرالی اپنی خاص رفتار پکڑ لیتی تو وہ اچک کر ٹرالی پر بیٹھ جاتے۔ اسی طرح کوئی آدھے گھنٹے کے ٹرالی سفر کے بعد گڑھ کا مضافاتی ریلوے سٹیشن آ گیا۔ ہم ٹرالی سے اتر کر سٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئے اور رائے پور جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ ایک قلی نے ہمیں بتایا کہ رائے پور گاڑی شام کو جائے گی۔ ہم نے وہیں تھوڑا بہت کھانا کھایا اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ نیلا سانپ میری جیب میں تھا اور بڑے سکون کے ساتھ تھا۔ جیسے سو رہا ہو۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! تمہارے خیال میں مجھے پاروتی ناگن کو پھر سے انسانی روپ میں لانے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ تم اس قسم کی باتوں کو اچھی طرح سے سمجھتی ہو۔ تم کیلاش پربت کے ناگ مندر میں بھی رہ چکی ہو۔ کیا تمہیں کوئی ایسا چلہ یاد ہے جس کو کر کے پاروتی سانپ سے واپس انسانی شکل اختیار کر لے؟"

کانچی کچھ دیر غور کرتی رہی - پھر بولی۔

"مجھے ایسا کوئی چلہ نہیں آتا۔ یہ باتیں میری طاقت سے باہر ہیں۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"کیا بہار کے کسی مندر میں کوئی ایسا سادھو وغیرہ نہیں ہے جو اپنا منتر پھونک کر پاروتی پر کئے گئے طلسم کو ختم کر دے۔"

اچانک کانچی کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ کہنے لگی۔

"ایک بات ہو سکتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

اس نے کہا۔ "مجھے یاد آ گیا۔ رانچی شہر میں سنا ہے ایک باوٹی ہے جہاں ایک مسلمان درویش رہتا ہے۔ وہ بڑا کرنی والا فقیر ہے۔ لوگ بڑی دور دور سے اپنی مرادیں پوری کرانے اس کے پاس آتے ہیں۔ اس کے پاس چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ پاروتی کو سانپ سے دوبارہ انسانی شکل میں لے آئے۔"

"اس بزرگ کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

کانچی نے کہا۔

"نام تو مجھے معلوم نہیں سنا ہے اسے باوٹی والا فقیر کہتے ہیں۔ رانچی چل کر اس کا پتہ پوچھ لیں گے۔"

مجھے تھوڑی سی امید پیدا ہو گئی۔ جب رائے پور جانے والی ریل گاڑی آئی تو ہم اس میں سوار ہو گئے۔ ٹکٹ تو ہمیں لینی نہیں تھی۔ ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ مسافروں نے ہمارے لئے جگہ بنا دی اور ہماری سارا راستہ خدمت کرتے رہے۔ رائے پور کا شہر وہاں سے بہت دور تھا۔ دوسرے دن ہم رائے پور پہنچے۔ وہاں سے گاڑی بدلی اور رانچی والی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ اس طرح سفر کرتے کرتے ہم جس وقت رانچی کے ریلوے سٹیشن پر اترے تو دن کافی نکل آیا تھا۔ ہم نے سٹیشن سے باہر آ کر ایک آدمی سے باوٹی والے فقیر کے بارے میں پوچھا۔ وہ آدمی بولا۔

"تمہیں باوٹی والے باباجی کے درشنوں کو جانا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں بھیا! ہم جوگی لوگ ضرور ہیں۔ مگر باوٹی والے باباجی کی ہم بڑی عزت کرتے ہیں۔ وہ بڑی کرنی والے فقیر ہیں۔ ہم ان کے درشنوں کو جا رہے ہیں۔"

وہ آدمی کہنے لگا۔

"یہاں سے یکے میں بیٹھ جاؤ۔ وہ تمہیں باوٹی والے باباجی کے استھان پر پہنچا دے گا۔"

سامنے تانگوں کا اڈہ تھا۔ وہاں ہمارے پنجاب کی طرح کے تانگے نہیں تھے بلکہ

یکے تھے جو ریڑھے کی طرح کے تھے مگر ان پر چار سیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اکے والے سے کہا۔

"بابا لوگ ہمیں بابا جی باوٹی والے کے استھان پر پہنچا دو۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔"

اکے والا نیچے اتر آیا۔ کہنے لگا۔

"پدھاریئے مہاراج!"

میں اور کانچی اکے پر سوار ہو گئے۔ اکے والا آگے ڈنڈے پر بیٹھ گیا اور اکا روانہ ہو گیا۔ سڑک غیر ہموار تھی۔ اکا خوب ہچکولے کھا رہا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد دور سے ہمیں ایک ٹیلہ نظر آیا۔ یکے والا کہنے لگا۔

"مہاراج! اس ٹیلے کے پاس بابا جی رہتے ہیں۔"

سارا راستہ کوچوان ہمیں بابا جی کی کرامتیں سناتا آیا کہ انہوں نے کس طرح ایک کوڑھی کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور کوڑھی ٹھیک ہو گیا۔ کس طرح ایک نابینا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور اس کی بینائی واپس آ گئی۔ ہم خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔

ٹیلے کے پاس جا کر یکا ایک پیپل کے درخت کے پاس رک گیا۔ وہاں پہلے سے دو تین اکے کھڑے تھے۔ عورتیں مرد اور بچے ایک طرف بیٹھے تھے۔ سامنے پتھر کی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا جہاں ایک دربان پہرہ دے رہا تھا۔ جو کوئی آدمی یا عورت اندر جانے کی کوشش کرتی وہ اسے پیچھے ہٹا کر کہتا۔

"ابھی تمہاری باری نہیں آئی۔ کل آنا۔"

ہم اکے سے اتر کر دربان کے پاس گئے۔ دربان نے ایک جوگی اور جوگن کو دیکھا تو کسی قدر تعجب سے پوچھا۔

"آپ تو ہندو ہیں۔ بابا جی مسلمان ہیں آپ کس لئے آئے ہیں؟"

دربان مسلمان تھا۔ اس نے سبز لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر سفید رومال بندھا ہوا تھا۔ میں اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ بھائی میں بھی مسلمان ہوں۔ کیونکہ کانچی پر میں اپنا

مسلمان ہونا ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"بھیا! ہم بابا جی کے درشنوں کرنے آئے ہیں۔"

دربان بولا۔ "بابا لوگ۔ آپ اپنی باری کا انتظار کریں۔ جو لوگ پہلے آئے ہوئے ہیں وہ بھگت لیں تو پھر آپ کو اندر جانے کی اجازت ملے گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے بھیا! ہم اپنی باری کا انتظار کر لیتے ہیں۔ مگر ہماری باری کب آئے گی؟"

دربان نے حساب لگا کر کہا۔

"شام تو پڑ جائے گی۔"

عین اس وقت بڑے زور سے پھنکار کی آواز آئی اور نیلا سانپ میری جیب سے اچھل کر زمین پر آ گیا اور پھن لہراتے ہوئے پھنکارنے لگا۔ دربان ڈر کر پرے ہو گیا اور بولا۔

"اس کو پکڑو۔ اس کو پکڑو۔"

میں نے جلدی سے نیلے سانپ یعنی پاروتی کو پکڑا اور جیب میں ڈالتے ہوئے دربان سے کہا۔

"بھائی ہمیں معاف کر دینا۔ ہم تمہیں ڈرانا بالکل نہیں چاہتے تھے۔ یہ سانپ اپنے آپ باہر نکل آیا ہے۔ ہم اپنی باری پر ہی بابا جی کے درشن کریں گے۔"

میں اور کانچی واپس جانے ہی لگے تھے کہ اندر سے ایک آدمی دوڑتا ہوا دروازے پر آیا اور دربان سے بولا۔

"رکو! بابا جی کا حکم ہے کہ جو دو جوگی اور جوگن آئے ہیں انہیں میرے پاس بھیج دو۔"

میں تو حیران رہ گیا۔ کانچی نے میری طرف بڑے فخر کے ساتھ دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"دیکھا۔ میں نہ کہتی تھی کہ باوٹی والے بابا جی بڑے کرنی والے فقیر ہیں۔ دیکھ

لو۔ انہیں ہمارے آنے کی فوراً خبر ہو گئی۔ حالانکہ انہیں کسی نے اندر جا کر نہیں بتایا۔"

دربان نے اسی وقت ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی اور دروازے سے پرے ہٹ گیا۔ جو آدمی پیغام لے کر آیا تھا اس نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔

"تشریف لایئے۔ بابا جی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ہم اس آدمی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ آگے ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی۔ دونوں جانب جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ سب سے آخر میں بھی ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ اس جھونپڑی کے باہر آگ پر دیگ چڑھی ہوئی تھی۔ شاید زائرین کے لئے بھنڈارہ پک رہا تھا۔ جھونپڑی کے باہر دو فقیر آمنے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے مراقبے میں ہوں۔ ہمیں وہیں رکنے کا اشارہ کر کے وہ آدمی خود جھونپڑی کا ٹاٹ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ فوراً ہی باہر آیا اور اشارے سے ہمیں اندر جانے کو کہا۔ خود ایک طرف ہٹ گیا۔ میں آگے آگے تھا۔ کانچی میرے پیچھے پیچھے تھی۔ میں ٹاٹ اٹھا کر اندر گیا تو دیکھا کہ فرش پر بھی ٹاٹ بچھا ہوا ہے جس پر سفید ریش بزرگ بیٹھا ہے۔ سر پر سبز عمامہ ہے۔ بدن پر سبز رنگ کا چغہ ہے۔ میں نے بے اختیار ہو کر جاتے ہی انہیں کہا۔

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام"

بزرگ نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اور کانچی بزرگ کے قدموں میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ بابا جی نے مجھ پر بھرپور نگاہ ڈالی اور بڑی نرم آواز میں کہا۔

"بیٹا! مسلمان ہو تو مسلمان بن کر دکھاؤ۔ ہمیشہ مسلمان بنے رہو۔ ہندو کیوں بنتے ہو؟"

میں نے دیکھا کہ کانچی چونک کر مجھے تکنے لگی تھی۔ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ میں

ہندو نہیں ہوں بلکہ مسلمان ہوں۔ مجھے کانچی کی پرواہ نہیں تھی۔ میں صرف پاروتی کی خاطر اپنے آپ کو ہندو ظاہر کرتا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"بابا جی! آپ میرے دل کا حال جانتے ہیں کہ میں نے ہندوؤں والا بھیس کس لئے بدلا۔"

بابا جی نے کہا۔

"چاہے کچھ بھی ہو۔ تمہیں اللہ کا دروازہ نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔"

وہ چپ ہو گئے۔ جھونپڑی میں خاموشی چھا گئی۔ مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ بھی خیال تھا کہ بابا جی شاید میرے دل کا حال جان گئے ہیں۔ کانچی بھی چپ چاپ بڑے ادب سے بیٹھی تھی۔ اتنے میں بابا جی کہنے لگے۔

"میں جانتا ہوں تم کس لئے میری پاس آئے ہو۔ میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔ لیکن جتنا مجھے میرے خدا نے اختیار دیا ہوا ہے اتنی ہی مدد کروں گا۔ تمہاری جیب میں جو سانپ ہے اسے باہر نکالو۔"

میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نیلا سانپ نکال کر وہیں نیچے اپنے سامنے ٹاٹ پر رکھ دیا۔ پاروتی یعنی نیلے سانپ پر بھی بابا جی کا اتنا اثر ہو چکا تھا کہ وہ بھی ادب سے سر جھکا کر سمٹ سمٹا کر بیٹھ گیا۔ نہ اس نے اپنی گردن اٹھائی اور نہ پھنکار ماری۔ بابا جی نے گہری نگاہ سانپ پر ڈالی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔

"ہم اس قسم کی شعبدہ بازیوں کو حرام سمجھتے ہیں۔ ہم تو یہاں دکھی اور بیمار لوگوں کی خدمت کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر جس سانپ کو تم ہمارے پاس لائے ہو۔ یہ ایک ایسی عورت ہے جس کے دل میں ہمیں اسلام کے نور کی کرن پھوٹتی نظر آ رہی ہے۔"

مجھے یاد آ گیا کہ پاروتی کو شروع ہی سے بتوں کی پوجا سے نفرت تھی اور وہ مجھے کہا کرتی تھی کہ ایسا لگتا ہے کسی روز میں ان سب بتوں کو توڑ پھوڑ کر تمہارے مذہب

اسلام میں داخل ہو جاؤں گی۔ میں بابا جی کی روشن ضمیری کا زبردست قائل ہو گیا تھا میں کچھ کہنے لگا تو بابا جی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا اور کہا۔

"میں جانتا ہوں تم کیا کہنے والے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہم اس سانپ کو پھر سے عورت کی شکل میں لے آئیں۔"

میں نے کہا۔ "جی ہاں بابا جی!"

بابا جی نے آنکھیں بند کر لیں اور گہری سوچ میں گم ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد بابا جی نے آنکھیں کھولیں۔ ہماری طرف دیکھا اور کہا۔

"اس کا ہمیں اختیار تو ہے مگر اجازت نہیں ہے۔ تمہیں اپنی مراد پوری کرنے کے لئے دلی شہر میں لال پہاڑی کے پیچھے بابا سدا رنگ کی خانقاہ میں جانا ہو گا۔ بابا سدا رنگ کا درجہ مجھ سے بہت اونچا ہے۔ وہ اگر چاہیں تو اس سانپ کو دوبارہ انسانی شکل میں واپس لا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا= "بابا جی! کیا آپ....؟"

انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"اب تمہارا ہمارے پاس کوئی کام نہیں جاؤ بابا سدا رنگ کے پاس جا کر اپنی فریاد پیش کرو۔ اور سنو! اب کبھی ہندو نہ بننا۔ مسلمان ہو کر بت پرستوں والا حلیہ نہ بنانا۔ جاؤ۔"

میں نے نیلے سانپ کو اٹھا کر جیب میں ڈالا۔ بابا جی کو سلام کیا۔ کانچی نے بھی بڑے ادب سے بابا جی کو سلام کیا اور ہم دونوں جھونپڑی سے باہر آ گئے۔ کانچی خاموش تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اسے کبھی گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ میں ہندو نہیں ہوں مسلمان ہوں۔ جب ہم احاطے کی دیوار کے دروازے میں سے نکل کر باہر آئے تو کانچی نے آہستہ سے کہا۔

"تم مسلمان تھے تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟ مجھے تو بتا دیتے..."

میں نے کہا۔ ”کانچی تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ میرے سامنے کیسی کیسی مجبوریاں نہیں تھیں۔ میں نے غیر مسلموں والا بھیس صرف پاروتی کی بھلائی کی خاطر اختیار کیا تھا۔ تم پاروتی کی اگر دردناک کہانی سنو تو تمہاری آنکھ سے آنسو نہ تھمیں کہ کس طرح ایک شریف گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکی کو تمہارے ہندو سپیروں اور جوگیوں نے اغوا کیا اور پھر اس کے ساتھ کیسے کیسے مظالم کئے۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے چلا؟ کہاں پہنچ گیا اور پاروتی سے میری ملاقات کیسے ہوئی؟ یہ بھی ایک لمبی داستان ہے۔ اس داستان کو سنانے کا وقت نہیں۔“

ہم اکے میں بیٹھ کر سٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے مسلمان ہونے کا راز کھل جانے پر کانچی کو نفسیاتی طور پر دھچکا لگا ہے۔ وہ خاموش تھی۔ میں نے بھی اس سے کوئی بات نہ کی۔ یکہ سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ جب ہم کافی دور نکل گئے تو میں نے کانچی سے کہا۔

”کیا بات ہے؟ تم چپ چپ ہو۔“

حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ چپ کیوں ہے۔ کہنے لگی۔

”ویسے ہی چپ ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

رانچی کے سٹیشن پر پہنچنے کے بعد میں نے دلی جانے والی گاڑی کے بارے میں ایک قلی سے پوچھا تو وہ بولا۔

”یہاں سے کوئی گاڑی سیدھی دلی نہیں جاتی آپ کو مرزا پور جانے والی گاڑی پکڑنی ہو گی - مرزا پور سے آپ کو دلی جانے والی گاڑی ملے گی۔“

قلی نے یہ بھی بتایا کہ یہ بڑا لمبا سفر ہے۔ کانچی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔

”میں سوچتی ہوں اب میرا تمہارے ساتھ دلی جانا کوئی اتنا ضروری نہیں ہے۔ یہ کام تم خود بھی کر سکتے ہو۔ میں دیوتاؤں کا خزانہ پنڈت سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ محفوظ ہو گیا ہے۔“

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ میں ہندو نہیں مسلمان ہوں کانچی کا دل مجھ سے

اکھڑ گیا تھا۔ میں بھی اسے زبردستی اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

”اگر تم واپس جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ میں تمہارا بہت احسان مند ہوں۔ تمہاری مدد کے بغیر میں پاروتی ناگن کو حاصل نہیں کر سکتا تھا۔“

کانچی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کہنے لگی۔

”اس میں احسان والی کوئی بات نہیں ہے۔“

ہم خاموش ہو گئے۔ اس وقت ہم پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا۔

”یہاں سے تم کس طرف جاؤ گی؟“

وہ بولی۔ ”میں سوچتی ہوں درگا پوجا کا تہوار شروع ہونے والا ہے۔ پہلے کلکتے کی یاترا کروں اس کے بعد اپنے وطن تبت چلی جاؤں۔“

مرزا پور جانے والی گاڑی پہلے آ گئی۔ میں یہاں کانچی سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ مرزا پور پہنچ کر میں نے گاڑی بدلی اور دلی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ آگے بھی بڑا لمبا سفر تھا۔ ٹرین الٰہ آباد کان پور اور علی گڑھ سے ہوتی ہوئی ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد دلی پہنچی۔ میں ابھی تک ہندو جوگیوں والے بھیس میں تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مگر میرے پاس دوسرے کپڑے نہیں تھے۔ اتنے روپے بھی نہیں تھے کہ نئے کپڑے خرید لوں۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ ماتھے پر جو تلک لگا تھا وہ مٹا دیا اور کرمنڈل بھی راستے میں ٹرین سے باہر پھینک دیا۔ دلی کے سٹیشن پر گاڑی صبح کے وقت پہنچی تھی۔ میں نے سٹیشن پر ہی تھوڑا سا ناشتہ کیا۔ ویٹنگ روم کے باتھ روم میں جا کر جیب سے پاروتی کے نیلے سانپ کو نکال کر دیکھا۔ سانپ بالکل ٹھیک تھا اور سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے پاروتی مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں نے اسے رومال میں لپیٹ کر بڑی احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ اب مجھے دلی شہر کی لال پہاڑی والی خانقاہ میں جانا تھا جہاں سدا رنگ بابا کا ڈیرہ تھا۔ نیلے سانپ کو پاروتی کی شکل میں واپس لانے کی یہی ایک امید باقی تھی کہ سدا رنگ بابا ہی یہ کام کر

سکتے ہیں۔

میں سواریوں والے تانگے میں بیٹھ کر لال پہاڑی والی خانقاہ پر پہنچ گیا۔ وہاں بابا جی کے عقیدت مند کافی تعداد میں خانقاہ کے باہر درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک ہندو جوگی کو یعنی مجھے دیکھا تو حیرت سے تکنے لگے۔ میں لوگوں سے دور ایک الگ تھلگ جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ بابا جی ایک گھنٹے بعد عقیدت مندوں سے ملاقات کریں گے۔ اس دوران وہاں قوالی شروع ہو گئی۔ لوگ قوالی سننے جمع ہو گئے۔ میں نے سوچا چلو قوالی سنتے ہیں۔ اس طرح وقت بھی گزر جائے گا۔ میں بھی لوگوں کے مجمع میں آ کر بیٹھ گیا۔ قوال کسی شاعر کا فارسی کلام گا رہے تھے۔ ساز اور ڈھولک بج رہی تھی۔ جب قوالی کا رنگ خوب جم گیا اور قوالی تیز ہو گئی تو نیلا سانپ یعنی پاروتی میری جیب سے زور لگا کر باہر نکل آئی۔ میں اسے پکڑتا ہی رہ گیا اور وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے قوالوں کے سامنے جا کر پھن اٹھا کر رقص کرنے لگی۔ سب لوگ ایک سانپ کو یوں قوالی کی دھن پر رقص کرتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

قوال پہلے تو کچھ خوف زدہ ہوئے۔ مگر جب دیکھا کہ سانپ انہیں کچھ نہیں کہہ رہا بلکہ ان کی قوالی پر وجد کر رہا ہے تو انہوں نے بھی دھن تیز کر دی۔ نیلے سانپ نے بھی رقص کو تیز کر دیا۔ میں خاموش بیٹھا یہ منظر دیکھتا رہا۔ آخر قوالی ختم ہو گئی۔ نیلا سانپ یعنی پاروتی رینگتی ہوئی چپ چاپ میرے پاس آ گئی۔ میں نے اسے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ لوگ مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ سانپ کہاں سے لیا ہے؟ میں نے کہا۔

"بابا لوگ ہم تو فقیر آدمی ہیں۔ ایک جنگل سے مل گیا۔ زخمی تھا۔ ہم نے اس کا زخم دھویا۔ مرہم لگائی اور پھر جنگل میں چھوڑا تو یہ واپس نہ گیا۔ بس اسی روز سے ہمارے ساتھ رہ رہا ہے۔ آج ہم بابا جی کے درشن کرنے آئے۔ قوالی ہونے لگی تو سانپ وجد میں آ گیا۔"

میں اس سے زیادہ لوگوں کو اور کیا بتاتا۔ اتنے میں بابا جی سدا رنگ نے لوگوں سے ملنا شروع کر دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد عقیدت مند خانقاہ کی کوٹھڑی میں

جاتے اور بابا جی کی دعائیں وصول کر کے پر سکون حالت میں واپس آ جاتے۔ آخر میری باری بھی آ گئی۔ جب میں بابا جی کی کوٹھڑی میں داخل ہوا تو باب جی نے جلالی آواز میں کہا۔

"تو نے ابھی تک اپنے اندر کے بت نہیں توڑے۔ جا پہلے مسلمانوں والا اپنا اصلی حلیہ بنا۔ پھر ہمارے پاس آ۔۔۔ جا۔۔۔۔"

میں اسی وقت باہر نکل آیا۔

سوچنے لگا دوسرے کپڑے کہاں سے حاصل کروں۔ میں نے باہر سڑک پر آ کر دوسری جیب میں سے پیسے نکال کر دیکھے۔ کل ساڑھے سات روپے تھے۔ اتنی رقم پاکستان بننے کے ایک سال بعد تک بہت ہوا کرتی تھی۔ میں لوگوں سے پوچھتا پوچھتا دلی کے ایک بازار میں آ گیا۔ جہاں ریڈی میڈ سستی قسم کے کرتے پاجامے وغیرہ بکتے تھے۔ سردیوں کا موسم جا رہا تھا۔ دن کے وقت اتنی سردی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے ایک پاجامہ ایک کرتہ اور ایک واسکٹ خریدی۔ اور دکان کے اندر ہی جوگیوں والا لباس اتار کر کرتہ پاجامہ واسکٹ پہن لی۔ دکاندار بڑا حیران ہوا۔ آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"سادھو مہاراج! کیا آپ سی آئی ڈی کے جاسوس ہیں؟"

میں نے اسے رازداری سے کہا۔

"تم نے ٹھیک پہچانا۔ مگر اس کا ذکر کسی کے آگے مت کرنا۔ میں سپیشل پولیس کا جاسوس ہوں اور مسلمان ہوں۔"

دکاندار خوش ہو کر بولا۔

"بھائی صاحب ہم گاہکوں کے راز کسی کو نہیں بتایا کرتے۔ ورنہ ہماری دکانداری دو دن نہ چلے۔"

اب میرا حلیہ مسلمانوں والا بن گیا تھا۔ نیلے سانپ کو میں نے واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ یہاں سے میں واپس بابا سدا رنگ کی خانقاہ پر آ گیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں بابا جی نے مجھے اندر بلا لیا۔ مجھے مسلمانوں والے لباس میں

دیکھ کر کہا۔

"اب کبھی بت پرستوں والا لباس نہ پہننا۔"

میں نے عرض کی۔

"انشاء اللہ آپ کے حکم پر پورا عمل کروں گا۔"

میں بابا جی کے آگے اپنا مدعا بیان کرنے کے واسطے الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ بابا سدا رنگ نے فرمایا۔

"وہ سانپ نکالو جسے تم اپنے ساتھ لائے ہو۔"

میں نے جلدی سے رومال جیب سے نکال کر سامنے رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ پاروتی کا سانپ رومال کے اندر ہی رہا۔ وہ باہر نہ نکلا۔ بابا سدا رنگ نے سانپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"رومال میں کیوں چھپ کر بیٹھی ہو؟ باہر آ جاؤ۔"

انہیں اپنے کشف سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سانپ اصل میں ایک عورت ہے۔ نیلا سانپ بابا جی کا حکم سنتے ہی آہستہ آہستہ رومال سے نکل آیا اور بابا جی کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ بابا سدا رنگ کچھ دیر سانپ پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ پھر میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور فرمایا۔

"اس کو خواجہ نظام الدینؒ اولیاء کی درگاہ پر لے جاؤ اور وہاں اسے حوض کا پانی پلاؤ۔ خدا نے چاہا تو آدھی رات کے بعد یہ اپنی اصلی شکل میں واپس آ جائے گی اور سنو۔۔ جس رات یہ اپنی اصلی شکل میں واپس آ جائے گی اس کے دوسرے دن تمہیں درگاہ شریف کی مسجد کے سامنے درخت کے نیچے بیٹھا ایک فقیر ملے گا۔ وہ اس لڑکی کو سیدھی راہ پر لے آئے گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

میں سلام کر کے تعظیم بجا لا کر بابا سدا رنگ کی کوٹھڑی سے نکل آیا۔ نیلے سانپ کو میں نے اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ وہاں سے میں تانگے میں بیٹھ کر شہر سے باہر حضرت خواجہ صاحبؒ کی درگاہ پر حاضری دینے آ گیا۔ میں سب سے پہلے مزار

شریف پر جا کر فاتحہ خوانی کرنا اور سلام عرض کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس خیال سے رک گیا کہ ایک ہندو عورت سانپ کے روپ میں میری جیب میں ہے کہیں بے ادبی نہ ہو جائے۔ میں دوسری طرف والے دروازے سے ہو کر درگاہ شریف کے حوض پر آ گیا۔ درگاہ کے باہر ہی سے میں نے مٹی کا ایک چھوٹا سا کٹورا خرید لیا تھا۔ میں نے حوض میں سے تھوڑا سا پانی کٹورے میں ڈالا اور الٹے پاؤں وہاں سے واپس ہوا۔ حوض کا برکت والا پانی مجھے آدھی رات کے بعد نیلے سانپ کو پلانا تھا۔ اس کے لئے کسی ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں میں رات بسر کر سکوں اور جہاں مکمل تنہائی ہو اور میرے سوا دوسرا کوئی نہ ہو۔

اب تو خواجہ صاحبؒ کی درگاہ شریف کے آس پاس بہت آبادی ہو گئی ہے۔ اس زمانے میں اتنی آبادی نہیں تھی۔ میری پاس صرف ڈھائی روپے باقی رہ گئے تھے۔ وہاں کوئی ایسا ہوٹل یا سرائے نہیں تھی جہاں میں اکیلے میں رات بسر کر سکتا۔ جب کوئی راستہ نظر نہ آیا تو میں نے یہی فیصلہ کیا کہ بستی سے دور کسی غیر آباد جگہ پر چل کر بیٹھ جانا چاہئے۔ ایک طرف مجھے درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ میں اس طرف چل پڑا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ درختوں کے درمیان ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ پندرہ بیس قبریں ادھر ادھر بنی ہوئی تھیں۔ کونے میں ایک بارہ دری میں آ کر بیٹھ گیا۔ حوض کے پانی والا کٹورا میرے پاس ہی تھا۔ قبرستان میں آتے وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ اس حساب سے مجھے تین گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ رات جیسے جیسے گہری ہوتی گئی رات کی خاموشی زیادہ پراسرار ہو گئی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ مجھے قبرستان میں کبھی بھی ڈر نہیں لگا تھا۔ میں بڑے سکون کے ساتھ بارہ دری کے ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ اس دوران مجھے نیند بھی آنے لگی۔ مگر میں نے اپنے اوپر نیند طاری نہ ہونے دی۔ رات گزرتی جا رہی تھی - آسمان پر ستارے نظر آ رہے تھے۔ جب مشرق کی طرف آسمان پر سات ستاروں کی ٹولی ایک طرف کو جھکی ہوئی دکھائی دی تو میں سمجھ گیا کہ آدھی رات گزر گئی ہے۔ میری خانہ بدوشی کے زمانے میں مجھے اس بات کا تجربہ

ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود میں نے مزید آدھا گھنٹہ انتظار کرلیا۔ جب آدھا گھنٹہ بھی گزر گیا تو میں تیار ہوگیا۔

میں نے جیب سے نیلے سانپوں والا رومال نکال کر سامنے رکھ لیا۔ حوض کے پانی والا کٹورا اپنے قریب کر لیا۔ پھر رومال میں سے نیلے سانپ یعنی پاروتی کو آہستہ سے ہاتھ میں پکڑا اور اس کا منہ پانی کے کٹورے کے ساتھ لگا دیا۔ سانپ نے ذرا بھی ہچکچاہٹ کا اظہار نہ کیا۔ اس نے فوراً کٹورے میں سے پانی پینا شروع کردیا۔ اس وقت واقعی میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ کیونکہ میرے سامنے ایک کرامت ہونے والی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ سانپ عورت کی شکل اختیار نہیں کرے گا۔ کبھی خیال آتا کہ نہیں سانپ ضرور پاروتی کی شکل میں آجائے گا۔ نیلے سانپ نے کٹورے میں سے آدھے سے زیادہ پانی پی لیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے سر اٹھا کر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بارہ دری کے فرش پر لیٹ گیا۔ اس طرح سانپ کو لیٹتے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

قبرستان میں چاروں طرف سناٹا اور رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بارہ دری کا فرش سفید سنگ مرمر کا تھا۔ جس کی وجہ سے اندھیرے میں بھی نظر آرہا تھا۔ میری نگاہیں نیلے سانپ پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک سانپ میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ اپنی جگہ پر گول دائرے میں رینگنے لگا۔ کوئی ایک منٹ تک وہ اسی طرح اپنے دائرے میں رینگتا رہا۔ پھر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اپنا پھن کھول لیا اور دائیں بائیں گھومنے لگا۔ میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے سانپ میری نظروں سے غائب ہوگیا۔ دو تین سیکنڈ تک سنگ مرمر کا فرش بالکل خالی رہا۔ پھر جس جگہ سانپ بیٹھا ہوا تھا وہاں دھواں سا جمع ہونا شروع ہوگیا۔ اس دھوئیں نے آہستہ آہستہ انسانی جسم کی شکل اختیار کرنا شروع کرلی۔ پھر ہلکی سی روشنی دھوئیں میں ہوئی۔ جیسے بہت کمزور سی بجلی بادلوں میں چمک کر غائب ہوگئی ہو۔ اس روشنی کے بجھتے ہی پاروتی ظاہر ہوگئی۔ وہ میرے سامنے سانپ والی جگہ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی تھی۔ اندھیرے میں اس کی کیسری رنگ کی آنکھیں انگاروں کی طرح دمک رہی تھیں۔ میں نے اس کو آواز دی۔

"پاروتی پاروتی۔"

پاروتی کے چہرے پر مسکراہٹ سی نمودار ہوئی۔ پھر میں نے ایک طویل عرصے کے ند اس کی آواز سنی۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ میں انسانی شکل میں آکر تمہیں دیکھ رہی ہوں۔"

میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ پاروتی نہ صرف انسانی شکل میں واپس آگئی ی بلکہ اس کی کھوئی ہوئی یادداشت بھی واپس آگئی تھی۔ اس نے چاروں طرف بڑے ر سے دیکھا اور پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟ یہ کونسی جگہ ہے؟"

تب میں نے اس سے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی بیان کردی۔ وہ رت سے سنتی رہی۔ جب میں نے کہانی ختم کی تو اس نے کہا۔

"مجھے کچھ یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے مجھ پر اس وقت حملہ کیا تھا جب میں انپ کے روپ میں تھی اور میرے جسم کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ اس کے بعد مجھے رف اتنا یاد ہے کہ ایک پجاری نے مجھ پر منتر پھونکا تھا اور میں انسانی شکل سے سانپ ی شکل میں آگئی تھی۔ پھر میں نے تمہیں دیکھا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا تھا مگر تم سے اپنی بات نہیں کر سکتی تھی۔ جس طرح پہلے جب میں سانپ کے روپ میں ہوتی ی تو انسانی آواز میں تم سے بات کرلیا کرتی تھی۔ اس حالت میں میں کسی کسی وقت کل مدہوش ہو جاتی تھی۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ تم مجھے لے کر ایک مسلمان بزرگ ے پاس گئے تھے۔ میں نے ان کے چہرے کے گرد نور کی روشنی دیکھی تھی۔ اور میں نے ان کی بے حد تعظیم و تکریم کی تھی۔

میں نے پاروتی سے کہا۔

"پاروتی میں صبح بھی تمہیں ایک بزرگ کے پاس لے کر جارہا ہوں۔ بابا سدا رنگ جس نے تم پر کئے گئے منتر کے طلسم کو توڑنے کا طریقہ بتایا تھا۔ انہوں نے ہی مجھے کم دیا کہ میں درگاہ شریف خواجہ خواجگان کے حوض کا پانی تمہیں پلاؤں۔ میں نے ایسا

ہی کیا اور تم انسانی شکل میں واپس آگئیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ صبح پاروتی کو لے کر درگاہ شریف کی مسجد کے سامنے درخت کے نیچے ایک فقیر بیٹھا ملے گا۔ اس کے پاس جانا۔ کیا تم اس فقیر کے پاس جانا چاہتی ہو؟"

پاروتی نے کہا۔ "کیوں نہیں - میں ضرور جاؤں گی۔ مجھے تو اب معلوم ہوا ہے کہ تم مسلمانوں کا مذہب اسلام نورانی مذہب ہے - اور تمہارا دین ہی سچا ہے۔ میں تو شروع ہی سے اسلام کو دل سے مانتی تھی۔ مگر کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ مجھے اس فقیر کے پاس ضرور لے چلو۔ میں چاہتی ہوں کہ اس فقیر کے ہاتھ پر مسلمان ہو جاؤں۔"

یہ بات میں چاہتا تھا کہ پاروتی خود کہے۔ اور اپنی مرضی سے اسلام کا دین اختیار کرلے۔ اب جبکہ اس نے اس خواہش کا حرف حرف اظہار کردیا تو میں نے اسے کہا۔

" ٹھیک ہے صبح مسجد والے فقیر کے پاس چلیں گے۔ ان کے آگے تم خود اس خواہش کا اظہار کرنا۔ وہ تمہیں کلمہ پڑھا کر مسلمان کر دیں گے۔"

پاروتی بڑی خوش ہوئی۔ ہم نے قبرستان کی بارہ دری میں اسی طرح پرانے دنوں کو یاد کرکے ' ان کی باتیں کرکے باقی کی رات گزار دی۔ جب صبح کا اجالا پھیلا تو میں اسے ساتھ لے کر درگاہ شریف والی مسجد کے پاس آگیا۔ میں نے دیکھا کہ مسجد کے سامنے نیم کا سایہ دار درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے ایک فقیر بوریئے پر بیٹھا تسبیح پھیر رہا تھا۔ میں نے اور پاروتی نے قریب جاکر سلام کیا اور خاموشی اور ادب سے ایک طرف ہوکر بیٹھ گئے۔ فقیر کی آنکھیں بند تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور پاروتی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بچی تم بڑی خوش قسمت ہو کہ اللہ نے تمہیں سیدھی راہ دکھا دی۔"

میں نے پاروتی کو اشارہ کیا۔ اس نے فقیر سے کہا

"بابا جی میں ہندو عورت ہوں۔ لیکن میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ مجھے مسلمان کردیں۔"

فقیر کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ اس نے کہا۔ "تم پر خدا کی رحمت ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ فقیر ہمیں مسجد میں لے گیا۔ یہاں اس نے اپنی نگرانی میں پاروتی کو وضو کرایا۔ اپنے سامنے بٹھایا اور کلمہ شریف پڑھا کر مسلمان کیا اور کہا۔

" بچی ہم نے تمہارا نام پاروتی سے پروین رکھ دیا ہے۔ اب تم مسلمان ہو اور خداوند کریم نے تمہیں اپنی رحمتوں کے سائے میں لے لیا ہے۔"

پاروتی نے دعا مانگ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور فقیر سے پوچھا۔

باباجی میرے پاس ایک طاقت تھی کہ میں انسان سے ناگن اور ناگن سے پھر انسان بن جاتی تھی۔ کیا یہ طاقت اب بھی میرے پاس رہے گی؟"

فقیر نے کہا۔ "وہ طاقت تم نے اپنی جان پر سخت مصیبتیں اٹھا کر دن رات کی چلہ کشی اور محنت سے حاصل کی ہے۔ وہ طاقت تمہارے پاس ہی رہے گی۔ لیکن اس طاقت کو تم انسانوں کی بھلائی کے لئے استعمال کرو گی۔ اپنی اس طاقت سے کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔

پاروتی یعنی پروین نے کہا "میں وعدہ کرتی ہوں بابا کہ ایسا ہی کروں گی۔"

فقیر نے اسے دعا دی اور کہا۔ "جاؤ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔"

* ہم نے فقیر کو سلام کیا اور مسجد سے نکل آئے - باہر آکر پروین (اب میں بھی پاروتی کو پروین ہی لکھوں گا) نے مجھ سے کہا۔

"میں کلکتہ جاکر ایک بار اپنا پرانا مکان دیکھنا چاہتی ہوں - کیا تم میرے ساتھ چلوگے؟"

میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔ لیکن دل میں ایک خیال ضرور آیا کہ کہیں اس علاقے میں گرو پجاری سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ ہم پھر کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔

میں نے پروین سے کہا۔

"ہمارے پاس ریل کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ ہم نے ریل میں بغیر ٹکٹ سفر کیا تو پکڑے جائیں گے۔"

پاروتی یعنی پروین سوچ میں پڑ گئی۔ تھوڑی دیر غور کرتی رہی۔ پھر بولی۔

"میرے کپڑے بھی بڑے پرانے ہو گئے ہیں اور یہ ہندوؤں کا لباس ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ مسلمان عورتوں کی طرح شلوار قمیض اور دوپٹہ اوڑھوں - میں اب ساڑھی کبھی نہیں پہنوں گی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ایک بات ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" پروین نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"میں دلی میں کسی دکان یا کارخانے میں نوکری کر لیتا ہوں۔ ہم پیسے جمع کر کے کلکتے کا کرایہ بھی اکٹھا کر لیں گے اور تم اپنا نیا لباس بھی بنوا لینا۔"

پروین کہنے لگی۔

"تمہاری بیوقوفوں والی باتیں نہ گئیں اس طرح تو ہمیں نہ جانے کتنے دن دلی شہر میں رہنا پڑے۔ نہیں۔ میں اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ میرے پاس جتنے پیسے تھے وہ تو ختم ہو چکے ہیں۔ اب تو صرف اتنے پیسے ہیں کہ جس سے ہم دوپہر کا کھانا ہی کھا سکتے ہیں۔"

پروین کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے پوچھا۔ "کہاں جانا چاہتی ہو؟"

پروین نے کہا۔ "میں تمہیں اسی قبرستان میں لے جانا چاہتی ہوں جہاں ہم نے رات بسر کی تھی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ہم درگاہ شریف کی بستی کے پیچھے سے ہوتے ہوئے اس قبرستان میں آ گئے جو درختوں کے جھنڈ میں تھا اور جہاں ایک پرانی بارہ دری میں ہم نے رات گزاری تھی اور پروین سانپ سے انسانی شکل میں واپس آئی تھی۔ دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ قبرستان میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس قبرستان میں کچھ نئی قبریں تھیں اور کچھ پرانی بھی تھیں۔ پروین نے کہا۔

"بارہ دری والی قبر پر چلو۔"

ہم بارہ دری میں آ گئے۔ پروین نے قبر کے گرد ایک چکر لگا کر اس کا جائزہ لیا۔ پھر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس قبرستان میں کسی بادشاہ کا کوئی خزانہ دفن ہے۔"

میں اس کا منہ تکنے لگا۔

"خزانہ؟ بادشاہ کا خزانہ؟"

"ہاں" پروین نے کہا۔

میں نے پوچھا۔ "لیکن اس خزانے کا سراغ کون لگائے گا؟"

پروین نے کہا۔ "اس کا سراغ نہ تم لگا سکتے ہو۔ نہ میں لگا سکتی ہوں۔ اس کا سراغ ایک سانپ لگائے گا۔"

"کون سا سانپ؟ مجھے تو یہاں کوئی سانپ دکھائی نہیں دیتا۔"

پروین کہنے لگی۔

"ایک سانپ اس قبرستان میں موجود ہے۔ مجھے اس کی بو آ رہی ہے۔ میں اس کو بلاتی ہوں اور خزانے کے بارے میں اس سے بات کرتی ہوں۔"

مجھے معلوم تھا کہ پروین ایسا کر سکتی ہے۔ وہ پہلے بھی سانپوں کو بلا کر ان سے ان کی زبان میں بات کیا کرتی تھی۔ میں نے کہا۔

"بھلا بلاؤ سانپ کو۔"

پروین نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ مل رہے تھے وہ منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہوا میں پھونک ماری اور منہ سے رک رک کر دو تین ایسی آوازیں نکالیں جیسے وہ سس سس کر رہی ہو۔ وہ کسی ان دیکھے سانپ سے اس کی زبان میں بات کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"جو سانپ اس قبرستان میں رہتا ہے میں نے اسے بلایا ہے۔"

میں بھی چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں بارہ دری کے نیچے سامنے کی جانب پرانی قبروں کے درمیان مجھے ایک کالا سانپ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ پروین نے بھی اس سانپ کو دیکھ لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"وہ دیکھو۔ سانپ آ رہا ہے۔ اس نے میری آواز سن لی تھی۔ میں اس سے خزانے کی بابت پوچھتی ہوں۔ تم اپنی جگہ پر بالکل بے حس و حرکت ہو کر بیٹھے رہنا۔"

میں ساکت ہو کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں سانپ بارہ دری کے فرش پر نمودار ہوا۔ یہ کالے رنگ کا کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا سانپ تھا۔ اس کے جسم پر نیلے رنگ کی دھاریاں بھی تھیں۔ سانپ قبر کے اوپر سے ہو کر آیا اور پاروتی یعنی پروین کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے پھن کھولا اور تین بار سر جھکا کر پروین کو سلام کیا۔ پروین اب اس سے سانپوں کی زبان میں باتیں کرنے لگی۔ وہ بات کر کے چپ ہو جاتی تو سانپ کے منہ سے بھی سس سس اور سسکار کی آوازیں نکلنے لگتیں۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھا انسان اور سانپ کے درمیان یہ عجیب و غریب مکالمہ سن رہا تھا۔

جب ان کا مکالمہ ختم ہوا تو سانپ فرش پر بارہ دری کی سیڑھیوں کی طرف رینگنے لگا۔ پروین نے مجھ سے کہا۔

"سانپ ہمیں ایک دفن شدہ خزانے کے پاس لے کر جا رہا ہے۔ خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔"

سانپ سیڑھیاں اتر کر قبروں میں چلنے لگا۔ ہم دونوں بھی اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ جہاں قبرستان کی سرحد ختم ہوتی تھی وہاں ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا۔ کھنڈر کیا تھا محض ایک موٹی دیوار تھی جس کی پرانی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھیں اور زمین پر ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ سانپ اس بوسیدہ دیوار کے پیچھے آ کر رک گیا۔ پروین اور میں بھی وہاں پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ پروین نے ایک بار پھر سانپ سے اس کی زبان میں باتیں شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر بعد سانپ دیوار کے قریب اینٹوں کے ڈھیر میں گھس گیا۔ میں نے پروین سے پوچھا۔

"سانپ کہاں گیا ہے؟"

وہ بولی۔ "یہاں کسی مغل بادشاہ کا بڑا قیمتی خزانہ دفن ہے۔ یہ خزانہ زمین سے کئی گز نیچے دفن ہے۔ میں نے سانپ کو حکم دیا ہے کہ وہ بادشاہ کے مدفون خزانے میں سے کوئی قیمتی ہیرا موتی نکال کر لے آئے۔ کیونکہ ہم نے سارا خزانہ لے کر کیا کرنا ہے۔ جتنی ہمیں ضرورت ہے ہم اتنا ہی لے لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ یہ تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ اتنی زیادہ دولت لے کر ہم کیا کریں گے۔"

ہم وہیں اینٹوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھ کر سانپ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد سانپ اینٹوں میں سے باہر آتا نظر آیا۔ اس نے منہ میں ایک سرخ رنگ کا آلوچے جتنا بڑا موتی پکڑا ہوا تھا۔ سانپ نے وہ سرخ موتی پاروتی کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اگر میں اپنی داستان بیان کرتے کرتے پروین کی جگہ پاروتی کا نام بول جاؤں تو کوئی خیال نہ کیجئے گا بلکہ اسے پروین ہی سمجھئے گا۔ کیونکہ پاروتی کے اسلام

قبول کرنے کے بعد اس کا نام فقیر بابا نے پروین رکھ دیا تھا۔ پروین نے موتی اٹھا کر غور سے دیکھا پھر مجھے دکھایا اور کہنے لگی۔

"مجھے ہیرے موتیوں کی زیادہ پہچان نہیں ہے کیا تمہیں پہچان ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں بھی اس معاملے میں تمہاری طرح اناڑی ہوں۔ یہ تو کوئی جوہری ہی دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ موتی کتنا قیمتی ہے۔"

پروین نے سانپ کو اس کی زبان میں واپس جانے کا حکم دیا۔ سانپ سر جھکا کر پروین کو سلام کر کے قبروں کی طرف چلا گیا اور غائب ہو گیا۔ پروین کہنے لگی۔

"چلو اب دلی کے صرافہ بازار میں چل کر اس موتی کو کسی جوہری کے پاس فروخت کرتے ہیں۔ اس کو بیچ کر جو روپے ملیں گے ان سے ہم کلکتہ کے دو ٹکٹ خرید کر کلکتے چلے جائیں گے۔"

ہم دونوں میں سے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ موتی کس قدر قیمتی ہے۔ یہ راز تو دلی کے صرافہ بازار میں پہنچنے کے بعد کھلا۔ ہم دونوں قبرستان سے نکلے اور بستی درگاہ شریف میں سے ایک تانگے میں بیٹھ کر شہر آ گئے۔ شہر پہنچ کر پوچھتے پوچھتے صرافہ بازار میں آئے تو وہاں دکانوں کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ دن کے وقت بھی دکانوں میں بڑے بڑے بلب روشن تھے۔ شیشے کی الماریوں میں سونے کے زیورات چمک دمک رہے تھے۔ جوہری اپنی دکانوں پر بیٹھے کاروبار میں مصروف تھے۔

"پروین نے پوچھا۔

"کس جوہری کے پاس چلیں گے؟"

میں نے کہا۔ "کسی کے پاس بھی چلے چلتے ہیں۔ ہمیں تو یہ موتی بیچنا ہے۔ ہمیں اس سے کیا کہ جوہری کیسا ہے؟"

میں پروین کو ساتھ لے کر ایک دکان میں داخل ہو گیا۔ جوہری ہندو سیٹھ تھا۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ توند نکلی ہوئی تھی۔ پیچھے دیوار پر لکشمی دیوی کی تصویر لگی تھی جس پر گیندے کے پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ میں اور پروین لباس ہی سے مسلمان لگتے تھے۔

جوہری نے ہمیں ایک نظر دیکھا اور ہمیں بے حیثیت سمجھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟ کوئی ٹانکا وغیرہ لگوانا ہے تو دوسرے بازار میں جاؤ۔ یہاں زیوروں کو ٹانکا لگانے کا کام نہیں ہوتا۔"

اس حقیقت کا شروع ہی سے مجھے تجربہ ہو چکا تھا کہ بھارت کے ہندو اپنے آپ کو مسلمانوں سے برتر سمجھتے ہیں اور دل میں مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ انہیں مزدور کی حیثیت دیتے ہیں۔ مجھے ہندو سیٹھ کا یہ توہین آمیز رویہ سخت برا لگا۔ اسے پروین نے بھی محسوس کیا۔ خزانے کا موتی میری جیب میں تھا۔ میں نے کہا۔

"ہم کسی زیور کو ٹانکا لگوانے نہیں آئے۔"

ہندو سیٹھ نے چڑ کر کہا۔

"تو پھر منہ اٹھائے اندر کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہمارے پاس ایک خاندانی موتی ہے۔ ہمارے حالات ٹھیک نہیں رہے۔ ہم اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔"

ہندو سیٹھ نے بے اعتنائی سے کہا۔

"دکھاؤ دکھاؤ میاں کونسا موتی ہے نکالو۔ ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔"

میں نے مدفون خزانے کا سرخ موتی نکال کر سیٹھ کے سامنے شیشے کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ میری نگاہیں سیٹھ کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ موتی کو دیکھتے ہی سیٹھ کے چہرے پر ایک نمایاں تبدیلی ظاہر ہو گئی تھی۔ اس نے آلوچے کے سائز کا سرخ موتی اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس سے زیادہ قیمتی موتی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مگر ہندو سیٹھ بڑا کائیاں اور مکار آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ یہ انمول موتی ہمیں کہیں سے ہاتھ لگ گیا ہے۔ فوراً ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ بے نیازی سے موتی ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ نقلی موتی ہے میاں صاحب۔ اس کو لے جاؤ۔"

پروین نے کہا۔

"لالہ جی! یہ موتی نقلی نہیں ہے۔ اصلی ہے۔ آپ اسے غور سے دیکھیں۔"

ہندو سیٹھ نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔

"بی بی! یہ نقلی ہے۔ میں نے غور سے دیکھ لیا ہے۔"

میں نے موتی اٹھا لیا۔ سیٹھ کے پاس اس کا ایک ملازم شیشے کے شوکیس کو کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔ وہ اپنے لباس سے مسلمان لگتا تھا۔ اس نے بھی موتی کو دیکھا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے جس بادشاہ کے خزانے کا یہ موتی ہے اس کو کسی نے نقلی موتی دے دیا ہو۔ اتنے میں ہندو سیٹھ کو اندر سے کسی نے آواز دی۔ وہ کرسی پر سے اٹھ کر دکان کے اندر چلا گیا۔ اسکے ساتھ ہی ملازم نے ہماری طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ موتی اصل ہے اور بڑا قیمتی ہے۔ ہندو لالے کی باتوں میں نہ آنا۔"

یہ کہہ کر مسلمان ملازم شوکیس کی جھاڑ پونچھ کرتا دوسری طرف چلا گیا۔ میں نے پروین سے کہا۔

"لگتا ہے یہ ہندو سیٹھ ہم سے یہ قیمتی موتی اونے پونے ہتھیانا چاہتا ہے۔"

پروین نے کہا۔

"جو دیتا ہے لے لو۔ ہمیں اتنے پیسے لے کر کیا کرنے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مگر ہم بیوقوف بننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سیٹھ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔"

اس دوران ہندو سیٹھ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ہماری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"میاں! ایک بات کروں گا۔ میں اس موتی کے تمہیں پانچ روپے دے دوں گا۔ ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں دوں گا۔ منظور ہے تو موتی دے جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "مگر سیٹھ صاحب! یہ بڑا قیمتی موتی ہے۔"

"تو تم اس کا کیا لو گے؟ تم ہی بتا دو۔"

ہندو سیٹھ نے ترش لہجے میں کہا۔ میں نے کہا۔

"ہم تو اس کے کم از کم پانچ ہزار روپے لیں گے۔"

ہندو سیٹھ بولا۔

"میرا بڑا بھائی اندر کمرے میں بیٹھا ہے میں اس سے بات کرتا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ سیٹھ اندر پہلے ہی سے اپنے بڑے بھائی سے بات کر آیا تھا کہ مغلیہ دور کا ایک نایاب موتی بکنے کو آیا ہے جو اتنا قیمتی ہے کہ ہم ساری دکان بیچ کر بھی اسے نہیں خرید سکتے۔ میں نے موتی جیب میں رکھ لیا اور ہندو سیٹھ کے ساتھ دکان کے اندر جو چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا وہاں آ گئے۔ کمرے میں میز کرسیاں لگی تھیں۔ ایک بڑی مکار شکل والا ہندو لالہ کرسی پر بیٹھا ترازو میں چھوٹے چھوٹے سفید موتی تول رہا تھا یہ سیٹھ کا بڑا بھائی تھا۔ سیٹھ بھی ہمارے ساتھ ہی کمرے میں آیا تھا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔

"یہ نقلی موتی کے پانچ ہزار مانگتے ہیں۔ مکند لال جی!"

مکند لال نے ہماری طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ترازو ایک طرف رکھا اور بولا۔

"لاؤ۔ دکھاؤ کونسا موتی ہے؟"

میں نے سرخ موتی اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے موتی کو الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔

"یہ موتی تو چوری کا ہے۔ تم لوگوں نے کہاں سے چرایا ہے؟ سچ سچ بتا دو نہیں تو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا۔

"یہ چوری کا نہیں ہے۔ یہ ہمارا خاندانی موتی ہے ہمارے حالات خراب ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس خاندانی موتی کو فروخت کرنا چاہتے ہیں۔"

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس دوران مکند لال پولیس کو فون کر چکا تھا۔ ہم ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک دم سے ایک سکھ تھانیدار اور تین سپاہی کمرے میں

داخل ہوئے اور انہوں نے آتے ہی مجھے اور پروین کو حراست میں لے لیا۔ سکھ تھانیدار نے اسی وقت مجھے ہتھکڑی لگا دی۔ میں نے سخت احتجاج کیا مگر میری کسی نے نہ سنی۔ سپاہی مجھے اور پروین کو پکڑ کر دکان کے باہر لے آئے۔ باہر پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ ہمیں زبردستی گاڑی میں دھکیل دیا گیا اور گاڑی تھانے کی طرف روانہ ہو گئی۔

تھانے پہنچ کر مجھے اور پروین کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ میں نے پروین سے کہا۔

"تم دیکھ رہی ہو کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ پھر تم اپنی طاقت سے کام کیوں نہیں لیتی؟"

پروین کہنے لگی۔

"میں ایک خاص وقت کا انتظار کر رہی ہوں۔"

اتنے میں سکھ تھانیدار حوالات کی سلاخوں والے دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بڑی رعونت سے بولا۔

"سچ سچ بتا دو تم نے موتی کہاں سے چرایا ہے۔ نہیں تو عدالت کی طرف سے تم دونوں کو پانچ پانچ سال کی سزا ہو جائے گی۔"

میں نے سکھ تھانیدار کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم چور نہیں ہیں۔ یہ ہمارا خاندانی موتی ہے۔ مگر وہ نہ مانا اور چلا گیا۔ اس حوالات میں پہلے سے ایک ملزم کمبل اوڑھے کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب تھانیدار چلا گیا تو ملزم نے ہم سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے اسے ساری بات بتائی تو وہ بولا۔

"یہ تھانیدار صرافہ بازار کے ہندو سیٹھوں سے ملا ہوا ہے۔ جب بھی کوئی کم حیثیت کا آدمی کوئی قیمتی زیور یا ہیرا موتی لے کر آتا ہے تو سیٹھ سکھ تھانیدار کی مدد سے اسے حوالات میں پہنچا دیتا ہے اور اس کا مال خود ہضم کر جاتا ہے۔ تھانیدار کو ہندو سیٹھ ہر ماہ ایک خاص رقم رشوت کے طور پر دیتا ہے۔"

میرے ساتھ پروین بھی اس ملزم کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔

"بتاؤ۔ کیا اب بھی تم خاموش رہو گی؟"

پروین کہنے لگی۔

"اب میرا فرض بن گیا ہے کہ میں سادہ لوح لوگوں کو ان ٹھگوں سے نجات دلاؤں۔"

پھر اس نے ملزم کی طرف دیکھا جس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی مگر مجرمانہ زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ کمزور اور زیادہ عمر کا لگ رہا تھا۔ پروین نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"کیا اس آدمی کے سامنے طاقت کا مظاہرہ کروں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

پروین کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگی۔

"تم حوالات میں میرا انتظار کرو۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گی۔"

ملزم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بی بی! حوالات کو تو باہر سے تالا لگا ہے باہر سنتری بھی پہرہ دے رہا ہے۔ تم کیسے باہر جاؤ گی؟"

پروین نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ دیوار کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ زور سے لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ملزم تعجب سے پروین کو تک رہا تھا کہ یہ عورت لمبے لمبے سانس کیوں لے رہی ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"بھائی! کیا تمہاری گھر والی کو کوئی بیماری لگی ہوئی ہے؟"

میں نے اسے جھڑک دیا۔

"خاموش رہو۔"

ملزم چپ ہو گیا۔ اس دوران پروین اچانک ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔ اس

کی جگہ ایک بالشت بھر کا نیلا سانپ کنڈل مارے بیٹھا تھا۔ حوالاتی ملزم کا تو رنگ اڑ گیا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سانپ کو دیکھنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس کی زبان سے صرف اتنا نکلا۔

"س س سانپ"

اور وہ وہیں دہشت کے مارے بے ہوش ہو کر لڑھک گیا۔ مجھے پروین کی آواز آئی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

حوالات کے دروازے پر جو سنتری پہرہ دے رہا تھا وہ سٹول پر بیٹھا تھا اور اس کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ پروین نیلے سانپ کے روپ میں حوالات کی سلاخوں میں سے رینگ کر باہر نکل گئی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ سانپ سنتری کی ٹانگوں کے قریب گیا اور میرے دیکھتے دیکھتے اس نے سنتری کو ڈس دیا۔ سنتری ذرا سا اچھلا اس نے اپنی ٹانگ کو جھک کر دیکھا اور وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حوالات تھانے کی عمارت کے کونے میں واقع تھی۔ یہاں سے تھانے کے دفتر پر نظر نہیں پڑتی تھی۔ سنتری کے بے ہوش ہوتے ہی پروین سانپ سے انسانی شکل میں واپس آ گئی۔ سنتری کی بیلٹ کے ساتھ چابیوں کا گول رنگ لٹکا ہوا تھا۔ پروین نے رنگ نکالا۔ اس میں سے ایک چابی حوالات کے تالے کو لگتی تھی۔ پروین نے دو تین چابیاں لگائیں۔ چوتھی چابی لگ گئی۔ وہ دروازہ کھول کر بولی۔

"باہر آ جاؤ۔"

میں جلدی سے حوالات سے باہر آ گیا۔ ہم دونوں حوالات کے پیچھے سے تیز تیز چلتے سڑک پر آ گئے۔

سڑک پر آتے ہی میں نے پروین سے کہا۔

"ہمارا موتی اس کمینے ہندو سیٹھ کے قبضے میں ہے۔ ہمیں اس سے اپنا موتی واپس لینا ہے۔"

پروین بولی۔ "ہم وہیں جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تھانیدار کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ ہم حوالات سے فرار ہو گئے ہیں۔ وہ ضرور ہماری تلاش میں پولیس لے کر ہندو سیٹھ کی دکان پر آئے گا۔"

پروین نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ اب میں ان سب ٹھگوں سے سمجھ لوں گی۔"

میں نے پروین سے پوچھا کہ کیا اس نے سنتری کو ہلاک کر دیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔

"نہیں۔ میں اب کسی بھی انسان کو ناحق ہلاک نہیں کر سکتی۔ مجھے میرا دین اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ میری طاقت صرف انسانیت اور اسلام کے دشمنوں کے خلاف استعمال ہونے کے لئے وقف ہے۔"

ہم جتنی جلدی نکل سکتے تھے پولیس سٹیشن کے علاقے سے نکل گئے۔ ہمارے پاس اب اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ تانگے یا رکشے میں بیٹھ کر صرافہ بازار پہنچتے۔ ہمیں صرافہ بازار کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ پوچھتے پوچھتے جب ہم صرافہ بازار میں آئے تو شام ہو چکی تھی اور بازار کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔

میں نے پروین سے کہا۔

"مجھے خطرہ ہے کہ پولیس سیٹھ کی دکان پر ہمارا انتظار نہ کر رہی ہو۔ پولیس ہماری تلاش میں یہاں ضرور آئی ہوئی ہو گی۔"

پروین بازار میں ایک طرف رک گئی۔ ہندو سیٹھ کی دکان ہم نے پہچان لی تھی۔ وہ ہم سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ بازار میں لوگوں کی کافی آمد و رفت تھی۔ سونے چاندی کے زیورات سے بھری ہوئی دکانیں دن کے مقابلے میں شام کے وقت زیادہ جگمگا رہی تھیں۔

"تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہندو سیٹھ سے ہمیں اپنا قیمتی موتی بھی واپس لینا ہے۔"

پروین کہنے لگی۔

"ایک کام کرتے ہیں۔ میں سانپ کا روپ بدلتی ہوں۔ تم مجھے اپنی جیب میں چھپا لینا۔ اس کے بعد سیٹھ کے پاس جا کر اس سے اپنا موتی واپس مانگنا۔ اگر اس نے سیدھے سبھاؤ دے دیا تو بڑی اچھی بات ہو گی۔ ہم سیٹھ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ اگر اس نے موتی دینے سے انکار کیا تو پھر میں معاملہ خود ہی ٹھیک کر لوں گی۔"

بازار میں لوگ آ جا رہے تھے۔ وہاں پروین سانپ کا روپ اختیار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔

"وہ ایک گاڑی کھڑی ہے۔ اس کے پیچھے آ جاؤ۔"

بازار میں ایک دکان کے قریب بند گاڑی کھڑی تھی۔ میں اور پروین اس کے پیچھے چلے گئے۔ اب ہم لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ پروین نے آنکھیں بند کر کے دو تین گہرے سانس لئے۔ دوسرے لمحے میرے سامنے زمین پر ایک نیلے رنگ کا سانپ موجود تھا۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈالا اور تیز تیز قدموں سے ہندو سیٹھ کی دکان کی طرف چل پڑا۔

مجھے باہر کوئی پولیس کا سپاہی دکھائی نہ دیا۔ ہندو سیٹھ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا بہی کھاتہ

کھول کر اس پر کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا۔

"لالہ جی! ہمارا موتی واپس کر دو۔ میں اپنا موتی واپس لینے آیا ہوں۔"

ہندو سیٹھ نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک دم غصے میں آ کر بولا۔

"تم چور ہو۔ تم حوالات توڑ کر بھاگے ہو پولیس تمہارے پیچھے لگی ہے۔ میں ابھی تھانیدار صاحب کو فون کرتا ہوں۔"

وہ ٹیلی فون کرنے ہی لگا تھا کہ میں نے اس کا بازو کھینچ لیا اور کہا۔

"ہم فساد نہیں کرنا چاہتے۔ ہم کسی کو کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ تم نے ہمارا قیمتی موتی پولیس کی ملی بھگت سے ہم سے ہتھیا لیا ہے۔ وہ ہمیں واپس کر دو۔"

دکان کے دوسرے ملازم ایک دم وہاں آ گئے۔ سیٹھ نے چلا کر کہا۔

"اس کو پکڑ لو۔ یہ جیل سے بھاگا ہوا چور ہے۔"

جیسے ہی سیٹھ کے نوکر میری طرف بڑھے میں نے جیب سے سانپ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور چلا کر بولا۔

"خبردار! اگر کوئی میرے قریب آیا تو زندہ نہیں بچے گا۔"

میں نے سیٹھ سے ایک بار پھر کہا۔

"سیٹھ میری امانت واپس کر دو۔ یہ ہماری شرافت ہے کہ ہم نے ابھی تک تمہارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔"

ایک ملازم نے مجھے پیچھے سے ایسا دھکا دیا کہ سانپ میری ہاتھ سے چھوٹ کر کاؤنٹر پر جا گرا۔ ملازموں نے مجھے قابو کر لیا اور دو نوکر سانپ کو مارنے کے لئے بڑھے۔ اچانک سانپ نے ایک خوفناک پھنکار ماری۔ میں نے دیکھا کہ پھنکار کے ساتھ سانپ کے منہ سے چنگاریوں کی پھل جھڑیاں سی نکل کر شراروں کی طرح دکان کے اندر اڑنے لگیں۔ سب خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دبک گئے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں دکان کے اندر جو چھوٹا کمرہ تھا شور سن کر اس کے اندر سے ہندو سیٹھ کا مکار بھائی بھی

باہر آ گیا۔ مجھے صرف ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ سانپ کو کسی شے سے مار نہ دیں۔ مگر پروین اتنی ناسمجھ نہیں تھی کہ اپنے آپ کو سانپ کے روپ میں ان کے آگے زیادہ دیر تک رہنے دیتی۔

دوسری پھنکار کے ساتھ ہی اس نے انسانی شکل اختیار کر لی۔ اس کرامت کی وہاں اشد ضرورت تھی۔ صرف یہی ایک طریقہ ان ضعیف الاعتقاد توہم پرست ہندوؤں کو مطیع کرنے کا رہ گیا تھا۔ ذرا تصور کریں کہ آپ کے سامنے ایک سانپ بیٹھے بیٹھے اچانک عورت بن جائے تو آپ کا کیا حال ہو گا۔ آپ تو ششدر ہو کر رہ جائیں گے۔ یہی حال وہاں دکان کے اندر ملازموں اور دکان کے دونوں ہندو سیٹھوں کا ہوا۔ پروین کو ان لوگوں نے پہچان تو لیا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو میرے ساتھ موتی بیچنے دکان پر آئی تھی۔ مگر یہ بات وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ عورت حقیقت میں ایک ناگن ہے جو عورت کی شکل میں چل پھر رہی تھی۔ ان لوگوں پر ایک دہشت طاری ہو گئی تھی۔ پروین کاؤنٹر سے نیچے اتر آئی۔ اس نے سیٹھ سے کہا۔

"جو موتی ہم تمہارے پاس لائے تھے وہ ہمیں واپس کر دو۔"

ہندو سیٹھ سے مارے دہشت کے بات نہیں ہو رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ ہاتھ سوائے مسلمان نوکر کے سب نے جوڑے ہوئے تھے۔ وہ پروین کو کوئی آسمانی دیوی سمجھ رہے تھے۔ ہندو سیٹھ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے شما کر دو دیوی جی..."

پروین نے کہا۔

"زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہمارا موتی نکالو۔"

سیٹھ نے اس وقت ایک دراز کھولا۔ اس میں سے ہمارا آلوچے کے سائز کا سرخ موتی نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر رحم طلب انداز میں بولا۔

"دیوی میا! میری غلطی معاف کر دو۔ ہم سے بھول ہو گئی تھی۔ ہمیں شما کر دو۔"

پروین نے موتی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"یہی موتی ہے نا؟"

میں نے موتی کو غور سے دیکھا۔ وہ خزانے والا موتی ہی تھا۔ میں نے کہا۔

"موتی تو وہی ہے مگر ان دھوکے بازوں اور لٹیروں کو بھی کچھ سزا ملنی چاہئے۔ نہ جانے انہوں نے کیسے ضرورت مند غریب لوگوں کو نہیں لوٹا ہو گا۔"

دونوں سیٹھ ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگے۔ دکان کے ملازموں پر تو سانپ کے اچانک انسان بن جانے کے شعبدے کا اس قدر شدید اثر ہوا تھا کہ وہ جیسے سکتے کے عالم میں تھے اور ایک طرف دبکے ہمیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے تک رہے تھے کہ یہ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔

پروین نے کہا۔

"میں اگر چاہوں تو صرف ایک پھنکار مار کر تمہاری ساری دکان کو جلا کر راکھ کر سکتی ہوں۔ مگر میرا دین اسلام مجھے حکم دیتا ہے کہ اگر ایک آدمی اپنے گناہوں سے توبہ کر لے اور آئندہ وہ گناہ نہ کرنے کا وعدہ کرے تو اسے معاف کر دو۔ اگر تم مجھ سے سچا وعدہ کرو کہ تم آئندہ کسی کے ساتھ دھوکہ نہیں کرو گے۔ کسی مصیبت زدہ کی مصیبت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو میں تمہیں معاف کر سکتی ہوں۔ ورنہ میرے صرف ایک بار پھنکارنے کی دیر ہو گی اور یہ ساری دکان شعلوں میں بھڑکنے لگے گی۔"

دونوں سیٹھ پروین کے آگے سجدے میں گر گئے۔ پروین نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"دیکھو یہ فرق ہوتا ہے ایک مسلمان اور ہندو میں۔ مسلمان خدا کے سوا کبھی کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ مگر ان دونوں ہندوؤں کی جب جان پر بنی تو میرے آگے سجدے کرنے لگے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد پروین میں ایک زبردست اور تعمیری تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے دونوں ہندو سیٹھوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ لیکن یاد رکھنا۔ اگر اب تم نے کسی کو دھوکا دے

کر اس کا مال لوٹا تو میں جہاں بھی ہوں گی اسی وقت یہاں پہنچ جاؤں گی اور تمہاری دکان کو آگ لگا دوں گی۔"

دونوں بھائی سجدے سے سر اٹھا کر روتے ہوئے بولے۔

"دیوی! ہم کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیں گے۔"

پروین نے کہا۔

"ٹھیک ہے - اب آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

پروین کاؤنٹر سے نیچے اتر آئی۔ اس نے دکان کے ملازموں سے کہا۔

"تم لوگ بھی اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاؤ۔ یوں سمجھو کہ یہاں کچھ نہیں ہوا۔"

پھر اس نے سیٹھ سے کہا۔

"لالہ جی! اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر دکان کے پچھلے کمرے میں چلو۔"

دونوں سیٹھ فوراً دکان کے پچھلے کمرے میں آ گئے۔ پروین نے میری طرف گردن موڑ کر کہا۔

"آخر ہمیں موتی بھی فروخت کرنا ہے۔"

دکان کے عقبی کمرے میں آ کر پروین نے دروازہ بند کر دیا ور مجھ سے کہا۔

"موتی نکال کر مجھے دو۔"

میں نے جیب سے موتی نکال کر پروین کے حوالے کر دیا۔ اس وقت دونوں سیٹھ میز کے قریب کرسیوں پر سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ پروین نے سرخ موتی ان کے سامنے میز پر رکھ دیا ور کہا۔

"اب دیانت داری سے بتاؤ کہ اس موتی کی اصل قیمت کتنی ہے؟"

ہندو سیٹھ نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"دیوی جی! اگر آپ اس کی اصل قیمت پوچھتی ہیں تو وہ اتنی زیادہ ہے کہ میں اپنی ساری دکان زیوروں اور ہیرے جواہرات کے ساتھ فروخت کر دوں تو اس موتی کی

ی قیمت بھی ادا نہیں ہو گی۔ یہ سرخ موتی نایاب ہے۔ اس ملک کا امیر سے امیر ی بلکہ راجہ مہاراجہ بھی اس موتی کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔"

پروین کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے ہم یہ موتی تمہارے پاس فروخت نہیں کریں گے کیونکہ تم اس کی ل قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ مگر تم نے ہم دونوں کی بے عزتی کی ہے تمہاری وجہ سے ں پولیس چوروں کی طرح ہتھکڑی لگا کر لے گئی اور حوالات میں بند کر دیا۔ تمہیں ں کا ہرجانہ دینا ہو گا۔"

لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"میں ہرجانے بھرنے کو تیار ہوں۔ آپ حکم کریں دیوی جی!"

میں دل میں پروین کی ذہانت کی تعریف کرنے لگا۔ اس نے اچھا کیا جو اونے پونے ی ان دھوکے بازوں کے پاس فروخت نہیں کیا۔ یہ اس لائق نہیں تھے کہ اربوں پے کی مالیت کا قدیم انمول موتی ان کو چند ہزار روپوں کے عوض دے دیا جاتا۔ ین نے کہا۔

"تمہاری تجوری میں جتنے کرنسی نوٹ ہیں سب یہاں منگواؤ۔"

"جو حکم دیوی جی!"

لالہ جی نے اپنے چھوٹے بھائی کو چابی دے کر کہا۔

"مکند لال جی! تجوری کا سارا مال لے آؤ۔"

مکند لال باہر چلا گیا۔ پروین کہنے لگی۔

"تم لوگ دیوی دیوتاؤں کی پوجا بھی کرتے ہو اور لوگوں سے دھوکے بھی کرتے ۔ ان کی دولت لوٹتے ہو۔ یقین کرو اگر میں مسلمان نہ ہوتی تو تم دونوں بھائیوں کو ھی زندہ نہ چھوڑتی۔"

سیٹھ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"دیوی جی! کیا آپ مسلمان ہیں؟"

پروین نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"خاموش ہو کر بیٹھے رہو۔"

سیٹھ وہیں سہم کر دبک گیا۔ اتنے میں اس کا بھائی تھیلے میں تجوری کی سار دولت ڈال کر آ گیا۔ اس نے سارے نوٹوں کی گڈیاں میز پر الٹ دیں۔ پروین نے سے پوچھا۔

"ہمیں کتنی رقم کی ضرورت ہو گی؟"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے پانچ دس ہزار روپے کافی ہوں گے۔"

میں نے دیکھا کہ دونوں ہندو سیٹھوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی صرف پانچ دس ہزار روپے میں ان کی جان چھوٹ رہی تھی۔ پروین نے دس ہزا روپے کے نوٹ جو کہ سو سو کی شکل میں تھے گن کر نکال لئے انہیں رومال میں باند کر میرے حوالے کیا اور ہندو سیٹھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"اس دولت میں سے تمہاری جائز کمائی کتنی ہے؟"

سیٹھ آئیں بائیں کرنے لگا۔ پروین نے سخت غصے میں چلا کر کہا۔

"بکواس بند کرو۔ یہ بتاؤ اس میں سے تمہاری جائز کمائی کتنی ہے۔ خبردار جھو بولنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں سب کچھ جانتی ہوں صرف تمہاری زبان سے سچ چاہتی ہوں۔"

سیٹھ نے ہاتھ باندھ کر کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ابھی بتاتا ہوں دیوی جی!"

اس نے میز پر رکھی کرنسی نوٹوں کی گڈیوں کو تین حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصہ اپنی طرف کر کے باقی دو حصوں کے نوٹ الگ کر کے بولا۔

"دیوی جی! یہ دو حصے میری جائز کمائی کے نہیں ہیں۔ جتنی میری جائز کمائی تھی میں نے اپنی طرف کر لی ہے۔"

تب پروین نے کہا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ۔"

دونوں سیٹھ کرسیوں پر سے اٹھ کر پیچھے ہٹ گئے۔ پروین نے میرے دیکھتے دیکھتے پھنکار ماری - اس کے منہ سے چنگاریاں نکل کر نوٹوں کی گڈیوں پر پڑیں اور انہیں آگ لگ گئی۔ مجھ سے کہا۔

"چلو۔ اب یہاں ہمارا کوئی کام نہیں۔ میں نے اس سیٹھ کی حرام کی کمائی کو آگ لگا دی ہے۔"

دونوں سیٹھ گھبرا کر آگ بجھانے کی کوشش میں لگ گئے اور ہم دونوں کمرے سے نکل کر دکان سے باہر آ گئے۔ میں نے پروین سے کہا۔

"وہ کم بخت تو آگ بجھا کر نوٹوں کو بچا لیں گے۔"

پروین نے مسکرا کر کہا۔

"ان کا باپ بھی اس آگ کو نہیں بجھا سکتا وہ آگ جہنم کی آگ ہے۔"

ہم صرافہ بازار میں سے گزرتے ہوئے چوک میں آئے تو رکشا ٹیکسی دیکھنے لگے۔

میں نے پروین سے کہا۔

"یہاں سے سیدھا سٹیشن پر چلتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ کلکتے کی گاڑی کس وقت چلتی ہے۔"

وہ بولی۔ "ہمارے پاس اتنے پیسے ہیں۔ آخر ان کو بھی تو ٹھکانے لگانا ہو گا۔ میرا دل تاج محل دیکھنے کو چاہتا ہے۔ چلو یہاں سے آگرہ چلتے ہیں۔ آج کل چاندنی راتیں ہیں۔ سنا ہے چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ بڑا دلکش ہوتا ہے۔"

مجھے خود بھی تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ہمارے پاس روپے بھی کافی تھے۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو۔ آگرے چلتے ہیں۔ چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ دیکھیں گے۔"

ہم نے چوک میں سے ایک خالی ٹیکسی پکڑی اور سیدھا دلی کے ریلوے سٹیشن پر

آ گئے۔ میرے پاس دس ہزار روپے کی رقم سو سو کے نوٹوں میں موجود تھی جسے میں نے رومال میں لپیٹ کر اپنی قمیض کے اندر کمر کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ صرف سو سو کے دس نوٹ نکال کر واسکٹ کی جیب میں رکھ لئے تھے۔ اس زمانے میں سو روپے کے نوٹ کی بڑی قیمت ہوتی تھی۔ تڑوا لو تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کرنے کے لئے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا تو وہ بولا۔

"صاحب جی میرے پاس چھٹا نہیں ہے۔"

پروین نے پوچھا۔ "تمہارا کیا نام ہے بھائی؟"

ٹیکسی والا بولا۔ "محمد حنیف"

پروین نے میرے ہاتھ سے سو روپے کا نوٹ ۔ لے کر اسے دیا اور کہا۔

"یہ تم رکھ لو۔ یہ تمہارا ہے۔"

اور وہ ٹیکسی والے کو حیران و پریشان چھوڑ کر مجھے ساتھ لئے سٹیشن کی لابی کی طرف چلنے لگی۔ میں نے پروین کے اس فراخ دلانہ عمل پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

آگرہ جانے والی گاڑی ہمیں رات کے نو بجے ملی۔ اس گاڑی نے ہمیں رات کے پچھلے پہر آگرہ پہنچایا۔ سٹیشن سے باہر آ کر میں نے پروین سے کہا۔

"پروین! ہمارے پاس خرچ کرنے کے لئے بہت پیسے ہیں۔ ہم کسی اچھے ہوٹل میں کمرہ لے لیتے ہیں۔"

پروین مسکرا رہی تھی کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے چلو کسی اعلیٰ ہوٹل میں چلتے ہیں۔"

سٹیشن کے باہر سے ہم نے ٹیکسی لی اور اسے کہا کہ شہر کے سب سے اچھے ہوٹل میں لے چلو۔ اس زمانے میں ابھی فائیو سٹار ہوٹلوں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ انگریزوں کی سہولیات کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑے بڑے شہروں میں دو تین اعلیٰ ہوٹل ضرور بنے ہوتے تھے۔ ٹیکسی والا ہمیں آگرہ شہر کے مضافات میں اسی قسم کے ایک اعلیٰ ہوٹل میں لے آیا۔ یہ ہوٹل ایک بہت عالی شان کوٹھی کی شکل کا تھا۔ اردگرد باغیچہ تھا جس میں

درخت اور پھولوں کے قطعے تھے۔ دوسری منزل کی ٹیرس پر بتیاں روشن تھیں۔ ہوٹل کے پورچ میں ایک جانب تین چار موٹر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سارے ہوٹل پر ایک بڑی سنجیدہ قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں اور پروین ہوٹل کی لابی میں اس جگہ آ گئے جہاں کاؤنٹر کے پیچھے ایک خوش پوش نوجوان موجود تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"ہمیں ایک کمرہ چاہئے۔"

اس نے ہم دونوں کو اوپر سے نیچے تک ایک سرسری سی نظر سے دیکھا اور رجسٹر کھول کر بولا۔

"سر! آپ کو سنگل بیڈ روم والا کمرہ چاہئے کہ ڈبل بیڈ روم والا؟"

میں نے کہا۔ "ڈبل بیڈ روم والا"

اس نے کاروباری خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"سر! ڈبل بیڈ روم والے کمرے کا چوبیس گھنٹے کا کرایہ سو روپے ہو گا۔"

اس زمانے کا سو روپیہ آج کے دو ہزار روپے کے برابر ہوتا تھا۔

میں نے واسکٹ کی جیب سے سو سو کے تین نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم تاج محل کی سیر کرنے آئے ہیں ہو سکتا ہے زیادہ دن ٹھہریں۔ فی الحال آپ تین دن کا کرایہ جمع کر لیں۔"

کاؤنٹر کلرک نے میرا اور پروین کا نام رجسٹر میں درج کیا اور ہمارا ایڈریس پوچھا۔ میں نے دلی شہر کا ایک جعلی ایڈریس لکھوا دیا۔ ہوٹل کا ملازم ہمیں ساتھ لے کر دوسری منزل میں آیا اور کمرہ کھول دیا۔ یہ تین کمرے تھے۔ دو بیڈ روم اور ایک ڈرائینگ روم۔ کچن باتھ ساتھ ہی تھا۔ ہم نے سب سے پہلے باری باری نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے بیڈ روم میں جا کر لیٹ گئے۔

دوسرے دن ہم نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ آگرہ کے بڑے بازار میں جا کر اپنے لئے نئے کپڑے نئے جوتے اور جرسیاں وغیرہ خریدیں۔ پروین نے اپنے لئے معمولی سنگھار کا کچھ سامان خریدا۔ ہوٹل میں واپس آ کر ہم نے ناشتہ کیا اور نئے کپڑے پہن کر ٹیکسی لی اور تاج محل کی سیر کو نکل گئے۔

چاندنی رات کو تو ہمیں تاج محل دیکھنا ہی تھا مگر میں دن کے وقت بھی اس تاریخی عمارت اور محبت کی غیر فانی یادگار کو دیکھنا چاہتا تھا۔ دور سے دریا کے کنارے تاج محل کی سفید عمارت ایسے لگ رہی تھی جیسے کسی نے ہیرا تراش کر دریا کنارے رکھ دیا ہے۔ سب سے پہلے ہم نے ممتاز محل کی قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ پھر تاج محل کی روشوں پر ٹہلتے رہے غیر ملکی سیاح اور مقامی لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ گرمیاں شروع ہونے ہی والی تھیں۔ دوپہر کے وقت دھوپ میں کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ رات کو معمولی سی خنکی ہو جاتی تھی۔ ہم ایک سرسبز قطعے میں گلاب کے پھولوں کی کیاری کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پروین کہنے لگی۔

"جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے میرے دل کو ایک عجیب سکون محسوس ہو رہا ہے میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی۔۔۔"

میں نے کہا۔ "اللہ نے تم پر اپنا خاص فضل کیا ہے۔ واقعی تم خوش نصیب ہو کہ دین اسلام کے نورانی حلقے میں آ گئی ہو۔"

پروین نے نئی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر جالی دار دوپٹہ تھا۔ اس لباس میں وہ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اگرچہ اس کا رنگ اب بھی جامنی رنگ کا تھا۔ مگر سانپوں کے ڈسوانے اور سانپوں کو کھانے سے اسے نجات مل چکی تھی۔ اس کی صحت پہلے سے کافی بہتر ہو رہی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔

"ہمارے پاس بہت سارے روپے جمع ہو گئے ہیں۔ ان کا ہم کیا کریں گے؟"

پروین کہنے لگی۔

"ہمیں تو اتنے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ غریبوں میں بانٹ دیں گے۔ اپنی ضرورت کے کچھ روپے ضرور رکھ لیں گے۔"

پھر اس نے اچانک میری طرف دیکھا اور بولی۔

"کیا تم واقعی پاکستان چلے جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "خیال تو یہی ہے کہ تمہیں کلکتے کی سیر کروانے کے بعد پاکستان چلا جاؤں گا۔ لیکن چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے تمہیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دوں۔"

"وہ محفوظ جگہ کونسی ہو سکتی ہے؟" پروین نے سوال کیا۔

میں سوچنے لگا کہ اس کے سوال کا کیا جواب دوں۔ جواب تو یہی ہو سکتا تھا کہ پروین کسی شریف آدمی سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لے اور میں اطمینان کے ساتھ اپنے وطن چلا جاؤں۔ مگر میں اس بارے میں اسے کوئی رائے یا مشورہ دیتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"میرا مطلب ہے کہ کوئی ایسی جگہ جہاں تم باقی زندگی سکون سے بسر کر سکو۔ تم پڑھی لکھی ہو کلکتہ تمہارا اپنا شہر ہے۔ تم وہاں کسی سکول میں ٹیچر کیوں نہیں لگ جاتیں۔ اس طرح تم لیڈیز ہوسٹل میں بھی رہ سکو گی۔"

پروین نے سر نیچے کر لیا اور انگلی سے زمین پر اگی ہوئی گھاس اکھیڑتے ہوئے بولی۔

"ہو سکتا ہے کبھی مجھے ایسا ہی کرنا پڑ جائے۔"

میں نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"پروین! سچ کہتا ہوں جب میں نے سانپ کے روپ میں تمہارے جسم ٹکڑے اٹھائے تھے تو مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ تم دوبارہ زندہ ہو جاؤ گی۔ میرا خیا کہ پروین کو اب میں انسانی شکل میں کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔"

پروین مسکرائی۔

"بس یہ سانپوں کی دنیا کی باتیں ہیں پہلے مجھے بھی کچھ معلوم نہیں تھا مگر سن کے سپیروں میں رہ کر میں نے سب کچھ سیکھ لیا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اگر خدا نہ کرے اب تم کسی وقت مجھ سے اچانک جدا ہو گئیں تو میں تم کیسے اور کہاں تلاش کروں گا؟ مجھے کوئی ایسی نشانی بتا دو کہ جس کی مدد سے مجھے تم سراغ مل جائے۔"

پروین ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"انسان کے جسم سے ہر وقت حرارت کی لہریں نکلتی رہتی ہیں۔ ان لہروں کی ا خاص خوشبو ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے جسم سے نکلنے والی لہروں کی خوشبو الگ ہوتی اس خوشبو کو عام انسان محسوس نہیں کر سکتا جب کہ یہ خوشبو دنیا کی فضا میں پھیلی ہوتی ہے۔ سانپ اس خوشبو کو بڑی جلدی محسوس کر لیتا ہے۔ خاص طور پر م خوشبو سانپ فوراً سونگھ لیتا ہے چاہے وہ مجھ سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔ تمہیں ایک سانپ ہی ناگ پور میں مجھ تک لایا تھا۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے کہ اگر تم مجھ سے جدا کر دی جاؤ تو تمہارا سراغ لگا سکوں؟"

پروین نے کہا۔ "میں تمہیں ایک خاص منتر بتاتی ہوں اگر ہم پر کسی وقت مصیبت پڑ گئی اور میں تم سے جدا ہو گئی تو جو منتر میں تمہیں بتانے والی ہوں اس من کسی ویران علاقے میں جا کر تین بار پڑھنا۔ پھر زمین پر تین بار ہاتھ مارنا اس علاقے جو کوئی سانپ بھی ہو گا وہ اپنے بل میں سے نکل کر تمہارے پاس آ جائے گا۔ تم ا

میرا رومال سنگھا دینا۔ پھر وہ تمہیں وہاں لے آئے گا جہاں میں ہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ مجھے وہ منتر یاد کرا دو۔"

پروین بولی۔ "منتر زیادہ لمبا چوڑا نہیں ہے۔ صرف تین لفظ ہیں جن کو تمہیں تین بار دہرانا ہو گا۔ غور سے سنو۔ میں تمہیں وہ خاص منتر بتاتی ہوں۔"

اس کے بعد پروین نے مجھے وہ خاص منتر بتایا۔ یہ منتر مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں یہ منتر آپ کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ اگر آپ نے یہ منتر تین بار پڑھ کر زمین پر تین مرتبہ ہاتھ مارا تو اس علاقے میں جہاں کہیں بھی کوئی سانپ ہو گا وہ نکل کر آپ کے سامنے آ جائے گا اور آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

میں نے وہ تین لفظ منتر کے جو پروین نے مجھے بتائے اچھی طرح سے یاد کر لئے۔

وہ کہنے لگی۔

"میرے رومال کو جس میں میرے جسم کی بو ہے سنبھال کر رکھنا۔ کیونکہ اس رومال کو سونگھ کر ہی سانپ میری تلاش میں نکلے گا۔"

میں نے کہا۔ "اگر خدانخواستہ رومال گم ہو گیا یا پھٹ پھٹا گیا تو اس صورت میں مجھے کیا کرنا ہو گا؟ پھر تو میں تمہیں کبھی نہیں تلاش کر سکوں گا۔"

پروین کچھ دیر چپ ہو کر غور کرتی رہی۔ اس کے بعد میری طرف چہرہ اٹھا کر بولی۔

"پھر تم ایسا کر سکتے ہو کہ جب سانپ تمہارے سامنے آ جائے تو تم منتر کے وہی تین لفظ پڑھ کر سانپ کے منہ پر پھونک مار دینا۔ سانپ کو میری خوشبو آ جائے گی۔"

"یہ تم نے بڑی اچھی بات مجھے بتا دی۔ بس اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ چلو شہر چل کر کسی اچھے سے ریستوران میں کافی پیتے ہیں۔ ایک مدت ہو گئی ہے کسی اعلیٰ قسم کے ریستوران میں بیٹھ کر کافی پئے ہوئے۔"

"ہاں۔ یہ تم نے بالکل درست کہا۔ ہم تو بس جنگلی لوگوں کی طرح جنگلوں صحراؤں میں ہی دربدری کرتے رہے ہیں۔ اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ شہر

کے کسی کلاس ون ریستوران میں بیٹھ کر کافی پی سکیں۔"

ہم نے تاج محل کے باہر جہاں ٹیکسی سٹینڈ تھا وہاں سے ایک ٹیکسی لی اور اسے آگرہ شہر کے سب سے اعلیٰ ریستوران میں چلنے کو کہا۔ ٹیکسی سٹینڈ کے قریب ہی ایک آدمی سٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے پرانی کانگریسی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہماری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے سوچا اس ملک کے لوگ عورتوں کی طرف غور سے دیکھا ہی کرتے ہیں۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور ٹیکسی میں پروین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل پڑی۔

جب ٹیکسی آگرہ شہر کے بازاروں میں آئی تو ڈرائیور نے کہا۔

"صاحب! یہاں ایک کیلاش ریستوران ہے وہاں کی کافی اور رس گلے سارے شہر میں مشہور ہیں۔ آپ کو وہاں نہ لے چلوں؟"

پروین بنگالن تھی۔ رس گلوں کا سن کر بے تاب ہو کر بولی۔

"ہاں ہاں۔ وہیں لے چلو۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ایک مدت کے بعد رس گلوں کا نام سنا ہے۔ کافی کے ساتھ رس گلوں کا بڑا مزہ آئے گا۔"

کیلاش ریستوران شہر کے فیشن ایبل علاقے میں واقع تھا۔ بڑا ماڈرن قسم کا ریستوران تھا۔ فرنیچر خوب چمک رہا تھا۔ میں اور پروین کونے والی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ اور لوگ بھی بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ فضا میں بڑی پرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے رس گلوں اور کافی کا آڈر دیا اور جیب سے بڑی اعلیٰ قسم کا سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ پروین مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں بیرا کافی اور رس گلے لے کر آ گیا۔ رس گلے واقعی بڑے لذیذ تھے۔ پروین کہنے لگی۔

"مگر ہمارے بنگال میں جیسے رس گلے بنتے ہیں ویسے نہیں ہیں۔"

پروین میرے لئے کافی بنانے لگی۔ کافی بناتے بناتے اچانک وہ رک گئی۔ میں نے

اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے پروین؟"

پروین ایسے سانس لے رہی تھی جیسے فضا میں کوئی خاص قسم کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔"

اور اس نے کافی بنا کر مجھے دی۔ پھر اپنے لئے کافی بنائی۔ ہم کافی پینے اور باتیں کرنے لگے۔ لیکن مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ پروین فضا میں کیا سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ یونہی ایسا نہیں کر رہی تھی۔ اس کو فضا میں ضرور کوئی خاص بو محسوس ہوئی ہو گی میں نے کافی کا گھونٹ پینے کے بعد پیالی نیچے رکھی اور سگریٹ کا کش لگانے لگا تو اچانک میری نظر ریستوران کے دروازے پر پڑی۔ وہاں مجھے وہی کھدر کی کانگریسی ٹوپی والا آدمی نظر آیا جس کو میں نے تاج محل کے ٹیکسی سٹینڈ پر دیکھا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ یہ شخص یہاں کیسے پہنچ گیا؟ کہیں یہ ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا؟ میرا خیال دلی میں ہم پر لگائے گئے چوری کے الزام اور پھر حوالات میں ہمیں بند کر دینے کی طرف چلا گیا۔ کہیں یہ سی آئی ڈی کا آدمی تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے دلی پولیس نے آگرہ پولیس کو خبردار کر دیا ہو کہ ایک لڑکا اور لڑکی جن پر چوری کا الزام تھا حوالات سے فرار ہو گئے ہیں۔ اگر نظر آ جائیں تو انہیں فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ پھر سوچا کہ دلی پولیس سٹیشن کے پاس تو ہماری کوئی تصویر نہیں تھی۔ جو وہ آگرہ کی پولیس کو بھیجتے۔ پھر یہ آدمی ریستوران میں کیسے آ گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کاؤنٹر پر جا کر ریستوران کے مینیجر سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے بیڑی سلگائی اور ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران پروین کافی پی رہی تھی۔ اس نے ایک دم سے ٹھٹک کر کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور دو تین گہرے سانس لئے۔

میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے پروین؟ تم کیا سونگھ رہی ہو؟"

پروین نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

"مجھے ایک غیر مانوس سی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

"کس قسم کی بو؟" میں نے پوچھا۔ "کیا یہ کسی سانپ کی بو ہے؟"

پروین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ یہ سانپ کی بو نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہی بو ہے۔ لیکن مجھے اتنا م ہے کہ یہ خطرناک بو ہے۔ چلو۔ اٹھو۔ چلتے ہیں۔ یہاں میرا جی گھبرانے لگا ہے۔"

میں نے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کیا - میری نظریں ریستوران کے کاؤنٹر طرف گئیں۔ وہ کانگریسی ٹوپی والا پراسرار آدمی اب وہاں نہیں تھا۔ ہم بل ادا کر ریستوران سے باہر آ گئے۔ باہر آ کر میں نے پروین سے پوچھا۔

"ایسا لگتا ہے تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہو۔ آخر تمہیں کیا محسوس ہوا تھا؟"

پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو ان باتوں کو ..... تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں ناگن بھی ہوں اور ناگنوں کو فضا میں بعض اوقات عجیب عجیب بوئیں محسوس ہوتی ہیں۔ چلو اپنے ہو میں چلتے ہیں۔"

ہم نے ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ میں نے ٹیکسی میں ہوئے خاص طور پر چاروں طرف نگاہ دوڑائی تھی مگر وہ پراسرار آدمی مجھے کہیں نہیں آیا تھا۔ میں نے پروین سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی کہ وہ خوامخواہ پر ہو گی۔

میں نے ہوٹل کے کمرے میں آ کر پروین سے پوچھا۔

"چاندنی رات میں تاج محل کی سیر کا پروگرام ہے یا اسے ملتوی کر دیا ہے؟"

پروین نے فوراً جواب دیا۔

"کیوں نہیں۔ آج تو پورن ماشی کی رات ہے پورا چاند نکلے گا۔ ہم آج رات محل دیکھنے ضرور جائیں گے۔"

دوپہر کو ہم کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔ تیسرے پہر ۔ چائے پی اور اخبار رسالے پڑھنے اور باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ رات کا ا بھی ہم نے کمرے میں منگوا کر ہی کھایا۔ جب رات کے دس بج گئے اور آسمان پر ا چاند چمکنے لگا تو ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر تاج محل کی طرف چل دیئے۔

تاج محل تو چاندنی رات میں نگینے کی طرح چمک رہا تھا۔ وہاں بہت لوگ چاندنی اس تاریخی عمارت کا نظارہ کرنے آئے ہوئے تھے۔ ہم ایک روش پر کھڑے ہو کر محل کی حسین عمارت کو دیکھنے لگے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم خواب کی دنیا میں آ ہیں۔ پروین کہنے لگی۔

"کتنی خوش تھی ممتاز محل کہ اس کے خاوند نے اس کے لئے تاج محل بنوایا جس یکھنے کے لئے دنیا کے کونے کونے سے لوگ آتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ممتاز محل کا خاوند ہندوستان کا بادشاہ تھا وہ جو چاہے بنا سکتا تھا۔"

پروین بڑے جذباتی انداز میں کہنے لگی۔

"نہیں نہیں۔ اصل بات محبت کی ہوتی ہے۔ شاہجہان اپنی بیوی سے بہت محبت ا تھا۔"

ہم تاج محل کے پہلے چبوترے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک وردی ں گائیڈ ہمارے پاس آ گیا۔ کہنے لگا۔

"صاحب جی! اگر آپ میاں بیوی ہیں تو باری باری تاج محل کے پہلے مینار کا ایک لگائیں۔ آپ ساری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔"

پروین پہلے ہی بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ہم ضرور چکر لگائیں گے۔ پہلے میں چکر لگاؤں گی۔"

گائیڈ خوش ہو کر بولا۔

"آپ بڑی خوش قسمت ہیں۔ کہتے ہیں جو عورت اپنے خاوند سے پہلے چکر لگائے

وہ اپنے خاوند کا ساری زندگی بھرپور پیار حاصل کرتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

گائیڈ بولا۔

"نہیں بابو جی! بیگم صاحب کو اکیلے ہی چکر لگانے دیں۔ ورنہ مینار کی دعا کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

پروین اٹھ کھڑی ہوئی - مجھ سے کہا۔

"نہیں نہیں۔ تم میرے بعد چکر لگانا میں ابھی چکر لگا کر آتی ہوں۔"

پروین گائیڈ کے ساتھ تاج محل کے پہلے مینار کی طرف چل پڑی۔ یہ مینار کوئی سو قدم کے فاصلے پر تھا اور مجھے اس کا صرف سامنے والا حصہ ہی چاندنی میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے درختوں کے خاکے سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے پروین سے کہا۔

"دیر نہ لگانا۔"

وہ بولی۔ "ابھی آتی ہوں۔ تم یہیں بیٹھے رہنا۔"

میں نے کچھ اور لوگوں کو بھی دیکھا جو مینار کا چکر لگا رہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے۔ عورتیں بھی تھیں۔ میں اس قسم کے توہمات کا قائل نہیں ہوں۔ مگر پروین کی ضد اور اس کے شوق کی وجہ سے خاموش رہا۔ میں پروین کو گائیڈ کے ساتھ جاتے دیکھتا رہا۔ مینار کے پاس جا کر پروین دوسری طرف مڑ گئی۔

میں نے سگریٹ سلگا لیا اور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے پروین کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ واپس آ کر وہ مجھے بھی چکر لگانے پر مجبور کرے گی۔ میرا دل تو بالکل نہیں چاہتا تھا لیکن محض پروین کی خاطر میں نے سوچ لیا کہ مینار کا ایک چکر لگا لوں گا۔ چاندنی رات بڑی خوبصورت تھی۔ جو لوگ چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ کرنے آئے ہوئے تھے وہ ادھر ادھر چلتے نظر آ رہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے خواب میں چل رہے ہوں۔ میرا سگریٹ ختم ہو گیا۔ میں نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر سنگ مرمر کے کشادہ چبوترے پر ادھر سے ادھر

ٹہلنے لگا۔

میرا دوسرا سگریٹ بھی ختم ہو گیا۔ پروین ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ گائیڈ کے کہنے کے مطابق اسے مینار کا صرف ایک ہی چکر لگانا تھا۔ اب تک اسے واپس آ جانا چاہئے تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے سگریٹ پھینکا اور مینار کی طرف چلنے لگا کہ جا کر دیکھوں پروین نے اتنی دیر کیوں لگا دی ہے۔ مینار کے پاس جا کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر مینار کا چکر لگایا۔ پروین مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ وہاں ایک عورت اور ایک مرد چکر لگا رہے تھے۔ جب وہ چکر لگا چکے تو میں نے ان سے پروین کے بارے میں پوچھا جس پر انہوں نے کہا کہ اس حلئے اور لباس کی عورت انہوں نے یہاں نہیں دیکھی۔ وہ گائیڈ بھی کہیں دکھائی نہ دیا۔ ایک طرف ایک آدمی پتھر کی سیڑھی پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہاں ایک گائیڈ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک عورت کے ساتھ آیا تھا وہ کہاں چلا گیا؟"

وہ آدمی کہنے لگا۔

"رات کو تو یہاں کسی گائیڈ کی ڈیوٹی نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا۔ "اس نے وردی پہنی ہوئی تھی۔ کہتا تھا میں گائیڈ ہوں۔ وہ میری بیوی کو مینار کا چکر لگانے کے لئے لے گیا تھا۔"

وہ آدمی بولا۔

"میں یہاں کا چوکیدار ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ رات کو کبھی کسی گائیڈ کی ڈیوٹی نہیں لگتی۔ آپ کو کسی نے دھوکا دیا ہے۔"

میں نے اسے گائیڈ اور پروین کا حلیہ بتایا۔ چوکیدار کہنے لگا۔

"میں بڑی دیر سے یہاں بیٹھا ہوں۔ میں نے اس حلیئے کا کوئی گائیڈ اور کوئی عورت نہیں دیکھی۔"

میں سخت پریشان ہوا۔ ضرور وہ آدمی پروین کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ مگر پروین

کو اتنے لوگوں کے درمیان اغوا کرنا آسان نہیں تھا۔ اور پھر پروین زبردست طاقت رکھتی تھی۔ وہ ناگن بن کر اغوا کرنے والے کو ہلاک کر سکتی تھی۔ نہیں نہیں۔ میں نے اپنے دل سے کہا۔ ایسا نہیں ہوا پروین ضرور یہیں کہیں ہو گی۔ ممکن ہے وہ دوسرے مینار کا چکر لگانے چلی گئی ہو۔ میں تیز تیز قدموں سے دوسرے مینار کے پاس گیا۔ وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس قسم کے چکر صرف اسی مینار کے گرد لگائے جاتے تھے جس طرف وہ گائیڈ پروین کو لے کر گیا تھا۔ لیکن میں نے دوسرے مینار کے آس پاس بھی پروین کو تلاش کیا۔ اس طرح میں تیسرے اور چوتھے مینار پر بھی گیا۔ میں نے سارے کا سارا تاج محل چھان مارا۔ جگہ جگہ دیکھا۔ جھاڑیوں اور باغیچوں میں تلاش کیا مگر پروین کو تو جیسے زمین کھا گئی تھی۔ سخت مایوسی اور پریشانی کی حالت میں واپس آ کر اسی چبوترے پر بیٹھ گیا جہاں پہلے بیٹھا تھا۔

ذہن انتہائی الجھ گیا تھا۔ دل میں طرح طرح کے خدشے اور وسوسے پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ پھر مجھے خیال آنے لگا کہ پروین نے دو بار کوئی خوشبو محسوس کی تھی جس کے بارے میں اس نے تشویش کا اظہار کیا تھا۔ کہیں کوئی دشمن تو اس کے پیچھے نہیں لگ گیا تھا؟ مگر ایسا دشمن کونسا ہو سکتا تھا؟ اچانک مجھے اس پراسرار آدمی کا خیال آ گیا جس کو میں نے سب سے پہلے دن کے وقت تاج محل کے ٹیکسی سٹینڈ پر اور پھر کیلاش ریستوران میں دیکھا تھا۔ میں ان ہی پریشان کن خیالات میں الجھا وہاں بیٹھا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

پولیس کا ایک سپاہی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"بابو! تاج محل کا گیٹ بند ہونے والا ہے ٹائم ہو گیا ہے۔ اب جاؤ۔ کل رات آ کر دیکھنا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سپاہی سے کہا کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ تاج محل دیکھنے آیا تھا۔ وہ ایک گائیڈ کے ساتھ مینار کا چکر لگانے گئی تھی۔ پھر واپس نہیں آئی۔

سپاہی بولا۔

"گائیڈ کے ساتھ تم نے اپنی بیوی کو کیوں بھیج دیا؟ عورتیں تو کونے والے مینار کا اکیلی ہی چکر لگاتی ہیں۔ کوئی گائیڈ انہیں ساتھ لے کر نہیں جاتا۔"

میں نے کہا۔ "میں دلی سے آیا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ گائیڈ میری بیوی کو غائب کر دے گا۔ کیا یہاں کوئی سرکاری دفتر نہیں ہے جہاں سے مجھے گائیڈ کے بارے میں پتہ چل سکے کہ وہ کون تھا اور کہاں رہتا ہے؟"

سپاہی نے کہا۔

"بھیا! پہلی بات تو یہ ہے کہ تاج محل پر رات کے وقت کسی سرکاری گائیڈ کی ڈیوٹی نہیں ہوتی۔ کیا معلوم وہ کون بدمعاش تھا جو گائیڈ کی وردی پہن کر تمہارے پاس آیا اور تمہاری بیوی کو لے اڑا۔ ایسا کرو۔ تم میرے ساتھ تھانے چلو۔ تھانے میں رپٹ

درج کرا دو پولیس تمہاری بیوی اور گائیڈ کو خود ہی تلاش کر لے گی۔"

میں پولیس سٹیشن نہیں جانا چاہتا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں الٹا پولیس مجھے ہی نہ پکڑ ـ کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ دلی کی حوالات سے بھاگے ہوئے مجرم ہو۔ میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں جہاں ٹھہرا ہوا ہوں وہاں جا کر دیکھتا ہوں شاید میری بیو وہاں پہنچ گئی ہو۔"

سپاہی چاندنی رات میں مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں وہاں سے تاج مح کے بڑے احاطے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ سب لوگ جو چاندنی رات میں تا محل کا نظارہ کرنے آئے ہوئے تھے واپس جا رہے تھے۔ میں شکستہ دل تھا۔ ذہن ایک خلفشار کا شکار تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پروین کہاں اور کیسے غائب ہو گئی۔ م ٹیکسی سٹینڈ پر آ کر کھڑا ہو گیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کہ سارے لوگ وہا سے اپنے اپنے گھروں کو نہیں چلے گئے۔ وہاں صرف ایک ٹیکسی خالی رہ گئی تھی ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔

"بابو شہر چلنا ہے تو آ جاؤ۔ میں جا رہا ہوں پھر یہاں سے کوئی سواری نہیں ـ گی۔"

میں بوجھل قدم اٹھاتا اور بار بار تاج محل کے مینار کی طرف دیکھتا ٹیکسی میں آ بیٹھ گیا۔

"کہاں چلیں گے بابو جی؟"

میں نے اپنے ہوٹل کا نام لیا۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے کچھ نہیں کب گاڑی وہاں سے چلی۔ کن کن بازاروں اور سڑکوں سے گزری اور کر ہوٹل کے پورچ میں آ کر رک گئی۔ سارا رستہ اسی خیال میں ڈوبا رہا کہ پروین کو کس نے اغوا کیا ہو گا۔ کیا وہ پراسرار آدمی جس نے کانگریسی کیپ پہنی ہوئی تھی اور میرے خیال کے مطابق ہمارا پیچھا کر رہا تھا کہیں یہ ساری مصیبت اسی کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئی۔ مگر اس وقت تو وہ وہاں کہیں نہیں تھا۔ صرف گائیڈ میرے پاس

تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گائیڈ بھی اسی کا بھیجا ہوا آدمی ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ پروین کو اتنی جلدی اغوا کیسے کر لیا گیا کہ وہ ایک آواز بھی بلند نہ کر سکی۔ وہ مجھے مدد کے لئے بھی نہ بلا سکی۔ وہ تو بڑی جلدی ناگن کا روپ بدل کر گائیڈ کو ہلاک کر سکتی تھی۔ اسے سانپ بننے کے لئے صرف تین سانس ہی کھینچنے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ پروین کو ضرور کلوروفارم بلکہ اس سے تیز کوئی بے ہوشی کی دوائی سنگھائی گئی تھی کہ جس کو سونگھتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔

میں ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا یہی کچھ سوچتا رہا۔

ساری رات میں نے جاگ کر گزار دی۔ آخر میں نے وہی فیصلہ کیا جس کے بارے میں مجھے خوش قسمتی سے آگرہ میں پہنچتے ہی پروین نے بتا دیا تھا۔ یعنی اب مجھے ایک سانپ کو منتر پڑھ کر بلانا اور اسے پروین کا رومال سنگھا کر پروین کی تلاش کے لئے روانہ کرنا تھا۔ دن نکلتے ہی میں تاج محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس خیال سے کہ شاید وہاں پروین کا کوئی سراغ مل جائے۔ اگر سراغ نہ ملا تو وہیں سے کسی سانپ کو بلا لوں گا۔ کیونکہ تاج محل دریا کے کنارے پر واقع تھا اور وہاں اکثر علاقہ ویران تھا اور ایسی جگہوں پر سانپ اکثر پائے جاتے ہیں۔

دن کی روشنی میں تاج محل چاندنی رات والے تاج محل سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ میں تیسرے مینار کے پاس آ گیا۔ میں زمین پر جھک کر دیکھنے لگا کہ شاید پروین کی کوئی چوڑی وغیرہ وہاں ٹوٹی ہوئی پڑی ہو۔ مگر وہاں کوئی ایسی شے نہیں تھی۔ آخر میں تاج محل کی عمارت کے عقب میں ایک ویران جگہ پر چلا گیا۔ یہاں بنجر زمین تھی اور خشک جھاڑیاں کہیں کہیں اگی ہوئی تھیں۔ میں ایک جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔ پروین کے بتائے ہوئے منتر کے تینوں لفظ مجھے زبانی یاد تھے۔ میں نے تینوں الفاظ تین بار قدرے اونچی آواز میں دہرائے اور پھر زمین پر تین بار ہاتھ مارا۔ اس کے بعد متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ سانپ آیا ہے یا نہیں۔ دس پندرہ سیکنڈ گزر گئے۔ کسی طرف سے کوئی سانپ نہ آیا۔ میں دوسری بار منتر پڑھ کر پھونکنے والا تھا کہ اچانک

مجھے اپنے پیچھے سے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک نسواری رنگ کا بالشت بھر کا سانپ میرے پیچھے اپنا چھوٹا سا پھن اٹھائے میری طرف منہ کئے پھنکار رہا تھا۔ میں پروین کی ہدایت کے مطابق اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگ کر میرے قریب آگیا۔ میں نے جیب سے پروین کا رومال نکال کر اس کی طرف پھینکا۔ سانپ نے رومال پر منہ رکھ دیا۔ پھر فوراً پیچھے ہٹ گیا تین بار رومال کے آگے سر جھکایا اور ایک طرف آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا۔

میں جلدی سے اٹھا۔ پروین کا رومال اٹھا کر جیب میں ڈالا اور سانپ کے پیچھے چلنے لگا۔ سانپ اس طرف جا رہا تھا جدھر دریا کا کنارا تھا۔ مجھے خیال آیا اگر سانپ دریا میں اتر گیا تو میں کیا کروں گا؟ یہاں تو کوئی کشتی بھی نہیں ملے گی۔ سانپ تو پانی پر تیر سکتا ہے۔ میں بھی تیر سکتا تھا مگر کپڑوں سمیت دریا میں نہیں کودنا چاہتا تھا۔ دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ سانپ دریا میں نہ اترے۔ نسواری سانپ دریا کے کنارے پہنچ کر رک گیا۔ اس نے گردن اوپر اٹھائی۔ دائیں بائیں گھمائی۔ زبان بار بار باہر نکال کر پروین کی بو کو محسوس کیا اور جدھر سے بو آ رہی تھی اس طرف چلنے لگا۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک چلتا گیا۔ پھر اس نے دریا کے کنارے سے ہٹنا شروع کر دیا اور بنجر زمین پر نکل آیا۔ یہ کلرزدہ زمین تھی۔ سانپ ایک خاص آہستہ رفتار کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

کلرزدہ میدان ختم ہوا تو سامنے ایک گاؤں آگیا۔ بستی کے کچے مکان دھوپ میں صاف نظر آ رہے تھے۔ سانپ گاؤں میں داخل نہیں ہوا۔ بلکہ گاؤں کے باہر ہی باہر سے گزر گیا۔ سامنے سے دو دیہاتی آ رہے تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں یہ سانپ کو دیکھ کر ہلاک نہ کر دیں۔ میں چوکس ہو گیا کہ اگر انہوں نے سانپ کو مارنا چاہا تو میں انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ شاید سانپ نے بھی سامنے سے آتے آدمیوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک طرف جھاڑیوں میں گھس گیا۔ میں وہاں کھڑا ہو گیا۔ دونوں دیہاتی باتیں کرتے مجھ پر ایک نظر ڈالتے گزر گئے۔ ان کے جانے کے بعد سانپ جھاڑیوں میں

سے نکل آیا اور کچے راستے پر چل پڑا۔ میرا اور سانپ کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ قدموں کا ہو گا۔ چونکہ یہ آباد علاقہ تھے۔ کھیت بھی تھے اس لئے دیہاتی لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ جونہی سامنے سے کوئی آدمی آتا نظر آتا سانپ جلدی سے کسی طرف چھپ جاتا۔ اس طرح میں اور سانپ آبادی والے علاقے سے نکل کر غیر آباد علاقے میں آ گئے۔

سانپ میرے آگے آگے زمین پر بل کھاتا رینگتا چلا جا رہا تھا۔ ہم ایک خشک نالے کے پل پر سے گزر کر اس کی دوسری جانب آئے تو سامنے کچھ فاصلے پر چند ایک کچے مکان دکھائی دیئے۔ میرا خیال تھا سانپ ان مکانوں سے بچ کر دوسری طرف سے ہو کر نکل جائے گا مگر میں یہ دیکھ کر کچھ حیران ہوا کہ سانپ کا رخ ان مکانوں کی طرف ہی تھا۔ یہ ایک اونچے ٹیبے کے دامن میں ادھر ادھر بنے ہوئے چار پانچ جھونپڑی نما کچی دیواروں والے مکان تھے۔ آگے ایک چھوٹا سا جوہڑ تھا۔ ایک بوڑھا جوہڑ کے کنارے بیٹھا ناریل کا حقہ پی رہا تھا۔ میں اور سانپ اس سے کچھ فاصلے پر سے ہو کر گزر گئے۔ سانپ اب تیز تیز چل رہا تھا۔ وہ ایک مکان کے سامنے جا کر رک گیا اور پھن اٹھا کر زور زور سے پھنکارنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ پروین اسی مکان میں بند ہے۔ کچے مکان کا دروازہ بند تھا میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی کون ہو؟ میں نے کہا۔

"ذرا باہر آئیں۔"

دروازہ کھلا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ وہی کانگرسی ٹوپی والا آدمی تھا جو میرے خیال کے مطابق ہمارا پیچھا کرتا رہا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے اور کچھ گھبرا گیا ہے مگر وہ جلدی سنبھل گیا اور بولا۔

"کس سے ملنا ہے بھائی؟ کون ہو تم؟"

اس دوران سانپ میری ٹانگوں کے درمیان سے نکل کر اس آدمی کی طرف حملہ

کرنے کے لئے پھنکارتا ہوا بڑھا۔ وہ شخص چیخ مار کر کوٹھڑی میں گھس گیا اور سانپ سانپ کا شور مچا دیا۔ کوٹھڑی میں سے دو ہٹے کٹے آدمی نکل کر باہر آ گئے۔ انہوں نے سانپ کو دیکھا تو ایک نے لاٹھی اٹھا کر پوری طاقت سے سانپ پر ماری۔ سانپ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اب وہاں تین آدمی تھے اور میں اکیلا تھا۔ کانگریسی ٹوپی والے آدمی نے غصے کے ساتھ پوچھا۔

"یہ سانپ تم اپنے ساتھ لائے تھے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم یہ کہاں سے آ گیا تھا مجھے تو پیاس لگ رہی تھی سوچا یہاں سے پینے کو پانی مل جائے گا۔ اس لئے دروازہ کھٹکھٹایا۔"

کانگریسی ٹوپی والے آدمی نے اپنے ساتھیوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"تم لوگ اندر جاؤ۔"

وہ دونوں اندر چلے گئے۔ کانگریسی ٹوپی والے نے یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا کہ یہاں پانی نہیں ہے۔ میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔ سانپ کو دیکھا۔ اس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ سانپ مر گیا تھا۔ مجھے اس کی موت کا بڑا افسوس ہوا۔ مرتے مرتے سانپ مجھے بتا گیا تھا کہ اسی گھر سے پروین کی بو آ رہی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ سانپ مجھے ٹھیک جگہ پر لایا ہے اور پروین یہیں کہیں ہے۔ مگر میں اکیلا تھا اور وہ تین تھے۔ اگر میں ان سے الجھتا تو وہ بڑی آسانی سے مجھے بھی مار ڈالتے۔ دونوں ہٹے کٹے آدمی شکل ہی سے جرائم پیشہ قاتل لگے تھے۔

میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے اگر میں نے ان لوگوں سے پروین کے بارے میں کچھ پوچھا بھی تو یہ کبھی مجھے اس کے بارے میں نہیں بتائیں گے۔ سانپ نے مجھے اشارہ دے دیا تھا کہ پروین اگر ملے گی تو یہیں سے ملے گی۔ اگر خود اندر نہیں ہو گی تو یہاں سے اس کا سراغ ضرور مل جائے گا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا

کہ مجھے اس کانگریسی ٹوپی والے آدمی کا چھپ کر پیچھا کرنا چاہئے کہ یہ یہاں سے کہاں جاتا ہے۔ چنانچہ میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ جوہڑ کے پاس آیا تو بوڑھے کو حقہ پیتے دیکھ کر اس کے پاس آ گیا۔

اسے سلام کیا اس نے وعلیکم السلام کہہ کر حقہ منہ سے ہٹایا اور بولا۔

"کہو بھائی۔ مسافر ہو؟ کیسے آئے ہو؟"

میں اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور کہا۔

"ایک دوست کی تلاش میں آیا تھا۔ وہ سامنے والے مکان میں رہتا تھا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ مکان چھوڑ کر جا چکا ہے۔ اب وہاں کوئی اور ہی لوگ رہ رہے ہیں۔"

"کون سا مکان؟ وہ کونے والا؟" بوڑھے نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ وہی مکان۔"

بوڑھے نے ایک ہاتھ کان پر لگایا اور بولا۔

"بیٹا تم مسلمان ہو اس لئے تمہیں ضرور خبردار کروں گا کہ آج کے بعد اس مکان کا رخ نہ کرنا۔"

میں نے پوچھا۔

"کیوں بابا؟ اس مکان میں کیا کوئی جن بھوت رہتے ہیں؟"

بوڑھا کہنے لگا۔

"بھائی یہ لوگ جن بھوتوں سے بھی بڑھ کر خطرناک ہیں۔ یہ جدی پشتی سپیرے ہیں۔ ان کے پاس کالے علم کا جادو بھی ہے۔ یہ ہندو ہیں اور راتوں کو مرگھٹوں میں جا کر جہاں تازہ تازہ ہندو مردہ جلایا گیا ہو وہاں بیٹھ کر چلے کاٹتے ہیں۔ چوریاں اور ڈاکے بھی ڈالتے ہیں۔ بستی کے لوگ تو ان کے قریب نہیں پھٹکتے۔"

میں نے مزید کریدتے ہوئے پوچھا۔

"بابا! ان میں ایک آدمی سر پر کانگرس کی کھدر کی ٹوپی پہنے رکھتا ہے۔ وہ کون ہے؟"

بوڑھے نے کہا۔

"وہ ان کا سرغنہ ہے۔ اس کو تو سانپ بھی کاٹ لے تو کچھ نہیں ہوتا۔ سنا ہے ان کے پاس ایسے سانپ بھی ہیں جو زمین کے اندر چھپے ہوئے خزانوں کا پتہ بتا دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر انہیں شاندار بنگلہ بنا کر رہنا چاہئے۔ اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں کیوں رہتے ہیں۔"

بوڑھا حقے کا کش لگا کر کہنے لگا۔

"بس ابھی کسی سانپ نے ٹھیک سے خزانے کا پتہ نہیں بتایا ہو گا۔ اور سنو۔ ان کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اماوس کی اندھیری راتوں میں ہندو عورتوں کی بدروحیں ان سے ملاقات کرنے آتی ہیں۔ تم پھر اس مکان کے قریب نہ جانا۔ قسمت والے ہو کہ ان سے بچ کر آ گئے۔ ورنہ یہ لوگ تو نوجوان لڑکوں کو بھی جادو ٹونے سے اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں۔"

جتنی دیر میں بوڑھے کے پاس بیٹھا رہا میری نگاہیں برابر کونے والے مکان پر لگی رہیں۔ اس دوران مکان کا دروازہ بند رہا۔ نہ کوئی باہر نکلا - نہ کوئی باہر سے اندر گیا۔ مجھے سانپ کے مرنے کا بہت افسوس تھا۔ پھر سوچا کہ پروین نے مجھے دوسری ترکیب بھی بتا دی ہے۔ اس ترکیب پر عمل کر کے کسی دوسرے سانپ کی راہ نمائی حاصل کر لوں گا۔ میں تھوڑی دیر بوڑھے کے پاس بیٹھ کر سلام کر کے واپس چل دیا۔

پروگرام یہ بنایا کہ اوپر سے چکر کاٹ کر مکان کے پیچھے کی طرف آ کر کسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاؤں گا اور ان لوگوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کروں گا۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ پروین اس مکان میں کسی جگہ بے ہوش پڑی ہے۔ میں سیدھا چلتا گیا۔ پھر آگے

سے چکر لگا کر کچے مکانوں کے عقب میں آ گیا۔ اس طرف کھیت تھے۔ جس مکان سے سانپ کو پروین کی بو آئی ہوئی تھی اس کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک درخت اگا ہوا تھا جس کی شاخیں مکان کی چھت پر بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ میں کھیت کے کونے میں آ کر رک گیا اور مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ کھیتوں میں ایک آدمی ہل چلا رہا تھا مگر وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں آہستہ آہستہ چل کر مکان کے پچھواڑے والے درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ آس پاس کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں درخت پر چڑھ گیا اور اس کی شاخوں کو پکڑتا ہوا مکان کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ چھت پر اترنے کے بعد میں کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ چھت کے کونے میں مرغیوں کا ڈربا بنا ہوا تھا مگر اندر کوئی مرغی نہیں تھی۔ میں جھک کر چلتا ڈربے کے پاس آیا اور گردن آگے کر کے نیچے دیکھا۔ اس طرف مکان کا دروازہ تھا۔

دروازہ اسی طرح بند تھا۔ میں نے بڑے غور سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی کہ شاید اندر جو لوگ بیٹھے ہیں ان کی باتیں سن سکوں مگر وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی ہو گی کہ دور سے کسی موٹر گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ میں سمجھا سڑک پر سے کوئی جیپ یا موٹر گاڑی گزر رہی ہو گی۔ مگر آواز قریب آتی گئی۔ میں نے چھت کی منڈیر پر سے سر اوپر کر کے دکھا۔ ایک جیپ مکان کی طرف چلی آ رہی تھی۔ وہ مکان کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ جیپ میں ایک ہٹا کٹا ڈرائیور بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے دو تین بار ہارن دیا۔ مکان کا دروازہ کھلا اور مکان کے اندر سے وہ تینوں آدمی باہر نکل کر جیپ میں سوار ہو گئے۔ ان میں ایک وہی پراسرار کانگریسی ٹوپی والا تھا اور دوسرے دونوں ہٹے کٹے آدمی تھے جنہوں نے سانپ کو مارا تھا۔ انہوں نے جیپ میں تین پٹاریاں بھی رکھیں۔ یہ ایسی پٹاریاں تھیں جن میں سپیرے سانپ رکھا کرتے ہیں۔

میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ اتنے میں جیپ چل پڑی۔ اور بستی سے نکل کر بڑی سڑک کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں اگر نیچے مکان کے باہر بھی ہوتا تو کچھ

نہیں کر سکتا تھا۔ میں جیپ کے پیچھے دوڑ کر اس کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔ جیپ آہستہ آہستہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں جلدی جلدی درخت پر سے اتر کر نیچے آیا۔ سامنے کی طرف آ کر مکان کے دروازے کو دیکھا جو چوپٹ کھلا تھا۔ میں کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ کوٹھڑی کے فرش پر چیتھڑے سے بکھرے ہوئے تھے۔ ساری کوٹھڑی خالی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ وہاں سے چلے گئے تھے۔ میں نے گہرے گہرے لمبے لمبے تین چار سانس لئے کہ شاید مجھے پروین کی بو آ جائے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مایوس ہو کر مکان سے باہر آ گیا اور واپس اپنے ہوٹل کی طرف چلنے لگا۔ تاج محل کے پاس آ کر خیال آیا کہ کسی دوسرے سانپ کو بلا کر اس کی مدد حاصل کرنی چاہئے۔ دیکھتا ہوں وہ مجھے پروین کی بو سونگھ کر کس طرف لے جاتا ہے۔

میں وہیں زمین پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ تین بار پروین کا بتایا ہوا منتر پڑھا۔ پھر تین بار زمین پر ہاتھ مارے اور سانپ کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر انتظار کیا مگر کوئی سانپ نہ آیا۔ دوسری بار پھر منتر پڑھ کر پھونکا۔ اس بار بھی کوئی سانپ نہ آیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس علاقے میں وہی نسواری رنگ کا ایک سانپ تھا جو مارا گیا ہے۔ میں اٹھ کر تاج محل کی طرف چلنے لگا۔ وہاں ٹیکسی سٹینڈ پر آ کر ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل میں آ کر بستر پر گر پڑا۔ سخت مایوس تھا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ بادل نخواستہ دوپہر کا کھانا کھایا اور پروین کے بارے میں غور و فکر کرنے لگا کہ وہ کہاں ہو گی کس حال میں ہو گی۔ جن لوگوں سے مجھے اس کا سراغ ملنا تھا کم بخت وہ فرار ہو چکے تھے۔

رات اسی پریشانی اور بے چینی کے عالم میں گزر گئی۔ اگلے روز ٹیکسی پکڑ کر دوبارہ وہاں گیا جہاں سانپ مجھے لے کر گیا تھا۔ مکان اسی طرح خالی پڑا تھا۔ میں جوہڑ کی طرف آ گیا۔ بوڑھا وہاں پر نہیں تھا۔ میں واپس جا رہا تھا کہ سامنے سے وہی بوڑھا آتا نظر آیا۔ میں نے سلام کیا تو وعلیکم السلام کہہ کر بولا۔

"میاں تم پھر کیسے آ گئے؟ تم کس کی تلاش میں ہو؟ مجھے کھل کر بتاؤ۔"

میں بوڑھے کو کھل کر نہیں بتانا چاہتا تھا۔ لیکن حالات ایسی صورت اختیار کر گئے

تھے کہ مجھے بوڑھے کو بتانا ہی پڑا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ تاج محل کے مینار سے میری بیوی چاندنی رات میں غائب ہو گئی ہے اور مجھے شک ہے کہ یہ کانگرسی ٹوپی والے کا کام ہے۔ کیونکہ جب سے ہم دونوں آگرے میں آئے تھے یہ آدمی ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔

بوڑھا مجھے لے کر وہیں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"بھائی تم مارے گئے۔ اپنی بیوی سے ہاتھ دھو لو اب وہ تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔ ان لوگوں نے اس بے چاری کو جانے کہاں کا کہاں پہنچا دیا ہو گا۔"

میں نے بوڑھے سے کہا۔

"بابا! میں اپنی بیوی کو تلاش کر لوں گا۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہ لوگ مکان چھوڑ کر کہاں گئے ہوں گے؟ ان کا یہاں کوئی دوسرا ٹھکانہ بھی ہے؟"

بوڑھا بولا۔

"میاں ان کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے اس مکان میں بھی سال میں ایک آدھ بار ہی آتے ہیں۔ ہاں تم ایسا کرو کہ یہاں سے سیدھا پھلوا ندی کے پل پر چلے جاؤ۔ پل کی دوسری طرف ایک ویران جگہ آئے گی وہاں ایک شمشان گھاٹ ہے۔ وہاں ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی کبھی راتوں کو وہاں جا کر جادو ٹونہ کرتے ہیں۔ چلہ بھی کاٹتے ہیں۔ اور اپنے جادو ٹونے کے واسطے جلے ہوئی مردے کی ہڈیاں بھی تلاش کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہیں یہ لوگ وہاں مل جائیں مگر رات کو جانا اور کوئی ہتھیار ساتھ لے کر جانا۔ کیونکہ یہ لوگ قتل بھی کر دیتے ہیں۔"

میں بوڑھے کا شکریہ ادا کر کے اپنے ہوٹل میں آ گیا۔ اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب رات کافی گہری ہو گئی تو میں ٹیکسی لے کر اس بستی کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ دن کے وقت بوڑھے نے مجھے جو راستہ پھلوا ندی کو جانے والا بتایا تھا اس طرف اندھیرے میں چلنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک ندی کا پل آ گیا۔ بوڑھے نے کہا تھا کہ اس پل کی دوسری طرف شمشان گھاٹ ہے۔ میں

پل کی دوسری طرف آ گیا۔ یہ بڑی خوفناک جگہ تھی۔ ہر طرف موت کی خاموشی طار
تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک جگہ کسی اونچی جگہ پر آگ دہکتی ہوئی نظر آ
قریب جا کر دیکھا کہ یہی شمشان گھاٹ تھی۔ چبوترے پر کسی مردے کی لاش جل
راکھ ہو چکی تھی۔ آگ کے شعلے غائب ہو گئے تھے صرف انگارے دہک رہے تھ
میں نے گہری نگاہ سے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی انسان کیا جانور بھی نظر نہیں آ ر
تھا۔ ایک طرف جھونپڑی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چل کر جھونپڑی کے پاس آ گیا
جھونپڑی کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ باہر مٹی کا ایک بڑا سا مٹکا رکھا ہوا تھا
میں ٹاٹ کا پردہ اٹھاتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ خدا جانے پردہ اٹھانے پر اندر سے کیا چیز نک
کر مجھے چمٹ جائے۔

جھونپڑی میں سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔

میں جلدی سے ہٹ گیا۔ جھونپڑی میں سے ایک جھکی ہوئی کمر والا بوڑھا آدمی انستا ہوا باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں سلاخ تھی۔ وہ اس چبوترے کے پاس گیا جہاں ے کو جلایا گیا تھا۔ وہ سلاخ سے آگ کریدنے لگا۔ میں دبے پاؤں چل کر اس کے ب ایک طرف اندھیرے میں کھڑے ہو کر دیکھنے لگا۔ چتا پر انگارے دہک رہے تھے۔ ں نے انگاروں میں سے کسی چیز کو سلاخ سے نیچے گرا دیا۔ پھر کندھے پر ڈالا ہوا کپڑا ے کر اس چیز کو اٹھا لیا۔ وہ مردے کی کھوپڑی تھی۔ کھوپڑی کو کپڑے میں لپیٹ وڑھا جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے چلنے لگا تو میرے پاؤں تلے ایک ر پھسل گیا۔ آواز سن کر وہ وہیں رک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس نے مجھے ھیرے میں دیکھ لیا تھا۔ بڑی رعب دار آواز میں بولا۔

"کون ہو تم؟"

میں نے اس سے زیادہ رعب دار آواز میں کہا۔

"میں پولیس کا آدمی ہوں۔ تم مردے کی کھوپڑی نکال کر لے جا رہے ہو؟ تمہیں لوم نہیں ایسا کرنا جرم ہے جس کی سزا سات سال قید ہے۔"

بوڑھے نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج! مجھے شما کر دیں۔ کسی نے کہا تھا میرا بچہ بیمار ہے۔ تازہ جلے ہوئے

مردے کی کھوپڑی لا دو۔ اس میں پانی ڈال کر بیمار بچے کو پلاؤں گا تو وہ اچھا ہو جائے گا۔"

میں نے کہا

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ سچ سچ بتاؤ نہیں تو ابھی پکڑ کر تھانے لے جاؤں گا۔"

بوڑھا تو میرے قدموں پر گر پڑا۔

"حضور معاف کر دیں۔ میں نے سچ بولا ہے میرا کوئی قصور نہیں۔ بیمار بچے کی خاطر کھوپڑی نکال کر لے جا رہا تھا۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور بتاؤ یہاں اور کون کون لوگ جادو ٹونہ کرنے آتے ہیں۔"

بوڑھا بولا۔

"مہاراج! کبھی کبھی رات کو سپیرے لوگ یہاں آتے ہیں۔ وہ مردے کی دو تین ہڈیاں نکال کر چبوترے پر بیٹھ کر کچھ دیر منتر پڑھتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے وہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟"

"مہاراج! بستی کی طرف سے آتے ہیں۔ میں نے منع کیا تو وہ کہنے لگے تجھے جان سے مار دیں گے۔ خبردار کسی کے آگے ذکر نہ کرنا۔"

بوڑھا جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس سے مجھے مفید معلومات حاصل ہونے کی توقع بھی نہیں تھی۔ جو کچھ وہ بتا سکتا تھا اور جتنا کچھ اسے معلوم تھا اس نے مجھے بتا دیا تھا۔

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آئندہ وہ لوگ یہاں آئیں تو تھانے میں آ کر ہمیں خبردار کر دینا۔"

"جو حکم مہاراج۔"

میں شمشان سے واپس چل پڑا۔

مجھے ایک سانپ کی ضرورت تھی جس کو پروین کا رومال سنگھا کر میں اسے اس کی

اش میں روانہ کر سکوں۔ تاج محل کے ویران علاقے سے مجھے کوئی سانپ نہیں ملا ا۔ آگرہ میں پرانے کھنڈروں کی کمی نہیں تھی۔ اگلے روز میں آگرہ کے پرانے قلعے ی طرف نکل گیا۔ قلعے کے آس پاس دو چار ٹوٹے پھوٹے کھنڈر تھے۔ میں ایک جگہ وار کی گری ہوئی پرانی اینٹوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھ گیا۔ وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں ا۔ میں نے پروین کا سکھایا ہوا منتر تین بار پڑھا۔ پھر زمین پر تین بار ہاتھ مارا اور انپ کا انتظار کرنے لگا۔ میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں نے ایک کالے نگ کے سانپ کو دیکھا جو دوسرے کھنڈر کی طرف سے رینگتا ہوا میری طرف آ رہا ا۔ میں سانپ سے اس لئے نہیں ڈرتا تھا کہ میرے پاس پروین کا رومال تھا جس کی بو کر سانپ میرے سامنے ادب سے سر جھکا کر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کالا سانپ آہستہ آہستہ میرے قریب آ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے جیب سے پروین کا رومال نکال کر اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ سانپ نے رومال میں آتی پروین کی تیز بو کو سونگھ کر زور سے پھنکار ماری اور پیچھے ہٹ کر ایک طرف دیکھنے لگا۔ وہ پرانے قلعے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ قلعے کی طرف چلنے لگا۔ میں نے پروین کا رومال جیب یں رکھا اور سانپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

کالا سانپ قلعے کے بہت بڑے محرابی دروازے کی دہلیز پر آ کر رک گیا۔ قلعے کا روازہ آدھا زمین میں دھنس گیا ہوا تھا۔ سانپ نے منہ اوپر اٹھا کر پروین کی بو سونگھی اور قلعے کی ڈیوڑھی میں سے ہوتا ہوا اندر بہت کھلے میدان میں آ گیا۔ یہ قلعے کا بہت بڑا اندرونی احاطہ تھا۔ تین طرف اونچی دیوار تھی۔ ایک جانب دو منزلہ ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑیاں اور دالان نظر آ رہے تھے۔ کالا سانپ ان کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں ایک شکستہ زینہ قلعے کی دوسری منزل کو جاتا تھا۔ سانپ زینے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اوپر ایک دالان تھا۔ دالان کے فرش پر گرد جمی ہوئی تھی اور اینٹیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ دالان کی ایک جانب تین کوٹھڑیاں تھیں۔ کسی کوٹھڑی کا دروازہ سلامت نہیں تھا۔ سانپ ایک کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس

کے پیچھے کوٹھڑی میں آ گیا۔ یہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔

کالا سانپ کوٹھڑی کے کونے میں جا کر پھنکارنے لگا۔ میں اس کے قریب گیا تو دیکھا کہ وہاں ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ سانپ زینہ اترنے لگا۔ آگے پھر ایک دالان آ گیا۔ اس دالان میں بھی ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ سانپ وہ زینہ بھی اتر گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی نیچے آ گیا۔ یہ زمین کے اندر ایک کشادہ جگہ تھی جہاں اونچی چھت کے دو بڑے سوراخوں میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ درمیان میں ایک پرانا تابوت پڑا ہے۔ سانپ اس تابوت کے سرہانے کی جانب فرش پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دھندلی روشنی میں تابوت کو غور سے دیکھا۔ لکڑی کے تابوت کی حالت بے حد شکستہ ہو رہی تھی۔ اس پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی اور مکڑیوں نے جگہ جگہ جالے بن رکھے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر سانپ مجھے یہاں لایا ہے تو اس تابوت کو کھول کر دیکھنا چاہئے۔ ممکن ہے اندر پروین بے ہوش پڑی ہو۔ وہ جرائم پیشہ قاتل سپیرے پروین کو بے ہوش کر کے اس تابوت میں ڈال گئے ہوں۔

تابوت کو تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کا ڈھکن اٹھایا تو ایسی چرچراہٹ کی آواز پیدا ہوئی کہ میں خود بھی ڈر گیا۔ تابوت کا ڈھکن ذرا سا اوپر اٹھا اور پھر اچانک اپنے آپ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ سانپ وہاں نہیں تھا۔ حیران ہوا کہ سانپ کہاں غائب ہو گیا۔ میں نے دوبارہ تابوت کو کھولنے کی کوشش کی مگر ڈھکن تابوت کے ساتھ ایسا جڑ چکا تھا جیسے کسی نے کیل ٹھونک کر بند کر دیا ہو۔ میں وہاں سے واپس بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ سانپ یونہی مجھے وہاں نہیں لایا تھا۔ وہ یقیناً پروین کی بو کے پیچھے پیچھے چل کر یہاں آیا تھا۔ اس تابوت کے کھلنے سے پروین کی گمشدگی کا راز حل ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر پورا زور لگا کر تابوت کے ڈھکن کو کھولنا چاہا تو مجھے ایک عورت کی پر سکون مگر کمزور آواز سنائی دی۔

"میرے تابوت کو مت کھولو۔ تم اسے نہیں کھول سکو گے۔"

میں خوف کے مارے وہیں بیٹھ گیا۔ غیبی عورت کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"جس کی تلاش میں سانپ تمہیں یہاں لایا ہے وہ یہاں لائی ضرور گئی تھی مگر اب وہ یہاں نہیں ہے۔"

میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

عورت کی آواز آئی۔

"میرا نام انار بیگم ہے۔ میں ہندوستان کے ایک ترک بادشاہ کی چہیتی کنیز تھی۔"

میں نے سوال کیا۔

"جس کی تلاش مجھے یہاں کھینچ لائی ہے اس کا نام پروین ہے۔ اس کا پہلا ہندوانہ نام پاروتی تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد فقیر بابا نے اس کا نام پروین رکھ دیا تھا۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ یہاں کب آئی تھی؟ اسے کون لایا تھا؟ اور اب وہ کہاں ہو گی؟"

انار بیگم کی روح نے گہرا سانس بھرنے کے بعد کہا۔

"تم دنیا والوں کے پاس سوال بہت ہوتے ہیں۔ جواب نہیں ہوتے۔ پروین کو یہاں دو آدمی لائے تھے۔ وہ بے ہوش تھی۔ انہوں نے بے ہوشی کی حالت میں اسے میرے تابوت کے پاس لٹا کر اس پر کچھ طلسمی منتر پڑھے تھے۔ دونوں آدمی خطرناک سپیرے تھے جن کو جادو ٹونے کا کالا علم بہت آتا تھا۔ وہ پروین کو دوبارہ سانپ کی حالت میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ آپس میں اس قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ دیر تک وہ بے ہوش عورت پر کئی قسم کے منتر پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہے۔ مگر وہ عورت پروین سانپ کی شکل میں تبدیل نہ ہوئی۔ اس کے بعد وہ اسے اٹھا کر یہاں سے لے گئے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

انار بیگم کی روح نے کہا۔

"تم مجھ سے وہ باتیں پوچھ رہے ہو جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ میں نہیں جانتی۔"

میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"اے محترم روح! کیا تم مجھے کوئی ایسا طریقہ بتا سکتی ہو جس پر عمل کر کے میر پروین کے پاس پہنچ سکوں؟"

انار بیگم کی روح نے کہا۔

"تم اس کے پاس پہنچ بھی گئے تو تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

روح گویا ہوئی۔

"وہ اس لئے کہ ان سپروں نے پروین پر ایسا خطرناک منتر پھونکا تھا کہ اب وہ خو پریشان ہیں کہ اس منتر کا توڑ کیسے کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس منتر سے پروی سانپ میں تبدیل ہو جائے گی اور اس کی مدد سے زمین میں مدفون بادشاہوں کے خزا۔ لوٹ سکیں گے۔ لیکن منتر الٹا پڑ گیا۔ پروین اب جسمانی حالت میں زندہ ضرور ہے مگ اس کی روح اس کے جسم سے نکل کر کسی اور جگہ پہنچ چکی ہے۔"

میں پریشان ہو گیا۔

"تو کیا پروین مر چکی ہے؟ کیا اب اس کی روح کبھی اس کے جسم میں واپس نہیر آئے گی؟"

اس پر انار بیگم کی روح نے جواب دیا۔

"نہیں۔ پروین مری نہیں۔ وہ زندہ ہے مگر دنیا والوں کے لئے وہ مر چکی ہے۔"

میں نے کہا۔

"کیا میں پروین کی روح سے بھی نہیں مل سکتا؟ آپ میری ملاقات پروین کی رو سے کرا سکتی ہیں؟"

انار بیگم کی روح نے کہا۔

"ہاں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ پھر شاید تمہیں پروین کی روح خود کوئی ایسا طریقہ بتا د کہ اس کی روح دوبارہ اپنے جسم میں واپس جا سکے۔"

میں نے انار بیگم سے کہا۔

"اے نیک دل روح! مجھے ایک بار پروین سے ملا دو۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی یاد رکھوں گا۔"

انار بیگم کی روح بولی۔

"چونکہ پروین کی روح کا رشتہ اپنے جسم کے ساتھ ابھی تک قائم ہے اس لئے اس کی روح نہ عالم بالا میں ہے نہ عالم برزخ میں ہے اور نہ عالم ارضی میں ہے۔"

"تو پھر وہ کہاں ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

انار بیگم کی روح نے کہا۔

"پروین کی روح عالم ارضی اور عالم برزخ کے درمیان بھٹک رہی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ بات نہیں کر سکتی۔ اپنی مرضی سے کسی کے پاس نہیں جا سکتی۔"

"تو پھر میں اس سے کس طرح مل سکتا ہوں؟"

"پروین کی روح سے ملنے کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ آگرہ شہر کے جنوب میں دلی کی طرف جاتے ہوئے ساتویں میل پر سڑک کی بائیں جانب بیری کے درختوں کے جھنڈ میں ایک پرانی خانقاہ ہے۔ اگر تم آدھی رات کو وہاں جا کر ایک خاص عمل پڑھو تو پروین کی روح ظاہر ہو جائے گی اور تم سے بات بھی کر سکے گی۔"

میں نے کہا۔

"وہ عمل کیا ہے اے نیک روح؟"

انار بیگم نے مجھے ایک خاص وظیفہ بتایا اور کہا۔

"یہ وظیفہ پڑھنے سے پہلے خانقاہ کے چبوترے پر قبر کے سرہانے کی جانب اگربتیاں سلگا لینا۔ اس کے بعد وظیفہ ایک سو مرتبہ پڑھنا۔ خدا نے چاہا تو پروین سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔"

میں نے انار بیگم کی روح کا شکریہ ادا کیا اور تہہ خانے سے نکل کر قلعے سے باہر آ

گیا۔ ہوٹل میں پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ حیرانی کی بات ہے کہ جو وظیفہ مجھے انار بیگم کی روح نے بتایا تھا وہ مجھے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ میں بڑی بے چینی سے شام پڑنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب سورج غروب ہو گیا تو میں نے غسل کر کے وضو کیا۔ نئے کپڑے پہنے اور ٹیکسی لے کر آگرہ سے دلی جاتی سڑک پر نکل گیا۔ ساتویں میل کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ آگرہ شہر سے نکلنے کے بعد میں نے بائیں جانب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ جب مجھے کھیتوں میں کہیں بھی بیری کے درختوں کے جھنڈ دکھائی نہ دیئے تو میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

"یہاں ایک خانقاہ ہے۔ مجھے وہاں جانا ہے۔"

ڈرائیور بولا۔

"آپ شاہ جی کی خانقاہ پر جائیں گے؟"

میں نے سوچا کہ وہی خانقاہ ہو گی۔ میں نے کہا۔

"ہاں وہیں جانا ہے۔"

دو تین میل آگے جانے کے بعد بائیں جانب مجھے بیری کے درختوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ نظر آیا۔ ڈرائیور بولا۔

"وہ سامنے شاہ جی کی خانقاہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "بس یہیں ٹیکسی روک لو۔"

میں اپنے ساتھ اگربتیوں کا پورا بنڈل اور رومال میں گلاب کے پھول بھی لایا تھا۔ ٹیکسی والے کو رخصت کرنے کے بعد میں کھیتوں میں سے گزرتا ہوا شاہ جی کی خانقاہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ خانقاہ پر بیری کے گھنے درختوں نے اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں خانقاہ کے صحن پر جھکی ہوئی تھیں۔ صحن میں ایک پرانی قبر بنی ہوئی تھی۔ میں نے جاتے ہی قبر پر گلاب کے کچھ پھول ڈالے۔ تین چار اگربتیاں سلگا کر قبر کے سرہانے کی طرف لگا دیں۔ پھر فاتحہ پڑھ کر مرحوم کی روح کو ثواب پہنچایا۔ اور وہیں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

مجھے اب آدھی رات گزرنے کا انتظار تھا۔

شام کے وقت میں اس لئے آ گیا تھا کہ رات کے اندھیرے میں مجھے خانقاہ تلاش کرنے میں مشکل پیش آ سکتی تھی۔ خانقاہ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی کو کبھی کبھی دور سڑک پر سے گزرنے والی کوئی گاڑی یا ٹرک کی آواز توڑتی اور اس کے بعد پھر خاموشی چھا جاتی۔ شام کا سرمئی اندھیرا آہستہ آہستہ رات کے اندھیرے میں گم ہوتا گیا۔ پھر ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں نے جیب سے موم بتی نکال کر قبر پر روشن کر دی۔ اور وہیں بیٹھ کر آدھی رات کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے کلائی پر گھڑی باندھی ہوئی تھی۔ وقفے وقفے کے بعد گھڑی پر نگاہ ڈال کر وقت دیکھ لیتا تھا۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی خانقاہ پر چھائی ہوئی خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جب رات کے ٹھیک بارہ بج گئے تو میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ قبر کے پہلو میں گلاب کے سارے پھول بکھیر دیئے باقی کی اگربتیاں بھی سلگا کر قبر کے پاس ہی لگا دیں۔ اس کے بعد اللہ کا نام لے کر وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ وظیفہ ایک سو بار پڑھنا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے وظیفے کا ورد کرتا رہا۔ ساتھ ساتھ گنتا بھی جا رہا تھا۔ جب پورے سو کی گنتی مکمل ہو گئی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ خانقاہ پر موم بتی کی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اگربتیوں کی خوشبو نے فضا کو لبریز کر دیا تھا۔

اچانک ایسی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جیسے کسی نے ٹھنڈا سانس بھرا ہو۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"پروین؟ پروین! کیا یہ تم ہو؟"

مجھے پروین کی بڑی نحیف سی آواز سنائی دی۔

"ہاں۔ میں ہوں۔ پروین کی بھٹکتی ہوئی روح!"

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"پروین! خدا کے لئے مجھے بتاؤ تم کہاں ہو؟ تم کس حالت میں ہو؟ مجھے اپنی صورت تو دکھا دو"

پروین کی آواز آئی۔

"میں نہ عالم بالا میں ہوں نہ عالم برزخ میں اور نہ عالم ارضی میں رہتی ہوں۔ میں چونکہ ابھی تک مردہ نہیں ہوں اور میری روح کا میری جسم کے ساتھ ایک باریک سا رشتہ قائم ہے اس لئے میں عالم حیرت میں بھٹک رہی ہوں۔ میں صرف تمہیں خواب میں مل سکتی ہوں۔ خواب میں ہی تمہیں اپنی شکل دکھا سکتی ہوں اور خواب میں ہی تم میری شکل دیکھ سکتے ہو اور مجھ سے بات کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "تو خدا کے لئے مجھے خواب میں ملنے کے لئے آ جاؤ۔"

پروین کی روح کی آواز آئی۔

"آج رات میں تمہیں خواب میں ملنے آؤں گی۔ تم رات کو وضو کر کے اور کلمہ شریف پڑھ کر سونا۔ میں تمیں ملنے آ جاؤں گی۔ اب میں جاتی ہوں۔ میں زیادہ دیر کسی جگہ نہیں ٹھہر سکتی۔ شاید یہ مجھے میرے گذشتہ برے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔ میرے حق میں دعا کرنا کہ خدا میرے گناہ معاف کر دے۔ میں جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔"

اس کے بعد موم بتی کی لو تھرتھرائی اور پھر پروین کی آواز نہ آئی۔ وہ جا چکی تھی۔ میں بہت اداس ہو گیا تھا۔ پروین پر سخت مصیبت نازل ہو گئی تھی۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میں نے پروین کو تاج محل کے مینار کے چکر لگانے کی کیوں اجازت دی۔ میں اسے روک لیتا۔ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا۔ مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ گائیڈ کے روپ میں میری بدنصیبی میرے سامنے آن کھڑے ہوئی ہے۔

میں دیر تک خانقاہ میں قبر کے پاس بیٹھا خدا کو یاد کرتا اور خداوند کریم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔

ایک دو بار میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ آخر جب آسمان پر صبح کا نور نمودار ہونے لگا تو میں نے ایک بار پھر قبر میں آسودہ خاک بزرگ کی روح کے ایصال ثواب کے لئے فاتحہ پڑھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا خانقاہ سے باہر نکل آیا۔ سڑک پر

ابھی تک پچھلے پہر کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ صبح کے نور کی روشنی آسمان کے مشرقی افق پر آہستہ آہستہ اجاگر ہو رہی تھی۔ کوئی رکشا ٹیکسی وہاں نہ ملی۔ پیدل ہی آگرہ شہر کی طرف چلنے لگا۔ شاید ایک آدھ میل پیدل چلا ہوں گا کہ پیچھے سے گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ میں سڑک کے کنارے ہو گیا۔ پیچھے دیکھا تو گاڑی کے اوپر سرخ بتی جل رہی تھی۔ یہ کوئی ٹیکسی تھی اور خالی تھی۔ میں نے ہاتھ دے دیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائیٹس میں ڈرائیور نے مجھے دیکھ کر گاڑی روک لی۔

"شہر جاؤ گے بابو؟"

"ہاں بھئی۔"

میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کو ہوٹل کا نام بتا کر کہا کہ مجھے اس ہوٹل میں لے جائے۔ ٹیکسی چل پڑی۔ میرے کانوں میں ابھی تک پروین کی روح کی آواز گونج رہی تھی۔ کاش میں اس کی صورت بھی دیکھ سکتا۔ اب صرف ایک ہی امید باقی رہ گئی تھی کہ پروین کو میں کم از کم خواب میں تو دیکھ سکوں گا اور اس سے باتیں کر سکوں گا۔

رات میں نے غسل کرنے کے بعد وضو کیا اور بستر پر بتی بجھا کر لیٹ گیا۔ اس خیال سے نیند بھی نہیں آ رہی تھی کہ رات کو خواب میں پروین سے ملنا ہے۔ کچھ معلوم نہیں کس وقت مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ اس کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ میں کسی شہر کے بازار میں سے گزر رہا ہوں۔ شہر کی ساری دکانیں کھلی ہیں مگر نہ کوئی دکاندار موجود ہے اور نہ کوئی گاہک ہی نظر آ رہا ہے۔ سارا بازار خالی ہے۔ کسی طرف سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی۔ بازار آگے جا کر اپنے آپ ایک گلی کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ گلی بھی سنسان پڑی تھی۔ مکانوں کے دروازوں پر خاموشی کی مہر لگی تھی۔ کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ ایک عجیب سا ڈرا دینے والا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

گلی آگے ایک کھلی جگہ پر نکل آئی۔

مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ یہ دن کا وقت ہے یا رات کا وقت ہے۔ ایک عجیب سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جسے نہ آپ روشنی کہہ سکتے ہیں نہ اندھیرا۔ یہ اندھیرے اور روشنی کے درمیان کی کوئی حالت تھی۔ دھند یا کہرا بھی نہیں تھا۔ کھلی جگہ پر آ کر میں رک گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تالاب ہے جس کے اوپر سامنے ایک اونچی عمارت کو جانے کے لئے راستہ بنا ہوا ہے۔ یہ ایک قسم کا پل تھا۔ میں اپنے آپ عمارت میں داخل ہونے کے لئے تالاب کے پل کی طرف بڑھا۔ مجھے جیسے کوئی کہہ رہا تھا کہ سامنے والی عمارت میں چلو۔ پل پر قدم رکھتے ہی مجھے پھنکاریں سنائی دینے لگیں۔ میں نے ڈر کر نیچے دیکھا۔ میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ پل کے نیچے تالاب میں پانی کے اوپر سانپ ہی سانپ تیر رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ یہ پانی نہیں بلکہ سانپوں سے بھرا ہوا تالاب ہے۔ ہر سانپ پھنکار رہا تھا اور بار بار گردن اوپر میری طرف کر رہا تھا۔ میں ڈر کر واپس جانے لگا تو میرے دل میں جیسے کسی نے آہستہ سے کہا۔ "سامنے والی عمارت میں چلو۔" اور میں پل پر چلنے لگا۔ میں تیز تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرے پاؤں جیسے من من بھاری ہو گئے تھے۔ میں جتنی تیز چلنے کی کوشش کرتا میرے پاؤں اتنے ہی بھاری ہو جاتے۔

کسی نہ کسی طرح آخر میں عمارت کے پاس پہنچ گیا۔

عمارت کو سر اٹھا کر دیکھا تو دہشت زدہ ہو گیا۔ ساری کی ساری عمارت ایک پہاڑ جتنے بڑے سانپ کی شکل کی بنی ہوئی تھی۔ دروازہ سانپ کے کھلے ہوئے منہ کا بنا تھا۔ بنی دروازے کی جگہ ایک اژدہا قسم کے سانپ نے اپنا منہ کھول رکھا تھا۔ اس کی زبان ہ اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ خوف کے مارے مجھے پسینہ آ گیا۔ اسی قت میرے کانوں میں پروین کی کمزور اور نحیف سی آواز آئی۔

"سانپ کے اندر آ جاؤ۔"

پروین کی آواز سن کر مجھے حوصلہ ہوا اور میں سانپ کے منہ میں داخل ہو گیا۔ سانپ کی زبان کی سیڑھیاں چڑھتا اوپر گیا تو دیکھا کہ سامنے ایک اور سانپ کے منہ کا روازہ بنا ہوا ہے۔ میں حوصلہ کر کے اس دروازے میں بھی داخل ہو گیا۔ مجھے یوں سوس ہونے لگا جیسے میں سانپ کے پیٹ میں چل رہا ہوں۔ یہ گول سرنگ نما راستہ ا جس کی دیواروں میں مجھے سانپ کی بڑی بڑی کمان کی طرح کی پسلیاں دکھائی دے ہی تھیں۔

آگے ایک چھوٹا سا طاق تھا۔ یہاں کر سرنگ ختم ہو جاتی تھی۔ میں نے طاق کو ہستہ سے دھکیل کر کھولا تو مجھے ایسی وازیں سنائی دیں جیسے بہت سی عورتیں آہستہ ہستہ رو رہی ہوں۔ میں نے طاق کے اندر سر ڈال کر دیکھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا باغیچہ نظر آیا۔ میں باغیچے میں اتر گیا۔ عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں ہستہ آہستہ دور ہوتی گئیں۔ پھر ان آوازوں کی جگہ ایک سیٹی ایسی لمبی آواز نے لے ۔ یہ سیٹی کی آواز رک رک کر آ رہی تھی۔ مجھے یاد آ گیا۔ میں نے بچپن میں برسات کے دنوں میں ایک تالاب کے پاس یہ آواز سنی تھی اور ایک سپیرے سے پوچھا تھا کہ آواز کس جانور کی ہوتی ہے۔ اس نے کہا تھا۔ یہ سانپ کی سیٹی کی آواز ہے۔ سانپ سات کے موسم میں کبھی کبھی ایسی آواز نکالا کرتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر وہیں رک گیا ہ کہیں آگے بھی سانپ ہی سانپ نہ ہوں۔ اتنے میں میرے کانوں نے ایک بار پھر وین کی آواز سنی۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

"رکو نہیں۔ چلتے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

"مگر تم سامنے کیوں نہیں آتیں؟ تم نے تو کہا تھا کہ تم خواب میں میرے سامنے آ جاؤ گی مجھ سے باتیں کرو گی۔"

اس کے جواب میں پروین کی آواز نہ آئی۔ وہی سانپ کی سیٹی تھوڑی دیر بعد سنائی دے رہی تھی۔ میں باغیچے میں چلنے لگا۔ ایک چھوٹی سی روش تھی جس پر میں چل رہا تھا۔ جب میں درختوں کے نیچے پہنچا تو دیکھا کہ ایک ایک درخت کی ٹہنیوں پر کئی کئی سانپ لپٹے نیچے لٹک رہے تھے اور اپنی گردن اٹھا اٹھا کر لہرا رہے تھے۔ جیسے ابھی مجھے ڈس دیں گے۔ میں نے سوچا کہ یہ خواب ہے۔ میں خواب میں مر نہیں سکتا۔ اس لئے بھاگنے کی ضرورت نہیں آگے پروین میرا انتظار کر رہی ہے۔

میں درختوں کے نیچے سمٹ سمٹا کر چل رہا تھا۔ ٹہنیوں پر لٹکے ہوئے سانپ میری طرف لہرا لہرا کر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بالکل قریب آ کر واپس پلٹ جاتے۔ جیسے جھولا ایک مقام پر آ کر واپس چلا جاتا ہے۔ روش ختم ہوئی تو سامنے ایک سرسبز گھاس والا قطعہ آ گیا۔ قطعے کے وسط میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ میں تخت کے پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ تخت لکڑی کا نہیں ہے بلکہ سانپوں کی سریاں اور ہڈیوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ اتنے میں میں نے ایک جانب سے پروین کو اس عالم میں آتے دیکھا کہ اس کے جسم کے گرد ایک بہت بڑا سانپ لپٹا ہوا تھا جس کے بوجھ سے وہ دہری ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے اردگرد چھ سات عورتیں اور مرد چل رہے تھے۔ ان مردوں اور عورتوں کے جسموں سے بھی سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ میں نے پروین کو دیکھا تو بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ پروین کے جسم کے گرد اژدہا قسم کا سانپ لپٹا ہوا تھا اس نے مجھے دیکھ کر اتنی زور سے پھنکار ماری کہ مجھے لگا دھوئیں اور آگ کا بادل میرے جسم کو چھوتا ہوا گزر گیا ہے۔ تب پروین کی آواز آئی۔

"تخت کے پیچھے چلے جاؤ۔"

میں دوڑ کر گھاس پر بچھے ہوئے تخت کے پیچھے جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ پروین اپنے گرد لپٹے ہوئے بہت بڑے اژدہا سانپ کا سر دونوں ہاتھوں میں اٹھائے رک رک کر چلتی تخت کے پاس آئی۔ اور اس پر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی اژدہا اپنے آپ اس کے جسم سے اتر کر ایک طرف کو چلا گیا۔ اس کے بعد وہ مرد عورتیں بھی اپنے اپنے جسموں کے گرد لپٹے ہوئے سانپوں کی گردنیں پکڑے وہاں سے چلے گئے۔ جب وہاں سوائے میری اور پروین کے اور کوئی نہ رہا تو میں جھاڑی کی اوٹ سے نکل کر پروین کے سامنے آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔

"میں نے تمہیں اپنی حالت کا نظارہ کرنے کے لئے یہاں بلایا ہے۔ دیکھو۔ میں کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ یہ خدا کی طرف سے نازل کیا ہوا عذاب نہیں ہے۔ بلکہ اس عذاب کو میں نے خود اپنے لئے دنیا میں پیدا کیا تھا۔"

میں اس کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ میں نے اسے کہا۔

"پروین! کیا اس حالت کو ان جرائم پیشہ سپیروں کی وجہ سے پہنچی ہو جنہوں نے تمہیں تاج محل کے مینار سے اغوا کیا تھا اور پھر تمہاری بے ہوشی کی حالت میں تم پر ایک ایسا طاقتور منتر پھونکا کہ جو الٹا پڑ گیا اور تمہاری روح نے عارضی طور پر تمہارے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔"

پروین عالم خواب میں میرے بالکل پاس تخت پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکان اور شکستگی کے اثرات نمایاں تھے۔ جیسے وہ مسلسل کسی تکلیف میں مبتلا ہی ہو۔ کہنے لگی۔

"وہ تو ایک بہانہ تھا جو میرے اپنے کئے ہوئے اعمال نے پیدا کر دیا تھا تاکہ میں اپنے کئے ہوئے برے عملوں کی سزا بھگت سکوں۔"

میں نے پروین کی اس وقت کی ذہنی اور نفسیاتی حالت پر توجہ دینے کی بجائے اس سے پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ تاج محل سے کس طرح اغوا ہوئی تھی؟ کیا گائیڈ کے علاوہ بھی وہاں کوئی اور آدمی تھا؟

پروین نے تھکی ہوئی آواز میں ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"وہ ساری باتیں اب مجھے خواب کی طرح لگتی ہیں اور اب یہ حالت جس کو تم خواب کی حالت کہتے ہو اور سمجھتے ہو مجھے حقیقی زندگی کی طرح معلوم ہو رہی ہے۔"

میں چپ سا ہو کر پروین کی طرف تکنے لگا۔

"پروین! کیا تم اس دنیا سے کب نکل کر میرے پاس آؤ گی؟"

اس نے کہا۔

"یہ میں اپنے جسم پر کئے گئے عذاب کی سزا بھگت رہی ہوں۔ جس طرح انسان کے جسم پر کوئی زخم لگ جائے تو زخم کو آہستہ آہستہ آرام آتا ہے اور زخم ٹھیک ہونے تک اپنا پورا وقت لیتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں ایک آدمی گناہ کر کے اپنے اوپر جو ظلم کرتا ہے اور اپنی روح کو زخمی کر لیتا ہے اسے اگلی دنیا میں اس وقت تک تکلیفیں سہنی پڑتی ہیں جب تک کہ اس کی روح کے زخم ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ یاد رکھو۔ جسم کے زخم کو ٹھیک ہونے میں اتنی دیر نہیں لگتی۔ لیکن روح پر جو زخم لگتے ہیں انہیں بھرنے میں ایک لمبی مدت لگتی ہے یہ لمبی مدت ایک سال کی بھی ہو سکتی ہے ایک ہزار سال کی بھی ہو سکتی ہے۔ دس ہزار سال کی بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے یہاں ایسی ایسی گناہ گار روحوں کو دیکھا ہے جو دو دو کروڑ سال سے یہاں پڑی اپنی روح پر لگے ہوئے گناہوں کے زخموں کے بھر جانے کا انتظار کر رہی ہیں۔"

میں تو حیران سا ہو کر پروین کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری ابھی مکمل طور پر موت واقع نہیں ہوئی۔ ابھی میری روح کا رشتہ ایک باریک ڈوری کے ذریعے میرے نیم مردہ جسم سے بندھا ہوا ہے۔ اگر میری روح کسی طرح واپس اپنی جسم میں چلی گئی تو مجھے عالم ارضی میں رہ کر اپنے گناہوں کو دھونے اور توبہ کرنے کا سنہری موقع مل جائے گا۔ کیونکہ زندہ رہ کر ایک گناہ گار اگر صدق دل سے توبہ کر لے اور آئندہ گناہ نہ کرے تو اس کی روح پر لگے ہوئے سارے زخم اللہ پاک ٹھیک کر دیتا ہے اور اسے معافی مل جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ میں تمہاری روح کو تمہارے جسم میں واپس لانے کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ تمہارا نیم مردہ جسم اس وقت کہاں ہے اور مجھے تمہیں دوبارہ عالم ارضی میں زندہ حالت میں دیکھنے کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

پروین نے کہا۔

"جن لوگوں نے مجھ کو تاج محل کے مینار سے اغوا کیا تھا وہ لوگ بڑے قاتل قسم کے جرائم پیشہ سپیرے تھے۔ وہ کالے علم اور سانپوں کے طلسم کے بڑے ماہر تھے انہوں نے مجھ کو کوئی دوائی سنگھا کر بے ہوش کیا تھا۔ میں تم سے الگ ہو کر گائیڈ کے ساتھ جب تاج محل کے مینار کا چکر لگانے اس کی دوسری طرف گئی تو اچانک گائیڈ نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا اور میرے منہ پر گیلا رومال رکھ کر اسے بند کر دیا۔ میں نے اس خیال سے زور سے سانس لیا کہ سانپ بن کر اسے ڈس دوں گی لیکن اس سانس کے ساتھ ہی میرے جسم کے اندر رومال میں ملی ہوئی بے ہوشی کی دوا داخل ہو گئی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ اس کے بعد جب ہوش آیا تو وہ لوگ مجھ پر نہ جانے کتنے ناپاک کافرانہ منتر پڑھ کر پھونک چکے تھے جس کی وجہ سے میں ہوش میں تو آ گئی تھی لیکن نہ بول سکتی تھی نہ ہاتھ پیر ہلا سکتی تھی۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ میں اپنی آنکھیں بھی ادھر ادھر نہ پھیر سکتی تھی۔ میرا سانس بھی بند ہو چکا تھا۔ ورنہ میں سانس بھر کر سانپ کی شکل بدل سکتی تھی۔ ایک طرح سے میں زندہ مردہ تھی۔ میرا خیال تمہاری طرف چلا گیا کہ نہ جانے میرے غائب ہو جانے سے تم کس قدر پریشان نہیں ہو گے۔ میں کسی طرح تم سے ملاقات کرنے کو بے قرار تھی۔ مگر مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ تم کہاں ہو۔ اگر میں پوری طرح مر چکی ہوتی تو مجھے ایک سیکنڈ سے بھی پہلے پتہ چل جاتا کہ تم کہاں ہو۔ کیونکہ مرنے کے بعد روح کی آنکھوں کے آگے سے خدا بہت سے پردے اٹھا دیتا ہے۔ لیکن میرے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ میں پوری طرح مری ہوئی نہیں تھی۔ میرا جسم زندہ تھا مگر روح اس دنیا میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے ابتدائی مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ میری پتھرائی ہوئی آنکھیں صرف

میرے جسم میں روح کا جو باریک سا رشتہ قائم تھا اس کی وجہ سے چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ ورنہ میرا جسم بالکل مردہ تھا۔"

میں خواب میں پروین کے پاس بیٹھا اس کی حیران کر دینے والی آنکھیں کھول دینے والی باتیں سن رہا تھا۔ اور مجھے ایک لمحے کے لئے احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے پروین سے کہا۔

"خدا کے لئے مجھے بتاؤ تمہارا مردہ جسم ان لوگوں نے کہاں چھپا کر رکھا ہوا ہے؟"

پروین کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ وہ کہنے لگی۔

انسان اگر صرف ایک بار موت کے بعد کی زندگی کی ایک جھلک دیکھ لے تو پھر ساری زندگی کبھی کوئی گناہ نہ کرے۔ ان جرائم پیشہ سپیروں پر اب مجھے رحم آتا ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں اپنی موت کے بعد انتہائی دردناک اور شدید عذاب بھگتنا پڑے گا۔ اور کوئی پتہ نہیں کہ وہ ڈاکو خونی اور جرائم پیشہ لوگ یہ اذیت ناک عذاب ایک سال تک بھگتیں گے یا ایک لاکھ سال تک عذاب میں جلتے، گلتے، سڑتے رہیں گے...... اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میرا مردہ جسم ان لوگوں نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ یہ بات ابھی ابھی کسی غیبی طاقت نے میرے دل میں ڈالی ہے۔ مجھ پر جو یہ رحم کیا گیا ہے تو صرف اس لئے کہ میری نیت نیک تھی اور میں نے ہندو دیوی دیوتاؤں کی پوجا والے مذہب کو چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کرنے والے دین اسلام کو قبول کر لیا ہے۔"

پروین نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں کچھ کہنے لگا۔ لیکن جیسے کسی نے میری زبان ایک لمحے کے لئے بند کر دی۔ پروین نے تین چار مرتبہ دھیمی آواز میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں کی بخشش کی دعا مانگی۔ پھر آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"آگرہ سے اٹاوا اور کان پور جاتے ہوئے راستے میں ایک سٹیشن فیروز آباد آتا ہے فیروز آباد ریلوے سٹیشن کے پاس انگریزوں کے زمانے کا ایک مردہ خانہ ہے جو اب

بالکل ویران پڑا رہتا ہے کیونکہ سرکاری مردہ خانہ شہر کے ہسپتال میں بنا دیا گیا ہے۔ اس ویران مردہ خانے کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے۔ اس تہہ خانے میں میری نیم مردہ لاش ان لوگوں نے ترپال سے ڈھک کر رکھی ہوئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"پروین! پلیز مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا جسم دوبارہ کس طرح زندہ ہو گا۔ میں ایسا کونسا جتن کروں کہ تمہاری روح پھر سے اپنے جسم میں داخل ہو جائے؟"

پروین نے آہ بھر کر کہا۔

"یہ بات اب میرے اختیار سے بھی باہر ہو چکی ہے۔ ان سپیروں نے مجھ پر ایسا آتشی طلسم پھونکا ہے کہ جو الٹا پڑ جانے کے بعد ان کے قابو سے بھی باہر ہو گیا ہے۔ وہ خود اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح میں دوبارہ زندہ ہو جاؤں۔ اگر زندہ نہیں ہوتی تو کم از کم ناگن کی شکل ہی اختیار کر لوں۔"

"کیا تمہارے ذہن میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ تمہاری روح واپس تمہارے جسم میں چلی جائے؟"

پروین نے میرے اس سوال کے جواب میں کہا۔

"ابھی تک مجھے ایسا کوئی طریقہ معلوم نہیں ہو سکا لیکن میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ چونکہ میں نے آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ مجھے ضرور بخش دے گا۔ اس دوران تم صرف ایک کام کرو کہ اس ویران مردہ خانے سے میری لاش نکال کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دو۔ یہ محفوظ جگہ ایسی ہونی چاہئے جہاں میرے دشمن جرائم پیشہ سپیرے نہ پہنچ سکیں۔ کیونکہ اگر انہوں نے مجھ پر مزید کوئی جادو ٹونہ نہ کیا تو ممکن ہے اب تک میرے جسم کے ساتھ روح کا جو نازک رشتہ قائم ہے وہ بھی ٹوٹ جائے اور میں پوری طرح مر جاؤں۔ پھر میں تمہاری دنیا میں کبھی نہیں آ سکوں۔"

میں نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں اس کا انتظام ہر حالت میں کر کے رہوں گا۔"

میں تمہارا نیم مردہ جسم وہاں سے نکال کر محفوظ جگہ پر لے جاؤں گا۔ لیکن کہیں تمہاری لاش خراب ہونا تو شروع نہیں ہو جائے گی؟؟"

پروین بولی۔

"جب تک میری روح کا رشتہ میرے جسم سے قائم ہے میری لاش کو کچھ نہیں ہو گا۔"

اسی وقت اچانک ایک طرف سے عورتوں کے رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگیں۔ یہ وہی آوازیں تھیں جو پہلے بھی مجھے سنائی دی تھیں۔ میں نے پروین سے ان آوازوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اس دنیائے حیرت کی سیر کراتی ہوں۔"

وہ تخت پر سے اٹھی اور سامنے والے ٹیلے کی طرف چل پڑی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہوا میں تیر رہا ہوں۔

عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں سامنے والے ٹیلے سے آ رہی تھیں۔ پروین کی روح ٹیلے پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"اب میرے ساتھ ساتھ چلنا۔"

ٹیلے پر ایک پگ ڈنڈی اوپر کو جا رہی تھی۔ ہم پگ ڈنڈی پر چڑھتے گئے۔ تھوڑا آگے جا کر پگ ڈنڈی ٹیلے کے پہلو کے ساتھ متوازی رخ اختیار کر گئی۔ ہم ذرا آگے گئے تو بین کرنے کی آوازیں پوری طرح سنائی دینے لگیں۔ پروین ٹیلے کے اندر بنے ہوئے غار کے دہانے پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے غار کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔

"ادھر دیکھو۔"

میں نے دیکھا کے غار کے اندر چاروں طرف برف جمی ہوئی ہے۔ دیواریں برف کی ہیں۔ چھت برف کی ہے۔ فرش برف کا ہے۔ برف کے فرش پر جگہ جگہ عورتیں برف کے ستونوں کے ساتھ بندھی ہوئی ہیں۔ ان کے بال کھلے ہیں۔ گردنیں نیچے کو جھکی ہوئی ہیں اور وہ دردناک آوازوں میں رو رہی ہیں۔ پروین نے کہا۔

"یہ وہ بدنصیب عورتیں ہیں جنہوں نے دنیا میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے خاطر فحاشی اور بدکاری کا راستہ اختیار کیا۔ ان کے سامنے نیکی کا راستہ بھی تھا۔ مگر ں نے اپنے اوپر ظلم کیا اور برائی کے راستے پر چل پڑیں۔ یہ عذاب خود ان کا اپنا کیا ہوا ہے۔ جب تک ان دیواروں چھتوں اور فرش کی برفیں پگھل نہیں جاتیں یہ عذاب میں مبتلا رہیں گی۔ آؤ میں تمہیں کچھ اور دکھاتی ہوں۔"

پروین کی روح مجھے آگے لے گئی۔ یہاں ٹیلے کے دامن میں ایک سرسبز و شاداب پہ تھا جس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہاں سے خدا کی حمد و ثنا کی ح پرور پرسکون آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے کچھ سفید پوش خواتین نظر پڑیں جن کے ے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ باغیچے میں سے ایسی خوشبوئیں آ رہی تھیں میں نے پہلے کہیں محسوس نہیں کی تھیں۔ پروین کی روح نے کہا۔

"یہ وہ پاکباز خواتین ہیں جو اپنے خاوندوں کی وفادار رہیں۔ ساری زندگی نیکی کے ستے پر چلیں۔ رزق حلال کی روکھی سوکھی کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا لیکن اپنی روح کو ہ رکھا۔ اپنی روح کو داغ دار ہونے سے بچایا اب یہ بہشت میں ہمہ وقت خدا کی ثنا میں مصروف ہیں۔ انہیں جو روحانی مسرت حاصل ہے ہم دنیا والے اس کا تصور نہیں کر سکتے۔"

میں وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے باغیچے میں سے جو خوشبو آ رہی تھی وہ ی روح کو گہرا سکون عطا کر رہی تھی۔ مگر پروین نے کہا۔

"آؤ آگے چلیں۔"

اور ہم ٹیلے سے اتر کر دوسری طرف آ گئے۔

پروین نے مجھے اس دنیا کے کچھ اور منظر دکھائے جنہیں دیکھ کر میں نے دل میں عہد کر لیا کہ کبھی کوئی گناہ نہیں کروں گا۔ کسی کو برا نہیں کہوں گا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا اور خدا سے ہمیشہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہوں گا۔ اس کے بعد پروین اور میں ایک جگہ آ کر رک گئے۔

ہمارے سامنے ایک دریا بہہ رہا تھا۔ پروین نے کہا۔

"میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔ اب مجھے یہاں سے واپس اپنے اعمال کا حساب چکانے کے لئے واپس جانا ہو گا۔ تم جاؤ اور خدا کے حضور نماز پڑھ کر میری بخشش کی دعا کرو اگر تم میرے نیم مردہ جسم کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور خدا کی رضا شامل حال رہی تو میں خواب میں آ کر بتاؤں گی کہ میری روح اپنے جسم میں دوبارہ کس طرح داخل ہو سکتی ہے۔"

اتنا کہہ کر پروین دریا کی لہروں پر چلتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے دیکھا کہ میں آگرہ کے ہوٹل کے کمرے کے بیڈ روم میں بستر پر لیٹا ہوا ہوں اور کھڑکی پر گرے ہوئے پردوں میں سے دھوپ چھن چھن کر کمرے میں آ رہی ہے۔ میرے دل و دماغ پر خواب کا گہرا اثر تھا۔ میرا دل بستر سے اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ واپس خواب کی دنیا میں چلا جاؤں۔ لیکن ایک بار خواب ٹوٹ جائے

تو پھر اسے دوبارہ دیکھنا محال ہوتا ہے۔

میں کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ فوراً غسل خانے میں جا کر غسل کیا۔ وضو کیا۔ دو رکعت نفل پڑھے۔ خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش کا طلبگار ہوا۔ پروین کے حق میں صدق دل سے دعا مانگی اور نیچے جا کر ناشتہ کیا۔ اور وہیں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے وہاں سے مجھے فروز آباد جا کر ویران مردہ خانے سے پروین کے نیم مردہ جسم کو نکال کر کسی محفوظ جگہ پر لے جانا تھا۔ فیروز آباد کا شہر آگرہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ میں اسی ہوٹل میں رہوں گا۔ یہاں سے فیروز آباد جا کر پروین کا نیم مردہ جسم رات کے اندھیرے میں اٹھا کر لے آؤں گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں اسے رکھوں گا کہاں۔ یہ کوئی زیور یا قیمتی دستاویزات نہیں تھیں کہ میں انہیں کسی بینک کے لاکر میں جمع کرا دیتا۔ ایک انسانی لاش تھی۔ اگرچہ یہ لاش پوری طرح مردہ نہیں تھی۔ اسے اپنے ساتھ ہوٹل میں نہیں لا سکتا تھا۔ یہاں لاتا تو پولیس کو خبر ہو جاتی۔ پولیس والے فوراً لاش کو قبضے میں لے کر مجھے گرفتار کر لیتے۔ ہوٹل والوں کو اتنا معلوم تھا کہ میرے ساتھ ایک عورت بھی آ کر کمرے میں ٹھہری تھی۔ اگر میں انہیں بتاؤں کہ وہ میری بیوی تھی اور دوسرے شہر گئی تھی۔ وہاں بیمار رہ کر مر گئی تو وہ لوگ ضرور یقین کر لیں گے لیکن اس حالت میں بھی لاش کو ہوٹل میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ لوگ یہی کہتے کہ اگر یہ آپ کی بیوی تھی اور مر گئی ہے تو اسے قبرستان میں دفن کیوں نہیں کرتے۔

فیروز آباد والے ویران مردہ خانے میں اگر لاش کو پڑی رہنے دیتا تو وہاں بھی وہ محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ جن جرائم پیشہ سپیروں نے پروین کی لاش کو وہاں چھپایا ہوا تھا وہ ضرور واپس آ کر لاش کو اٹھا کر لے جاتے۔ یا اس پر کوئی دوسرا جادو ٹونہ کرنا شروع کر دیتے۔ ایک بات طے تھی کہ مجھے پروین کے نیم مردہ جسم یا لاش کو ویران مردہ خانے سے ضرور لے جانا تھا اور اسے میں آگرہ شہر والے اپنے ہوٹل میں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ روپیہ پیسہ تو میرے پاس کافی ہے۔ کیوں نہ میں پروین کی

لاش کو فیروز آباد یا آگرے کے کسی ہسپتال میں داخل کرا دوں۔ انہیں کہوں کہ میری بیوی اچانک بے ہوش ہو گئی ہے۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ میں اس کا علاج کرانا چاہتا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ جن لوگوں پر سکتہ طاری ہوتا ہے ان کے دل کی دھڑکن جاری ہوتی ہے اور وہ بے ہوشی کی حالت میں بھی سانس ضرور لے رہے ہوتے ہیں۔ مگر پروین نے تو مجھے بتایا تھا کہ میں سانس بھی نہیں لے رہی اور میرے دل کی دھڑکن بھی بند ہو گئی ہے لیکن میرا جسم اسی طرح گرم ہے اور روح کے ساتھ جسم کا رشتہ برقرار ہے۔ ہسپتال والے تو اس حالت میں پروین کو مردہ قرار دے کر لاش میرے حوالے کر دیں گے۔ پھر کیا کرنا چاہئے۔

میں ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کافی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لاش کو کہاں چھپایا جائے۔ آخر ایک ترکیب میرے دماغ میں آ گئی۔ یہ بڑی مناسب اور محفوظ ترکیب تھی۔ اس طرح میں پروین کی لاش کو چاہے جتنے دن جتنے سال چاہوں محفوظ رکھ سکتا تھا اور کسی کو ذرا سا شک بھی نہیں پڑ سکتا تھا۔ ترکیب یہ تھی کہ میں پروین کی لاش فیروز آباد سے لے کر اپنے ہوٹل میں آگرے آ جاؤں اور ہوٹل والوں سے کہہ دوں کہ میری بیوی فیروز آباد اپنے عزیزوں سے ملنے گئی تھی وہاں بخار چڑھا اور مر گئی۔ اس کے بعد میں اسے آگرہ کے کسی قبرستان میں دفنا دوں۔ پھر آدھی رات کو قبرستان میں جا کر قبر کی ایک جانب اتنا بڑا سوراخ بنا دوں کہ جس میں سے گزر کر میں ہر رات پروین کی لاش کو دیکھنے اور چیک کرنے آتا جاتا رہوں۔ اس طرح کسی کو شک بھی نہیں پڑے گا اور مجھے لاش کی حفاظت کی پریشانی بھی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ میں اپنی اس انوکھی اور محفوظ ترین ترکیب پر خود ہی بڑا خوش ہوا۔ اسی وقت ہوٹل کے کاؤنٹر پر گیا۔ کاؤنٹر کلرک سے کہا۔

"میری بیوی جو میرے ساتھ یہاں آئی تھی اپنے رشتے داروں سے ملنے فیروز آباد گئی تھی۔ ابھی ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ وہاں بیمار پڑ گئی ہے۔ میں اس کی خبر لینے جا رہا ہوں۔ یہاں میرا کمرہ محفوظ رکھئے گا۔ میں آپ کو مزید ایک ہفتے کا کرایہ ادا کر

دوں گا۔"

ہوٹل کے کلرک نے کہا۔

"کوئی بات نہیں صاحب۔ آپ ضرور اپنی بیگم صاحبہ کی خبر گیری کو جایئے۔ آپ کا کمرہ بالکل محفوظ رہے گا۔ صرف آپ کے فلیٹ کی ایک چابی ہمارے پاس رہے گی۔"

میں نے کہا۔ "بے شک آپ چابی اپنے پاس رکھئے گا۔"

میں تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں آیا۔ تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ اپنے نئے پرانے کپڑوں اور پروین کے کپڑوں کو اچھی طرح تہہ کر کے الماری میں بند کیا۔ پروین کے پانچ ہزار روپے بھی میرے پیسوں کے ساتھ ہی میرے پاس پڑے تھے۔ ان میں سے ابھی تک بمشکل تین چار سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ اتنی رقم میں اپنے ساتھ ساتھ لے کر نہیں پھر سکتا تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ رقم میں ہوٹل کے منیجر کے پاس جمع کرا دیتا ہوں۔ اس طرح رقم محفوظ رہے گی۔ چنانچہ میں نیچے آ گیا۔ کاؤنٹر کلرک کو مزید ایک ہفتے کا فلیٹ کا کرایہ ادا کیا۔ تین چار سو روپے اپنے پاس رکھ لئے اور باقی نو ہزار روپے کے نوٹ جیب میں ڈال کر ہوٹل کے بڑے منیجر کے کمرے میں گیا۔ اسے ساری بات بیان کی کہ میری بیوی بیمار ہے۔ میں اس کی تیمار داری کے لئے فیروز آباد جا رہا ہوں۔ میری یہ رقم اپنے پاس بطور امانت رکھ لیجئے۔ اور میں نے نو ہزار روپے کے نوٹ نکال کر منیجر کے سامنے میز پر رکھ دیئے۔ منیجر ادھیڑ عمر کا شریفانہ چہرے والا آدمی تھا۔ اس نے سارے نوٹ گنے۔ انہیں ایک لفافہ میں ڈال کر میرے سامنے مہر بند کیا۔ سامنے والی لوہے کی الماری کھول کر اس کے دراز میں رکھا۔ اور مجھے نو ہزار روپے کی رسید لکھ کر دے دی۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں ہوٹل سے نکل کر ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ فیروز آباد جانے والی گاڑی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد ملے گی۔ میں وہیں سٹیشن کے ریفرشمنٹ روم میں بیٹھ کر چائے وغیرہ پینے لگا۔ فیروز آبا کا ٹکٹ میں نے لے لیا تھا۔ گاڑی آئی تو میں اس میں سوار ہو کر فیروز آباد پہنچ گیا۔ اس زمانے میں

یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ شہر میں جانے کی بجائے میں گاڑی سے اترنے کے بعد ریلوے سٹیشن کے پیچھے آ گیا۔ پروین نے مجھے خواب میں بتایا تھا کہ سٹیشن کے آس پاس ہی انگریزوں کے زمانے کا بنایا ہوا کوئی مردہ خانہ ہے جو اب ویران پڑا ہے وہاں میری لاش چھپائی گئی ہے۔ سٹیشن کے پیچھے کھوکھا نما دکانیں تھیں۔ میں ایک دکاندار کے پاس گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"بھائی صاحب یہاں صادق علی صاحب کا مکان کہاں ہو گا۔"

دکاندار کہنے لگا۔ "بھائی صاحب! ان کا کوئی اتا پتا بھی تو معلوم ہو۔ خالی مکان کا پوچھنے سے کیا پتہ چلے گا؟"

میں نے کہا۔ "انہوں نے کہا تھا کہ میرا مکان انگریزوں کے پرانے مردہ گھر کے کہیں قریب ہی ہے۔"

دکاندار بولا۔

"تو بھائی صاحب! انگریزوں کا پرانا مردہ خانہ یہاں سے پیچھے نالہ پار کرو گے تو آگے آئے گا۔ وہاں جا کر معلوم کرنا۔"

مجھے یہی معلوم کرنا تھا کہ پرانا مردہ خانہ کس طرح ہے۔ اگر میں صرف مردہ خانے کا ہی پوچھتا تو دکاندار کو ضرور تشویش ہوتی کہ یہ شخص مردہ خانے کیا لینے جا رہا ہے۔ میں نے دکاندار کا شکریہ ادا کیا اور کھوکھوں کی دکانوں کے پیچھے کی طرف چل پڑا۔ پیچھے کچھ دور چلنے کے بعد ایک گندا نالہ آ گیا۔ نالے کا پل پار کر کے ایک اجاڑ سے میدان میں پہنچا تو دور ایک کواٹر سا نظر پڑا۔ قریب پہنچ کر دیکھا کہ ایک بوسیدہ سا کمرہ ہے جس کی دیواریں شکستہ ہو رہی ہیں۔ برآمدے کی آدھی چھت ڈھے چکی ہے۔ برآمدے میں ایک جگہ مٹی کھود کر ایک کالا کتا سو رہا تھا میرے قدموں کی آہٹ پر کتے نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور اٹھ کر دوسری طرف بھاگ گیا۔ میں برآمدے میں آ گیا۔ مردہ خانے کا گرد آلود دروازہ بند تھا۔ باہر تالا بھی لگا ہوا تھا۔ تالا دروازے کی بوسیدگی کے مقابلے میں نیا لگ رہا تھا۔ صرف معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے دو تین روز پہلے ہی لگایا ہے۔ میں

نے قریب پڑی ہوئی ایک اینٹ اٹھا کر زور سے تالے پر ماری۔ تالا تو نہ ٹوٹا مگر اس کا کنڈا ٹوٹ گیا۔ دروازہ کھول کر مردہ خانے میں داخل ہوا۔ فرش گرد آلود تھا۔ درمیان میں ایک لوہے کا سٹریچر پڑا تھا جس کی ایک ٹانگ غائب تھی۔ سٹریچر پر بھی گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ پروین نے کہا تھا کہ یہاں نیچے تہہ خانے میں میرا جسم چھپایا ہوا ہے۔ میں جھک کر فرش کو غور سے دیکھنے لگا۔

کونے میں ایک جگہ مجھے کچھ اینٹیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے انہیں ایک ایک کر کے پرے ہٹایا تو دیکھا۔ نیچے ایک گرد آلود بوریا بچھا ہوا تھا۔ بوریا ہٹایا تو نیچے لکڑی کا چوکھٹا دکھائی دیا۔ یہ کوئی چار فٹ لمبا اور پانچ فٹ کے قریب چوڑ چوکھٹا تھا۔ اس کے ساتھ کنڈا لگا ہوا تھا۔ میں نے کنڈے کو پکڑ کر چوکھٹے کو زور لگا کر اوپر اٹھا دیا۔ نیچے لوہے کا زینہ تھا۔ میں نے چوکھٹے کو دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ دروازے کو بند کیا اور ماچس جلا کر تہہ خانے کا زینہ اترنے لگا۔ چھ سات سیڑھیاں اترنے کے بعد ماچس کی تیلی بجھ گئی۔ میں نے دوسری تیلی جلائی اس کی روشنی میں سامنے دیوار کے پاس فرش پر ایک انسانی جسم پڑا دیکھا جس پر ترپال پڑی ہوئی تھی۔ پروین نے کہا تھا کہ جرائم پیشہ سپیروں نے وہاں میرا نیم مردہ جسم ڈال کر اوپر ترپال ڈالی ہوئی ہے۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ ماچس کی تیسری تیلی جلا کر ترپال کو ہٹایا تو نیچے پروین کا چہرہ دکھائی دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مجھ پر رقت سی طاری ہو گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پایا۔ پروین کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے مگر بول نہیں سکتی۔ ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتی۔ مگر میری آواز ضرور سن رہی ہو گی۔ میں نے کہا۔

"پروین! تم جس قدر بھی سن سکتی ہو جس قدر بھی دیکھ سکتی ہو۔ تم ضرور مجھے دیکھ رہی ہو گی۔ میری آواز سن رہی ہو گی میں تمہارے پاس پہنچ گیا ہوں۔ اب تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ میں رات کو آؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

میں نے پروین کے چہرے پر دوبارہ ترپال ڈال دی۔ تہہ خانے سے باہر آکر اسی طرح اسے بند کیا۔ اوپر اینٹیں رکھیں۔ پھر مردہ خانے سے باہر آکر دروازے کا کنڈا اس طرح پھنسا دیا کہ معلوم ہو تالا لگا ہوا ہے۔

اب اس ایڈونچر کا سب سے مشکل مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ یعنی مجھے وہاں سے پروین کی لاش کو نکال کر اپنے ساتھ آگرے لے جانا تھا۔ میں کچھ دیر تک اس ویران مردہ خانے کے شکستہ برآمدے میں کھڑا سوچتا رہا۔ آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔ میں وہاں سے فیروز آباد شہر کی طرف چل پڑا۔ پروین نے مجھے خواب میں بتایا تھا کہ اس شہر میں بھی ایک ہسپتال ہے۔ شہر میں آکر میں نے ہسپتال کا پتہ معلوم کیا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ چھوٹا سا سرکاری ہسپتال تھا۔ میں خاموشی سے واپس ہوا اور ٹیکسی تلاش کرنے لگا۔ مگر وہاں ٹیکسیاں نہیں چلتی تھیں۔ ٹیکسی کے بغیر میں پروین کے نیم مردہ جسم کو مردہ خانے سے نکال کر نہیں لا سکتا تھا۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ ابھی سارا دن پڑا ہے اور آگرہ فیروز آباد سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ مجھے آگرے جا کر وہاں سے ایک ٹیکسی لے کر یہاں آنا چاہئے۔ اس وقت کوئی ریل گاڑی آگرے کی طرف جانے والی نہ ملی تو میں ایک لاری میں بیٹھ کر آگرے پہنچ گیا۔ وہاں شہر کے بڑے ٹیکسی سٹینڈ پر آکر ایک ٹیکسی والے سے بات کی۔ یہ [illegible] ڈرائیور کافی عمر کا تھا۔ شرعی ڈاڑھی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ میری بیوی فیروز آباد کے ہسپتال میں بیمار پڑی تھی۔ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی میت آگرے لانی ہے۔ یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ ہم پنجاب سے تاج محل دیکھنے آگرہ آئے تھے۔ میری بیوی نے کہا کہ فیروز آباد بھی دیکھنا ہے۔ میں اسے وہاں لے کر گیا تو اس کی پیٹ میں اچانک شدید درد اٹھا۔ میں نے اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ ہسپتال والوں نے کہا کہ آپریشن کرنا پڑے گا۔ انہوں نے آپریشن کیا لیکن میری بیوی وفات پا گئی۔ فیروز آباد سے پریشان حال یہاں آیا ہوں۔ کیونکہ فیروز آباد میں کوئی ٹیکسی وغیرہ نہیں تھی۔ ہسپتال والوں نے لاش مردہ خانے میں رکھ دی ہے۔ تم جتنے پیسے کہو گے میں تمہیں دے دوں گا۔

مسلمان بوڑھے ڈرائیور نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بابو جی۔ بیٹھئے میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

کوئی ایک گھنٹے میں ہم فیروز آباد پہنچ گئے۔ میں نے ٹیکسی پرانے مردہ خانے کے باہر رکوائی۔ ڈرائیور کو باہر کھڑا کر کے خود مردہ خانے میں گیا۔ تہہ خانے سے پروین کی نیم مردہ لاش کو کاندھے پر اٹھا کر باہر لایا۔ اسے ٹیکسی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا اور ڈرائیور سے کہا۔

"اب آگرہ لے چلو میاں۔"

ڈرائیور بولا۔

"بابو جی آپ اپنی بیوی کی میت کو پنجاب اپنے شہر میں کیوں نہیں لے جاتے؟"

میں نے کہا۔

"ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ میت کی حالت ٹھیک نہیں یہ بڑی جلدی خراب ہو جائے گی۔ اسے فوراً دفن کر دو۔"

ٹیکسی آگرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں پروین کے جسم کو سیدھا ہوٹل بھی نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ راستے میں میں نے مسلمان ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ چونکہ آگرہ میں ہمارا کوئی واقف کار نہیں ہے اس لئے میت کو سیدھا قبرستان لے چلے۔ وہ کہنے لگا۔

"بابو جی! آپ کو ہسپتال سے پرچی بنوا کر لانی چاہئے تھی۔ کیا آپ پرچی لائے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میاں جی! پرچی تو میں نے نہیں بنوائی۔ کچھ آپ ہی میری مدد کیجئے گا۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ بیوی بھی وفات پا گئی ہے۔ پنجاب لے کر گیا تو راستے میں میت کے خراب ہو جانے کا خطرہ ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس امانت کو جتنی جلدی ہو سکے آگرہ کے کسی قبرستان میں ہی دفن کر دوں۔"

ٹیکسی ڈرائیور کہنے لگا۔

"بابو جی! شہر کے قبرستان میں تو گورکن لاوارث کو دفن نہیں کریں گے۔ آپ ایسا کریں۔ تاج محل کے پیچھے ایک قبرستان ہے۔ وہاں چونکہ دریا کا پانی مار کرنے لگا ہے ۔ اس لئے وہاں اب کوئی اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتا۔ ہم وہاں قبر کھود کر میت کو سپرد خاک کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ ہو سکتا ہے۔"

میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اپنی مرضی کی قبر بنا دوں اور قبر ایسی جگہ پر بنے کہ جہاں کسی کا آنا جانا بھی نہ ہو۔ بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ آگرہ شہر میں داخل ہوئے تو بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی ایک الگ تھلگ جگہ پر کھڑی کر دی میں نے اسے سو روپے دیئے۔ وہ بازار سے کفن دفن کا مختصر سا سامان لے آیا۔ میں نے ٹیکسی میں ہی پروین کے نیم مردہ جسم کو لٹھے کی چادر میں لپیٹ دیا۔ اس کے بعد ٹیکسی ڈرائیور تاج محل کے عقب میں دریا کے کنارے ایک ویران جگہ پر لے آیا۔ یہاں ایک پرانا تالاب تھا۔ جو نہ جانے کب سے خشک پڑا تھا۔ اس میں تھوہر کے پودے اگے ہوئے تھے۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کسی پرانی عمارت کے کھنڈر کی صرف ایک محرابی دیوار ہی باقی رہ گئی تھی جو ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ دیوار کی دوسری طرف دریا کا پانی دلدل کی شکل میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں دس بارہ قبریں شکستہ حالت میں باقی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

"ان قبروں پر بھی دیا جلانے والے نہیں آتے معلوم ہوتا ہے ان کے لواحقین بھی یا تو خود مر کھپ گئے ہیں یا کسی دوسرے شہر جا چکے ہیں۔"

ایک جگہ مجھے نشیب میں کسی پرانی قبر کا کافی بڑا شگاف نظر آیا۔ یہ شگاف زمین کے اندر لحد کی صورت میں تھا مجھے یہ جگہ پسند آ گئی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"یہ ہمیں ایک بنی بنائی قبر مل گئی ہے میں یہاں اپنی بیوی کو دفن کر دیتا ہوں۔"

میں نے پروین کے نیم مردہ جسم کو ٹیکسی میں سے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا۔ او پرانی قبر کے پاس لے آیا۔ اس دوران نیک دل ٹیکسی ڈرائیور نے نشیب کی جگہ ک خوب صاف کر دیا ہوا تھا۔ میں نے "لاش" کو نشیبی لحد کے اندر لٹا دیا۔ اس کے بعد

نے ادھر ادھر سے اینٹیں اور پتھر اکٹھے کئے اور لحد کے شگاف پر لگا کر اسے بند کر دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کچھ جھاڑیاں توڑ کر لے آیا۔ اینٹوں پر ہم نے جھاڑیاں ڈال دیں۔ اب وہ قبر باہر سے کسی کو نظر نہیں آتی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میں نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔ فاتحہ تو نہ پڑھا۔ بس خدا سے یہی التجا کی کہ یا اللہ تو مجھے معاف کر دے۔ فاتحہ پڑھ کر ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

"بابو جی! آپ اس قبر کو پختہ ضرور کروا لیں رات کو یہاں مردار خور جانور دریا پار کر کے آ جاتے ہیں۔ کہیں وہ اینٹیں اکھیڑ کر میت کو خراب نہ کر دیں۔"

میں نے کہا۔ "اب تو میں واپس جا رہا ہوں۔ ایک ہفتے بعد آؤں گا تو قبر کو ضرور پختہ کروا دوں گا۔"

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دو سو روپے دیئے - وہ بہت خوش ہو گیا اور مجھے میرے ہوٹل چھوڑ کر چلا گیا۔

میں سوچنے لگا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہئے۔ پروین نے کہا تھا کہ جب میں اس کی لاش کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دوں تو وہ مجھے بتائے گی کہ اس کی روح واپس اس کے جسم میں کیسے داخل ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے مجھے خواب میں آ کر بتانے کے لئے کہا تھا یا نہیں۔ جو کچھ بھی تھا میں اس کے نیم مردہ جسم کو زیادہ دیر تک ویران قبرستان کی قبر میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ دریا پار سے مردار خور وغیرہ آ کر اس کو چیر پھاڑ نہ دیں۔ پروین اگرچہ مردہ حالت میں نہیں تھی۔ لیکن وہ اٹھ کر درندوں کو بھگا بھی نہیں سکتی تھی۔ میں شام ہوتے ہی ویران قبرستان چلا گیا۔ پرانی قبر کی جھاڑیاں اور اینٹیں ہٹا کر دیکھا۔ پروین کی لاش کفن میں لپٹی محفوظ پڑی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔

"پروین! میں نے تمہیں اپنے پاس محفوظ کر کے رکھ لیا ہے۔ اب مجھے خواب میں آ کر بتاؤ کہ تمہاری روح کس طرح تمہارے جسم میں واپس آئے گی؟ تم مجھے جو کہو گی میں اسی طرح کروں گا۔"

اس کے بعد میں نے قبر کو اچھی طرح سے بند کر کے جھاڑیوں میں چھپا دیا اور ہوٹل میں آ کر منہ ہاتھ دھو کر نیچے کھانا کھانے چلا گیا۔ رات کو دیر تک جاگتا رہا۔ کبھی خیال آتا کہ خدا جانے پروین نے میری بات سنی بھی ہے یا نہیں۔ وہ خواب میں آئے گی یا نہیں۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دریا بہہ رہا ہے۔ کنارے پر ایک گنبد والی بارہ دری ہے۔ بارہ دری میں ایک چاندی کی چوکی پر سرخ لباس پہنے پروین بیٹھی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ مجھے پاس بلایا۔ کہنے لگی۔

"خدا نے میرے گناہوں کو بخش دیا ہے۔ اس لئے کہ میں نے سچے دل سے گناہوں سے توبہ کی تھی۔ انسان اگر سچے دل سے توبہ کر لے اور آئندہ گناہ نہ کرے تو خدا اسے معاف کر دیتا ہے۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے اب تم واپس اپنے جسم میں داخل ہو سکتی ہو۔ کیونکہ تم پوری طرح مری نہیں تھیں۔ تمہارے جسم کے ساتھ روح رشتہ قائم تھا۔"

وہ بولی۔ "ہاں --- اب خدا کی طرف سے اپنے جسم میں واپس جانے کی اجازت ہے۔ مگر اس کے لئے تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔"

میں پروین کی طرف دیکھنے لگا۔

"بتاؤ۔ مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

پروین نے کہا۔

"گیارہ دیگیں میٹھے چاولوں کی پکوا کر غریبوں کو کھلاؤ۔ اس کے بعد میری قبر پر آ جانا مگر رات کے وقت آنا۔ جب چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہو۔"

میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔

میں دوسرے دن شہر کی سب سے بڑی مسجد کے امام صاحب کے پاس گیا۔ انہیں جا کر کہا کہ میں گیارہ دیگیں میٹھے چاولوں کی پکوا کر غریبوں محتاجوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا۔

"ضرور پکوائیں۔ ہم اعلان کروا دیں گے محتاج اور غریب لوگ یہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے امام صاحب کے تعاون سے گیارہ دیگیں دم کروا دیں۔ شام تک دیگیں تیار ہو گئیں۔ کتنے ہی محتاج اور غریب غربا وہاں جمع ہو گئے۔ ساری دیگوں کے چاول ان میں بانٹ دیئے گئے۔ میں نے مسجد کے دروازے کی مرمت کے لئے بھی امام صاحب کو ایک ہزار روپے بطور نذرانے کے دیئے۔ میرے پاس ابھی تک کافی رقم موجود تھی۔ جب رات ہو گئی تو میں سیدھا پرانے قبرستان پہنچ گیا۔ اس وقت چاند غروب ہو رہا تھا اور اس کی مدھم چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ پرانی قبر کے پاس گیا تو یہ دیکھ

کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ قبر کی اینٹیں ادھر ادھر پڑی تھیں اور لحد خالی تھی۔ پروین کا جسم وہاں نہیں تھا۔ دل بیٹھنے لگا۔ یااللہ یہ کیا مصیبت آن پڑی ہے۔ پروین کو کون اٹھا کر لے گیا ہے ضرور یہ ان جرائم پیشہ سپیروں کا کام ہے۔ مگر اب میں انہیں کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ وہ تو پروین کا نیم مردہ جسم اٹھا کر نہ جانے کہاں لے گئے ہوں گے۔

سخت پریشانی کے عالم میں وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی نے میرا نام لے کر مجھے آواز دی۔ یہ پروین کی آواز تھی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ چھٹکی چاندنی میں شلوار قمیض میں ملبوس کفن کی چادر سر پر ڈالے مجھ سے چھ سات قدم کے فاصلے پر پروین کھڑی تھی۔ کچھ نہ پوچھیں کہ خوشی سے میرا کیا حال ہوا۔ میں بے اختیار ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے کر کے میرے ہاتھوں کو وہیں روک لیا۔ کہنے لگی۔

"خوشی کا اظہار صرف جائز حد تک ہو تو اچھا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "پروین! تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ تمہیں پھر سے زندہ حالت میں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔"

پروین مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"چلو اب ہوٹل واپس چلتے ہیں۔ تم نے ہوٹل والوں کو کہیں یہ تو نہیں کہا کہ میں مرچکی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ میں نے انہیں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ تم فیروز آباد گئی ہوئی تھی کہ وہاں بیمار پڑ گئیں۔"

ہم وہاں سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ رات کے وقت وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی ٹیکسی رکشا نہیں تھا۔ ہم پیدل ہی چل پڑے۔ شہر کے قریب پہنچ کر ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس میں بیٹھ کر ہم ہوٹل میں آ گئے۔ پروین نے آتے ہی سب سے پہلے غسل کیا۔ صاف کپڑے پہنے اور اپنے بستر میں بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"مجھے بھوک بالکل نہیں ہے۔ لیکن کافی پینے کو بہت جی چاہتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس وقت شاید ہی ہوٹل کی طرف سے کافی سپلائی ہو مگر میں کوشش کرتا ہوں۔ نہیں تو میں خود نیچے جا کر بنوا لاؤں گا۔"

میں نے اوپر سے فون کر کے کہا کہ میری بیوی کے سر میں شدید درد ہے۔ اگر آپ کافی بنا کر اوپر بھجوادیں تو بہت شکرگزار ہوں گا۔ فون پر سروس کلرک نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں ابھی کافی بھجوائے دیتا ہوں۔"

مین اور پروین باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں ملازم کافی لے کر آ گیا۔ یہ دو آدمیوں کی کافی تھی۔ میں نے پروین کو کافی بنا کر دی - ایک پیالی اپنے لئے بنائی۔ پروین نے کافی کا نیم گرم گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔

"کافی نے میری روح کی یادوں کو تازہ کر دیا ہے ایک لمحے کے لئے غور کرو کہ کہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا اور کہاں پہنچ گئے ہیں۔ کیسے کیسے خطرناک حالات سے نہیں گزرے۔ کیسی کیسی تکلیفیں اور اذیتیں ہم نے برداشت نہیں کیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرا انجام بخیر ہوا ہے۔ اور میں ایک مسلمان عورت کی حیثیت سے کلمہ پڑھ کر جان دوں گی۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تو تمہاری بہت عمر پڑی ہے ابھی تم ایسی باتیں نہ کرو۔"

پروین نے کافی کی پیالی تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم نہیں سمجھ سکو گے۔ یقین کرو میں عالم برزخ میں نہیں تھی کیونکہ میری مکمل موت واقع نہیں ہوئی تھی میں اس کرہ فلک کا نام نہیں جانتی۔ میں اسے چھوٹا عالم برزخ ہی کہوں گی۔ میں کہہ رہی تھی کہ جب سے میں نے اس چھوٹے عالم برزخ کی جھلک دیکھی ہے اور وہاں کچھ وقت گزارا ہے اس دنیا میں اب میرا جی نہیں لگتا۔ اگر انسان اس دنیا میں رہ کر برائی سے اپنے آپ کو بچائے رکھے۔ خدا کی یاد اپنے دل میں ہر وقت رکھے اور نیک کام کرے تو یقین کرو اوپر کی دنیا اور اس دنیا کی زندگی میں نیک

انسانوں کو خوشیاں اور لذتیں خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہیں اس دنیا کی لذتیں اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ میں یہ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میں اوپر کی دنیا کی ایک جھلک دیکھ آئی ہوں۔"

میں پروین کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ خواب میں ہی سہی' لیکن اس عالم بالا کی ایک ہلکی سی جھلک میں نے بھی دیکھ لی تھی۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کبھی کوئی برا کام نہیں کروں گا اور اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے رکھوں گا۔ کافی ختم ہو گئی تو پروین نے کہا۔

"اب مجھے نیند آ رہی ہے۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔"

میں اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ دیر تک بستر پر لیٹا گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرتا رہا۔ پھر مجھے بھی نیند آ گئی۔ دوسرے روز پروین نے کلکتے جانے کی تیاری شروع کر دی کہنے لگی۔

"میں سب سے پہلے کلکتے میں اپنے مکان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ ان گلیوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جہاں کھیل کود کر میں بڑی ہوئی - اس کے بعد میں کاکسز بازار کے جنگل میں سنتھالی سپیروں کے اڈے پر جا کر اس جھوٹے ناگ دیوتا کے مندر کو آگ لگانا چاہتی ہوں جہاں مجھے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔"

میں نے پروین کے پروگرام پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ یہ اس کی جذباتی خواہشات تھیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک سوچ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"میں جھوٹے ناگ دیوتا کے مندر کو تباہ کر کے اس برائی کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتی ہوں جہاں معصوم لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کی زندگیاں برباد کی جاتی ہیں۔"

میں نے ہوٹل ہی سے ریلوے انکوائری کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ کلکتے جانے والی گاڑی ہمیں کان پور سے ملے گی۔ ہمیں پہلے آگرہ سے کان پور جانا ہو گا۔ میں نے آگرے سے کان پور تک سیکنڈ کلاس میں دو سیٹیں بک کروا لیں۔ ہمارے پاس روپیہ پیسہ آ گیا تھا تو سامان بھی نمودار ہو گیا۔ یعنی میرے اور پروین کے نئے جوڑے وغیرہ۔

ں کے لئے ہمیں ایک اٹیچی کیس خریدنا پڑا۔ ہوٹل کا حساب وغیرہ صاف کر کے ہم ٹیچی کیس لے کر ٹیکسی میں سوار ہوئے اور آگرہ کے ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ کانپور انے والی گاڑی ہمیں دوپہر کے بعد ملی۔ اس گاڑی نے ہمیں رات کے پچھلے پہر کان پور پہنچایا۔ کلکتہ میل وہاں سے صبح روانہ ہوئی۔ سارا دن اور ساری رات سفر میں ہے۔ اگلے دن صبح گاڑی کلکتے کے دوسرے بڑے سٹیشن ہوڑہ پہنچ گئی۔

پروین نے اپنا اٹیچی کیس سٹیشن کے لاک روم میں رکھوا دیا۔ وہاں سے ہم پروین کے محلے میں آ گئے۔ پروین کے ماں باپ تو مدت ہوئی اپنا مکان چھوڑ کر کسی نامعلوم قام کی طرف جا چکے تھے۔ ان کے مکان میں کوئی اور بنگالی فیملی رہ رہی تھی۔ محلے کی ورتوں نے پروین کو پہچان لیا۔ وہ اسے مسلمانوں والے لباس شلوار قمیض میں دیکھ کر ی حیران ہوئیں۔ ایک بوڑھی بنگالی عورت نے اس سے پوچھا۔

"پاروتی! تم نے ساڑھی کیوں نہیں پہنی ہوئی؟"

پروین نے کہا۔

"دیدی! میں اب پاروتی نہیں ہوں۔ میرا نام پروین ہے۔ میں مسلمان ہو چکی وں۔"

یہ سن کر عورتیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ پھر وہ اپنے اپنے گھروں ں چلی گئیں۔ کسی نے پروین سے کوئی بات نہ کی۔ پروین نے مجھے کہا۔

"تم نے دیکھ لیا کہ ہندو لوگ مسلمانوں سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔ جب ک ان عورتوں کو میرے مسلمان ہونے کا علم نہیں تھا مجھ سے بڑی گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ جیسے ہی انہیں پتہ چلا کہ میں مسلمان ہو گئی ہوں تو مجھ سے اس طرح ور ہو گئیں جس طرح لوگ کوڑھیوں سے دور بھاگتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کا مجھے بھی بہت تجربہ ہو چکا ہے۔ ہندوؤں میں اچھے لوگ بھی ں۔ مگر وہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ ہندوؤں کی اکثریت یہاں کے سلمانوں سے نفرت کرتی ہے۔ ان کے اسی نفرت کے رویئے کی وجہ سے مسلمانوں کو

الگ ملک پاکستان بنانا پڑا۔"

ہم باتیں کرتے گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ یہ بنگالی ہندوؤں کا محلہ تھا۔ اپنے لباس سے صاف پہچانے جاتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ بنگالی ہندو ہمیں گھور گ کر دیکھ رہے تھے۔ ہم بڑے بازار میں آ گئے۔ یہاں ہم ایک ریستوران میں کافی بیٹھ گئے۔

میں نے پروین سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم اپنا اٹیچی کیس ریلوے سٹیشن کے لاک روم میں ہی ر دیتے ہیں۔ اور ان کپڑوں میں ہی کاکسز بازار کے جنگل والے سنتھالوں کے جو ناگ مندر میں چلتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

پروین نے کہا۔

"ایسا ہی کریں گے۔ مگر ہم کل صبح صبح یہاں سے چلیں گے۔ آج کا دن اور ر ہم آرام کرتے ہیں۔"

"تو پھر ہمیں کسی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑے گا۔"

"ٹھہر جائیں گے۔ ہمارے پاس پیسے موجود ہیں ضرورت پڑی تو سانپ کے ذر کسی اور مدفون خزانے میں سے کوئی ہیرا موتی منگوا لیں گے۔" پروین نے مسکرا ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔

"تو پھر ہم سٹیشن سے اٹیچی کیس نکلوا لیں گے۔"

ہم نے ایسا ہی کیا۔ کافی پینے کے بعد ہم ریستوران سے نکل کر سٹیشن پر گ وہاں سے اٹیچی کیس نکلوایا اور سٹیشن کے قریب ہی ایک درمیانے درجے کے ہو میں ڈبل بیڈ والا بڑا کمرہ لے لیا۔ رات آرام کیا۔ دوسرے روز صبح صبح ہم کاکسز با کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سارا علاقہ ہمارا دیکھا بھالا اور جانا پہچانا تھا۔ آگے سنتھ کے سپیروں کے جنگل کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا مگر پروین ایک ایک جھاڑی ا

ایک درخت سے واقف تھی۔ اس وقت آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ ہم جنگل میں پیدل ہی چلے جا رہے تھے۔ جنگلوں میں کئی کئی میل تک پیدل چلنا ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی ہم گھنٹہ آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد تھوڑی دیر بیٹھ کر آرام کر لیتے تھے۔ ہم نے کھانے پینے کی چیزیں ساتھ رکھ لی تھیں۔ میرے کاندھے سے پانی سے بھری ہوئی تھرمس لٹک رہی تھی۔ تھیلے میں کچھ برگر قسم کی فوڈ تھی۔ شام کے وقت ہم جنگل میں ایک جگہ کچھ کھانے پینے کے لئے بیٹھے تو پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد ہے۔ کبھی مجھے بھوک لگتی تھی تو میں تمہیں جنگل میں چھوڑ کر سانپ کی تلاش میں نکل جاتی تھی۔"

اس نے ایک ہاتھ کان سے لگا کر توبہ توبہ کہا اور بولی۔

"لگتا ہے وہ میری جنگلی زندگی کا زمانہ تھا۔ اب میں تہذیب کی روشنی میں آ گئی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی۔ اب مجھے سانپ دیکھ کر ایک سیکنڈ کے لئے بھی خیال نہیں آتا کہ اس سے اپنے آپ کو ڈسواؤں۔ یا اس کو کھا جاؤں۔ اللہ مجھے معاف کرے۔"

جب شام کا اندھیرا تھوڑا گہرا ہو گیا تو پروین نے جنگل کے سامنے والے درختوں کی طرف غور سے دیکھا۔

"ان درختوں کے پیچھے ایک ٹیلہ ہے۔ اس ٹیلے کے دامن میں چھوٹے ناگ دیوتا کا مندر ہے جہاں سنتھالی سپیروں کا اڈہ ہے۔ یہ سارے کے سارے بردہ فروش اور بدکار آدمی ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتی۔ خدا کرے کہ یہ سارے بدمعاش ڈیرے پر موجود ہوں۔"

درختوں سے نکلنے کے بعد جب ہم سامنے والے ٹیلے کی طرف بڑھے تو پروین رک گئی۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے پروین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اس شیرنی کی آنکھوں کی چمک دکھائی دی جس نے اپنے شکار کی بو سونگھ لی

ہو۔ اس وقت مجھے پروین پہلے والی پاروتی معلوم ہوئی۔ وہ سامنے والے ٹیلے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ہم سنتھالی سپیروں کے علاقے میں داخل ہو گئے ہیں۔ آگے اونچی آواز میں بات نہ کرنا۔ کھانسنا بھی نہیں۔ میرے پیچھے پیچھے دبے پاؤں چلنا۔ آؤ۔"

وہ میرے آگے آگے جھاڑیوں میں چل پڑی۔ اس نے اپنا دوپٹہ سر کے گرد باندھ لیا تھا۔ کیونکہ کاندھے پر پڑے پڑے وہ جھاڑیوں میں الجھ رہا تھا۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ یہ سنتھال کے بدمعاش سپیروں کا کس طرح مقابلہ کرے گی۔ نہ اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا نہ میرے پاس ہی کوئی ہتھیار تھا۔ کلکتے سے چلتے وقت میں نے اسے کہا تھا کہ ہم کوئی خنجر خرید کر ساتھ رکھ لیتے ہیں جس پر پروین نے جواب دیا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں کی آنکھیں جنگلوں کے اندھیرے کی عادی تھیں۔ ہم نے نہ جانے کتنی تاریک راتیں ان جنگلوں کی دربدری میں گزار دی تھیں۔ ہم ٹیلے کے نشیب میں پہنچ گئے تھے۔ درخت اتنے ساتھ ساتھ کھڑے تھے کہ انہوں نے ایک دیوار بنا دی تھی۔

ایک بہت بڑے درخت کے پاس جا کر پروین رک گئی۔ اندھیرے میں مجھے اس کا سایہ نما خاکہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ بیٹھ گئی۔ اور ہاتھ سے مجھے بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا۔ درخت کا تنا بہت بڑے ستون کی طرح تھا۔ بیٹھتے ہی مجھے درخت کے پیچھے کچھ فاصلے پر روشنی جھلملاتی نظر پڑی۔ پروین نے میرے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔

"یہی ناگ دیوتا کا استھان ہے۔ ہمیں رینگ کر وہاں جانا ہو گا۔"

ہم گھاس اور جھاڑیوں میں احتیاط سے رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ روشنی قریب ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ مٹی کے تیل کا ایک بڑا لیمپ ہے جو درخت کے تنے میں بنے ہوئے ناگ دیوتا کے بت کے آگے جل رہا ہے۔ اس کے اردگرد کچھ آدمی زمین پر لیٹے گہری نیند سو رہے تھے۔ پروین نے منہ میرے قریب لا کر سرگوشی کی۔

"یہ سنتھالی بدمعاش پجاری سو رہے ہیں۔ میں انہیں جہنم کی آگ میں دھکیلنے جا رہی ہوں۔"

پروین نے اتنا کہہ کر دو تین گہری سانسیں لیں۔ دوسرے لمحے وہ سانپ بن گئی۔ یہ وہی نیلا سانپ تھا جس کے ٹکڑے میں رومال میں ڈال کر کیلاش پربت لے گیا تھا۔ سانپ نے پھن کھول کر میری طرف، ایک نگاہ ڈال کر دیکھا گویا کہہ رہا ہو کہ تم اسی جگہ لیٹے رہو۔ نیلا سانپ اندھیرے میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اپنی نگاہیں مٹی کے تیل کے لیمپ کے آس پاس جما دیں۔ جہاں سنتھالی سپیرے گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے انہیں گنا وہ کل پانچ تھے۔ جنگل میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

یہ سناٹا نیلے سانپ کے جانے کے بعد مجھے زیادہ خوفناک اور پراسرار ہوتا محسوس ہوا۔ پھر اچانک سویا ہوا ایک سپیرا اپنا آدھا دھڑ اوپر اٹھا کر بیٹھ گیا۔ اس کا منہ ایسے کھل گیا جیسے کچھ کہنے یا چلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ بے جان ہو کر پیچھے کو گر پڑا۔ اسی طرح دوسرا سپیرا بھی اٹھا اور کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہوئے وہیں لڑھک گیا۔ عجیب بات تھی کہ سویا ہوا سپیرا اٹھ کر بیٹھتا۔ منہ کھولتا۔ اس کی آواز نہ آتی اور وہ پیچھے کو پچھاڑ کھا کر گر پڑتا اور پھر ساکت ہو جاتا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پروین سانپ کے روپ میں انہیں کچھ ایسے طریقے سے ڈس رہی ہے کہ سب سے پہلے ان کی آواز بند ہو جاتی تھی اور آدھا دھڑ مردہ ہو جاتا تھا۔ بعد میں پروین نے مجھے بتایا کہ ان خطرناک سنتھالی سپیروں کو سانپ کے زہر سے مارنا آسان نہیں تھا۔ یہ لوگ سانپ کے ڈستے ہی ایک ایسا منتر پڑھ کر پھونک دیتے تھے کہ نہ صرف ان کے بدن پر سانپ کے زہر کا اثر ختم ہو جاتا تھا بلکہ جس سانپ نے انہیں ڈسا ہوتا تھا وہ بھی جل کر راکھ ہو جاتا تھا۔ اس لئے پروین انہیں ان کی گردن کی ایک خاص رگ پر ڈس کر زہر داخل کر دیتی کہ سب سے پہلے ان کی آواز بند ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ نچلے دھڑ کو ڈستی اور یوں ایک ایک کر کے پانچوں کے پانچوں بدکردار سپیرے میری آنکھوں کے سامنے اپنا دھڑ اوپر اٹھا اٹھا کر منہ کھول کر بولنے کی ناکام

کوشش کرتے کرتے مرگئے۔ جب پانچواں سپیرا بھی سانپ کے زہر سے مرگیا تو پروین انسانی شکل میں چل کر میرے پاس آئی اور بولی۔

"اب ہمیں کسی سے چھپنے کی ضرورت نہیں ہے میں نے تمام سپیروں کو اپنے زہر سے ہلاک کر دیا ہے۔ اب میرے ساتھ آؤ اور ان بدکردار ظالم سپیروں کو جہنم کی آگ میں جلتے دیکھو۔"

ہم آہستہ آہستہ چل کر اس درخت کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے جس کے تنے میں سانپ دیوتا کا بت لگا ہوا تھا اور جس کے سامنے پانچوں سپیروں کی لاشیں پڑی تھیں۔ پروین نے ایک سپیرے کی لاش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ وہ سپیرا ہے جس نے مجھے کلکتے میرے گھر سے اغوا کیا تھا۔ اب ان کا انجام دیکھو۔"

لیمپ کی روشنی میں مجھے سپیروں کی لاشوں میں سے ہلکے ہلکے بخارات اٹھتے نظر آنے لگے۔ پروین نے کہا۔

"میرے زہر نے ان کے اندر کے دوزخ کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ان کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون جم گیا ہے اور اب اپنے ہی گناہوں کی آگ میں سرخ ہو کر ان کے جسم کو جلانے لگا ہے۔"

پروین نے درخت کے تنے میں نصب ناگ دیوتا کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کل تک میں گناہوں کی دلدل میں ڈوبی ہوئی تھی اور تیری پوجا کرتی تھی۔ آج میں سچائی کی روشنی میں ہوں اور تجھے جہنم میں پھینکنے لگی ہوں۔"

یہ کہہ کر پروین نے سانس اندر کو کھینچ کر منہ سے پھنکار کی آواز نکالی۔ میں نے پہلی بار اس کے منہ سے پھنکار کے ساتھ آگ کی چنگاریاں نکلتے ہوئے دیکھیں۔ ان چنگاریوں میں اس قدر تپش اور زبردست آتش گیر مادہ تھا کہ جیسے ہی چنگاریاں درخت پر پڑیں درخت نے آگ پکڑ لی۔ ایک دھماکے کے ساتھ درخت آگ کے شعلوں کا ایک ستون بن گیا اور اس آگ میں جھوٹا ناگ دیوتا بھی جل کر بھسم ہونے لگا۔ دوسری

پھنکار پروین نے پانچوں بدکردار سپیروں کی لاشوں پر پھینکی۔ پھنکار کی چنگاریاں سپیروں کی سبز اور سیاہ ہوتی لحہ بہ لحہ پگھلتی اور اپنی ہی آگ کے انگاروں میں جلتی لاشوں پر گریں تو وہ بھی ایک دھماکے سے آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہاں اب آگ ہی آگ تھی۔ شعلے ہی شعلے تھے۔ پروین نے مجھے بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے نکل آؤ۔"

ہم وہاں سے واپس دوڑ پڑے۔ آگ کے شعلے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ واقعی جہنم کی آگ معلوم ہوتی تھی کہ اس کے شعلے بلند سے بلندتر ہو رہے تھے اور جنگل میں چاروں طرف بڑھتے ہوئے سپیروں کے چھوٹے بڑے بتوں اور مندر کو بھسم کرتے جا رہے تھے۔

جنگل کی اندھیری رات میں ہم دونوں کافی دور تک واپس دوڑتے چلے گئے۔

پروین کی پھنکاروں نے ناگ مندر کے ارد گرد ایسی بھیانک آگ لگا دی تھی کہ اس نے ارد گرد کے سارے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ہم ایک ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ اس کے پل پر سے ندی پار کی اور دوسرے کنارے پر تھک کر بیٹھ گئے۔ میں بہت زیادہ تھک گیا تھا جبکہ پروین اتنی زیادہ نہیں تھکی تھی۔ ہم پلٹ کر دور جنگل کی آگ کے شعلوں کو دیکھنے لگے۔ پروین نے کہا۔

"یہ آگ کافروں کے تمام مندروں اور ان کے مکار جھوٹے پجاریوں کو جب تک بھسم نہیں کرے گی، بجھے گی نہیں۔"

آگ کے لہراتے ہوئے آسمان کی طرف بلند ہوتے شعلوں نے جنگل کی رات کو روشن کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر ہم ندی کے پاس بیٹھے آگ کو دیکھتے رہے۔ پھر جنگل میں اس راستے پر چل پڑے جو کاکسز بازار کے سمندری ساحل کی طرف جاتا تھا۔ رات کا باقی کا حصہ ہم نے ایک کھاڑی کے پاس گھنے درختوں کے نیچے ایک چٹان کی کھوہ میں بسر کیا۔ دوسرے دن سورج نکلا تو ہم کاکسز بازار کی طرف روانہ ہوگئے۔ پروین بڑی خوش تھی کہ اس نے سنتھال کے بدکردار سپیروں اور ناگ دیوتا کے مکار پجاریوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ان سے اپنا بدلہ ہی نہیں چکا دیا بلکہ آئندہ کے لئے برائی کی جڑ کو ہی کاٹ دیا ہے۔

ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ ہم کاکسز بازار پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم واپس کلکتے آ گئے۔ ایک دن اور ایک رات کلکتے کے ہوٹل میں آرام کیا۔ میں نے پروین سے پوچھا کہ اب جبکہ اس نے اپنے ماں باپ کے پرانے گھر کو دیکھ لیا ہے اور سنتھالی سپیروں سے اپنے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا انتقام بھی لے لیا ہے تو اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں اس نے کیا سوچا ہے۔ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو؟"

میں نے کہا "یہ تمہاری اپنی زندگی کا معاملہ ہے۔ اپنی زندگی جس طرح اور جہاں چاہو بسر کر سکتی ہو۔"

پروین کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ کہنے لگی۔

"میرا ہندوستان میں رہنے کو بالکل جی نہیں چاہتا۔ یہاں قدم قدم پر کفر کا رواج ہے۔ یہ بت پرستوں، توہم پرستوں اور مسلمانوں سے نفرت کرنے والے ہندوؤں کا ملک ہے۔ وہاں ایک خدا ایک رسول ﷺ اور ایک کتاب کو ماننے والے رہتے ہیں۔ ویسے بھی اب ہندوستان میں اب میرا کوئی نہیں ہے۔ ماں باپ خدا جانے کہاں غائب ہو چکے ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا نہیں - مجھے کچھ معلوم نہیں۔ کوئی عزیز رشتہ دار بھی نہیں ہے۔ یہاں کے ہندوؤں کو جب معلوم ہوگا کہ میں ہندو تھی اور اب مسلمان ہو گئی ہوں تو مجھ سے نفرت کریں گے۔ میرا جینا حرام کر دیں گے۔ مجھے نہ سکون سے زندہ رہنے دیں گے اور نہ چین سے مرنے دیں گے۔

میں نے خوش ہو کر کہا "تم میرے ساتھ پاکستان چلی چلو گی تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ میں وہاں تمہیں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملاؤں گا۔ وہ تمہیں مل کر بڑے خوش ہونگے۔"

پروین کہنے لگی "میں اگر تمہارے ساتھ پاکستان گئی تو صرف ایک شرط پر جاؤں گی کہ تم نہ تو مجھے اپنے گھر لے کر جاؤ گے اور نہ ہی اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے

ملاؤ گے۔

وہ کیوں ”میں نے تعجب سے پوچھا۔

پروین نے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”تم اس بات کو نہیں سمجھ سکو گے۔ بہرحال میں ابھی اس مسئلے پر تھوڑا اور غور و فکر کرنا چاہتی ہوں - مجھے آج رات سوچ لینے دو - کل تمہیں اپنا آخری فیصلہ بتادوں گی۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ اگر میں پاکستان گئی تو نہ تم اپنے گھروالوں کو میرے بارے میں کچھ بتاؤ گے اور نہ میں ان سے ملاقات کروں گی۔ میں پاکستان کے کسی بھی شہر میں اکیلی رہ لوں گی۔ میں نے ایف ایس سی کی ہوئی ہے - میں کسی ہسپتال میں نرس بن کر بیماروں کی خدمت کروں گی اور ہسپتال کے نرسز کوارٹر میں ہی رہائش اختیار کرلوں گی۔“

میں نے اس بات کو مزید آگے نہ بڑھایا۔ وہ دن اور رات بھی گزر گئے۔ اس کے اگلے دن پروین میرے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی - بولی۔

”میں نے فیصلہ کرلیا ہے - میں تمہارے پاکستان ساتھ جاؤں گی۔ وہاں کسی شہر میں نرسنگ ٹریننگ کا کورس کروں گی اور باقی زندگی پاکستان میں رہ کر بیماروں کی خدمت کرتے ہوئے گزار دوں گی۔ اب یہی میری زندگی کا نصب العین ہے۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟؟“

پروین نے میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا ”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے تو خوشی ہوگی کہ میرے وطن پاکستان کو ایک اچھی نرس مل جائے گی۔“

پاکستان کا قیام عمل میں آئے اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ دونوں ملکوں یعنی بھارت اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ سرحدوں میں دونوں جانب باؤنڈری فورس کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا۔ کوئی آدمی خاص پرمٹ کے بغیر سرحد پار نہیں کرسکتا تھا۔

کلکتے سے مشرقی پاکستان زیادہ قریب تھا۔ پروین کا خیال تھا کہ ہم کلکتے سے مشرقی

پاکستان جائیں گے۔ وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز یا بحری جہاز پاکستان چلے جائیں گے۔ ہم نے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ کلکتہ میں ابھی پاکستان کا ہائی کمیشن کا آفس قائم نہیں ہوا۔ ہمیں اس کے لئے دلی جانا ہوگا۔ جہاں پاکستان کا ہائی کمیشن کام کرنے لگا تھا۔ پروین کہنے لگی۔

”تم پاکستان کے شہری ہو۔ پاکستان کے رہنے والے ہو۔ تمہیں کوئی پرمٹ لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم مغربی بنگال سے بارڈر پار کرکے مشرقی پاکستان میں آسانی سے داخل ہو سکتے ہیں۔ یہاں بارڈر پر ابھی کسی قسم کی سختی نہیں ہے۔ مہاجرین ابھی تک ادھر سے ادھر آ جا رہے ہیں۔ میں بھی مہاجر ہوں اور ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان میں آباد ہونا چاہتی ہوں۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

پروین بنگال کی رہنے والی تھی۔ بنگلہ زبان اس کی مادری زبان تھی۔ مغربی بنگال کے سارے سرحدی علاقے سے وہ واقف تھی۔ چنانچہ ہم نے مشرقی پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہمارے پاس انڈین کرنسی تھی۔ ہم نے ہوٹل میں ہی ایک ایجنٹ سے اس کے عوض پاکستانی کرنسی بدلوا لی۔ یہ کل سوا چھ ہزار روپے تھے۔ جو اس وقت اچھی خاصی رقم ہوا کرتی تھی۔ پروین نے کہا۔

”ہم ہلی کے مقام سے باڈر کراس کرکے مشرقی پاکستان میں داخل ہونگے۔“

اس نے ہوٹل کے بنگالی مینیجر سے ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ہم ٹرین کے ذریعے ہلی پہنچے - وہاں مسلمان مہاجروں کا ایک چھوٹا سا قافلہ مغربی بنگال سے ہجرت کرکے مشرقی پاکستان جارہا تھا۔ ہم بھی اس قافلے کے ساتھ ہوگئے۔ باڈر پر پاکستانی فوج موجود تھی مگر وہ ضروری چیکنگ کے بعد مہاجرین کو جانے کی اجازت دے دیتی تھی۔ ہماری بھی چیکنگ ہوئی۔ میں نے پروین کو اپنی بیوی ظاہر کیا۔ اور اپنے بارے میں بتایا کہ میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ کلکتے میں نوکری کرتا تھا۔ وہیں پروین سے شادی کی - اور اب مشرقی پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ ہمارے عارضی پرمٹ بنائے گئے۔ اور ہم مشرقی پاکستان کی سرزمین میں داخل ہوگئے۔

ہلی سے ہمیں ڈھاکے جانا تھا۔ راستے میں ایک مقام پر دریا کا نیا پل بن رہا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ٹرین سے ایک جگہ اتر کر کشتی میں دوسرے مہاجرین کے ساتھ دریا پار کیا۔ دوسری جانب ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ ایک دن اور ایک رات ٹرین میں سفر کرنے کے بعد ہم ڈھاکہ پہنچ گئے۔ ڈھاکہ میں ہم ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ ہم نے اپنے آپ کو میاں بیوی ظاہر کیا تھا۔ ہمیں مجبوراً ایک ہی کمرہ لینا پڑا۔ جس میں ڈرائینگ روم اور بیڈ روم ایک ہی کمرے میں تھا۔ میں نے ابھی تک مشرقی پاکستان نہیں دیکھا تھا۔ پروین سکول کے زمانے میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ ڈھاکہ آچکی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔

"میں ڈھاکہ شہر کی سیر کرنا چاہتا ہوں - ایسا کرتے ہیں ہم ہوائی جہاز پر کراچی کے لئے اپنی نشستیں ریزرو کروا دیتے ہیں۔ ہمیں ایک دو دن ضرور مل جائیں گے۔ اس دوران ہم شہر کی سیر کرلیں گے۔"

پروین نے کہا۔"چلو پہلے ایئرلائنز کے آفس جاکر جہاز میں سیٹیں بک کراتے ہیں۔"

اس زمانے میں پی آئی اے کی جگہ اورینٹ ائیرویز کے جہاز ڈھاکہ سے کراچی جایا کرتے تھے۔ ہم اورینٹ ائیرویز کے آفس گئے جو ڈھاکہ ائیرپورٹ کے پاس ہی تھا۔ ہمیں تین دن بعد کی فلائٹ میں جگہ مل گئی۔ میں بڑا خوش ہوا۔ اس طرح مجھے ڈھاکہ کی سیر کا موقع مل گیا تھا۔ ہم ہوٹل میں آگئے۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ پروین کہنے لگی۔

"ہم کل شہر کی سیر کرنے نکلیں گے۔ ابھی تھوڑی دیر میں رات ہو جائے گی۔"

رات کو میں نے پروین کو پلنگ پر سلایا اور خود صوفے پر سو گیا۔ کمرے کی ایک بتی میں نے روشن رہنے دی تھی۔ کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد پروین سو گئی۔ میں صوفے پر لیٹا کچھ دیر ڈھاکہ کے اردو اخبار کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر میں نے بھی اخبار ایک طرف رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں ابھی غنودگی کے عالم میں تھا کہ

ے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی شے صوفے کی پشت کے اوپر سے گزر رہی ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

دیوار پر لگی بتی جل رہی تھی۔ میں نے بجلی کی روشنی میں ایک سبز رنگ کے سانپ کو دیکھا جو صوفے کے اوپر سے رینگتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں جلدی سے صوفے پر سے اچھل کر قالین پر آگیا۔ سانپ بھی وہیں رک گیا۔ اس نے گردن غالی پھر اپنا پھن کھولا اور پھنکارنے لگا۔ میری جیب میں پروین کا رومال نہیں تھا۔ میں نے پروین کو آواز دے کر جگا دیا۔

"کیا ہوا؟"

پروین پلنگ پر اٹھ بیٹھی۔ اب اس نے بھی سانپ کو دیکھ لیا تھا۔ سبز سانپ نے پنی گردن اور اوپر اٹھالی اور اپنے پھن کو دائیں بائیں لہراتے ہوئے آگے کو جھکا دیا۔ پروین پلنگ پر سے اتر کر صوفے کے پاس آئی۔ اس نے سانپ کو اٹھالیا اور اس کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔

"یہ بنگال کا دریائی سانپ ہے۔"

پروین کے ہاتھ میں سانپ بالکل نیم مردہ سا ہو کر لٹکنے لگا تھا۔ پروین نے اس کی گردن پکڑ کر اوپر کرلی۔ اور پھر اس سے ہلکی ہلکی سسکاریوں میں باتیں کرنے لگی۔ جس طرح کہ وہ عام طور پر سانپوں سے باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کے بعد پروین نے سانپ کو اپنی کلائی کے گرد لپیٹا۔ میرے پاس صوفے پر آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"لگتا ہے بنگال کے سپیروں کو میرے آنے کا پتہ چل گیا ہے - انہوں نے اس سانپ کو میری سراغ رسانی کے لئے یہاں بھیجا ہے۔"

میں نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے یہاں ایک نئی مصیبت ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اس سانپ کو واپس مت جانے دینا۔ اسے یہیں ختم کر ڈالتے ہیں۔ یہ واپس جاکر ہمارے دشمن سپیروں کو ہمارا ٹھکانہ بتا دے گا۔"

پروین نے سانپ کی طرف دیکھا۔ اس سے مسکرا کر کوئی بات کی۔ پھر میری طرف

پلٹ کر کہا۔ "فکر نہ کرو' یہ سانپ واپس جاکر پدم سپیروں کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔"

میں نے کہا "سانپ کا کیا بھروسہ ہے۔"

پروین بولی یہ میرا مطیع ہے - میں نے اسے حکم دیا ہے کہ جس سپیرے نے اسے میری تلاش میں یہاں بھیجا ہے۔ اسے واپس جاکر میرے بارے میں کچھ نہ بتائے۔ گھبراؤ نہیں - سانپ میرا حکم مانتے ہیں۔"

"تو کیا ہم ساری رات اس سانپ کو اپنے کمرے میں رکھیں گے؟؟"

پروین نے آگے بڑھ کر کمرے کی کھڑکی کھولی اور سانپ کو دوسری طرف گلی میں گرادیا۔ کھڑکی بند کر کے پلنگ پر آگئی اور مجھے کہا۔

"بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ سانپ واپس سپیروں کے پاس جانے کی بجائے دریا کی طرف چلا جائے گا۔ جہاں وہ رہتا ہے۔"

باقی رات میں نے بڑی مشکل سے گزاری۔ پروین تو مزے سے سو گئی۔ مگر میری آنکھ بار بار کھل جاتی۔ ایسے محسوس ہوتا کہ سبز سانپ کمرے میں رینگ رہا ہے۔

دوسرے دن ہم ڈھاکہ شہر کی سیر کو نکل گئے۔ دوپہر تک شہر کے بازاروں' باغات اور دریائے بوڑھی گنگا کی سیر کرتے رہے۔ دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا اور سورج غروب ہونے سے پہلے گھاٹ پر جاکر کشتی لی اور دریا کے دوسرے کنارے کی طرف دریا کے اوپر کی جانب نکل گئے۔ کافی آگے جاکر ہم نے کشتی چھوڑ دی اور کنارے کے درختوں کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ ایک چھوٹا سا راستہ پٹ سن کے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا آگے اونچے اونچے تاڑ اور ناریل کے درختوں کی طرف نکل گیا تھا۔ ہم اتر کر اس راستے پر چلتے ہوئے ناریل کے جھنڈوں میں آگئے۔ ہم پھر یہاں سے بھی آگے چلے گئے۔

آگے کسی کارخانے کا بہت بڑا گودام تھا۔ آس پاس چند ایک جھونپڑیاں تھیں۔ کچھ عورتیں مرد اور بچے جھونپڑیوں کے پاس بیٹھے تھے۔ ایک کھوکھا تھا جہاں چائے پک

رہی تھی۔ ہم نے وہاں چائے پی اور واپس دریا کی طرف چلنے لگے تو ایک سیاہ رنگ کی ہڈیوں کی ڈھانچہ عورت ہاتھ باندھ کر ہمارے راستہ میں کھڑی ہوگئی اور بنگلہ زبان میں تیز تیز بولنے لگی۔ پروین اس سے بنگلہ میں باتیں کرنے لگی۔ پھر پروین نے اپنے پرس میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس عورت کو دیا۔ عورت نے آگے بڑھ کر پروین کا ماتھا چوم لیا۔ اس کے بعد ہم وہاں سے واپس دریا پر آگئے۔ یہاں سے کشتی پر بیٹھے اور دریا پار بوڑھی گنگا کے دوسرے کنارے پر اتر گئے۔ یہاں سبزیوں اور پھلوں کی منڈی تھی۔ شام کے وقت بھی وہاں کاروبار ہو رہا تھا۔ ہم نے کچھ کیلے خریدے اور سائیکل رکشہ لے کر واپس اپنے ہوٹل میں چلے آئے۔

رات کو ہم نے اکٹھے کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے دوران بھی پروین بار بار اپنے ماتھے کو بائیں ہاتھ سے سہلاتی رہی۔ میں نے پوچھا۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے پروین۔ کیا سر درد کر رہا ہے؟؟"

وہ بولی نہیں' جہاں اس بھکاری عورت نے میرے ماتھے کو چوما تھا وہاں جلن سی ہونے لگی ہے۔"

میں نے پروین کے ماتھے کو غور سے دیکھا۔ ماتھے پر ایک طرف جلد نیلی پڑ رہی تھی۔ پروین کا رنگ گہرا سانولا بلکہ کالا تھا۔ اور نیل کا نشان بجلی کی روشنی میں صاف نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اسے نہ بتایا کہ ماتھے پر نیل کا نشان پڑ گیا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ غسل خانے میں گئی۔ آئینے میں اس نے اپنے ماتھے کو دیکھا۔ باہر آئی تو بولی۔ "وہ عورت بھکارن نہیں تھی۔" میں چونک سا گیا۔

"تو پھر وہ کون تھی؟؟"

پروین صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہمیں پرسوں کی بجائے کل کی فلائیٹ میں جگہ مل سکتی ہے؟؟"

"آخر بات کیا ہوئی ہے؟؟" میں نے پوچھا

پروین نے کہا "پہلے تم ایئر لائنز کے آفس میں فون کر کے پوچھو۔ اگر کل صبح کی یا

آج رات کی فلائیٹ میں بھی جگہ مل جائے۔ تو ہم یہاں سے کراچی پرواز کر جائیں گے۔"

مجھے معلوم تھا کہ پروین جب کبھی اس قسم کی ہدایت کرتی ہے تو اس کے پیچھے کوئی گہری بات ہوتی ہے۔ میں نے کہا "میں نیچے جاکر فون کرتا ہوں۔"

میں پروین کو اپنا ماتھا سہلاتا چھوڑ کر نیچے ہوٹل کے مینیجر کے کاؤنٹر پر آگیا۔ میں نے اورینٹ ایئرلائنز کے آفس فون کر کے اپنا نام پروین کا نام اور پرسوں کی فلائٹ میں اپنے سیٹ نمبر بتائے اور کہا۔

"ہمیں ایک ایمرجنسی آن پڑی ہے۔ ہمارا جلد سے جلد کراچی پہنچنا ضروری ہو گیا ہے۔ کیا ہمیں آج رات بارہ بجے کی یا کل صبح کی فلائٹ میں دو سیٹیں مل سکتی ہیں؟"

دوسری طرف سے ریزرویشن کلرک نے کہا "آپ تھوڑا ہولڈ کریں۔"

کوئی ایک منٹ کے بعد ریزرویشن آفیسر کی آواز آئی۔

"آج رات ایک بجے کی فلائیٹ میں دو سیٹیں آپ کو چانس پر مل سکتی ہیں۔ ہم آپ کی ریزرویشن کنفرم نہیں کر سکتے۔ آپ ایئرپورٹ پر آجائیں۔ جن لوگوں کی ریزرویشن ہو چکی ہے۔ اگر وہ آگئے تو آپ کو جہاز سے اترنا پڑے گا۔"

میں نے اوپر آکر پروین کو ساری بات بتادی۔ وہ بولی میں یہ چانس لینے کے لئے تیار ہوں۔"

میں نے کہا "آخر ایسی کونسی بات ہو گئی ہے۔ تم مجھے بتاتی کیوں نہیں وہ بھکارن کون تھی۔ کیا وہ کوئی جادوگرنی تھی؟"

پروین نے ماتھے پر پٹی باندھ لی اور کہنے لگی۔"

"کپڑے وغیرہ اٹیچی کیس میں رکھ لو۔ ہم گیارہ بجے رات یہاں سے ایئرپورٹ چل دیں گے۔"

اس وقت ابھی رات کے نو ہی بجے تھے۔ ہم نے اپنے تھوڑے بہت کپڑے جو ہمارے پاس تھے اٹیچی کیس میں بند کردیئے۔ میں نیچے چلا آیا۔ ہوٹل والوں کو بلوں کی

ادائیگی کی اور کہا کہ ہمیں اچانک ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ ہم رات کی فلائٹ سے کراچی جارہے ہیں۔ ہوٹل سے باہر آکر ہم نے ٹیکسی لی۔ اور سیدھا ایئرپورٹ آگئے۔ یہاں ایئرلائینز کا ذیلی افس کاؤنٹر کی شکل میں موجود تھا۔ انہیں اپنے ٹکٹ دکھائے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم آپ کی ریزرویشن کنفرم نہیں کرسکتے۔ جن لوگوں کی یہ سیٹیں ہیں ان لوگوں کی بھی کنفریشن نہیں ہوئی۔ لیکن اگر وہ عین وقت پر آگئے تو آپ کو واپس جاناہوگا۔ ہم نے چانس لے لیا اور اور لاؤنج کے باہر ہال میں آکر بیٹھ گئے۔ پروین تھوڑی تھوڑی دیر بعد ماحول کا جائزہ لے لیتی تھی۔ جیسے اسے ابھی تک فضا میں خطرہ محسوس ہو رہا ہو۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہماری فلائیٹ کنفرم ہو گئی۔ ہم نے بورڈنگ کارڈ لئے اور لاؤنج میں آگئے۔ میں نے پروین سے کہا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں مطمئن ہوجانا چاہئے۔ یہاں کوئی سانپ ہماری سراغ رسانی کے لئے یہاں نہیں آئے گا۔"

پروین نے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا جائزہ لیا اور بولی۔

"جب تک جہاز ڈھاکے سے ٹیک آف نہیں کرجاتا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم بنگال کے سپیروں کے جادو طلسم سے واقف نہیں ہو۔"

لیکن جہاز ٹیک آف کر گیا اور کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آیا۔ جب طیارہ ڈھاکہ کے اوپر رات کے اندھیرے میں چکر لگا کر کراچی کی طرف روانہ ہوا تو پروین نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے پروین نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر ایسا اطمینان تھا جیسے اس کے سر پر سے کسی نے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہو۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

"مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں ماضی کی دلدل میں سے نکل کر ایک پاک صاف نئی زندگی کا آغاز کر رہی ہوں۔"

کراچی ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد مجھے بھی یوں محسوس ہوا جیسے میں دشمنوں کے

ملک سے نکل کر اپنے گھر کی سرزمین پر آگیا ہوں۔ یہ میرے نئے آزاد وطن پاکستان کی سرزمین تھی۔ پروین بڑی خوش تھی۔ کراچی سے ہم نے دوسری فلائیٹ لی اور لاہور آگئے۔ پروین سے کئے گئے وعدے کے مطابق میں اسے لے کر اپنے گھر جانے کی بجائے ایئرپورٹ سے سیدھا ایک ہوٹل میں آگیا۔ یہاں پروین کے لئے ایک کمرہ لے لیا۔ اسے ہوٹل میں چھوڑ کر میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد میں اپنے گھر جارہا تھا۔ میرے ماں باپ اور بہن بھائی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پھر سب کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔ سب نے مجھے گلے لگایا۔ والد صاحب نے دبی زبان میں میری آوارہ گردیوں کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا۔ میں نے آئندہ کبھی گھر سے نہ بھاگنے کا انہیں یقین دلایا اور معافی مانگی۔ پروین کا ذکر میں نے کسی سے نہ کیا۔ رات کو میں پروین کے پاس اس کے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ ایک ہفتہ پروین ہوٹل میں رہی - اس دوران میں نے کوشش کر کے اسے ایک نیم سرکاری ہسپتال میں بطور نرس بھرتی کرادیا۔ اسکی ٹریننگ کا کورس شروع ہوگیا۔ اسے ہسپتال سٹاف ہاسٹل میں ایک کمرہ مل گیا۔ یوں پروین نے پاکستان کے شہرلاہور میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کردیا۔

وہ بڑی محنتی اور لائق لڑکی ثابت ہوئی۔ ٹریننگ ختم ہونے کے بعد وہ ہسپتال میں بطور نرس کام کرنے لگی۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اب آزاد اسلامی ملک پاکستان ہی اس کا وطن ہے اور وہ پاکستان میں ایک نیک اور خدمت گزار زندگی بسر کرنے کی خواہش مند ہے۔ہسپتال میں پروین کی دن کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ میں ہر روز پروین سے ملنے نہیں جاتا تھا۔ اس نے خود مجھے منع کر رکھا تھا۔ ہم دوسرے تیسرے دن ایک دوسرے سے ملتے - ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد وہ کافی ہاؤس میں آ جاتی۔ میں پہلے سے وہاں اس کا انتظار کر رہا ہوتا تھا۔ ہم دونوں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کافی ہاؤس کی گیلری میں بیٹھے باتیں کرتے کافی پیتے اور پھر پروین اپنے ہوسٹل کی طرف چلی جاتی تھی اور میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا تھا۔

ایک دن شام کو میں اور پروین کافی ہاؤس میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ میں نے

جذبات میں آکر اپنے دل کی بات بے اختیار کہہ دی۔ میں نے کہا۔

"پروین! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

پروین میری طرف دیکھ کر تھوڑا شرما گئی۔ پھر مسکرا کر کہنے لگی۔

"اگر میں تمہاری دشمن ہوتی یا تم میرے دشمن ہوتے تو میں تم سے ضرور شادی کر لیتی۔"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔"

پروین نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

تقدیر نے مجھے عورت سے ناگن بنا دیا ہے میں جس سے شادی کروں گی وہ شادی کی پہلی رات کو ہی مر جائے گا۔ اب بتاؤ میں تم سے کیسے شادی کر سکتی ہوں؟"

پروین کے اس انکشاف پر میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ سانپوں اور ان کے جس زہریلے عمل سے وہ گزر چکی تھی اس کے نتیجے میں وہ ایک انتہائی زہریلی عورت بن چکی تھی۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی کو کاٹ دے تو وہ آدمی مر جاتا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک آدمی اس سے شادی کے بعد زندہ رہ سکتا۔

پروین کہنے لگی۔

"آج میں تم پر اپنے دل کا حال ظاہر کرتی ہوں۔ میرے سینے میں عورت کا دل ہے۔ اس دل میں بھی محبت کے جذبات ہیں۔ جب تم پہلی بار مجھے سنتھالی سپیروں کے جنگلوں میں ملے تھے تو تم مجھے بڑے اچھے لگے تھے۔ پھر ایک عرصہ ہم نے اکٹھے بسر کیا۔ تمہاری بہادری اور شرافت نے مجھے تمہارا گرویدہ بنا دیا۔ آہستہ آہستہ میں تم سے محبت کرنے لگی۔ لیکن میں نے تم سے کبھی اس کا اظہار نہ کیا۔ اس لئے کہ میں جانتی تھی کہ میں تمہاری محبت کے لائق نہیں ہوں۔ میں جانتی تھی کہ اگر میں اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہارے قریب گئی تو تم زندہ نہیں رہ سکو گے۔ مجھے اپنی محبت سے بڑھ کر تمہاری زندگی عزیز تھی۔ اس لئے میں نے تمہارے آگے بھی اپنی محبت کا اظہار

نہ کیا۔ اب تم نے مجھ سے شادی کی بات کی تو میرے لئے ضروری ہو گیا کہ میں حقیقت حال بیان کر دوں۔ ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے دوست ہیں اور ساری زندگی بڑے اچھے دوست بن کر رہیں گے۔"

یقین کریں اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پروین نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہا۔

"ان آنسوؤں میں تمہاری روح کی توانائی ہے اس توانائی کو صرف ایک عورت کی محبت کی خاطر ضائع مت کرو۔ اسے دوسروں کی بھلائی کے لئے استعمال میں لاؤ۔ جس طرح میں نے پاکستان میں رہ کر بیماروں کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے اسی طرح تم بھی اپنی زندگی اپنے وطن کی تعمیر اور بھلائی کے لئے وقف کر دو وہ محبت جو ہمیں انسانیت کا کوئی بلند مقام عطا نہیں کرتی جھوٹی محبت ہے۔ جو محبت ہمیں زندگی کی عمارت کی پہلی منزل سے دوسری تیسری اور چوتھی منزلوں کی راہ دکھاتی ہے وہی اصل محبت ہے۔ وہی سچی محبت ہے۔"

پروین متبسم نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اب میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ میں نے پروین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"پروین!"

اس سے آگے میں ایک لفظ نہ بول سکا۔ میرا خیال ہے کہ میں محبت --- سچی محبت کے اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں دنیا کی زبانوں کے تمام الفاظ' تمام آوازیں' تمام ساعتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جہاں جسم پاکیزہ اور شفاف ہو کر ٹرانسپیرنٹ ہو جاتے ہیں۔ جہاں محبت کرنے والا دل دوسرے محبت کرنے والے دل کے آر پار دیکھنے لگتا ہے۔ جہاں خیال بعد میں پیدا ہوتا ہے اور مفہوم پہلے سمجھ میں آ جاتا ہے۔

شام گہری ہو گئی تھی جب میں اور پروین لاہور کے کافی ہاؤس سے باہر آئے۔ کافی ہاؤس کے قریب ہی ایک خالی تانگہ کھڑا تھا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے پروین کو نرسنگ ہوسٹل میں چھوڑا اور خود اپنے گھر چلا آیا۔ پاکستان آ کر پروین کی زندگی ایک

معمول پر آ گئی تھی۔ پروین ہسپتال میں مریضوں کی تیمار داری میں مصروف ہو گئی اور میں دوبارہ اپنی کالج کی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ یوں میری ایک طویل ایڈونچرس داستان کا اختتام ہو گیا۔